

علم الانسان ما عظم

کتابخانه

جورنالِ اسلامیہ
دہلی

شعبہ ۰۵

شماره ۱۵ ج

عدد داخلہ ۱۲۲۳۳

جبریل و جبریل



۱۸۹۲-۱۸۹۳

جامعہ

اُردو اکادمی جامعہ

کا

ماہوار رسالہ

مجلس ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین
پروفیسر محمد مجیب

مولانا اسلم جیرچوی
ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر عبد السلام

فی پرنٹنگ

مطبع جامعہ دہلی

ست سالانہ

لکھنؤ اور لکھنؤ کا باہر تصویر مہوار سال

پیامِ تسلیم کا شہد اس سال گرہ نمبر

پیامِ تسلیم کے سال گرہ کی اس سال جس شان و شوکت سے
تیار ہے۔ مدتوں بچوں کا کوئی پرچہ اس کی نظیر نہ پیش
کر سکے گا۔ اگر آپ فوٹو بلاک، دستی تصویریں، لطیفے، چٹکے اور ملک
کے بڑے بڑے لوگوں کے دل چسپ مضمون دیکھنا چاہتے ہوں
تو آج ہی (۸۸) کے ٹکٹ بھیج دیجئے۔ یہ شاندار نمبر آپ کو
مفت بھی مل سکتا ہے۔ اگر دسمبر ۱۹۳۲ء تک مبلغ چار بھیج کر
آپ ایک سال کے لئے خسارہ دار بن جائیں۔ سال گرہ نمبر
۲۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو شائع ہوگا۔

منیجر، مکتبہ جامعہ دہلی

لکھنؤ اور لکھنؤ کا باقاعدہ طور پر

پیامِ تسلیم کا شمار اس سال کے نمبر

پیامِ تسلیم کے سال گرہ کی اس سال جس شان و شوکت سے
تیار ہے۔ مدتوں بچوں کا کوئی پرچہ اس کی نظیر نہ پیش
کر سکے گا۔ اگر آپ فوٹو بلاک، دستی تصویریں، لطیفے، چٹکے اور ملک
کے بڑے بڑے لوگوں کے دل چسپ مضمون دیکھنا چاہتے ہوں
تو آج ہی (۸) کے ٹکٹ بھیج دیجئے۔ یہ شاندار نمبر آپ کو
مفت بھی مل سکتا ہے۔ اگر دسمبر ۱۹۳۲ء تک مبلغ چار بھیج کر
آپ ایک سال کے لئے خسارہ دار بن جائیں۔ سال گرہ نمبر
۲۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو شائع ہوگا۔

منیجر، مکتبہ جامعہ دہلی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جست

قیمت سالانہ
فی پرچہ
SV02
نیراوانت

مولانا اسلم جلیز چوہی
ڈاکٹر عابدہ احمد

جلد ۱۸
بابۂ ماہِ جن

- ۱۔ ہماری شامسری بناب نور
- ۲۔ قدرا دل کے ستارے محمد مہم صائب سنی
- ۳۔ تدوین علوم مولوی خلیل احمد صائب (جامعی)
- ۴۔ حکیم مولوی سید عید احمد صائب۔ اسعد ٹونگی مولانا محمد سورتی صاحب
- ۵۔ بیداری کا افہام (فنائت) حضرت کوثر چاند پوری
- ۶۔ غریبات حضرت جگر مولوی
- ۷۔ تنقید و تبصرہ
- ۸۔ دنیا کی رفتار (الف) ملک غیر ڈاکٹر زومر
- ۹۔ (ب) ہندستان س۔ ا
- ۱۰۔ (ج) عالم اسلامی ن۔ ن
- ۱۱۔ شذرات

محمد محیب بی بی (ڈاکٹر)، پرنٹر و پبلشر نے دفتر سالہ قلوباغ سے شائع کیا،

ہماری شاعری

میں حصے سے غموش ہو گیا ہوں اور سہ مدت سے جو چپ ہوں تو زباں صاف نہیں ہے۔ چمکا کیا، اس ملک کی موجودہ فضا میں تو بولنا حرام ہو گیا ہے۔ ایک میں کیا، بلبلِ نالہ کش تک دم بخود ہے! مگر اجاب کی فرمائش سے مجبور ہو کر آج کچھ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

مجھے مذہب سے محبت ہے اس لئے اس کی اس سرلی آواز یعنی شاعری سے بھی بہت الفت۔ اس شاعری کے متعلق حد کی غلط فہمیاں ہیں۔ اس لئے اس کی نسبت ذرا وضاحت سے کام لینا تھا۔ مگر ضیقِ وقت گلا گھیر ہے۔ انداز سے زیادہ زبان ہلانا مشکل ہے۔

اس بیان میں فلسفہ و روح شاعری اور اس کی ف و انبساط کو بتانے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں ہندی رس سے تعبیر کرتا۔ اور ہے ہمارا کن رس و سخن رن ہی سمجھ سکتا ہے۔ افسوس کہ اتنی بڑی کہانی دو بولوں میں ختم ہو جائے گی۔ مگر اسے اہل علم اور اہل نظر دیکھیں گے۔ میرا مدعا پوشیدہ نہ رہے گا۔ میں مطمئن ہوں۔ آج ہمیں، کل لوگ انہیں گے میرا مطلب سمجھیں گے، سمجھائیں گے اور اس مختصر کو مطول کر دکھائیں گے!!

۔ نذائینہ کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں حقیقت میں جلالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

ہمارے یہاں شعر و شاعری کو بھائی نہیں گیا ہے۔ اس محبت پر جو کچھ لکھا گیا اس میں اس سے گریز کر کے صرف نظم کی تعریف اور اس کی قصیدہ خوانی کی گئی ہے۔ بہت ہوا تو ایک صاحب نے فیاضی سے فرادیا کہ شاعری جزویت از پیغمبری۔ اس جیتاں کا جو جناب می آسان نہیں

اس نے پہلے شاعری کو سمجھا چاہئے تاکہ اس کے متعلق غلط فہمیاں دور ہوں اور اس سے وہ فوائد حاصل ہو سکیں جو نشانے فطرت ہے۔

جاننا چاہئے کہ اس عالم کے ذرہ ذرہ میں ہوزنی و تقابلی اور تناسب پایا جاتا ہے جس کا دوسرا نام حسن ہے۔ اصطلاح میں اس صفت کو ترجیع کہتے ہیں اس ترتیب و نظام پر نظر کر کے عقلا اس کا خود بخود وجود میں آجانا محال اور اس نے کسی ایک سند کا انما فی نفس سمجھتے ہیں جن عقلا نے اس صفت و حسن کو سمجھ کر اس کے اندر ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے۔

اول وہ جو بذریعہ وحی اس کی ذہن سے اور خلق کو وہ قوانین دے گئے:

صانع کی بندگی کے لئے ضروری تھو۔ انھیں انبیاء اور مرسلین سے دیا۔

دوم، وہ جو بذریعہ طبیعیات و مشاہدات اس مسئلے کی صداقت تک پہنچے اور اپنے استدراک اور استدلال کو عیاں کر گئے انھیں حکما و عقلا کہتے ہیں۔

سوم، وہ جو بذریعہ حیات و جذبات اس مسئلے سے باخبر ہو سکے اور دلائل و دہان ہو قطع نظر کر کے تجلیات و قیاسات سے کام لینے اور عوام کو اس طریقے سے متاثر کرنے لگے انھیں شعرا کہتے ہیں۔

یہاں تیسرے قسم کے حکما و عقلا یعنی شعرا سے بحث ہو۔

شاعری و شاعر۔ ایسا ہر وہ خیال جو بذریعہ حیات و جذبات، دل و دماغ میں پیدا ہو کر زبان و قلم سے نکلے وہ شاعری ہے۔ اور جو فرد اپنے حسن اور جذبہ سے اس عالم مصع کی صفت و حسن کو سمجھے اور اس کے صانع کا عاشق و مرید ہو کر اپنے خیالات، وہ نظم میں ہوں یا نثر میں، ادا کرے وہ شاعر ہے۔

شعر۔ کسی فقرے یا جملے کے موزوں یعنی وزن میں ادا ہونے کا نام شعر ہے۔ ایسے

خواتین کا بے اختیار منہ سے نکل جانا ہر ملق کی فطرت میں ہے۔ اس لئے اس کا قدیم و جدید
غیر نہیں۔

نظم۔ کسی خیال یا خیالات کا سلیقے سے کسی شعر یا اشعار میں بیان کرنے کا نام نظم ہے۔ یہ
نظم بھی فطری ہے جو شوق سے بڑھتا اور ایک موزوں طبع اس پر قادر ہو جاتا ہے۔

تاریخی عہد میں اس شاعری کا زمانہ کئی ہزار برس قبل مسیح شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی
بہترین یادگار رگ وید و ژبور ہیں۔ شرکی تاریخ مشتبہ ہے۔ اس لئے نظم کا کوئی زمانہ عین
نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ہندوستان کے عہد (جو اکثر موزوں ہیں) اپنی عرصوں قبل مسیح
باتے ہیں۔ اور ملکوں اور دوسری قوموں میں بھی وہ جذبات جو حمد کے لئے مخصوص تھے، اثر
نظم میں ظاہر ہوا کئے۔ مگر ان کا کوئی نمونہ موجود نہیں۔ اس لئے ان کے متعلق کوئی حکم نہیں
لگایا جاسکتا۔ یہ بے غرض شاعری ایک عرصے تک قائم اور اپنے پرستار یعنی شاعر کے ذریعے
سے دنیا پر ظاہر ہوتی رہی۔ لیکن اس میں رفتہ رفتہ آمیزش ہوتی چلی اور آخر وہ کم عیار ہو گئی۔
ہومر یونانی اور درپل رومی کی نظمیں گو شاعرانہ کیف و انداز سے خالی نہیں۔ مگر ان میں بھی
یونان و روم سے قریب تر ملک شام کے ان صحیح جذبات کا پرتو بہت کم نظر آتا ہے جو اس
حصہ دنیا پر بصورت ژبور ظاہر ہوئے۔ اور اس وجہ سے یورپین نظموں میں جو ابتدا سے
زیادہ تریونانی و رومی خیالات کے زیر اثر رہیں۔ وہ منظر نہیں آتا جسے ہم شاعری یا جان
شاعری کہتے ہیں۔

ہند میں یہ شاعری اور ملکوں سے زیادہ سلی۔ اور یہ ویدوں کے اثرات تھے۔
مہابھارت نظم، میں سری کرشن جی کے مازانہ و خصیصہ بیانات اس کے شاہد ہیں لیکن
سکندر کی بدولت جہان اور یونانی خیالات یہاں داخل ہوئے وہاں اس خطے کے آخر
وہ جذبات بھی گھر کر گئے جو ہومر و درپل کے لئے مخصوص ہیں۔ اور اس وجہ سے وائیکی و

کالیداس کے یہاں یونانی حکمت و تخیل زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن پھر بھی سسکرت اور خصوصاً شاکا کی اکثر نظمیں اُس سن سے خالی نہیں جو شاعری کے خط و خال ہیں۔

عرب، پراز جذبات و حیات واقع ہوئے ہیں۔ جوش آور زودہری شاعری کی جان ہیں۔ اودبہ دونوں باتیں قدرتِ امان میں موجود تھیں۔ انھیں ابتداء سے اگر کوئی ایسا علم ملتا جو ان پر قابو کر کے انھیں روکے رہتا اور صحیح راستے پر لگا دیتا تو اس فن شاعری میں جی وہ دنیا کے آقا ہو جاتے۔ مگر اُن پر کلدانیوں کا اثر پڑا، اور نہ صابیون کا۔ وہ آل ابراہیم کی گرفت سے بھی باہر رہے اور اس وجہ سے اُس نور کو وہ

اس قوم کی کائنات سبب

جاہلیت کی ایسی نظموں میں جو خیالات

مگر لاطینی کی وجہ سے حسنِ اصلی سے سزاوار اور

الشعراء جہم نعتاؤن

اسلام نے عربوں کو آدمی بنایا۔ ”مدینۃ العلم“ نے اُن کے حواس درست کئے اور باب ”مدینۃ العلم“ نے یہ کہہ کر کہ۔ رضینا قسمت الجبارینا۔ لنا علم و لہما، ال۔ اُن میں علم و دانش

(۱) کلدان، عراق عرب کا وہ مقام جہاں اکثر مادی و بنی پیدا ہوئے۔

(۲) صابیون۔ عرب کا وہ فرقہ جو موحدین کہلاتا تھا۔

(۳) آل ابراہیم۔ حضرت اسحاق و حضرت اسمعیل کی وہ اولاد جو دین ابراہیم کی علمبردار تھی۔

(۴) سبغہ معلقہ۔ وہ مشہور عربی قصائد جو فائدہ کعبہ میں آویزاں کئے گئے تھے۔

(۵) یعنی شعرا کی پیروی چیکے ہوئے کرتے ہیں۔

(۶) مدینۃ العلم۔ حضرت رسول بقول۔

(۷) امیر المومنین حضرت علیؑ۔

(۸) ہم اپنی قسمت سے خوش دل ہیں۔ ہم کو علم ملا اور نادانوں کو دولت!

کائنات ہی پیدا کروا پھر اسی گھرنے انہیں صفحہ شگفتہ کی سی زبور بخشی جس نے شاعری کے غہر کو جاکر اسے قوائے جواز ملے دیا۔

ایام جاہلیت کی شرگوئی گو شاعری کے اس معراج کمال تک نہ پہنچ سکی جو معضل بحث میں ہے مگر بلا شک وہ اس کیف سے بھی خالی نہیں جو ایک پر جوش اور آزاد قوم کا زہدہ انہوں نے کسی غیر متقن کا قصیدہ کہی نہیں پڑھا اور سردارانِ وقت کی خوشامدانه تعریف کہی نہیں کی۔ عویر، امر القیس کا مشہور مدوح ہے۔ مگر اس فصیح اللسان نے اس (عویر) کا قصیدہ اس وقت کہا جب کہ عویر نے اس (امر القیس) کے کنبہ کی جان بچائی۔ وہ صلہ کا مستحق تھا اور اسے دیا گیا۔

توہین ہوئی عربی شرگوئی کی کہ وہ اپنی آزادی کو فراموش کر کے، اموی و عباسی خلفاء کی درباری ہو گئی۔ بدقت تھا ابو نواس کہ امینِ خلیفہ کی مسند کا حاشیہ نشین بن کر اپنے قومی شعار و قار کو سلام کر بیٹھا۔ بد نصیب تھا ابو تمام کہ شخصی توجہات سے اس کے کام کا نام بلند ہو سکا۔ اور قابلِ افسوس ہے متنبی کہ سیف الدولہ اور اس کے لواحقین کی مرج میں اس کی خوش بیانی صرف ہوئی اور ان کی بدولت وہ قصیدہ گو سمجھا گیا!

ایران، یونان کے ہاتھوں غارت ہوا۔ سکندر اور اس کے لشکر نے جہاں آوارہ و مصادیغِ شکست کئے، وہاں افسوس کہ زبردشت کے سے معلم کے اس پر از نور آنکھ دکھائی سر در کڑا لاجورق وادئے ایسن کو چمکاتا اور دلوں کو گرماتا تھا۔ اور اس وجہ سے فارسیوں کی داستانِ پستان کا ایک ورق بھی ایسا دستیاب نہ ہو سکا جو ان کی شاعری کی حکایت سنانا۔ اس باب میں تازیوں کی تاخت کے بعد کی روایت کے سوا کوئی اور پانچ (نامہ) موجود نہیں۔ ناچار بہ اختصار اسی کا قصہ دہرایا جاتا ہے۔

عجم پر عرب کا اہل تسلط عباسیوں کے وقت میں ہوا۔ ہارون، فارس کا ولد اور تھما۔

اور مامون اس کا عاشق۔ اس طرف اویس۔۔۔

پرسوسال سے، اسلامی نہیں اموی اور بھپوری نہیں تشریف سلطنت کا اثر اس تھا۔ اس نے فارسیوں اور ترکیوں کی زبان سے اُس وقت جو کچھ وہ شام و عراقی لب و لہجے میں بولا۔ قصیدہ، عربی سیوہ ہے۔ اُس کا نقل زمین فارس پر بھی لگایا گیا اور یوں وہاں شخصی رطب اللسانی کی تلخ بنیاد پڑ گئی۔ عباس مروزی نے مامون کی شان میں یہ زبان فارسی جو قصیدہ خوانی کی وہ اس کی شاہد ہے۔ بنیاد غلط پڑی۔ اس نے آدم پرستی کی عمارت یہاں بھی کھڑی ہو گئی۔ اور وہ کبھی آج بھی نمایاں ہے۔ ایسی کج روی کے بعد بھی فارسی شعویوں میں فردوسی و سعدی قابل تعریف ہیں کہ وہ اگر اس جن کو خاطر خواہ جلوہ نہیں دیتے تو اُس کے صفات سے بھی دور نہیں جاتے اور کسی کی تقلید کے بغیر دنیا کے آگے اپنا اصول پیش کرتے ہیں۔

فردوسی، پہلوی کا وہ پہلا ناظم ہے جو اپنے صحیح جذبات کے بیان میں عجم یعنی گوجا نہیں۔ شہنامہ میں اس کی حمد ستادانہ بلکہ مجتہدانہ ہے۔ اس کے بعد کے شریک اس کے تابعین ہیں اور تبع تابعین اور اُن مں کے بیشتر اس ضروری بیان کو تقلید اور سادہ ادا کرنے والے۔ فردوسی حقیقی یزدان پرست ہوا اس لئے اُس نے جمشید کی فردویت و فرعونیت سے دنیا کو خوف دلایا وہ نیشلت یعنی اپنے ملک و قوم کا فردار اور اُن پر کسی بیرونی حملہ و حکومت کو خلاف فطرت بتانا اور اسے ایک صانع کی صنعت کی پامالی سمجھتا ہے، اس لئے وہ (فردوسی) رستم کے سے

(۱) مرو۔ ترکستان کا ایک مشہور مقام۔

(۲) پہلوی۔ اہلی فارسی زبان جو ساسانیوں کے زوال تک ایران میں رائج تھی۔

(۳) جمشید۔ ایران و توران کا وہ مشہور بادشاہ جس نے اخیر میں دعوتِ خدا کی کیا۔

(۴) رستم اُن تورانیوں سے جنگ کرتا رہا جو اُس وقت ایران پر حملہ آور ہو رہے تھے۔

نمک و قوم کے فدائی کی داستان کو یوں جلوہ دیا اور دنیا کو غلامی سے جنگ کا رعب دکھایا ہے۔ وہ شیدائے حقیقت ہے۔ اس نے ہر اسٹپ و گتساپ کا مدح خواں ہے اور زردشت کے زبردست معلم کا نانا خواں۔ افسوس کہ اُس کا کارنامہ مبنی شہنامہ محض ایک داستانِ پاشان بھجا اور اُس کے منشاء کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ بعد کے شعر گو اُس کے نقش قدم پر نہ چلے۔ اس نے بے راہ ہوئے۔ سلاطینِ ایران شخصیت کے غرور میں مست تھے۔ اُن کے درباری شعر گو اُن کی اس شراب کو دو آتشہ بناتے رہے۔ آزاد مٹی روح و زبان سلب ہوئی اور غازی ادب غلامی کا مترادف ہو گیا۔

شہنامے کے سے میوہ دار درخت کے پھلنے کے بعد زمینِ ایران پر گلستان کے پھول بسے۔ سعدی، یثرب و بلخ کی زبان کا نمک پیش، اور نجم معرفت آلِ محمد کا جرمہ کش ہے۔ مصلح الدین واقعی مصلح دنیا تھا۔ بد اخلاقیوں کے عہد میں اُس نے اخلاق کا سبق دیا۔ خود مختار سلاطین کو بے اختیار منوایا اور سے

رعیت چونچ ست ہلٹاں خست درخت لے پسر باشند از پنج سخت

کا سا اصول پیش کر کے دنیا کو حکمرانی کا راز اور راعی و رعایا کے حقوق و امتیاز کو بتلایا کہ اس کے بغیر عالم میں وجہِ معنی مناسب قائم نہیں رہ سکتا جو اس کائنات کی خوبصورتی و دل فریبی کے لئے لازم اور جس پر اس کا رخاۂ کی بنیاد نظر آتی ہے!

شیخ کے کلام اور خصوصاً اس کی گستاخ کی قدر ہوئی تو صرف اس قدر کا شعر مرابہ مدد کہ برد؟ کے مقولہ کو فراموش کر کے وہ مکتبوں تک پہنچائی اور بازمی اطفال بنا جی گئی اور یوں بالغ دماغوں تک اس کی رسائی نہ ہو سکی کہ ہماری زندگی میں کام آتی۔ اور پھر اس گلستان

۱۱) ہر اس کے بجائے گستاخ کے زمانے میں زردشت کا ظہور ہوا اور انہوں نے زردشتی دین قبول کیا۔

۱۲) زردشت، ایران کا وہ معلم وادی جس نے دعوائے پمیری کیا اور مجید و غیرہ کے اصول کو توڑ کر حکمرانیت کا سبق دیا۔

ہند میں جس فارسی ادب نے گھر کیا وہ ترکوں کے ذریعے سے یہاں پہنچا تھا۔ اس قوم میں اگر اسیاب کے وقت سے ہوا و لعب زیادہ پن اور شجیدگی ناپسند تھی۔ چلکیروں اور ان کے بعد کے تورانیوں کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ وہ مسلمان ہونے پر بھی اپنے مادی و مصالح نہ بھولے۔ اور اس لئے فارس کے ادبی، علمی، تاریخی، جغرافیہ، جہان نامے جو بظاہر خوش ناما ہو مگر بے مغز تھا۔ اس کو زبان اور وہ تین سو برس یعنی غوریوں سے لے کر زبان ہی کو مزا نہیں دیتا رہا بلکہ ہمارے حوالہ

منزل یا منگول اپنی قومیت و مذاق میں ان ترکوں سے بہت برتر تھے۔ ۱۰۰۰ سال پہلے
کے اس اثر رنگ کے آئینہ دار بھی بنے جس پر نائی کی قلعیان زیادہ تر تھیں اور حجازی
قلم جس پر کم رنگ بھرسکا تھا !

بار تقیوری اس قوم کا سر وار ہے جو آخر شاہ ہند بنا۔ اپنے خاندان میں اس کی عرش و فلاکت ضرب اثل رہی۔ اور اس وجہ سے اس میں وہ فروتنی ہونا چاہئے تھی جو ایک ملک زدہ کے لئے ضرور ہے۔ مگر وہ اپنی صیبت اور دشت نوردی کے عالم میں بھی یوں بے باکانہ کہتا ہے۔

نور دنیا بہارِ رمی دلر با خوش است
 بابر عیشِ کوش کہ عالم دو بار نیست

۱۱، مانی۔ یہ معلم عراقی ہے۔ مگر اس کا اصول زیادہ تر قرآن و حدیث میں پھیلا۔ ادھر کے مسلمانوں میں دین مانی کی اکثر باتیں رائج ہیں اور اس کا اثر اب تک باقی ہے۔ مانی زیادہ تر اپنی مصوری کے باعث مشہور ہوا۔

یہ یونانی ایسکپوٹرین کے وہ خیالات تھے جو سکندر کی ہمالی ہوئی راہ سے فرغانہ پہنچے اور وہاں سکندر اور بعد کو ہند آئے۔ اس وجہ سے کہ ہایوں سے شاہجہاں تک زیادہ تر بارہی پھال رہی اور شاہی اثرات سے اس ملک کی رفتار و گفتار بے قید ہو گئی اور یہاں کا درباری فارسی ادب کا شاعری کو جلوہ نہ دے سکا جو جن کی مدح خواں اور اس کی کیل رہی ہے۔ مالگیر اس معاملے میں حالی الذہن تھا۔ ورنہ اس کی توجہ سے جہاں اور بدعات دور ہوئے وہاں ہماری شاعری کی یہ برکت بھی دماغوں سے خارج ہو کر اسے ایک عبادت منواتی اور مرقات مصداق اعلیٰ ملک اسے پہنچا دیتی!

اورنگ زیب کے بعد یہ ملک مخصوص میں گرفتار اور بعد کو طوائف اللوکی کا شکار ہو گیا۔ بہادر شاہ (اول) اسے فرخ سیر تک عجب الجھن کا زمانہ تھا۔ چنانچہ قسط سارے شد اندر دمشق کہ یاران فراموش کر دئے عشق عشق ماشی کسی، یہاں تو خود فراموشی تھی۔ مگر ہماری اردو شاعری بھی عجب سخت جان ہے کہ ٹھیک اسی عالم انتشار میں وہ پیدا ہوئی اور بڑھنے لگی۔ تاتاریوں کی تاخت نے توران و ایران سے صلحار و اصفیا کو اخراج کر کے ہندوستان پہنچایا۔ ان کی برکت سے امید تھی کہ اب اس ملک میں بھی اس بادۂ حجاز کا دور عام اور علی الدوام ہو جائے گا جس کے وہ جرمہ کش رہے تھے۔ لیکن یہاں اس وقت تک ملک گیری و خانہ جنگی کا نشہ، اس طرح نہ اترا تھا کہ دماغ یکسو ہو کر اس کی طرف ہاتھ بڑھ جاتے۔ کوتاہ دست محروم اور پریشان منوم رہے۔ ہاں، سلطان بلبن کے دور میں سلطان جی کی توجہ و برکت

(۱) ایسکپوٹرین۔ یونان کا وہ مشہور قوجیات انسانی کو اسی دنیا میں ختم سمجھتا اور اسلئے کھانا پیدا خوش رہو کا سبق دیا کرتا تھا۔
(۲) سلطان جی جعفر ت نظام الدین اولیاء۔

سے غیر دستورِ مطلق زبان چپکا۔ اس نوا کا اثر ہو چلا تھا کہ سلطنتِ گردی کے ساتھ ادبِ مذاقِ گردی بھی ہو گئی۔ اور خسرو کے زمانے قوالوں کے گلوں میں اثر کر اس طرح بلند ہو سکے کہ ہندی نقار چلا جاتے۔ اور اس لئے فرخ سیر و محمد شاہ کی محفلوں میں خسرو کی سادہ گوئی جگہ پوربی کو بننے لگی۔

بیدل پوربی عظیم آبادی، عالمگیر شہزادوں اعظم و منظم کے مسلم تھے۔ اُن کا اور اُن کے سرود کا اثر دربار و بازار دونوں پر گواہ تھا، مگر اُن کی تعلیم عام فہم نہ تھی، اس لئے ہمارے دماغ اس کے اصلی فوائد سے خالی رہے۔ ہمارے شاہانہ محافل آج تو وہ اتنا زیادہ تران اثرات میں پرورش پاتی اور جوں جوں لبین سے نہیں بلکہ سیحون و جیحون سے بدتمتی سے اس ادب میں ہمارے

داخل نہ ہونے پائے جو اس عالمِ مرصع کو جلوہ دینے والے بلکہ اس سے ناسا۔ یہاں اس وجہ سے ابتداء ہمارے نظم اس جن ہی سے سراز رہی جو شاعری کی روح ہے بلکہ اُن فصیح و فطری جذبات سے بھی محروم ہو گئی جو اُس ذاتِ صن کے صفات ہیں!

اس میں شک نہیں کہ حافظ کے بعد بلجویوں بلکہ صفویوں تک ادبِ فارسی کے پتلے پر وہ خرقہ بھی نظر آیا جو اس کا عیب پوش رہا۔ لیکن اس کے اس جامِ احرام کا ایک اچھا حصہ زرم

-
- (۱) ادبِ گردی و مذاقِ گردی، اردو کے نئے الفاظ ہمارے تصرفات میں سے ہیں!
- (۲) سادہ۔ بچن کی طرح روزن وادرا، میر خسرو کا ایک ایسا کردہ ناگِ جبین کی جن میں گایا جاتا تھا۔
- (۳) پوربی ایک ناگ ہے۔ بیدل پوربی تھے۔ اس وقت ان کا کلام بہت مقبول تھا اس نسبت سے اُن کی غزلوں کو پوربی کہا گیا!
- (۴) مرزا عبدالقادر بیدل پوربی، عظیم آبادی تھے۔

میں نہیں بلکہ دنیا کے اُن چٹپوں میں بھی غوطہ کھا گیا جو ظاہر صفا ہوں مگر باطناً فکرتیں تھے۔ پہلی صدی
 ہجری سے تیسری بلکہ چوتھی صدی ہجری تک عالم اسلامی، عالم انتشار میں تھا۔ تعلیمات کا مقابلہ
 عملیات سے اور ان دونوں کی جنگ رومانیات سے شروع ہو گئی۔ معتزلہ پیچ میں آئے
 لیکن اُن کے اخوان الصفا کے سر پر وہ قیشہ سخت لگا کہ اٹھ نہ سکے۔ اور بعد کو ہماری علمی
 جماعت صاف صاف دو گروہ (علمائے ظاہر و علمائے باطن) میں منقسم ہو کر ایک دوسرے
 کی دستار اچھالنے لگی۔ اشاعۂ وہ خالہ کے آپس کے فسادات سے فائدہ اٹھا کر یہ فرقہ
 علمائے باطن مضبوط تر ہو گیا۔ یہی وہ گروہ ہے جو اپنی مختلف شکل و شمائل میں اور اپنی سادگی
 وضع کے باعث بعد کو ایک صوف کے نام سے شناخت کیا گیا۔ ابن جوزیؒ و ابن تیمیہ کی شفیق
 زبان گو اس فرقے پر بھی چلتی رہی مگر اُن گوشہ نشینوں کا قلع قمع نہ کر سکی۔ اہل ظاہر نے اگر
 انھیں سخت سخت کرنا چاہا تو انھوں نے بھی اپنے زور زبان سے انھیں پارہ پارہ کر دیا۔ ان اہل باطن
 کا واعظ انھیں اہل ظاہر میں سے ہے جس کی نسبت بہانگ دہل کہا گیا، کہ

واعظان کین جلوہ بر محراب و مبرہی کنند چوں بخلوت می روند آن کار و دیگر می کنند!
 یہ واعظ جیسے یوں بدنام ہوا کہ ہمارے ادب و شاعری کے قصائد میں وہ ایک مستعد
 مشبہ بہ ہی کا کام دے کر نہیں ہساتا بلکہ وہ ہماری محفلوں کا خونخوار محتسب بھی بنا اور آخر
 اس غریب پر دروازہ رحمت تک بند ہو گیا!

اس وقت ہماری حکومتیں زیادہ تر اُن علمائے ظاہر کے قبضے میں تھیں جن کی تائید
 پر اُن (سلطنت) کی ہستی منحصر تھی اس لئے ان (علمائے ظاہر) کے اصول کے خلاف تقریر و

(۱) فکرتیں۔ اس کے اصل معنی گندے کے ہیں مطلب یہ کہ اس وقت کا فارسی ادب منہ نہیں بلکہ جن میں ہوا تھا!
 (۲) معتزلہ مسلمانوں کا وہ مشہور فرقہ جس کے مسلک کی بنیاد عقل پر رکھی گئی۔ اس فرقے نے بنی عباس کے شروع عہد میں فروغ پایا
 لیکن مسلمانوں نے اُن دوسرے فرقوں نے جن کے ہاتھوں میں بعد کو سلطنت کی باگ آگئی معتزلہ کو زندہ نہ رہنے دیا، انکی
 انجمن اخوان الصفا خاک میں ملائی اور انکی کتابیں تک جلائی گئیں۔ (۳) اشاعہ مسلمانوں کا یہ بھی ایک نمایاں فرقہ
 تھا اور یہ خالہ یعنی جنابیل کی ضد تھا۔ (۴) ابن جوزی و ابن تیمیہ مشہور محدثین ہیں، صوفیوں کے دشمن اور اپنے
 اسلام کے دوسرے فرقوں کو بد کہنے میں مشاق و ممتاز۔

تحریر کفر و بغاوت تھی۔ اہل باطن۔ رحمت و شفقت کو قہاری سے اور عشق و محبت کو جباری سے بدھا ہوا دیکھ کر منہ بتائے مگر زبان نہ بلا سکتے تھے۔ لیکن خیالات و جذبات کیونکر ادا کب تک رکھتے۔ انھوں نے اپنے بیانات کا آخر دوسرا طریقہ اختیار کیا اور اپنے تصورات کا نقشہ، مجاز کے اس پائے پر کھینچا جو حقیقت کا مظہر تھا مگر ظاہرین کی گرفت سے باہر تھا۔

فراق و دوس و گل و بلبل و بہار و خزاں	جنون و عشق و دفا و جفا و ناز و ادا
بہار حسن و دل آویزی کرشمہ حسن	عجوبہ شوق و فور و خوشن و سودا
ریا بھرے ہوئے پند و نصائح و اعط	شباب و ساقی مہرزد و ساغر و مینا
تصور و حور و تین دانش و آسمان و زمین	
یہ تشبیہات و استعارات کہ	
نہیں بلکہ سامیوں (sensitives)	

(Marcanalisto) اور مانیول (manu)

اور عربوں (Maracene) کے مخلوط و مانع کا وہ جوہر تھے جو زمین و فرنیج پر قیامت (Maclete) اور جرمن پائے لٹ کے سے داعیان عشق باطنیوں کے گھروں میں کشید ہو کر دو آتشہ و سہ آتشہ بنے اور شراب معرفت کے نام سے پئے اور پلائے گئے۔ ان ہی کنایات و استعارات کی بنیاد پر ہمارے روحانی ادب و شاعری کی خشت اول رکھی گئی اور اور ان سے وہ مہل تیار ہو گیا جہاں ہمارے خزانچہ پرورش پائے رہے اور پرورش پا رہے ہیں!

(۱) بر اقلیت۔ فرنیج لفظ ہے۔ باطنیوں اور صوفیوں کی طرح یورپ کا وہ فرقہ جو وہاں اسی عیسوی مذہب کے پھیلنے کی کوشش کرتا رہا۔

(۲) پائے لٹ (Machete) جرمنی کا وہ مشہور فرقہ جس نے پروٹسٹ (مذہب) کے خشک و قشری رویے کو مٹا کر، مذہب کی بنیاد عشق و محبت پر رکھی

بیانات و تعلیمات کا یہ مجازی و دیوانی (یعنی صرفی) انداز *Reasoning*۔
 یعنی تعلیمات و تعلیمات سے گو دور نظر آئے مگر جذبات و هیات بلکہ تخیلات سے وہ قریب تھا
 اس لئے ہمارے حواس اس سحرگاہ گیر رہے اور جب تک وہ ان نیچرل ذہنا ہمارے دماغ
 بے ہمت و بے پروا پر کریف و کھانی تھے۔ لیکن بے بصری یا بلند پروازی نے ایسی لاجواب
 اور شیریں (طلاقت) کے لئے فضول الفاظ اور پھج و پھج استعارات کے وہ طوفان اٹھائے
 کہ اس کا اصلی و فطری زور ہوا بلکہ غائب ہو گیا۔ فارسی ادب و شاعری اس ساز و سامان سے
 اس ملک میں داخل ہوئی اور رفتہ رفتہ اتنی مضبوط ہو گئی کہ فرخ سیر کے عہد میں ہمارے ریختہ
 کی بنیاد آخر اسی پر قائم ہو کر پختہ ہو گئی۔

ابھی کہا جا چکا ہے کہ تاناریوں کی سخاکیوں نے ترک و فارس کے اہل صفا کو کس طرح
 ہندوستان پہنچایا اور کس خوشی و صلح جوئی سے وہ اپنے فرائض و وظائف میں مشغول تھے۔ شاہ
 بوطی ظہر کا دائرہ استغراق اگر میدان پانی پت کو گھیرے ہوئے ہے در دیر و حرم جلوہ دل کو
 کی آواز سے اس زمین کو فتح کر رہا تھا تو دلی میں سلطان جی کا رواق عروج بھی ہے پروازہ چراغ
 حرم ہو برندانہ کی صدا سے یہاں کی فضا پر قبضہ کئے ہوئے تھا۔ اہل دل کی ایسی صفائیوں نے
 اس ملک کے بند چشموں میں ایک طلاطم ڈالا اور یہاں کے قدم زنگ باطنیت میں ہیجان شروع
 ہو گیا۔ بابا کیر و اس انھیں صداؤں سے اٹھے اور گردناک بھی انھیں آوازوں سے چونکے
 اور پھر ہماری زمین پر سرمد ظاہر ہو کر منصور بھاگیا ہے آگاہ نئی چو شیشہ، از بوسے غلاب۔ کی
 خوشبودی کی ہوا میں جذب و تحلیل ہو کر ہمارے سردوں پر نفی و اثبات کا نور برسانے لگی۔ اور
 یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مالگیر کے بعد جب سلطنت میں انقلاب و زوال شروع ہوا تو سختی قلب گھٹنے
 اور گدازی دل بڑھنے لگی اور ہماری رنگین فراہی شوب کھا کر آخر صوفیانہ ہو گئی۔

فرخ سیر و محمد شاہ کے زمانے کو یاد کرنے والے اس عہد کی صرف ان آزادیوں بے شکریوں

اور خصوصاً اُن رنگ ریلیوں کو جلوہ دیتے ہیں جو جلو خانہ دہلی میں اس وقت بظاہر آئینہ تھیں۔
مگر اس تصویر کا دوسرا رخ مٹا دیا جاتا اور داغ اُس سے خالی رہ کر صبح صبح کے دوسو سوں کا اڑ
بن جاتا ہے۔ اس دور میں علوم و فنون کی ترقی کا ذکر ہمارے موصوٹ سے باہر ہے لیکن اتنا
سن لو کہ ان شاہوں کے جلوس میں جہاں ایک طرف پیش و نشاہ کے ساز چڑے تو دوسری
طرف اخلاق و معرفت کے نعرے بھی گونجتے اور دیوں کو گرماتے اور ہلاتے رہے۔

نواب نوازش علی خاں و نواب اشرف علی خان وہاں اردو لکے اُنسی عہد کے
ادام میں سے ہیں جن کے گھر میں محفل میلاد و بابائے ان کی بنیاد پڑی۔ اور حضرت خواجہ ناصر
عندلیپ اور حضرت شاہ گلشن علی اُسی زمانہ
تکلیہ، مذہب و اخلاق کے درس کے۔
برکت و توجہ سے یہ مذہبی چرچا آخر گھر گھر۔

یہ انھیں بزرگوار کا فیض تھا کہ نواب اشرف علی خاں۔

علی خاں فضلی (۱۷۷۷ء) نے اردو میں اپنی کربل کتھا سنا کر اس زبان کو کوثر و تسنیم سے دھویا
اور ہمارے داغ کو مصفا و مطہر کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا
مخترع اور اب تک ہندی نثر نہیں ہوئی مستمع اس دعوے نے ثابت کر دیا کہ آپ کی اردو
کی زبان کھلی تو اس ذکر میں جس کا اخلاق، عقیدات و جذبات دونوں کا حامل اور مدد
فریقین ہے!

دکن میں آپ کی زبان بہت قبل وجود میں آئی۔ عادل شاہی (ممعصر اکبر و جہانگیر) دہلی
نے وہاں اس کی بنیاد نظم پر رکھوا دی۔ شجاع الدین نوری ادھر کا وہ زردشت ہے جس کا نام
دکام دونوں نور علی نور سمجھا گیا۔ وہ اس زبان کی پہلی نظم پر فخر یہ کہتا ہے کہ

(۱) رنگ ریلیوں بھی بولتے ہیں مگر ہماری زبان پر رنگ ریلیوں ہے۔

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا دے سب نصیب دیا ہم نشا
 نہ کچھ خوف کھایا، نہ جھوٹا ذرا دُہم مرثیہ سے پہل کر دیا
 شروع میں کیا نظم کل واقعا دُہم تک کا احوال پورا لکھا
 میں جب اس کو لوگوں تک لگے پڑھا عجب حال عاشور خانہ کا تھا
 جن دانس کرتے تھے سب اداؤں کہ دکنی میں لکھا ہے کیا مرثیا
 زبان اپنی میں کس نے ایسا لکھا کبھی اس کو پہلے سنانے پڑھا
 امان سے اس کا ملے گا بھلا ہر نوری ہی موجد تو اس طرح کا

ملاحظہ ہو۔ وہاں بھی آپ کی زبان چھوٹی اور اس کی نظم نگاری بسم اللہ ہوتی ہے تو اسی
 ذکر میں جو عشق و معرفت کا سرچشمہ اور ہماری حیات کے لئے آبِ حیات ہے !

یہ تھے وہ اذکار جو دلی کی ان معرفت گاہوں میں زبانوں اور گلوں سے رسوں سے
 اٹھائے اور ہند کی فضا میں پھیلائے جا رہے تھے۔ شاہ ناصر عندلیب کے بعد ان کے خانہ باغ
 میں وہ طبل درد آشنا چکا جو خواجہ میرا درد کے لقب سے مشہور ہے۔ موسیقی کہ رازِ فطرت
 کو بلند اور شاعری کو رازِ فطرت کو عیاں کرتی ہے، وہاں دلی کے اس صنومہ میں بھی مدتوں
 گونجی۔ ان میر کے مضامین نے دلی ہی کو نہیں سارے ہند کو کھینچا۔ کلاوت اور اتانی سب
 ٹوٹے اور ان آوازوں سے اپنے مزار بھرے جو دوسری جگہ عاتقی سے خالی کئے گئے۔

درد نے اپنی واردات کے بیان میں تشبیہات و استعارات کا وہ گہرا پردہ نہ ڈالا
 جس میں حقیقت پوشیدہ ہو کر راز کی راز رہ جاتی۔ انھوں نے اپنا رستہ الگ نکالا۔ اور پرلے
 انداز میں اگر کہا بھی تو یوں کہا ہے

لے درد اس جہاں میں اگر صدائے غیب بے پردہ ہوئے جس سے وہ پردہ ہر ساز کا

(۱) اس سے ثابت ہو گیا کہ اردو نظم و نثر کی بنیاد اخلاق پر ہے نہ کہ بر اخلاق پر۔

(۲) فرار۔ باجہ۔ ساز

مینی لکھ ڈھا لکھو راز حقیقت کھول ہی دیتا اور حسن و معرفت کو عیاں کر ہی دیتا ہے !
 اس نعمت خدا داد کا خدایوں تو اس وقت کسی نے نہیں چکا مگر میر تقی میر نے اُس سے
 جو لطف اٹھایا اُس کا کیف اُن کی بات بات سے عیاں ہے۔ یہ خواجہ میر کے سجادہ کے وہ
 دوسرے خیر تھے جن کے قلب حزیں پر زمانے کی نیرنگیوں اور سلطنت گردیوں کا اتنا اثر پڑا
 کہ دلی نفس بنی، اور سہ کون رو رو کے زندگی کاٹے۔ تیر، دلی میں جی نہیں لگتا، فرما کر
 لکھنے چلے گئے اور وہاں کے باغ میں بیٹھ کر اپنا فسانہ سنا رہے۔ یہ مناسب، جو خجی،
 کے بندے نہیں۔ وہ عالم حسن پر آنکھیں
 کی بہ خموشیوں آرزو کرتے رہتے ہیں
 بہ رنگ بوئے گل اس باغ کے ہم آشنا ہوتے

یہ تھا وہ مذاق جو اس وقت دلی ہی تھا۔
 میں وہ درد کے مشہور مرید و شاگرد (مرزا جان آپوش کی سرگرمی سے گرم ہوا۔ اہل اردو کی بہ
 وہی آگ تھی جو کلکتہ و مرشد آباد اور خصوصاً ڈھاکہ کی زبان و کلام میں مدتوں شعلہ بنی رہی
 اب بھی اس کا اثر کچھ کچھ باقی ہے اور وہاں کی راکھ کرید تو دہلی و دہانی چنگاری مل ہی
 جائے گی۔

بہار اور خصوصاً عظیم آباد (پٹنہ) نے دلی کے ساتھ ساتھ اس حسن پر جی قربان کیا۔ بیدل
 ہی اس کے ولدا وہ نہیں۔ راسخ جو بمبھرو سم مرتبہ میر ہیں اس کے شیدائی رہے۔ وہ ہر طرف
 منہ پھیر کر فرماتے ہیں۔ ۵

مگر ان کعبو نہ یہ جانب رخ و لہریں پری رہی مری چشم تا نگہ پیس تری محو جلوہ گری رہی
 سنو۔

مجھے سوئے داغ فراق سے، ہوئے یوں جدا کہ پتھر سے دل میں تادم واپس وہاں انت الکی دھڑکی رہی

(۱) جیسے استاد وحشت (خان بہادر رضا علی، کلکتہ) کی شاعری!

سنو سنو۔

نہیں ہوشیوں کو کچھ مدد بھی شک ہو تو انھوں نے جنھیں تیسے جلوس کے سامنے میری طرح باندھ رکھی ہیں
نہ تھی چشمِ راسخ خستہ دل، کبھی خالی افک سودوتاں

شب و روز جامِ پر آب کی روش آنسوں پہ پھری ہی

نادری و درانی حلوں نے دلی کے چاندنی چوک اور لال قلعہ ہی کو نہیں لونا بلکہ وہاں
کے دماغوں کو بھی اجاڑ کر تتر بتر کر دیا فیض آباد اسی وقت آباد ہوا۔ صدف رنگی و سلا رنگی لڑ
کے درجات عالی ہوں کہ انھوں نے دار السلطنت (دلی) کے ان جواہر کو بھی بیٹا جو دلی
کے تحت و تاج کا کوہ نور تھے اور انھیں اپنی شہ نشین کا کرسی نشین کر دیا۔ میرضامک، دلی
سے اسی عہد میں فیض آباد آئے اور میر حسن اسی زمانے میں وہاں آباد ہو کر اُن نوابوں و مہتمم
جنگی و سلا رنگی، سے وابستہ ہو گئے۔

حسن، خواجہ میر ہی کی منفرد فکر کے ماثیہ نشین تھے۔ ان کا گھر نشینوں سے خود ادب و
اخلاق کا مدرسہ تھا جہاں اُن کی تربیت ہوئی۔ اس پر غنیلپ و درد کی صحت اور ان سے
ارادت۔ اپنی اس قربت و مودت کو وہ یوں بیان کرتے ہیں: جب قدم دیگر بزرگانِ مثل خواجہ
میرور دکھ دردمند پہاڑے اوشان میان درویشان چوں فردوس۔ دیگرے را بجایال خود
قائم نہ کروم کہ وضع آں را پسندم و دل بگفتار آں ہا بندم۔

حق ہے۔ اس صحبت سے آشنا ہونے کے بعد کہہ جاتے۔ یہ اسی غم سے اور کمیٹی
کا نتیجہ تھا کہ اُن کے دماغ و زبان نے ہمارے یہاں آنزوہ اعلیٰ مذاق شاعری قائم کر دیا جس
کا مثل ممکن نہیں۔ اس اعلیٰ فطرت اور قدرتی شاعری کا اظہار اہل انھیں کے وقت میں ہو گیا
تھا۔ مگر اس کی تکمیل ان کے پوتے میر انیس کے ذریعے سے مقدّمی اور وہ ہو کر رہی۔

۱۱) کوہ نور۔ وہ مشہور و معروف ہیراجو دلی کے تحت و تاج کا زیور بنا رہا۔

من بچنے کے ایک عظیم الشان کام کے سرانجام کے لئے تیار ہوا ہے تھے اور قدرت نے اس کام کی خاطر انھیں منتخب کر کے ایسی تعلیم و تربیت پر لگا دیا جس کی تکمیل کے بغیر اس امر کا خاطر خواہ انجام ممکن نہ تھا۔ عظیم الشان کام اُن کی اُس بے نظیر غنوی کا سرانجام تھا جو دنیا میں سحرالبیان کے نام سے ظاہر ہوئی اور بدرمید بن کر چلی۔ اس غنوی کو جس نے بغور پڑھا وہی سمجھ سکتا ہے کہ جب تک دنیا و مافیہا کے مختلف شعبہ و مدارج میں کسی کو دخل نام پڑا ایسی کوئی شے اس کے دماغ و قلم سے نکل نہیں سکتی۔

اس عجیب و غریب تصنیف کے مختلف رنگ پہلو میں گمران میں سب سے اول اور پختہ رنگ اس کی اُس حسد کا ہے جس کے لئے من کا دست سوال یوں بند ہوا اگر چاہتا ہے مرے دل کا چین وہ بادۂ خالص ملاجے انھوں نے پایا اور پلایا اور کیوں تالش کرتے ہیں

کروں پہلے توحید زوال رقم	جھکا جس کے سجدے میں دل قلم
سر لوح پر رکھ بیاض حبیب	کہا وہ سرا کوئی تجھ سا نہیں
نہیں کوئی تیرا نہ ہو گا شریک	تری ذات ہو وعدہ لا شریک
وے سب ہیں اس ہو وہ ہر کے پیش	ہمیشہ سو ہے اور ہے گا ہمیش
وہی مالک الملک دنیا و دیں	ہے قبضے میں اس کے زمان دنیا
سدا بے نمودوں کی اس نمود	دل بستگیاں کا ہے اس سو کشود
اسی کی نظر سے ہے ہم سب کی ڈ	اُسی کے سخن پر ہے گفت و شنید
نہیں اس سو خالی غرض کوئی شے	وہ کچھ ختم نہیں پر ہر اک ٹہیں ہو
نہ گوہر میں ہے وہ نہ ہو سنگ میں	لیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں

وہ ظاہر میں ہرچند ظاہر نہیں
پہ ظاہر کوئی اس سے باہر نہیں
آمل سے کیجئے اگر غور کچھ
تو سب کچھ وہی ہو نہیں اور کچھ
اسی گل کی بو سے خوشبو گلاب
پھرے ہوئے ساتھ دریا جباب
پر اس جوش میں آکے بہتا نہیں
تجھنے کی ہے بات کہتا نہیں

سلطنت مغلیہ کی بنیاد ہندوستان میں اور سلطنت صفویہ کی بنیاد ایران میں تقریباً ایک ہی وقت میں پڑی۔ حکومت مغلیہ کا بانی ایک رزمیہ شرب بادشاہ یعنی بابر اور سلطنت صفویہ کا بانی ایک صوفی شرب عالم یعنی شاہ صفی الدین ہے۔ مگر یہ طرفہ تاشہ ہو کہ یہاں کے مغلیہ و تاجیکین و مشائخ کا ادب و احترام کرتے ہیں اور صفویہ اپنے ہم شریوں کے عدو ہو جاتے ہیں۔

شاہ صفی الدین حضرت شیخ میلانیؒ کے مرید تھے۔ انھوں نے انیسویں اپنا ایک جماعت قائم کیا اور اُس کی امداد سے شمال و مغرب ایران کے اکثر بلاد پر قبضہ کر کے وہاں کے حاکم بن بیٹھے۔ ان کے اختلاف نے بعد کو فارس پر ہاتھ مارا اور اصفہان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اور یہ سلطنت صفویہ کے نام سے مشہور ہو گئی۔

ان سلاطین کو روس و ترک سے زیادہ اپنے ہم قوم و ہم شرب فرقہ و جماعت (صفویین) کا خدشہ تھا۔ اس گروہ کی تعداد اس وقت غیر معمولی اور اُن کی طاقت مسلم تھی اس لئے صفویوں نے تحت پر قدم رکھتے ہی اُن کے پامال کرنے کی فکر کی۔ شاہ اسماعیل اور شاہ سلطان حسین کا زمانہ تاریخ ایران میں شائع کشی کے لئے مشہور ہے۔ اس وقت ہزاروں جاسوس مقرر ہوئے۔ انھوں نے ان گوشہ نشینوں کا سرخ لگا کر انھیں گرفتار کر لیا اور حکومت نے انھیں سیاست کا خاکہ برنایا۔

تیسری صدی ہجری کے بن جزی و بن تمیمہ کی زبان کا حال ابھی سن چکے۔ مگر نویں صدی ہجری کی اس تیغ صفائی کی صفائیوں کی روداد ابھی تاریخوں میں پڑھو کہ اہل صفاء کے لئے وہ کس طرح شمیر بڑا بن رہی اور اُن غریبوں کے لئے اپنے ملک میں امن و امان کا راستہ کیونکر بند ہو کر کوہِ ہائے تیغ سے بھی اُن کا گزر نامحال ہو گیا۔ مشہور علامہ سید شاہ ظاہر کاشانی کا واقعہ

کسی تاریخ داں پر پوشیدہ نہیں۔ اُن کا سا شیخ وقت، بہ سختی و مجبوری کسی طرح اپنی جان کے کرایہ ان سے ہندوستان چلا آیا۔ یہ وہی علامہ طاہر ہیں جن کے دست پاک پر، بقول فرشتہ (تاریخ) برہان شاہ سلطان دکن نے بیعت کی اور معمار اکین سلطنت امامیہ مسلک اختیار کر کے اس مشرب کا خدمت گزار ہو گیا۔

ان سلاطین کے غیظ و غضب کی تلوار اس وقت کے زندہ اہل باطن ہی پر نہ چلی بلکہ اُن کے مجرم دوں کی بڑیوں کو بھی ریتے مہان سے محل پڑے۔ شاہ سلطان سین دشت و دشت میں آکر ایران کے صلحا و عرفا کے مزاروں کے بھی پیچھے پڑا اور گڑے مردے اکھاڑنے لگا۔ اپنے جوش غضب میں ایک دفعہ اسفہان سے شاہ تہ خاک کرنے کھڑا ہو گیا۔ مورخین کہتے ہیں کہ فیصلے کے لئے شیخ و خواجہ کے کلام سے تقاضا الہی بحق بنی فاطمہ

اور ان انبیا نے جواب دیا کہ وہ جو زاحم نہاد حائل پر ابرم یعنی غلام شاہم و سونگند می خورم۔ اہل پر بادشاہ ٹھٹھا ہوا اور وہ تہ نہیں سلامت رہ گئیں!

صفویوں کے عہد میں لاریب علی ترقیاں بھی ہوئیں اور اس کے لئے وہ لائق تائش ہیں۔ اس وقت جید علما بھی پیدا ہوئے۔ لیکن معقولات و منقولات کی تلوار اُن میں بھی چلتی رہی اور ان دونوں کے خدنگ و رو عایت کی طرف ہمیشہ سیدھے رہے۔ سلطنت کبھی معقولی تھی اور کبھی منقولی اور ان کے بل پر وہ (حکومت) باطنیت کا استیصال کرتی رہی۔ اور اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وجدان کمزور اور شاعری جو اس کا ایک زبردست آلہ کار ہے بے کار ہو جائے۔ ان حالتوں اور تزکیہ نفس کے ایسے اداروں کی تباہیوں کو دیکھ کر شیخ وقت، ملا پانچ آملی، زیادہ غموش نہ رہ سکے۔ ظاہر بنیوں کو وہ گھورتے، اور معقولیوں کو معقول کرتے رہے۔ شاہ عباس (صفوی) کے عہد میں کہ اس وقت وہ قاضی القضاۃ تھے، اپنی مشہور فتویٰ

اپنی دھلو تصنیف کی۔ اس میں ارشاد کرتے ہیں ۷

یثبت شئ منی ما علمت مختلفہ کم اری الا عوار ینہا مختلفہ
 زان نہ گرد بر تو ہر کشف از گرد شاگرد تو صد فقر از
 ایہا القوم اللہ ہی فی الدرسہ کلّا حصلتموہا دوسو سے
 دل نور کن زانوار علی چند باشی کا سہ یس بو علی
 علم نبود غیر علم عاشقی باقی تبیس ابلیس شقی

یہ وہی مان دھلوئے شیخ ہے جس کی لذت سید اکرم جناب مفتی میر محمد عباس صاحب
 اعلیٰ اللہ مقامہ، اپنی شتوی من دھلوئی میں نہ بھولے۔ فرماتے ہیں ۷

سیدان بہائی خوردہ نعت الوان شاہی خوردہ
 نظم اور یاد و نظم شہبہ ست بہت اس کنگول و آن عام ست
 بوریہا بسند جشیدہ صیت نبت ذرات باخوردہ صیت

یہ مان دھلوئی، من دھلوئی بنا اور اس کا خرا دھلوں ہماری زبانوں پر را۔ شیخ کی ۷
 مرحباے بلبل بستان حی کی پکار نے یلائے عشق کو چربے پروا اور قیس دل کو چرمجنوں بناو
 یہ صدائے نادونے فارس سے ہند بھی پہنچی اور جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس بستان
 کے بلبل، درد و میر اپنی نوا سنچوں سے باغ ہند کو فردوس بریں بنا رہے تھے۔ لکھنؤ میں بھی

(۱) یعنی فلسفہ میں وہ شعور کہاں جس سے معرفت حاصل ہو۔ اس میں عمر عزیز بیکار صرف کی۔

(۲) علامہ فخر الدین رازی۔

(۳) اے قوم مدرسوں میں جو تونے یکساں دھتکت سے دور اور دوسو ہی دوسو ہے!

(۴) بوعلی سینا شہور حکیم۔

(۵) حی بلبل کے قبیلے کا نام ہے۔ یہاں بستان حی سے مراد گلشن عشق ہے۔ دل کو بلبل کہا اور اسے
 اس باغ میں چھکا دیا۔

یہ آوازیں مدتوں گونجیں اور نواب سعاد علی خاں کے وقت تک کہ صحیح تعلیم و تربیت کا وہاں
 رواج تھا، شیخ کی یہ کڑکتی صداکانوں میں آرہی اور ظاہرینوں پر بجلی گرا رہی تھی۔
 علم رسمی سرسبز قیل و قال نے ازو کیفیت حاصل نہ حال
 طبع را افسردگی بخشد مدام مولوی باور نہ وارد ایں کلام
 چند ازیں نقد و کلام بے اصول مغز را خالی کنی لے بوالغفل
 صرف شد عورت ببحث نحو و صرف اذ اصواب مشق ہم نواں یکدہ حرف

لکھنؤ، دلی سے آزاد ہوتے ہی وہ۔

ونصیر الدین حیدر کے دور میں وہاں کا مذاق

کی گردنِ شمیم پر گھوم رہی اور وہاں کی زمین و آسمان

ہے، بے خبروں کے منہ میں چکر بستانِ حق نے کل چکی اور ناشی باغوں کی جواں جناباں
 میں گم ہو چکی تھی۔ خواجہ آتش۔ فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو وہاں کا یہ رنگ دیکھ کر ڈگ ہو گئے۔

یہ دہلی نژاد اور اُسی دائرے کے نقیر تھے جو دردِ میر کا تکیہ گاہ رہا تھا۔ انھوں نے اس

قدیم لب و لہجے میں اپنی آواز بلند کرنا چاہی تو گلوگیر ہونے لگی۔ مگر وہ بے پروا، ایک سرودِ

نظریہ زندگی کی اپنی آتش بیانی سے گرم کرتے رہے۔ اس وقت آن کے لئے ایک نہیں ہزار

کلمے اور جب چاہتے ایک آغا میرؔ نہ سہی کسی امیر کی سند کے ماشیہ نشین ہو جاتے۔ مگر انھوں

نے اپنی آزادی زبان جو انسان کا شرف ہے، کسی قیمت پر فروخت نہ کی اور یہ فرما کر کہ

طلبِ نیا کی کر کے زنِ مریدی ہو نہیں سکتی خیالِ آبروئے بہت مردانہ آتا ہے

(۱) ظاہر میں اور قشر میں (علماء) ہند اور خصوصاً لکھنؤ میں نواب سعاد علی خاں کے بعد عروج پا سکے۔ نواب

مروج خود ذی علم تھے۔ اس وجہ سے ان کا دھردل کے اثر میں آنا محال تھا۔ مگر ان کے بعد ہی علمائے ظاہر

کا زور شور شروع ہو گیا۔ اور پھر لکھنؤ کی خود مختاری و شاہی کی بدولت وہاں کی معاشرت و مذہبیت و شریعت

اطراف ہند میں پھیل گئی۔

سچے جھوٹ میں بیٹھے آتش افروزی کرتے رہے۔

قدیم شامی و عراقی اور جدید ایرانی صفوی زمانے کی طرح اس وقت ہند میں بھی اہل علم کے دو گروہ ہو گئے تھے۔ اُن ملکوں کی تعلیم میں یہ لک بھی مستویوں اور منقولیوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اور سہ علم بہود غیر علم ماضقی۔ کو فراموش کر کے ان دونوں کا روسے سخن اُن مشاق کی طرف بھی ہو جانا جو معرفت کے سرور میں سمجھ جاتے ہیں۔ آتش کا سا اہل عشق اُن کی زد سے کیونکر بچتا۔ زبانیں کھلیں۔ یہ سنتے اور بیٹھے جھوٹا کرتے!

یہ وہی وقت ہے کہ کھنڈ کے فرنگی محل کا نام بلند ہو چکا اور بحر العلوم (مولانا عبدالحی) کی توجہ سے وہ ایک محیط علم مانا جا چکا ہے۔ خواجہ آتش بھی وہاں کے فضل و کمال پر نظر کرتے اور دیکھ کر اس جوش میں فرماتے ہیں۔

چھانے ہوئے ہیں کوئے فرنگی محل تمام
و جھلتی ہے مانتھانہ ہماری غزل تمام
فرنگی محل کا استعارہ علم و فضل سے ہے۔ مطلب یہ کہ علوم کا ذخیرہ ہمارے سینے میں بھی ہے اور اس لئے اس کے نتیجہ حاصل یعنی معرفت سر ہم بھی آتشا اور اس کے پیامبر ہیں!

خواجہ صاحب تقریبات اللہ میں پیدا ہوئے اس لئے انھوں نے ملا حسن علیہ الرحمۃ کا جنھوں نے مسئلہ میں وفات پائی، زمانہ بھی دیکھا اور بحر العلوم (علیہ الرحمۃ) جن کا دھارم ۱۰۲۷ھ میں ہوا، کے تودہ معصوم و معنواہی ہیں۔ اس وقت وہاں منطق کا بھی بید زور اور فرنگی محل کا میرزا ہر پر عاشیہ مشہور ہو رہا تھا۔ خواجہ صاحب نے بھی سنا۔ سکرائے اور بے تکلف فرمایا کہ

عالم منطق مصور ہو تری تصویر کا
منہ کتابی قطبی ہو خط ماشیہ ہر پیر کا
یعنی علوم اور سارے قضیہ کا نتیجہ تصویر یا رکھینچنا اور عالم شہو میں اسے لانا ہے۔ اور خطوط جو اس روئے روشن کے صفات ہیں وہ بمنزلہ ماشیہ تغیر ہیں اور قال القول سے بنایا ہو کر ہم خود سے تصور میں تصویر جاں کھینچتے ہیں!

خواجہ صاحب کی آتش بیانیوں نے گوکھ میں ایک آگ لگا دی۔ مگر گفتو کے دل ان سے زیادہ گرم نہ ہوئے۔ اس سرود ہماری کی اصل ذمہ دار اس وقت کی حکومت ہو اور مولانا گفتو کی غیر ملامتہ تشونت، مگر پھر بھی اسی شہر (گفتو) کا آتش پارہ، ایک مقام پر اسی من و نور کا آتش کہہ یوں سلگا دیتا ہے۔

ہر شاخ میں ہر شکوفہ کاری ثمر ہے قلم کا سودباری
یہ شکوفہ بھی گل بجاؤ لی سے زیادہ ہماری آنکھیں روشن کر گیا!

یہ آتش مذاق، دلی کا تھخہ بھجاتا ہو گدگدہ اثر، ذوق و اس بھی نہ ہے تو شاعری کے خوانِ نعمت پر کھیاں بھٹکنے لگیں۔

خالی پشت لب شیریں ہے عمل کی کھی
فرار اپنے مشوق کی صفائی طبیعت کا کیا خوب

جانی ہے۔

نصیر نگہی ہو کیا غزل یہ کہ دل تڑپتا سرین کے جس کی بند ہے کب یوں کسی بشر، دھنگ پہلی نہیں پارا!
یہ تھا وہ مذاق شاعری جو آج سے سو سال قبل یعنی ۱۸۵۷ء میں دلی و گفتو اور ملک کے ایک پھر حصے میں پھیل کر ہم کو اور ہماری شاعری کو بدنام اور اسے بھگتیز یوں کی گپ بنا رہا تھا۔

مگر پھر بھی اسی ابرصے دیار اور دلی کے پرانے میکے میں ایسی نجاستوں کی شست و شو بھی ہو جاتی ہے۔ وہاں پھر ایک سرورکش اٹھا اور بادۂ حجاز کا وہ سرشار طلب جام۔

(۱) پنڈت دیانند کشن (۲) شاہ نصیر موصوم دہلوی

(۳) غلام حسین اور قسری علی کی مصیبت نے جب ہمارے ادب و شاعری سے الہیات و قصوف کو خارج کیا اور گفتو کی حکومت کے وہ شریک غالب بنے تو آندو شراب بھی دگ بدل اس لئے کہ وہ سلطنت اور پھر قسری حکومت کے خلاف نہیں جاسکتے تھے۔ اس وجہ سے گفتو کی شاعری میں انقلاب ہوا اور وہ ناشی باتوں میں گزرا ہو کر اتنی سنج ہو گئی کہ اگر اس شہر کے بعض شراب اس کی حالت پر نظر نہ کرتے تو یہ بدنامی کلنگ کا ٹیکہ بن جاتی! (۴) غالب۔

محبت کرتا ہو۔

کل سکے کرتی نہ خفت شراب میں ہوسے ظن ہر سانی کو شک ہے اب میں
یعنی حکم ہو چکا ہے۔ عدول نہ کر۔ ہاں ابھی ہے کہ یہ قطرہ سرور میں عروج پا کر دسائے حقیقت میں
جلد مل جاتے!

عظیم آباد (پتہ) ہمیشہ درد آباد رہا ہے۔ اس وجہ سے وہاں آتش نوازی نہیں،
آتش پرستی ہوا کی ہے۔ اور یہ اسی کا صلہ ہے کہ لکھنؤ میں اگر اس دریا سے نور کا یوں ذکر چرچا
جواب آسائیں دم بھرتا ہوں تیری آتشاکی کا نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جلائی کا
(آتش)

تو وہاں (عظیم آباد) یہ سمجھ کر اس کے غلین سننے والے کہیں بے چین کبے چین نہ جائیں ان
کی پولیسی کر دی گئی ہے

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھر کے سونے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا (شاد)
ہاں، رخ یار کی بہت شرمیں نکھیں اور بڑی لن ترانیاں سنی گئیں۔ اچھا اس کی ایک اور
تفسیر یاد کر لو۔

مہانور بار جو رخ تیرا، ذلوع دھبک اعتلا
چک اٹھے دشت و خیال و در نقشہ متزلزل
کو چہ یار کا دگر اُجھی خوب خوب بنا گیا۔ اب اس حقیقی کو چہ کی بھی ذرا سیر کر لو۔
ہیں گے شوق میں تھکے ترا کو چہ ہو کھیل گئے جلوہ گاہ میں منوں ہی جو سنا ہو وہ تیرا کھلا
ٹوٹری یا تو نبی بجا بجا کر ہمارے یہاں آرزو کے سے سانپ کو خوب خوب کھلایا گیا ہے۔ اب اس
مانا سنیں کو مارو اور اس معنی (افعی) کا سر کھلو، سنو۔
ہیں شاد جس کا بہت تھا اور وہی پیش آگیا اللہ تمہیں کہتے تھے کہ امید سے نہ زیادہ رکھو غلام!

یہ سچ ہے کہ قوموں کے عروج کے وقت نبی جب کہ اُن کے قوائے دماغی سالم رہتے ہیں، ان میں بڑے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ اسی شاعری کو لیجے تو دلیکی و کالیداس اور فردوسی و شکسپیر اس وقت پیدا ہوئے جبکہ اُن کی قوم کی ترقیوں کا دامن تھا۔ مگر یہ بہت کم دیکھا گیا ہے کہ اقوام کے زوال کے وقت نبی جبکہ اُن کے قوائے دماغی مضحل و پامال ہو جاتے ہیں، ان میں بڑے لوگ پیدا ہوں۔ اس لحاظ سے میر انیس کی سی زبردست ہستی کا اس ملک میں جبکہ وہ زوال پذیر ہو رہا تھا، وجود میں آنا عجیب سمجھا گیا ہے۔ لیکن معلمین اخلاق ہمیشہ ایسے ہی وقت ظاہر ہوئے ہیں جب کہ اُن کی قوموں کے اخلاق خراب ہو کر پستی کی جانب مائل ہو رہے تھے، میر انیس بھی ایک معلم اخلاق تھے۔ اس ملک میں جب کہ وہ ۔۔۔

اس نے سیرت آگیز نہیں کہ اُن کی زبان دکلا۔

کا وعدہ ہو چکا ہے

ان کے بزرگ خاندان میر امامی، ہرادی ہرادی

نوٹ صفحہ ۲۶، بید اشترخان بہادر سید علی محمد شاد (عظیم آبادی) وفات بنی سن ۱۱۶۷ھ بمطابق ۸۰ سال۔ شاد مرحوم بھی خواجہ میر درد ہی کی خالقاہ کے مجاوروں میں سے ہیں سلسلہ ملاحظہ ہو۔

خواجہ میر درد
میاں اشکی (عظیم آبادی)
شاہ الفت حسین فراز (" ")
شاد

(۱) میر امامی

صاحب بھلاؤ

(۲) میر راجہ رائے

(۳) میر جہاں

(۴) میر فیض اللہ

(۵) میر ضامک

اور دلی میں بھی ان کی تعلیم شروع ہو گئی تھی یہ میر رات اللہ (عالمگیری) اور ان کے پوتے میر فیض (۱۵) میر حسن

رہاوردشاسی، نے بھی منصب پائے اور اپنی خاندانی امتیاز کو سنبھالے رہے۔ ان میں فیض اللہ کے بیٹے (۶) میر ظفر

میر ضامک ہیں اور ان کے حلف الرشید میر حسن۔ ان میں بھی اپنے خاندان کے افراط موجود تھے۔ (۷) میر حسن

و ہدایت کا سلسلہ بخیر جاری رہا۔ یہ طریقہ نسل بعد نسل خون میں سرایت کرتا ہوا حسن تک پہنچا اور
حسن سے انیس کی رگوں میں اگر گرم ہونے اور ہوا کی طرح دوڑنے لگا۔ انیس کا زمانہ عجب
پراشوتبھا زمانہ تھا۔ ہم زمانے سے کھیل رہے اور زمانہ شناس ہم پر نہیں رہے تھے۔ انھوں نے
وہ دکھا جو خدا دشمن کو نہ دکھائے، اور اس سے آن کے دل میں وہ بیان ہوا جو ایک فطری
سلم و شاعر کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ وہ اپنے ملک و قوم کی ایسی ہستی کے اسباب و علل پر غور
اور اس کے علاج کی تدبیر کرنے لگے۔

ان کے گھر میں کئی پشت سے اخلاق پرستی یعنی مرثیہ گوئی کا رواج تھا اور اس سے متاثر
تھے۔ انھوں نے اس واقعہ (جس پر مرثیہ کا مدار ہے) کے راز کو سمجھا اور ایک زبردست آئیڈیل
پیش کر کے ہمارے قوائے عقلی کی درستگی میں مشغول ہو گئے۔

وہ بچے اور خوب بچے کہ پوری تول تولتے کا نام اخلاق ہے اور اس کے برعکس بد اخلاق۔
انھوں نے دیکھا اور خوب دیکھا کہ آپس کے عمدہ برتاؤ اور مسادات کا نام اخلاق ہے اور

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۷) درد کی محبت و ادارت نے اس پر جلایا۔ اس کا ذکر ادھر آچکا اور ان کے رنگ شاعری کو
بنایا جا چکا ہے۔

(۱) انیس کے وقت کا ہندوستان بد اخلاقیوں کا نمونہ اور بکتوں میں آپ اپنی مثال میں ہوا رہا تھا۔ ہمارے دل
پرستی و انقلاب پسندی کی طرف نہیں بلکہ غلامی کی جانب مائل ہو رہے تھے۔ اس وقت اگر کہیں کچھ روشنی دکھائی بھی
دی تو وہ ایک مریض کا سنبھالا تھا جو اس کے پرستاروں کو غلط امیدیں بھلائے رکھتا مگر کسی قطع حیات کو حائل لگ کر دیتا تھا!
(۲) انیس کے پروردگار اسی زمانہ سے مغربہ گوئی کا آغاز ہوا۔ پھر ان کے صاحبزادے میر حسن نے مرثیہ کے
میر خلیق کی مرثیہ گوئی محتاج بیان نہیں اس خاندان میں میر انیس وہ چوتھے بزرگوار ہیں جنہوں نے مغربہ کے
ذریعے سے اخلاق کا صدمہ دیا۔ اس پر وہ فخر کرتے اور اپنے ایک صاحبزادے میر مسکری رئیس کی زبان سے
فرماتے ہیں: ”عربی گزیریں میرا سی دشت کی بیاباں“ پانچویں پشت ہوشیاری کی مداحی میں
رئیس اس دشت کے پانچویں سیاح ہیں۔ ”عربی گزیریں ہیں“ اس گرامر دماغان کی عمر ہے نہ کہ کسی ایک فرد
کی یعنی اس مداحی میں ہمارے خاندان کے کی عمریں صرف ہو گئیں!

اخلاق نامکونہ اور مستکمل کرنا اور اس وقت بندہ اپنے اخلاق کا کم دور کرنا اور ان کا
توڑنا چاہتے ہیں۔

اس معنی کے سننے والوں کے لئے یہ موزوں فقرہ سے شاعری جزویت از پیگیری۔
غالباً اس چیز سے نہ ہوا ہوگا بلکہ شاعر ناظم نہیں، معلم اخلاق اور صادق الہیہ ہوتا اور اس میں ہر
صفت میں کو جلوہ دیتا ہے جو اس عالم مرصع کو روشن کر رہا ہے اور اس لئے وہ قدرت کا پیارا
ہے اس خصوص میں ایسے اپنے پیش روؤں سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں اپنے بیان
و کلام کا جو دائرہ وہ پہنچ گئے اس کو چکنا چال ہے۔ اور ایسی جرات پر صاف کہہ دیا جائے گا
اس احاطے جو باہر جو وہ بیرونی ہے

ہند کا شرف کہ یہاں ایسے پیدا ہوئے۔ شاعری کی موج کو وہ اس کی طرف مخاطب
ہوئے اور ان کے زور زبان سے ”پہنچی یہ زمین آسان تک“ اور اردو کی عزت کو انھوں
نے اسے منہ لگا دیا اور ان کے خیالات کا وہ بار اٹھا سکی اور ان کے سرور کا لہر گن بسکی!
اس بیان کے شروع میں کہا گیا ہے کہ۔ اس عالم کے ذرہ ذرہ میں ہوموئی و تقابل
اور تناسب پایا جاتا ہے جس کا دوسرا نام حسن ہے۔ اصطلاح میں اس صفت کو ترصیع کہتے
ہیں۔ اس ترتیب و نظام پر نظر کر کے عقلاً اس کا خود بخود وجود میں آ جانا محال اور اس لئے کسی
صانع کا ماننا فرض سمجھتے ہیں۔

اسی ترصیع نے مادہ پرستوں کو خدا پرست، حکما کو صفات پرست و قدرت پرست
اور شعرا کو حسن پرست بنا دیا۔ اور ان سب نے مختلف لب و لہجہ میں اس کی ستائش کی ہے۔ مگر
یہ جن جہاں دائمی کندن کی طرح چمکا وہ کان کہیں اور ہی ہے۔ اس ہمن کے ذخیرے میں سے
ایک ذرہ پر نظر کرو۔ پرکھو اور دیکھو کہ وہ صفت (ترصیع) کس طرح چمکتی اور اس صانع کے یہاں
کیونکر صفت کی جاتی ہے۔

صبح کا ذب کا فور ہوئی اور عاشور محرم کی صبح صادق بے حجاب ہو چلی۔ پوچھت رہی

اور سے ڈوبتے جاتے ہیں دریائے فلک کے تارے؛ نور برس رہا اور آس و منہ کے میں
 پنہاں، آٹھکار اور قدرت کا نشانہ ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کیفیت کا اثر پڑتا اور اُڑنی گوئے
 اوج طور بھی اس وقت غش سے چونک کر کلہ پڑتا اور سارا عالم آس و منہ کی یوں حسد
 کہلے گئے ہے۔

قریبانِ صنعتِ قلم آفریدگار قہرِ ہر دلقِ پُصنعتِ ترصیعِ آٹھکار
 عاجز ہے فکرِ شعرائے ہنرِ شعار ان صنعتوں کو پائے کہاں عقل سا کلا
 عالم تھا محو قدرتِ سبحانہ
 مینا کیا تھا وادہ

صاحبوہ

بدیں نامہ برِ عسر با بگذرد بخواند ہر آس نہ دارِ درد

قدراول کے ستارے

جب مطلع آسمان اندھیری رات میں ابر و باراں سے بالکل پاک ہو تو ہمیں ایسے
 لاتعداد چھوٹے بڑے منور اجرام سے مزین نظر آتا ہے جو ابتداً منتشر و بے قاعدہ سے معلوم ہو
 ہیں مگر چند روز دلچسپی و توجہ سے مشاہدہ فکلی کرنے کے بعد ان کی ترتیب بخوبی سمجھ میں آئے گی
 ہے۔

مقدمین بیت و نجوم نے آسمانی کے لئے ان کے متعدد مجامع انجوم قرار دئے تیر
 اپنی گرد و پیش کی اشیاء کی مشابہت سے ان کی فرضی شکلیں قائم کیں اور نام رکھے بارہ
 برج جو منطقہ البروج کے نام سے معروف ہیں ترتیب دئے اور انکے درمیان ایک فرضی
 خط کھینچا جس پر آفتاب ہمیشہ حرکت کرتا رہتا ہے۔ اس کی حرکت کی وجہ سے موسمی تغیرات رونما
 ہوتے ہیں۔ اس خط کو طریقی اٹس کہتے ہیں۔ اس کا دور تین سو ساٹھ درجوں میں تقسیم کیا گیا
 ہے۔

منطقہ البروج کے شمال میں اکیس مجامع انجوم اور جنوب میں پندرہ مجامع قرار دئے
 گئے ہیں۔

ستارے اپنی چمک و کم کے لحاظ سے درجوں میں منقسم ہیں جنہیں اصطلاح میں قدر
 کہتے ہیں۔

قدما نے چودہ ستاروں کو جو ان کے خیال میں کل کراٹ فکلی کے روشن ترین ستارے
 تھے قدراول میں رکھا مگر متاخرین نے ان میں چھ ستاروں کا اضافہ کر کے قدراول کے بیس ستارے
 کر لئے اور ان ستاروں کو مختلف مجامع میں ترتیب دیا۔ ان نئے مجامع کے نام ان لوگوں نے
 اپنے مذاق کے مطابق رکھے۔ مثلاً شمال میں دور بین عظیم ہرشل

اور جنوب میں منظر اکبر یا دوربین *Microscopium* اور منظر اصغر یا دوربین *Microscopium* وغیرہ۔

خالی اکھ سے نظر آنے والے تارے چھٹی قدر تک کے ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد کم سے کم ۲۳۹۱ تھی۔ مگر اب پانچزار شمار کئے جاتے ہیں چونکہ سب تارے بلحاظ نفع یکساں نہیں ہیں۔ اس لئے ان کی مسافت کے متعلق ہم سطحی رائے قائم کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ہم اجرام بہ نسبت روشن اجرام کے بعید تر ہیں اور جو تارے ہمیں نظر نہیں آتے وہ محتاج دور بین ہیں۔ زمانہ حال کی عظیم ترین دور بینیں اب تک میوین قدر تک کے تارے دیکھ سکی ہیں۔ بن کی تعداد کم و بیش ایک ارب سو کروڑ ہے۔ لیکن امید کی جاتی ہے کہ آئندہ ال۔

کے تارے دیکھ سکیں گی جن کی تعداد بین چارہم ان دور بین اجرام سے قطع نظر کر کے خالی آ

نور و حرارت کا مقابلہ اپنے آفتاب سے کریں۔

چراغ بجائے خود بڑے بڑے آفتاب ہیں اور بعض بعض کے سامنے تو ہمارے آفتاب کی وہی حقیقت ہر جو کرہ ارض کی آفتاب کے مقابلے میں۔

یہ بڑے بڑے اجرام باہم ایک دوسرے کی کشش سے جکڑے ہوئے اس فضا لامحدود میں ایک دوسرے کے گرد آہستہ آہستہ حرکت کر رہے ہیں۔ ان کی گردش باہمی یعنی یہی ہے جیسے زمین کے گرد چاند کی یا آفتاب کے گرد زمین و دیگر سیاروں کی۔ کل فی ملک لیون۔ اب ہم مختصر اقدار اول کے ستاروں اور ان کے مجامع کے حالات ناظرین کی دلچسپی کے لئے لکھتے ہیں۔ لہذا سب سے پہلے ہم آفتاب اور اس کے نظام کو دیکھتے ہیں جو خود ایک روشن ستارہ ہے اور ہمارے نظام شمسی کا مرکز ہے۔ بظاہر اسی کے وجود سے ہماری دنیا آباد ہے اور ہم زندہ ہیں۔

آفتاب | یہ کل ثوابت میں زمین سے نزدیک تر اور سب سے چھوٹا ستارہ ہے۔ ہمارا نظام شمسی اسی

نے خلق ہے۔ زمین سے ادم کا ذکر در تیس لاکھ میل دور ہے۔ اس کی زمین تک
 اٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔ یہ کسی دوسرے جرم سادھی سے کب نور و حرارت نہیں نکلتا۔ بلکہ
 اپنے ہی نور سے زمین اور دوسرے سیاروں کو منور کرتا ہے۔ جرم آفتاب کہہ ارض سے
 بارہ لاکھ اکتھ ہزار سات سو گنا بڑا ہے۔ اس کا قطر آٹھ لاکھ بانوے ہزار پانچ سو اور چوبیس
 ہزار انچ ہزار پانچ سو ہے۔ اس کی خارج شدہ حرارت کا..... حصہ زمین تک پہنچتا ہے، اگر
 اس کی حرارت کو منتشر ہونے نہ دیا جاتے تو یہ اتنی مقدار تاج کو بہ آسانی پگھلانے کے لئے کافی
 ہے جس سے ساری زمین ڈھکی ہوئی ہو۔ اور جس کی ضخامت گیارہ بارہ میل ہو۔ اس میں بھی
 مثل زمین کے متعدد عناصر کا وجود ہے۔ مثلاً لوہا۔ نکل۔ تانبا۔ چاندی۔ کاربن۔ ایلومینیم،
 پٹاسیم وغیرہ ان کے علاوہ دیگر عناصر کا بھی گمان کیا جاتا ہے۔ مگر ہنوز ان کے وجود کا پتہ نہیں
 چلا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ آفتاب کے کسی ایسے گوشے میں ہوں جہاں ہماری موجودہ تحقیقات
 کی رسائی نہ ہو اور آئندہ پہنچے۔ مثلاً گندھک فاسفورس۔ نائٹروجن۔ آرٹک۔ کلورین۔ ہائیڈروجن
 وغیرہ۔ اس میں کچھ ہیبت خاں بھی موجود ہیں۔

سوائے حکیم فیثاغورث کے کل فلاسفہ قدیم زمین کے گرد آفتاب کی گردش کے قائل
 تھے۔ چنانچہ یہ خیال ایک عرصہ دراز تک رہا یہاں تک کہ کوپرنس کا زمانہ آیا۔ یہ حکیم فلسفہ میں
 پیدا ہوا۔ اس نے اپنے پیش رو حکیم کے قول کی تائید کی اور اس کے قائم کردہ نظام کی تہذیب
 زمین کو مرکزیت سے ہٹا کر آفتاب کو مرکز تسلیم کیا اور بجائے سادھی گردش کے ارضی گردش
 ثابت کی۔

متاخرین نے مطالعے کو وسعت دی۔ جدید انکشافات کے اور مندرجہ ذیل بہار
 معلوم کے جو آفتاب کے گرد گھومتے ہیں۔

عطارد۔ زہرہ۔ مریخ اور پلوٹو زمین سے براعبار جسامت چھوٹے مائیکرونیٹر میں

(۱) کوپرنس فلسفہ میں بمقام قمارن پولیڈ میں پیدا ہوا اور فلسفہ میں ہر ستر سال فوت ہوا۔

یہ نہیں سمجھیں بلکہ ہیں۔ اب ہم اسی ترتیب سے ان کے منقرعات کئے ہیں۔
عطار اس کا مدار مدار زمین میں واقع ہے۔ یہ اس قدر چھوٹا ہے کہ اگر اس سے سولہ سو
 اہام باہم مل جائیں تو زمین کے برابر ہوں۔ اس کا قطر صرف تین ہزار میل ہے۔ آفتاب کے
 ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس لئے براہ آسانی نظر نہیں آتا کیونکہ غریب کو نامہ مرگ تنہا ہی رہی کہ
 اس کو دیکھے۔ مگر یہ آرزو پوری نہ ہوتی۔

ذہرہ اجسامت میں زمین کے کچھ ہی چھوٹا ہے۔ چونکہ اس کا مدار بھی مثل عطار کے مدار
 اور زمین میں واقع ہے۔ اس لئے آفتاب کے گردش میں بہت دیر گزیرا روں کے زمین سے زیادہ
 قریب چلا آتا ہے۔ اس حالت میں راصدین کو اس کے منقرعات دیکھ سکتے ہیں۔
 اس کی فضا بار و غیرہ سے ڈھکی رہتی ہے، بار
 اور بصورت ہر۔ چنانچہ جب یہ آسمان پر ہوتا۔
 کر سکتی ہر اور کسی ثابت کی۔ علماء کا خیال ہے کہ

سب سے پہلے ذہرہ ہی اہل زمین کا مسکن بنے گا۔ واللہ اعلم۔ آفتاب سے اور سچا چھوٹا درہتر
 لاکھ میل پر گردش کرتا ہے۔

زمین اس کا قطر آٹھ ہزار میل ہے۔ شل دیگر سیاروں کے آفتاب کے گردش کرتی ہے۔
 اس کی گردش سالانہ ۳۶۵ دن میں تمام ہوتی ہے۔ یہ زمانہ سال کہلاتا ہے۔ حکماء قدیم
 زمین کو سطح اور ساکن سمجھتے تھے۔ مگر دراصل یہ گردی اور متحرک ہے۔ اور قطبین پر دونوں
 ساڑھے تیرہ میل چھٹی ہو گئی ہے۔ اس کا ایک تابع بھی ہے جسے چاند کہتے ہیں۔ یہ زمین
 کے گردش کرنا ہے اور ستائیس دن سات گھنٹے تینتالیس منٹ میں اس کے گردش گوم
 جاتا ہے۔ اس زمانے کو قمری ہینہ کہتے ہیں۔ چاند کا قطر دو ہزار ایک سو ساٹھ میل ہے۔

گیلیلیو نے جولو دیگر اہرام کے اس کا معائنہ بھی اپنی دور بین سے کیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں اس نے پتھر کی ہر چیز پر آسانی دیکھ لی۔ مثلاً پہاڑ واویاں۔ آتش فشاں پہاڑ۔ کئی دہ سیدان۔ سمندر اور چٹانیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اگر ہم چاند پر سے زمین کو دیکھیں تو یہ بھی مثل چاند کے چکدار اور روشن نظر آئے گی۔ مثلاً اس نے زہرہ کے ابرا کو دکھ کرے کو پیش کیا جو باوجود بادلوں کے بھی زمین سے کہیں زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ حالانکہ بذات خود روشن نہیں ہیں بلکہ آفتاب کو اخذ نور کرتا ہے جیسے زمین اور دیگر سیارے۔ چاند بظاہر سوچ کے برابر نظر آتا ہے۔ حالانکہ جرم آفتاب سے چھ کروڑ اسی لاکھ گنا چھوٹا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند کا فاصلہ زمین سے دھلاکھ اڑتالیس ہزار اور سو سوچ کانو کروڑ نہیں لاکھ میل ہے۔

مریخ | اس کا قطر چار ہزار میل ہے۔ گیلیلیو نے اس کا معائنہ اپنی نو لیجا دور بین سے سنہ ۱۶۱۰ء میں کیا تھا۔ اس نے قمر مریخ پر بحروب کی علامات دیکھیں۔ پھر متعاقباً ہیئت حال اس کا مطالعہ کرتے رہے۔ جب اس کی رویت بہتر ہو تو اس کی سطح پر بعض بعض مقامات پر سیاہ خطوط کا جال سا بچھا معلوم ہوتا ہے۔ جس کا طول تین سے چار ہزار میل تک ہے۔ ریگستانوں کا بھی پتہ لگتا ہے۔ قطبین پر برف پوش چوٹیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی سالانہ گردش تقریباً دو سال میں تمام ہوتی ہے۔ اس کے دو تابع قمر ہیں جن کا قطر دس سے بیس میل تک ہے۔

نخنہ۔ تین چار سو کی تعداد میں مریخ مشتری کے درمیان گردش کر رہے ہیں۔ ان سب میں بڑا سیرس جس کا قطر چار سو اسی میل ہے اور باقی چھوٹے ہیں۔

مشتری | نظام شمسی کا سب سے بڑا سیارہ ہے۔ اس کا قطر تقریباً اٹھاسی ہزار چھ سو چالیس میل

۱۱، گیلیلیو ۱۶۱۰ء فروری ۱۶۱۰ء میں پیدا ہوا۔ سنہ ۱۶۱۰ء میں دور بین ایجاد کی۔ ۸ جنوری سنہ ۱۶۴۲ء کو مشتری کے اقمار معلوم کئے۔ اور اسی زمانے میں خود بین ایجاد کی۔ سنہ ۱۶۴۲ء میں انڈیا ہو گیا اور ۸ جنوری سنہ ۱۶۴۲ء میں فوت ہوا۔

ہو۔ یہ چھٹا بڑا سیارہ ہے کہ اس کے جرم میں کرہ ارض جیسے اجرام چودہ سو ساکتے ہیں۔ اس کے قمر میں مریخ کا انکشاف مسئلہ سے ساکتا تک ہوا۔ ابھی تک ان میں مزید اضافہ نہیں ہوا۔ مشہور ہے کہ اس نے اپنی کشش سے تقریباً چار سو مدار سیارے نظام شمسی میں داخل کر دیے ہیں۔ یہ زہرہ کے بعد سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔

زحل | مشتری کے بعد سب سے بڑا سیارہ ہے۔ اس کا قطر تقریباً ستہزار میل ہے۔ سالانہ گردش ساڑھے اٹیس برس میں تمام ہوتی ہے۔ اس کے آٹھ قمر ہیں جن میں مشتری کے اس نے بھی چار مدار سیارے نظام شمسی میں داخل کئے ہیں۔ اس کے دو قمر "دیم ہیرل" نے سائنس دانوں میں فضا کے۔

یورینس | یہ ستارہ جدید دریافت ہوا ہے۔ اس کے

کیا۔ اس کا سال ہمارے ۸۴ برس کے برابر ہوتا ہے۔

پر گردش کرتا ہے۔ بوجہ بعد آفتاب اس میں روشنی

کافی ہے۔ یعنی چوتھہ اجسام مثل زمین کے اس میں سا سے ہیں۔ اس سے چار برس دور ہے۔ سیارے اس کے متعلق ہیں۔

نیپچون | اس کا فاصلہ آفتاب سے دو ہزار آٹھ سو ملین میل ہے۔ مسئلہ میں اس کا انکشاف

ہوا۔ اس کی گردش سالانہ ایک سو سو اسی سال میں تمام ہوتی ہے۔ اس میں بھی چوتھہ اجسام

مثل زمین کے ساکتے ہیں۔ اس کا صرف ایک قمر ہے۔ اس کے متعلق نو مدار سیارے ہیں۔

پلوٹو | اس کا قمارف ہم سے ابھی ابھی ہوا ہے۔ یعنی جنوری مسئلہ میں انکشاف ہوا۔ براعقباً

جسامت مریخ کے برابر خیال کیا جاتا ہے۔ تین ارب پندرہ کروڑ میل آفتاب سے دور ہے اس

(۱) سروریم ہیرل مسئلہ میں پیدا ہوا۔ مسئلہ میں انگلستان گیا۔ مسئلہ میں اپنی دور میں بنائی اور مطالعہ

آسمان شروع کیا۔ آٹھ سو چوبیسے ستارے معلوم کئے اور ستاروں کی فہرست مرتب کی۔ پانچو اسی شہاب دنیائے

کے اور ثابت کیا کہ آفتاب الجائی کے ایک نقطے کی طرف جارہا ہے۔ مسئلہ میں فوت ہوا۔

کی گردش آفتاب کے گزرتے میں سال میں تمام ہوتی ہے۔ جس قدر دور مدار آفتاب سے
زمین آفتاب کی ہے اس کی سیارہ ۱ حصہ ہو تو آفتاب سے یقیناً ہے۔ اس کی مدد سطحی سطح
سے سیارہ کی نسبت کم ہوتی ہے۔

مدار سیارے | ان کے اجسام ٹھوس نہیں ہوتے کبھی کبھی نظر آتے ہیں اور بعض بعض تو نظام
شمسی کو قطع کرتے ہوئے اس طرح باہر نکل گئے ہیں کہ اب شاید واپس نہ آئیں۔ اسی طرح ایک اور
گرو سیارے مختلف نظاموں کی سیر کرتے پھر گئے یہاں تک کہ کسی ایسے زبردست نظام میں
چلے جائیں جہاں کا آفتاب اپنی قوت جاذبہ سے انہیں مقید کر کے پھر باہر نہ نکلنے دے اور یہ وہی
ہمیشہ کے لئے پابند خیر ہو جائیں۔ بعض مدار سیارے کئی کئی مرتبہ نظر آتے ہیں چنانچہ ایک ہی
سیارہ ~~۱۸۴۵~~ ~~۱۸۴۶~~ ~~۱۸۴۷~~ ~~۱۸۴۸~~ ~~۱۸۴۹~~ ~~۱۸۵۰~~ ~~۱۸۵۱~~ ~~۱۸۵۲~~ ~~۱۸۵۳~~ ~~۱۸۵۴~~ ~~۱۸۵۵~~ ~~۱۸۵۶~~ ~~۱۸۵۷~~ ~~۱۸۵۸~~ ~~۱۸۵۹~~ ~~۱۸۶۰~~ ~~۱۸۶۱~~ ~~۱۸۶۲~~ ~~۱۸۶۳~~ ~~۱۸۶۴~~ ~~۱۸۶۵~~ ~~۱۸۶۶~~ ~~۱۸۶۷~~ ~~۱۸۶۸~~ ~~۱۸۶۹~~ ~~۱۸۷۰~~ ~~۱۸۷۱~~ ~~۱۸۷۲~~ ~~۱۸۷۳~~ ~~۱۸۷۴~~ ~~۱۸۷۵~~ ~~۱۸۷۶~~ ~~۱۸۷۷~~ ~~۱۸۷۸~~ ~~۱۸۷۹~~ ~~۱۸۸۰~~ ~~۱۸۸۱~~ ~~۱۸۸۲~~ ~~۱۸۸۳~~ ~~۱۸۸۴~~ ~~۱۸۸۵~~ ~~۱۸۸۶~~ ~~۱۸۸۷~~ ~~۱۸۸۸~~ ~~۱۸۸۹~~ ~~۱۸۹۰~~ ~~۱۸۹۱~~ ~~۱۸۹۲~~ ~~۱۸۹۳~~ ~~۱۸۹۴~~ ~~۱۸۹۵~~ ~~۱۸۹۶~~ ~~۱۸۹۷~~ ~~۱۸۹۸~~ ~~۱۸۹۹~~ ~~۱۹۰۰~~ ~~۱۹۰۱~~ ~~۱۹۰۲~~ ~~۱۹۰۳~~ ~~۱۹۰۴~~ ~~۱۹۰۵~~ ~~۱۹۰۶~~ ~~۱۹۰۷~~ ~~۱۹۰۸~~ ~~۱۹۰۹~~ ~~۱۹۱۰~~ ~~۱۹۱۱~~ ~~۱۹۱۲~~ ~~۱۹۱۳~~ ~~۱۹۱۴~~ ~~۱۹۱۵~~ ~~۱۹۱۶~~ ~~۱۹۱۷~~ ~~۱۹۱۸~~ ~~۱۹۱۹~~ ~~۱۹۲۰~~ ~~۱۹۲۱~~ ~~۱۹۲۲~~ ~~۱۹۲۳~~ ~~۱۹۲۴~~ ~~۱۹۲۵~~ ~~۱۹۲۶~~ ~~۱۹۲۷~~ ~~۱۹۲۸~~ ~~۱۹۲۹~~ ~~۱۹۳۰~~ ~~۱۹۳۱~~ ~~۱۹۳۲~~ ~~۱۹۳۳~~ ~~۱۹۳۴~~ ~~۱۹۳۵~~ ~~۱۹۳۶~~ ~~۱۹۳۷~~ ~~۱۹۳۸~~ ~~۱۹۳۹~~ ~~۱۹۴۰~~ ~~۱۹۴۱~~ ~~۱۹۴۲~~ ~~۱۹۴۳~~ ~~۱۹۴۴~~ ~~۱۹۴۵~~ ~~۱۹۴۶~~ ~~۱۹۴۷~~ ~~۱۹۴۸~~ ~~۱۹۴۹~~ ~~۱۹۵۰~~ ~~۱۹۵۱~~ ~~۱۹۵۲~~ ~~۱۹۵۳~~ ~~۱۹۵۴~~ ~~۱۹۵۵~~ ~~۱۹۵۶~~ ~~۱۹۵۷~~ ~~۱۹۵۸~~ ~~۱۹۵۹~~ ~~۱۹۶۰~~ ~~۱۹۶۱~~ ~~۱۹۶۲~~ ~~۱۹۶۳~~ ~~۱۹۶۴~~ ~~۱۹۶۵~~ ~~۱۹۶۶~~ ~~۱۹۶۷~~ ~~۱۹۶۸~~ ~~۱۹۶۹~~ ~~۱۹۷۰~~ ~~۱۹۷۱~~ ~~۱۹۷۲~~ ~~۱۹۷۳~~ ~~۱۹۷۴~~ ~~۱۹۷۵~~ ~~۱۹۷۶~~ ~~۱۹۷۷~~ ~~۱۹۷۸~~ ~~۱۹۷۹~~ ~~۱۹۸۰~~ ~~۱۹۸۱~~ ~~۱۹۸۲~~ ~~۱۹۸۳~~ ~~۱۹۸۴~~ ~~۱۹۸۵~~ ~~۱۹۸۶~~ ~~۱۹۸۷~~ ~~۱۹۸۸~~ ~~۱۹۸۹~~ ~~۱۹۹۰~~ ~~۱۹۹۱~~ ~~۱۹۹۲~~ ~~۱۹۹۳~~ ~~۱۹۹۴~~ ~~۱۹۹۵~~ ~~۱۹۹۶~~ ~~۱۹۹۷~~ ~~۱۹۹۸~~ ~~۱۹۹۹~~ ~~۲۰۰۰~~ ~~۲۰۰۱~~ ~~۲۰۰۲~~ ~~۲۰۰۳~~ ~~۲۰۰۴~~ ~~۲۰۰۵~~ ~~۲۰۰۶~~ ~~۲۰۰۷~~ ~~۲۰۰۸~~ ~~۲۰۰۹~~ ~~۲۰۱۰~~ ~~۲۰۱۱~~ ~~۲۰۱۲~~ ~~۲۰۱۳~~ ~~۲۰۱۴~~ ~~۲۰۱۵~~ ~~۲۰۱۶~~ ~~۲۰۱۷~~ ~~۲۰۱۸~~ ~~۲۰۱۹~~ ~~۲۰۲۰~~ ~~۲۰۲۱~~ ~~۲۰۲۲~~ ~~۲۰۲۳~~ ~~۲۰۲۴~~ ~~۲۰۲۵~~ ~~۲۰۲۶~~ ~~۲۰۲۷~~ ~~۲۰۲۸~~ ~~۲۰۲۹~~ ~~۲۰۳۰~~ ~~۲۰۳۱~~ ~~۲۰۳۲~~ ~~۲۰۳۳~~ ~~۲۰۳۴~~ ~~۲۰۳۵~~ ~~۲۰۳۶~~ ~~۲۰۳۷~~ ~~۲۰۳۸~~ ~~۲۰۳۹~~ ~~۲۰۴۰~~ ~~۲۰۴۱~~ ~~۲۰۴۲~~ ~~۲۰۴۳~~ ~~۲۰۴۴~~ ~~۲۰۴۵~~ ~~۲۰۴۶~~ ~~۲۰۴۷~~ ~~۲۰۴۸~~ ~~۲۰۴۹~~ ~~۲۰۵۰~~ ~~۲۰۵۱~~ ~~۲۰۵۲~~ ~~۲۰۵۳~~ ~~۲۰۵۴~~ ~~۲۰۵۵~~ ~~۲۰۵۶~~ ~~۲۰۵۷~~ ~~۲۰۵۸~~ ~~۲۰۵۹~~ ~~۲۰۶۰~~ ~~۲۰۶۱~~ ~~۲۰۶۲~~ ~~۲۰۶۳~~ ~~۲۰۶۴~~ ~~۲۰۶۵~~ ~~۲۰۶۶~~ ~~۲۰۶۷~~ ~~۲۰۶۸~~ ~~۲۰۶۹~~ ~~۲۰۷۰~~ ~~۲۰۷۱~~ ~~۲۰۷۲~~ ~~۲۰۷۳~~ ~~۲۰۷۴~~ ~~۲۰۷۵~~ ~~۲۰۷۶~~ ~~۲۰۷۷~~ ~~۲۰۷۸~~ ~~۲۰۷۹~~ ~~۲۰۸۰~~ ~~۲۰۸۱~~ ~~۲۰۸۲~~ ~~۲۰۸۳~~ ~~۲۰۸۴~~ ~~۲۰۸۵~~ ~~۲۰۸۶~~ ~~۲۰۸۷~~ ~~۲۰۸۸~~ ~~۲۰۸۹~~ ~~۲۰۹۰~~ ~~۲۰۹۱~~ ~~۲۰۹۲~~ ~~۲۰۹۳~~ ~~۲۰۹۴~~ ~~۲۰۹۵~~ ~~۲۰۹۶~~ ~~۲۰۹۷~~ ~~۲۰۹۸~~ ~~۲۰۹۹~~ ~~۲۱۰۰~~ ~~۲۱۰۱~~ ~~۲۱۰۲~~ ~~۲۱۰۳~~ ~~۲۱۰۴~~ ~~۲۱۰۵~~ ~~۲۱۰۶~~ ~~۲۱۰۷~~ ~~۲۱۰۸~~ ~~۲۱۰۹~~ ~~۲۱۱۰~~ ~~۲۱۱۱~~ ~~۲۱۱۲~~ ~~۲۱۱۳~~ ~~۲۱۱۴~~ ~~۲۱۱۵~~ ~~۲۱۱۶~~ ~~۲۱۱۷~~ ~~۲۱۱۸~~ ~~۲۱۱۹~~ ~~۲۱۲۰~~ ~~۲۱۲۱~~ ~~۲۱۲۲~~ ~~۲۱۲۳~~ ~~۲۱۲۴~~ ~~۲۱۲۵~~ ~~۲۱۲۶~~ ~~۲۱۲۷~~ ~~۲۱۲۸~~ ~~۲۱۲۹~~ ~~۲۱۳۰~~ ~~۲۱۳۱~~ ~~۲۱۳۲~~ ~~۲۱۳۳~~ ~~۲۱۳۴~~ ~~۲۱۳۵~~ ~~۲۱۳۶~~ ~~۲۱۳۷~~ ~~۲۱۳۸~~ ~~۲۱۳۹~~ ~~۲۱۴۰~~ ~~۲۱۴۱~~ ~~۲۱۴۲~~ ~~۲۱۴۳~~ ~~۲۱۴۴~~ ~~۲۱۴۵~~ ~~۲۱۴۶~~ ~~۲۱۴۷~~ ~~۲۱۴۸~~ ~~۲۱۴۹~~ ~~۲۱۵۰~~ ~~۲۱۵۱~~ ~~۲۱۵۲~~ ~~۲۱۵۳~~ ~~۲۱۵۴~~ ~~۲۱۵۵~~ ~~۲۱۵۶~~ ~~۲۱۵۷~~ ~~۲۱۵۸~~ ~~۲۱۵۹~~ ~~۲۱۶۰~~ ~~۲۱۶۱~~ ~~۲۱۶۲~~ ~~۲۱۶۳~~ ~~۲۱۶۴~~ ~~۲۱۶۵~~ ~~۲۱۶۶~~ ~~۲۱۶۷~~ ~~۲۱۶۸~~ ~~۲۱۶۹~~ ~~۲۱۷۰~~ ~~۲۱۷۱~~ ~~۲۱۷۲~~ ~~۲۱۷۳~~ ~~۲۱۷۴~~ ~~۲۱۷۵~~ ~~۲۱۷۶~~ ~~۲۱۷۷~~ ~~۲۱۷۸~~ ~~۲۱۷۹~~ ~~۲۱۸۰~~ ~~۲۱۸۱~~ ~~۲۱۸۲~~ ~~۲۱۸۳~~ ~~۲۱۸۴~~ ~~۲۱۸۵~~ ~~۲۱۸۶~~ ~~۲۱۸۷~~ ~~۲۱۸۸~~ ~~۲۱۸۹~~ ~~۲۱۹۰~~ ~~۲۱۹۱~~ ~~۲۱۹۲~~ ~~۲۱۹۳~~ ~~۲۱۹۴~~ ~~۲۱۹۵~~ ~~۲۱۹۶~~ ~~۲۱۹۷~~ ~~۲۱۹۸~~ ~~۲۱۹۹~~ ~~۲۲۰۰~~ ~~۲۲۰۱~~ ~~۲۲۰۲~~ ~~۲۲۰۳~~ ~~۲۲۰۴~~ ~~۲۲۰۵~~ ~~۲۲۰۶~~ ~~۲۲۰۷~~ ~~۲۲۰۸~~ ~~۲۲۰۹~~ ~~۲۲۱۰~~ ~~۲۲۱۱~~ ~~۲۲۱۲~~ ~~۲۲۱۳~~ ~~۲۲۱۴~~ ~~۲۲۱۵~~ ~~۲۲۱۶~~ ~~۲۲۱۷~~ ~~۲۲۱۸~~ ~~۲۲۱۹~~ ~~۲۲۲۰~~ ~~۲۲۲۱~~ ~~۲۲۲۲~~ ~~۲۲۲۳~~ ~~۲۲۲۴~~ ~~۲۲۲۵~~ ~~۲۲۲۶~~ ~~۲۲۲۷~~ ~~۲۲۲۸~~ ~~۲۲۲۹~~ ~~۲۲۳۰~~ ~~۲۲۳۱~~ ~~۲۲۳۲~~ ~~۲۲۳۳~~ ~~۲۲۳۴~~ ~~۲۲۳۵~~ ~~۲۲۳۶~~ ~~۲۲۳۷~~ ~~۲۲۳۸~~ ~~۲۲۳۹~~ ~~۲۲۴۰~~ ~~۲۲۴۱~~ ~~۲۲۴۲~~ ~~۲۲۴۳~~ ~~۲۲۴۴~~ ~~۲۲۴۵~~ ~~۲۲۴۶~~ ~~۲۲۴۷~~ ~~۲۲۴۸~~ ~~۲۲۴۹~~ ~~۲۲۵۰~~ ~~۲۲۵۱~~ ~~۲۲۵۲~~ ~~۲۲۵۳~~ ~~۲۲۵۴~~ ~~۲۲۵۵~~ ~~۲۲۵۶~~ ~~۲۲۵۷~~ ~~۲۲۵۸~~ ~~۲۲۵۹~~ ~~۲۲۶۰~~ ~~۲۲۶۱~~ ~~۲۲۶۲~~ ~~۲۲۶۳~~ ~~۲۲۶۴~~ ~~۲۲۶۵~~ ~~۲۲۶۶~~ ~~۲۲۶۷~~ ~~۲۲۶۸~~ ~~۲۲۶۹~~ ~~۲۲۷۰~~ ~~۲۲۷۱~~ ~~۲۲۷۲~~ ~~۲۲۷۳~~ ~~۲۲۷۴~~ ~~۲۲۷۵~~ ~~۲۲۷۶~~ ~~۲۲۷۷~~ ~~۲۲۷۸~~ ~~۲۲۷۹~~ ~~۲۲۸۰~~ ~~۲۲۸۱~~ ~~۲۲۸۲~~ ~~۲۲۸۳~~ ~~۲۲۸۴~~ ~~۲۲۸۵~~ ~~۲۲۸۶~~ ~~۲۲۸۷~~ ~~۲۲۸۸~~ ~~۲۲۸۹~~ ~~۲۲۹۰~~ ~~۲۲۹۱~~ ~~۲۲۹۲~~ ~~۲۲۹۳~~ ~~۲۲۹۴~~ ~~۲۲۹۵~~ ~~۲۲۹۶~~ ~~۲۲۹۷~~ ~~۲۲۹۸~~ ~~۲۲۹۹~~ ~~۲۳۰۰~~ ~~۲۳۰۱~~ ~~۲۳۰۲~~ ~~۲۳۰۳~~ ~~۲۳۰۴~~ ~~۲۳۰۵~~ ~~۲۳۰۶~~ ~~۲۳۰۷~~ ~~۲۳۰۸~~ ~~۲۳۰۹~~ ~~۲۳۱۰~~ ~~۲۳۱۱~~ ~~۲۳۱۲~~ ~~۲۳۱۳~~ ~~۲۳۱۴~~ ~~۲۳۱۵~~ ~~۲۳۱۶~~ ~~۲۳۱۷~~ ~~۲۳۱۸~~ ~~۲۳۱۹~~ ~~۲۳۲۰~~ ~~۲۳۲۱~~ ~~۲۳۲۲~~ ~~۲۳۲۳~~ ~~۲۳۲۴~~ ~~۲۳۲۵~~ ~~۲۳۲۶~~ ~~۲۳۲۷~~ ~~۲۳۲۸~~ ~~۲۳۲۹~~ ~~۲۳۳۰~~ ~~۲۳۳۱~~ ~~۲۳۳۲~~ ~~۲۳۳۳~~ ~~۲۳۳۴~~ ~~۲۳۳۵~~ ~~۲۳۳۶~~ ~~۲۳۳۷~~ ~~۲۳۳۸~~ ~~۲۳۳۹~~ ~~۲۳۴۰~~ ~~۲۳۴۱~~ ~~۲۳۴۲~~ ~~۲۳۴۳~~ ~~۲۳۴۴~~ ~~۲۳۴۵~~ ~~۲۳۴۶~~ ~~۲۳۴۷~~ ~~۲۳۴۸~~ ~~۲۳۴۹~~ ~~۲۳۵۰~~ ~~۲۳۵۱~~ ~~۲۳۵۲~~ ~~۲۳۵۳~~ ~~۲۳۵۴~~ ~~۲۳۵۵~~ ~~۲۳۵۶~~ ~~۲۳۵۷~~ ~~۲۳۵۸~~ ~~۲۳۵۹~~ ~~۲۳۶۰~~ ~~۲۳۶۱~~ ~~۲۳۶۲~~ ~~۲۳۶۳~~ ~~۲۳۶۴~~ ~~۲۳۶۵~~ ~~۲۳۶۶~~ ~~۲۳۶۷~~ ~~۲۳۶۸~~ ~~۲۳۶۹~~ ~~۲۳۷۰~~ ~~۲۳۷۱~~ ~~۲۳۷۲~~ ~~۲۳۷۳~~ ~~۲۳۷۴~~ ~~۲۳۷۵~~ ~~۲۳۷۶~~ ~~۲۳۷۷~~ ~~۲۳۷۸~~ ~~۲۳۷۹~~ ~~۲۳۸۰~~ ~~۲۳۸۱~~ ~~۲۳۸۲~~ ~~۲۳۸۳~~ ~~۲۳۸۴~~ ~~۲۳۸۵~~ ~~۲۳۸۶~~ ~~۲۳۸۷~~ ~~۲۳۸۸~~ ~~۲۳۸۹~~ ~~۲۳۹۰~~ ~~۲۳۹۱~~ ~~۲۳۹۲~~ ~~۲۳۹۳~~ ~~۲۳۹۴~~ ~~۲۳۹۵~~ ~~۲۳۹۶~~ ~~۲۳۹۷~~ ~~۲۳۹۸~~ ~~۲۳۹۹~~ ~~۲۴۰۰~~ ~~۲۴۰۱~~ ~~۲۴۰۲~~ ~~۲۴۰۳~~ ~~۲۴۰۴~~ ~~۲۴۰۵~~ ~~۲۴۰۶~~ ~~۲۴۰۷~~ ~~۲۴۰۸~~ ~~۲۴۰۹~~ ~~۲۴۱۰~~ ~~۲۴۱۱~~ ~~۲۴۱۲~~ ~~۲۴۱۳~~ ~~۲۴۱۴~~ ~~۲۴۱۵~~ ~~۲۴۱۶~~ ~~۲۴۱۷~~ ~~۲۴۱۸~~ ~~۲۴۱۹~~ ~~۲۴۲۰~~ ~~۲۴۲۱~~ ~~۲۴۲۲~~ ~~۲۴۲۳~~ ~~۲۴۲۴~~ ~~۲۴۲۵~~ ~~۲۴۲۶~~ ~~۲۴۲۷~~ ~~۲۴۲۸~~ ~~۲۴۲۹~~ ~~۲۴۳۰~~ ~~۲۴۳۱~~ ~~۲۴۳۲~~ ~~۲۴۳۳~~ ~~۲۴۳۴~~ ~~۲۴۳۵~~ ~~۲۴۳۶~~ ~~۲۴۳۷~~ ~~۲۴۳۸~~ ~~۲۴۳۹~~ ~~۲۴۴۰~~ ~~۲۴۴۱~~ ~~۲۴۴۲~~ ~~۲۴۴۳~~ ~~۲۴۴۴~~ ~~۲۴۴۵~~ ~~۲۴۴۶~~ ~~۲۴۴۷~~ ~~۲۴۴۸~~ ~~۲۴۴۹~~ ~~۲۴۵۰~~ ~~۲۴۵۱~~ ~~۲۴۵۲~~ ~~۲۴۵۳~~ ~~۲۴۵۴~~ ~~۲۴۵۵~~ ~~۲۴۵۶~~ ~~۲۴۵۷~~ ~~۲۴۵۸~~ ~~۲۴۵۹~~ ~~۲۴۶۰~~ ~~۲۴۶۱~~ ~~۲۴۶۲~~ ~~۲۴۶۳~~ ~~۲۴۶۴~~ ~~۲۴۶۵~~ ~~۲۴۶۶~~ ~~۲۴۶۷~~ ~~۲۴۶۸~~ ~~۲۴۶۹~~ ~~۲۴۷۰~~ ~~۲۴۷۱~~ ~~۲۴۷۲~~ ~~۲۴۷۳~~ ~~۲۴۷۴~~ ~~۲۴۷۵~~ ~~۲۴۷۶~~ ~~۲۴۷۷~~ ~~۲۴۷۸~~ ~~۲۴۷۹~~ ~~۲۴۸۰~~ ~~۲۴۸۱~~ ~~۲۴۸۲~~ ~~۲۴۸۳~~ ~~۲۴۸۴~~ ~~۲۴۸۵~~ ~~۲۴۸۶~~ ~~۲۴۸۷~~ ~~۲۴۸۸~~ ~~۲۴۸۹~~ ~~۲۴۹۰~~ ~~۲۴۹۱~~ ~~۲۴۹۲~~ ~~۲۴۹۳~~ ~~۲۴۹۴~~ ~~۲۴۹۵~~ ~~۲۴۹۶~~ ~~۲۴۹۷~~ ~~۲۴۹۸~~ ~~۲۴۹۹~~ ~~۲۵۰۰~~ ~~۲۵۰۱~~ ~~۲۵۰۲~~ ~~۲۵۰۳~~ ~~۲۵۰۴~~ ~~۲۵۰۵~~ ~~۲۵۰۶~~ ~~۲۵۰۷~~ ~~۲۵۰۸~~ ~~۲۵۰۹~~ ~~۲۵۱۰~~ ~~۲۵۱۱~~ ~~۲۵۱۲~~ ~~۲۵۱۳~~ ~~۲۵۱۴~~ ~~۲۵۱۵~~ ~~۲۵۱۶~~ ~~۲۵۱۷~~ ~~۲۵۱۸~~ ~~۲۵۱۹~~ ~~۲۵۲۰~~ ~~۲۵۲۱~~ ~~۲۵۲۲~~ ~~۲۵۲۳~~ ~~۲۵۲۴~~ ~~۲۵۲۵~~ ~~۲۵۲۶~~ ~~۲۵۲۷~~ ~~۲۵۲۸~~ ~~۲۵۲۹~~ ~~۲۵۳۰~~ ~~۲۵۳۱~~ ~~۲۵۳۲~~ ~~۲۵۳۳~~ ~~۲۵۳۴~~ ~~۲۵۳۵~~ ~~۲۵۳۶~~ ~~۲۵۳۷~~ ~~۲۵۳۸~~ ~~۲۵۳۹~~ ~~۲۵۴۰~~ ~~۲۵۴۱~~ ~~۲۵۴۲~~ ~~۲۵۴۳~~ ~~۲۵۴۴~~ ~~۲۵۴۵~~ ~~۲۵۴۶~~ ~~۲۵۴۷~~ ~~۲۵۴۸~~ ~~۲۵۴۹~~ ~~۲۵۵۰~~ ~~۲۵۵۱~~ ~~۲۵۵۲~~ ~~۲۵۵۳~~ ~~۲۵۵۴~~ ~~۲۵۵۵~~ ~~۲۵۵۶~~ ~~۲۵۵۷~~ ~~۲۵۵۸~~ ~~۲۵۵۹~~ ~~۲۵۶۰~~ ~~۲۵۶۱~~ ~~۲۵۶۲~~ ~~۲۵۶۳~~ ~~۲۵۶۴~~ ~~۲۵۶۵~~ ~~۲۵۶۶~~ ~~۲۵۶۷~~ ~~۲۵۶۸~~ ~~۲۵۶۹~~ ~~۲۵۷۰~~ ~~۲۵۷۱~~ ~~۲۵۷۲~~ ~~۲۵۷۳~~ ~~۲۵۷۴~~ ~~۲۵۷۵~~ ~~۲۵۷۶~~ ~~۲۵۷۷~~ ~~۲۵۷۸~~ ~~۲۵۷۹~~ ~~۲۵۸۰~~ ~~۲۵۸۱~~ ~~۲۵۸۲~~ ~~۲۵۸۳~~ ~~۲۵۸۴~~ ~~۲۵۸۵~~ ~~۲۵۸۶~~ ~~۲۵۸۷~~ ~~۲۵۸۸~~ ~~۲۵۸۹~~ ~~۲۵۹۰~~ ~~۲۵۹۱~~ ~~۲۵۹۲~~ ~~۲۵۹۳~~ ~~۲۵۹۴~~ ~~۲۵۹۵~~ ~~۲۵۹۶~~ ~~۲۵۹۷~~ ~~۲۵۹۸~~ ~~۲۵۹۹~~ ~~۲۶۰۰~~ ~~۲۶۰۱~~ ~~۲۶۰۲~~ ~~۲۶۰۳~~ ~~۲۶۰۴~~ ~~۲۶۰۵~~ ~~۲۶۰۶~~ ~~۲۶۰۷~~ ~~۲۶۰۸~~ ~~۲۶۰۹~~ ~~۲۶۱۰~~ ~~۲۶۱۱~~ ~~۲۶۱۲~~ ~~۲۶۱۳~~ ~~۲۶۱۴~~ ~~۲۶۱۵~~ ~~۲۶۱۶~~ ~~۲۶۱۷~~ ~~۲۶۱۸~~ ~~۲۶۱۹~~ ~~۲۶۲۰~~ ~~۲۶۲۱~~ ~~۲۶۲۲~~ ~~۲۶۲۳~~ ~~۲۶۲۴~~ ~~۲۶۲۵~~ ~~۲۶۲۶~~ ~~۲۶۲۷~~ ~~۲۶۲۸~~ ~~۲۶۲۹~~ ~~۲۶۳۰~~ ~~۲۶۳۱~~ ~~۲۶۳۲~~ ~~۲۶۳۳~~ ~~۲۶۳۴~~ ~~۲۶۳۵~~ ~~۲۶۳۶~~ ~~۲۶۳۷~~ ~~۲۶۳۸~~ ~~۲۶۳۹~~ ~~۲۶۴۰~~ ~~۲۶۴۱~~ ~~۲۶۴۲~~ ~~۲۶۴۳~~ ~~۲۶۴۴~~ ~~۲۶۴۵~~ ~~۲۶۴۶~~ ~~۲۶۴۷~~ ~~۲۶۴۸~~ ~~۲۶۴۹~~ ~~۲۶۵۰~~ ~~۲۶۵۱~~ ~~۲۶۵۲~~ ~~۲۶۵۳~~ ~~۲۶۵۴~~ ~~۲۶۵۵~~ ~~۲۶۵۶~~ ~~۲۶۵۷~~ ~~۲۶۵۸~~ ~~۲۶۵۹~~ ~~۲۶۶۰~~ ~~۲۶۶۱~~ ~~۲۶۶۲~~ ~~۲۶۶۳~~ ~~۲۶۶۴~~ ~~۲۶۶۵~~ ~~۲۶۶۶~~ ~~۲۶۶۷~~ ~~۲۶۶۸~~ ~~۲۶۶۹~~ ~~۲۶۷۰~~ ~~۲۶۷۱~~ ~~۲۶۷۲~~ ~~۲۶۷۳~~ ~~۲۶۷۴~~ ~~۲۶۷۵~~ ~~۲۶۷۶~~ ~~۲۶۷۷~~ ~~۲۶۷۸~~ ~~۲۶۷۹~~ ~~۲۶۸۰~~ ~~۲۶۸۱~~ ~~۲۶۸۲~~ ~~۲۶۸۳~~ ~~۲۶۸۴~~ ~~۲۶۸۵~~ ~~۲۶۸۶~~ ~~۲۶۸۷~~ ~~۲۶۸۸~~ ~~۲۶۸۹~~ ~~۲۶۹۰~~ ~~۲۶۹۱~~ ~~۲۶۹۲~~ ~~۲۶۹۳~~ ~~۲۶۹۴~~ ~~۲۶۹۵~~ ~~۲۶۹۶~~ ~~۲۶۹۷~~ ~~۲۶۹۸~~ ~~۲۶۹۹~~ ~~۲۷۰۰~~ ~~۲۷۰۱~~ ~~۲۷۰~~

شکاری کے باعث ہو یہی لطیف شے کی مزاحمت بھی گوارا نہیں کر سکتے اور ذرا سی رگڑ سے مختل ہو کر شعلہ فشاں ہو جاتے ہیں۔ عظیم الجثہ شہاب کو کرہ ہوا کو قطع کر کے اپنی راہ لیتے ہیں مگر چوٹے شہاب اپنی تیزی و شعلہ فشاںی سے خود بل کر بخارات بن جاتے ہیں اور ایک دن خط کچھ دیر نظر آکر غائب ہو جاتا ہے۔ بعض وقت بڑے شہاب بھی کرہ ہوا کو قطع کرنے وقت کشش ارضی سے کھج کر زمین پر اترتے ہیں۔ ان کے گرنے اور پھٹنے کی آواز نہایت ہتینا ہوتی ہے۔ چنانچہ مسئلہ میں ایک نہایت زبردست شہاب باشندگان ہنگری پر بلائے آسمانی بن کر نازل ہوا۔ زمین کے قریب آتے آتے پھٹا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مغلہ ان ٹکڑوں کے ایک ٹکڑے جس کا وزن دس گیارہ من تھا کسی جگہ پڑا۔

نزل ہوا ہے۔ پارہ ہائے شہاب کا تجزیہ کر
مکمل۔ لوبا وغیرہ۔

ہم نظام شمسی میں داخل ہو کر اپنی منزل مقصود سے دور ہو گئے۔ ابھی میں بہت راستے کرنا ہے۔ لہذا اب ہم نظام شمسی کو چھوڑ کر نظام انجم کی راہ لیتے ہیں۔ امید ہے کہ عزیز ناظرین کو اصل سلسلہ تحریر یاد ہو گا۔

ہم اول لکھا آئے ہیں کہ سلف نے قدر اول کے صرف چودہ تارے شمار کئے تھے۔ بعد کو ان کی تعداد میں چھ کا اضافہ کیا گیا۔ چنانچہ اب قدر اول کے بیس تارے مانے جاتے ہیں اب ہم ان بیس تاروں اور ان کے جامع انجم کے حالات بہ اختصار لکھتے ہیں۔

نقطہ میں | اس مجمع انجم کی ہیئت مجموعی ایک ایسے جو ان سے مشابہ جس کا اوپر کا جسم آدمی سے اور نیچے کا حصہ گھوڑے سے ملتا ہو۔ اس مجمع انجم میں دو نہایت روشن تارے ہیں۔ اول تارہ جو ساڑھے چار سال ڈھکے فاصلے پر واقع ہے رجب منظر میں کہلاتا ہے۔ اور بلحاظ نور قیسا تارہ

دوم یعنی یہ تارہ اتنی دور واقع ہے کہ اسکی روشنی زمین تک ساڑھے چار برس میں آتی ہے جبکہ روشنی کی رفتار فی سکنڈ ایک لاکھ چھاسی ہزار میل ہے۔

جاتا ہے۔ اس کا فاصلہ زمین سے ذریعہ کرب پانچ سو ارب ترینہ کروڑ بیس لاکھ میل ہے۔
 یہ ہم سے سورج کے بعد دیگر ثابت کے مقابلے میں قریب تر ہے۔ یہ اعتبار جسامت یہ آفتاب کے برابر
 ہی مانا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا تارہ بھی قدر اول کا ہے۔

یہ مجمع النجوم خوری و فردری میں بالکل جنوبی مشرقی افق سے طلوع ہوتا ہے اور جون اور
 جولائی میں جنوب مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔

دجاہہ صلیب شمالی بھی کہلاتا ہے۔ اس کا روشن تارہ قدر اول سے ذرا کم ہے۔ مگر پہلی قدر کے
 ستاروں ہی میں شمار ہوتا ہے۔ اس کو ذب الدجاہہ یا الرؤف بھی کہتے ہیں۔ یہ بہ اعتبار سفت
 بہ استثنیٰ پہلے رجب ابوزاتام قدر اول کے ستاروں سے زیادہ ہے۔ یعنی زمین سے دو پدم
 چھپیں غیل! شکوہ بختیار چالیس کروڑ میل دور ہے۔ اس پر بھی روشن نظر آتا ہے ہمارے
 آفتاب سے ہزار گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ روشن ہے۔

دجاہہ میں ایک ستارہ ۶۱ دجاہہ کہلاتا ہے جس کی رفتار پرواز دو سو میل فی ثانیہ ہے
 اس کو کہہ شمالی کا نزدیک ترین ستارہ تسلیم کرتے ہیں جسے جنوبی کرہ میں جبل قنوس مانا
 جاتا ہے۔ مجمع النجوم دجاہہ اپریل دسمیٰ میں شمال مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور نومبر، دسمبر
 میں شمال مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ دجاہہ ۶۱ کا بعد زمین سے میل نے ۱۸۵۰ میں
 معلوم کیا۔

النہر اس کو دریا بھی کہتے ہیں۔ نہایت وسیع مجمع النجوم ہے۔ الجبار کے مغربی پہلو سے شروع
 ہو کر مغرب جنوب میں بڑھتا چلا گیا ہے۔ مگر اس کے اکثر ستارے مدہم ہیں۔ مگر ایک ستارہ قدر اول
 کا ہے جو آخر النہر الف نہر کہلاتا ہے۔ یہ برج حمل کے باطل جنوب میں جنوبی افق پر ٹٹا نظر آتا ہے
 مجمع النجوم نہر کا طلوع ستمبر، اکتوبر میں ہوتا ہے اور فردری، اپریل میں بالکل غروب ہو جاتا ہے۔
 سفینہ یہ بھی وسیع مجمع النجوم ہے۔ چنانچہ ولیم ہرشل نے اس کو چار حصوں میں منقسم کیا اور سب
 (۱) میل مسافت میں پیدا ہوا اور مسافت میں ہر ۶۲ سال فوت ہوا۔

۱۔ ام طلوعہ عظمہ کے۔ لنگر سفیدہ کا روشن ترین ستارہ ہیل کہلاتا ہے۔ بلحاظ نور آسمان پر دوسرے ستارے کا ستارہ مانا جاتا ہے۔ اس کے سال نور کا اندازہ پانچ سو اور ہزار سال کے درمیان کیا جاتا ہے۔ اور یہ روز بروز ہم سے دور ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر سال تین سو ساڑھے اسی ہزار سال میں دور ہو جاتا ہے۔ باوجود اس کے بھی اس کی روشنی میں فرق نہیں آتا۔ ہزاروں برس سے ایسا ہی روشنی نظر آتا ہے اور فائدہ عالم کب تک ایسا ہی نظر آئے گا۔ اس کے متعلق عوام الناس کا خیال ہے کہ جب یہ طلوع ہو جائے تو تمام حشرات الارض مر جاتے یا چھپ جاتے ہیں۔ ۱۱۔ چھپے میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو ہیل یا نی بھی کہتے ہیں۔ نومبر دسمبر میں طلوع اور فروری میں غروب ہو جاتا ہے۔ ہیل برج جوزا کے اگلے ستارے کا نام ہے۔ ۱۲۔ ام طلوعہ نظر آتا ہے اور خضراء یا نی ہیل کے شمال میں واقع ہے۔

۱۳۔ شیرین کر لینا چاہئے تاکہ شناخت میں آسانی ہو۔

۱۴۔ حوت جنوبی | یہ مجمع النجوم کچھ روشن نہیں۔ اس

کہتے ہیں۔ زمین سے چودہ نیل چھیا سٹھ کھرب یا بیس ارب پانچ سو روڑیں ہیں۔ ۱۵۔ عقرب کے تحت الاراس سے گزرتا ہے۔ یہ مجمع النجوم بیچ دلو کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ حوت جولائی میں طلوع اور نومبر تک غروب ہو جاتا ہے۔

۱۶۔ عسک الماعنہ | شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس میں ایک قدر اول کا ستارہ ہے جسے عیوق کہتے ہیں۔ یہ بلحاظ نور آسمان پر چھٹا ستارہ شمار کیا جاتا ہے۔ زمین سے اٹھائیس نیل چوتھ کھرب اسی ارب دس کروڑ چالیس لاکھ میل ہے اور ہر سال اٹھاون کروڑ چونتیس لاکھ سولہ ہزار میل ہم سے دور ہو جاتا ہے۔ سورج سے ایک ہزار گنے سے بھی زیادہ ہے۔ اس کو قریب الثریا بھی کہتے ہیں۔ عیوق تمبر میں طلوع اور اپریل تک غروب ہو جاتا ہے۔

۱۷۔ شلیاق | شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کا نام سر واقع ہے شمالی کریمیں کے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ اس کا فاصلہ زمین سے بیس نیل باون کھرب تانوی ارب

چھبیس کھریل ہو آفتاب سے سونگڑے بھی زیادہ بڑا ہو۔ اس کا طلوع اپریل میں ہوتا ہے۔ اور نومبر میں بالکل شمال مغرب میں غروب ہوتا ہے۔

عقاب شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس کی ہیئت ایک ایسے عقاب سے شاہہ ہو۔ جو برتوں ہونے اورٹنے کی کوشش کر رہا ہو اور منہ بجانب مشرق ہو۔ اس روشن قدر اول کے ستارہ سرطان کہلاتا ہے۔ یہ لحاظ نہ کر کے فلکی پرگیا رہواں ستارہ قرار دیا گیا ہے۔ زحل کے برابر روشن نظر آتا ہے۔ ہمارے آفتاب سے باعتبار جسامت و نور چھ سات گنا زیادہ ہو گا۔ زمین سے اٹھیل پائیس کرب زمین اور اٹھتر کروڑ چالیس لاکھ میل ہو۔ مجمع النجوم عقاب برج قوس کے شمال میں واقع ہے سرطان کا طلوع مئی میں اور غروب نومبر میں ہوتا ہے۔ سرطان کے احرار و چھوٹے ستارے بحیثیت نمایاں واقع ہیں۔ جن سے یہ آسانی شاخت کیا جاسکتا ہے

کلب اکبر یہ جنوبی مجمع النجوم ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کا نام شرانے یا نی ہے۔ اس کو عرب مجور بھی کہتے تھے۔ اور قبیلہ قیس اس کی عبادت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ نے سوہ نجم میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ اِنَّهُ مُؤَرَّبُ الْقُرْآنِ۔ اس کو کلب الیاء بھی کہتے ہیں۔ چونکہ عرب میں اس کا مطلع غرب بجانب مین ہے اس لئے یا نی کہلاتا ہے۔ باعتبار زو کرہ فلکی کے تمام قدر اول کے ستاروں سے زیادہ روشن ہے۔ اس کی روشنی ساڑھے آٹھ سال میں مین تک پہنچتی ہے۔ اس کا بعد زمین سے پانچ میل ستر کرب اکاونے ارب چھبیس کروڑ چالیس لاکھ میل ہو آفتاب سے تقریباً بیس پائیس گنا بڑا ہو۔ پانچ میل فی ثانیہ ہم سے قریب ہو رہا ہے۔ اس کا ایک بیڑا بھی معلوم کیا گیا ہے۔ اس کی پیشین گوئی بیس نے کی تھی اس کا انکشاف ستارے میں بمقام ہرکیہ ہوا۔ خیال ہے کہ یہ بیڑا شرانے یا نی کے گرد پچاس برس میں اپنی حرکت سالانہ تمام کرتا ہے اور یہ بھی روز بروز مثل مشتری وغیرہ کے سرد ہوتا جا رہا ہے۔ یہ شعریٰ کی روشنی کا دس ہزاروں حصہ روشنی دیتا ہے۔ ممکن ہو کہ اسی کی طرح اور بھی سیارے ہوں۔ شرانے یا نی کا طلوع نومبر میں ہوتا ہو اور پانچ یا ششرب اپریل میں بالکل غروب ہوتا ہے۔ نہایت روشن چمکدار ستارہ ہے۔ اس

مجمع النجوم میں چار ستارے ایسے ہیں جن کا وزن مجموعی آفتاب سے نو سو چالیس گنا زیادہ ہے۔
 کلب اصغر یا جنوبی مجمع النجوم ہے اور کلب اکبر کے شمال قدس مشرق میں واقع ہے اس
 مجمع النجوم کا قدر اول کا ستارہ شعراۃ شامی کہلاتا ہے۔ بلحاظ نور آفتوال شمار کیا جاتا ہے عرب میں
 اس کا مطلع عرب بجانب شام ہے۔ اس لئے شامی مشہور ہے۔ تقریباً دس سال میں اس کی روشنی
 زمین تک پہنچتی ہے۔ زمین سے پانچ نیل جیسی کرب چھین۔ ارب چھانوے کرو میل ہے یہ بھی
 مثل شعراۃ یانی کے ہم سے روز بروز قریب ہوتا جا رہا ہے۔ پانچ اس کی رفتار ڈھائی میل فی
 ثانیہ ہے۔ اس کے بھی ایک سیارے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ مگر ہنوز انکشاف نہیں ہوا۔ شعراۃ
 شامی کا طلوع نومبر میں ہوتا اور غروب اپریل میں ہوتا۔

نور | منطقة البرج میں ہے اور دوسرا برج ہے۔

ثریا دوم فردود ثریا کو خوشہ پروین بھی کہتے ہیں
 نہایت خوش نما اور مشہور مجمع النجوم ہے۔ اس کا
 وسط الثریا کہلاتا ہے۔ تیسری قدر کا ہے۔ رنگ سبزی مائل ہے۔ اگر دور بین سے دیکھیں تو
 بہت سے ستارے نظر آتے ہیں۔ خالی آنکھ سے دس تک گن سکتے ہیں۔ ثریا منازل قمر میں
 ہے اور چاند کی تیسری منزل ہے۔

دوسرا نقش سرود ہے۔ اس کی شکل بالکل وی (V) سے مشابہ ہے۔ اس
 مجمع کا روشن قدر اول کا ستارہ الدبران کہلاتا ہے۔ چونکہ یہ نور مذکور کی آنکھ پر واقع ہے۔
 اس لئے اسے عین الثور بھی کہتے ہیں۔ دو ہزار چالیس میل فی منٹ ہم سے دور ہو رہا ہے، زمین
 سے چھپیں نیل اٹالیس کرب چھین ارب تیس کرو میل ہے۔ الدبران چاند کی چوتھی منزل ہے
 عرب اس کو نحوس خیال کرتے تھے قبیلہ بنی تمیم در ان کی پرستش کیا کرتا تھا۔
 شروع اکتوبر میں طلوع اور آخر اپریل میں غروب ہوتا ہے۔

الجوزا جنوبی مجمع النجوم ہے۔ نہایت روشن ستاروں سے مزین ہے۔ اس کے سات ستارے مشرق و مغرب
مقابل آسمان سے جگمگ کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ خط معدل النهار بہ واقع ہے۔ اس نے
شمالی و جنوبی دونوں نیم کرے کے لوگ اسے خوب پہانتے ہیں۔

اس مجمع النجوم میں دو قدر اول کے ستارے ہیں۔ پہلا البطار الجوزا اور دوسرا امل الجوزا
کہلاتا ہے۔ البطار الجوزا البطار نور لڑاں ستارہ مانا جاتا ہے اور زمین سے اٹھاؤن نیل نیٹھ کرب
انحراب ساٹھ کرو میل ہے۔ اور رجل الجوزا زمین سے دو پدم تر لیٹھ نیل چاندی کرب ساٹھ
ارب میں کرو میل ہے۔ اور یہ پہل کے بعد قدر اول کے تمام ستاروں سے زیادہ مسافت
رکھتا ہے۔ جبار کا سر جن ستاروں سے بنتا ہے۔ وہ منازل قمر میں سے ہیں اور چاند کی پانچویں
منزل مانے جاتے ہیں۔ جبار کا طلوع اکتوبر میں اور غروب شروع اپریل میں ہوتا ہے۔

جوزا یا توامین یہ تیسرا برج ہے۔ اس کی برج کی ہیئت ایسے دو آدمیوں سے مشابہ ہے جو تولا
ہوں۔ اسی وجہ سے اس کو توامین کہتے ہیں۔ اس میں بھی مثل جبار کے دو قدر اول کے ستارے

ہیں۔ پہلے کا نام مقدم التوامین یا الف توامین ہے۔ اور دوسرے کا نام موخر التوامین یا ب
توامین ہے۔ مگر مقدم التوامین بہ نسبت موخر التوامین کے مدہم ہے۔ یہ دن بدن ہم سے دور ہوتا
جا رہا ہے۔ اور موخر التوامین روز بروز نزدیک آ رہا ہے۔ یہی وجہ مقدم کے موخر ہونے کی
ہے۔ چنانچہ مقدم التوامین کا فاصلہ زمین سے ارسٹھ نیل چار کرب میں ارب تہتر کرو
ساٹھ لاکھ میل ہے اور موخر کا فاصلہ نیل اکاسی کرب پچاس ارب پانچاس کرو ساٹھ
لاکھ میل ہے۔ اس مجمع میں توام ثانی کے پستان پر ایک ستارہ ہے جسے الہند کہتے ہیں۔
یہ چاند کی چٹنی منزل ہے۔ دو تین ستارے جوزا کے سر پر واقع ہیں جنہیں عرب الدراع
المبیط کہتے ہیں۔ یہ چاند کی ساتویں منزل مانے جاتے ہیں۔ برج جوزا کا طلوع اواخر اکتوبر
میں ہوتا ہے، اور غروب اواخر اپریل میں۔

سدا پانچواں برج ہے۔ اس کے قدراول کے ستارے کا نام قلب الاسد ہے۔ اس کی روشنی زمین تک ایک سو پچاس برس میں پہنچتی ہے۔ یہ زمین سے تاسی نیل اٹھانے کرب چون ارب پالیس کرو میل ہے۔ ہمارے آفتاب سے ہزار گنا ضرور جیم و روشن ہوگا۔
 برج اسد میں الجبہ ایک ثنی تارہ ہے۔ یہ چاند کی دسویں منزل مانا جاتا ہے۔ مگر سلمان ہیئت داں الجبہ سے حواہد کی پیشانی کے تین چار تارے دیتے ہیں۔ الجبہ کو ہندو پنجویں برج خیال کرتے ہیں۔

قرب الاسد اس کو زیرہ بھی کہتے ہیں اور یہ چاند کی گیارہویں منزل ہے۔ اسد میں ایک ستارہ قدر دوم کا ہے۔ اسے صرفہ کہتے ہیں۔
 اسکا خیال تھا کہ جب صرفہ طلوع ہوتا ہے تو گرمی۔
 تو سردی۔ چونکہ اسد نہایت وسیع برج ہے اس

سدا کا طلوع شروع دسمبر میں اور غروب آخری دسمبر میں۔

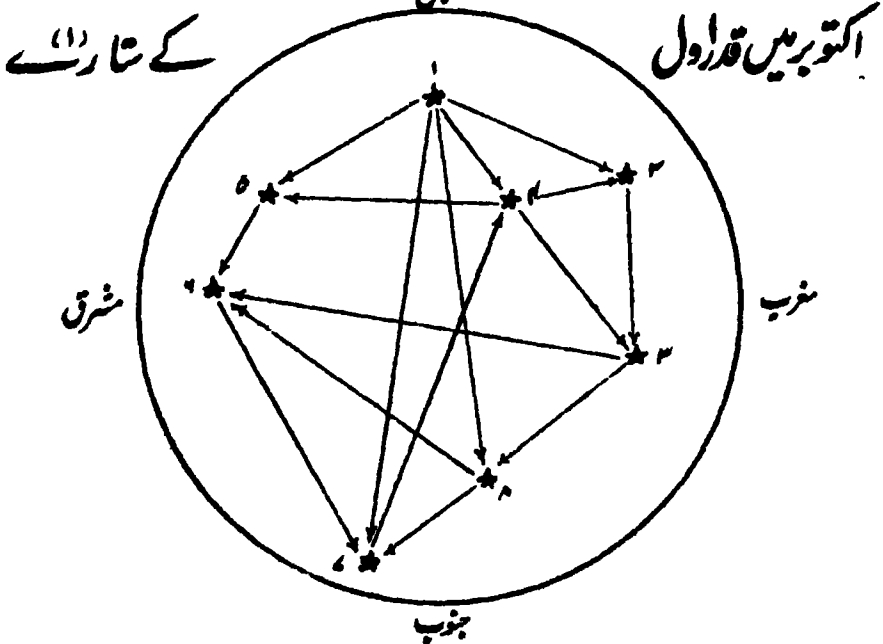
عوا یہ شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس کے قدراول کے روشن ستارے کو سماک کہتے ہیں۔ اس شمالی کہتے ہیں۔ بلحاظ نور چٹا ہے اور سواتین میل فی منٹ کی رفتار سے بن سنبھ کی طرف جارہا ہے۔ زمین سے تاسی نیل اٹھارہ کرب۔ اڑسٹھ ارب چھیانوے کرو میل ہے۔ ہمارے آفتاب سے بلحاظ نور و سمات ہزار گنا سے بھی زیادہ ہوگا۔ اس مجمع النجوم میں پانچ ستارے جن کی شکل ایل (۱۱) کی سی ہے۔ چاند کی تیرہویں منزل شمار کئے جاتے ہیں۔ عوا کا طلوع شروع فروری اور غروب وسط ستمبر تک ہوتا ہے۔

عذرا یا سنبھ منطقہ البروج میں سے ہے اور چٹا برج ہے۔ اس کے قدراول کے ستارے کو سماک المنزل کہتے ہیں۔ یہ السماک اور ساق اور سر بھی کہلاتا ہے۔ یہ بلحاظ نور سو لھواں تارہ ہے۔ اور چاند کی چودھویں منزل ہے۔ ہمارے آفتاب سے ہزار گنا ضرور جیم اور روشن ہوگا۔

برج سنبلہ کی میت ایک ایسی لڑکی سے مشابہ ہو جس کا دامن ٹٹکا ہوا ہے۔ اٹھا ہوا نیچے کی طرف اور سیدھا ہاتھ کندھے کی طرف اٹھا ہوا ہے۔ ہاتھ میں گہیوں کی بال ہے۔ یہی سنبلہ کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس کا طلوع شروع فروری اور غروب اگست تک ہوتا ہے۔

مغرب | آٹھواں برج ہرنجن لے نخس جانتے ہیں۔ اس کے قدر اول کے ستارے کو قلب المغرب کہتے ہیں۔ یہ سرخ رنگ ستارہ مریخ سے مشابہ ہے۔ بندی اس پر مریخ کا گمان کرتے ہیں۔ برج مغرب میں چاند کی تین منزلیں ہیں۔ اس کا سر جے اکیلل کہتے ہیں۔ چاند کی سترھویں منزل ہے۔ قلب اٹھارھویں اور دوم کے دو تین ستارے انیسویں منزل شمار ہوتے ہیں۔ اس کا طلوع اپریل میں اور غروب اگست و ستمبر تک ہوجاتا ہے۔

اب ہم اکتوبر میں دس گیارہ بجے نظر آنے والے صرف قدر اول کے ستاروں کا ایک نقشہ پیش کرتے۔ امید ہے کہ اس سے یہ چند ستارے بہ آسانی پہچانے جاسکیں گے۔ اختر شناسی کے لئے ہمیں سب سے زیادہ موزوں قطب تارہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ہمیں ساکن نظر آتا ہے اور باقی ستاروں کے مقامات بدلتے معلوم ہوتے ہیں۔ لہذا ہم اس کو مرکز قرار دیتے ہیں تاکہ آسانی



(۱) قطب تارا

(۲) نسر واقع

(۳) نسر طائر

(۴) ذنب الدجاجة

(۵) عمیق

(۶) الدبران

(۷) آخر الثمر

(۸) ثم الموت

م بخوف طوالت مضمون ختم کرتے ہیں

نیاں نہیں ہوا۔ ربنا، خلعت ہذا باطلا۔

تھوٹ صفحہ ۴۷، ارض البلد کی کمی بیشی کے لحاظ سے اگر ہمارے نقشوں میں کچھ اختلاف واقع ہو تو اس کو اپنے

ذوق حقیقی سے صحیح کر لینا چاہئے؟

تدوین علوم

”حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے اپنے بعض شاگردوں کے کہنے سے علوم کی تالیف اور ان کی موجودہ شکل کے متعلق ایک مختصر رسالہ ”السر المکتوم“ کے نام سے تصنیف فرمایا تھا۔ اس رسالہ میں علوم کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے۔ عربیہ۔ شرعیہ۔ فلسفہ۔ محاضریہ۔ یہ رسالہ اگرچہ بہت مختصر ہے۔ مگر پوری جامعیت کے ساتھ تمام جزئیات کو حاوی ہے۔ اس رسالہ کا پہلے ہی ترجمہ ہو چکا ہے جس کا بالاستیعاب تو میں نے مطالعہ نہیں کیا مگر کہیں کہیں سے دیکھا ضرور ہے۔ لیکن خود میں نے ترجمے کے وقت اسے پیش نظر نہیں رکھا بلکہ اپنے طور پر حتی الامکان بہت آسان الفاظ اور ترکیبوں کے ساتھ نیز ہر مفہوم کو الگ الگ پیرا گراف میں ترتیب دیا ہے۔ اور آخر میں تمام علوم کی فہرست اجمالی طور پر اپنی طرف سے بڑھا دی ہے“

علوم عربیہ | علوم عربیہ کو اس لئے مرتب کیا گیا کہ ان کے ذریعے سے کلام عرب کو سمجھا جائے۔ کلام عرب کی چند حالتیں ہیں، یا تو مفردات سے بحث کی جائے گی۔ اس کی چند صورتیں ہیں۔
(۱) مفرد سے بحث کی جائے اس کے معنی کے لحاظ سے اسے علم اللغۃ کہتے ہیں۔
(۲) مفرد سے بحث کی جائے اس طور پر کہ لفظ کس طریقہ سے ادا کیا جائے اسے علم الحاشیہ کہتے ہیں۔

(۳) مفرد سے بحث کی جائے اس لحاظ سے کہ وہ کس صفت اور شکل پر ہے اسے علم الصرف کہتے ہیں۔

(۴) مفرد سے بحث کی جائے اس حیثیت سے کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ کیا نسبت ہو یعنی کون اصل ہے اور کون فرع اسے علم الاشتقاق کہتے ہیں یا مرکبات سے بحث کی جائے گی اس کی بھی صورتیں ہیں۔

۱۔ مرکب سے بحث کی جائے اس حیثیت سے کہ کلموں کی آخر کی حالت ترکیب کے وقت

ہونا چاہئے۔ اسے علم الاعراب کہتے ہیں۔

۲۔ مرکب سے اس حیثیت سے بحث کی جائے کہ کلموں کو آپس میں کس طور پر مرکب ہونا چاہئے

علم التالیف کہتے ہیں۔

۳۔ مرکب سے بحث کی جائے کلام کی خوبی اور عمدگی کے لحاظ سے تو اسے علم البدیع کہتے ہیں۔

یا اشعار کے حالات سے بحث کی جائے گی اس کی بھی چند صورتیں ہیں۔

۱۔ حالت شعر سے بحث کی جائے باعتبار وزن شعر کے تو اسے علم عروض کہتے ہیں۔

۲۔ حالت شعر سے بحث کی جائے شعر کے آخر، کلام

ہیں۔

اسی کے ساتھ وہ علوم بھی شامل ہیں جن میں

بحث کی جائے اسے علم الخط کہتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یہ علوم ترقی یافتہ صورت میں نہ تھے۔ سب سے پہلے جس شخص نے نقوش

کتابت کی تشکیل کی ابوالاسود دہلوی۔ اس نے اشعار اور ان کے علاوہ دوسری کتابوں پر زیر زبر اور

رہن کی علامتیں بنائیں۔

پھر خلیل ابن احمد نے ننت میں کتاب الیمن تصنیف کی اور عروض و قافیہ کو مکمل صورت

میں بنایا اس کے بعد سیبویہ کا زمانہ آیا اس نے اپنی مشہور کتاب علم نحو میں کئی اسی کے ساتھ اس نے

علم منہاج۔ صرف۔ علم التالیف، اور تھوڑا سا معانی کا حصہ شامل کر دیا۔ کچھ دؤں بادشاہوں کے

مصابحوں اور دوسرے ادیبوں نے قصوں اور فصیح و بلیغ شعر کے کلام کی باریکیوں کو ایک جاکٹھا

کر شروع کر دیا اور یہی چیزیں علوم معانی۔ بیان اور بدیع کے استنباط کا سبب بنیں۔

موسم شرمیہ | وہ علوم جن کے ذریعے سے ایسی باتیں معلوم ہوں جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی طرف

سے لوگوں تک پہنچایا۔ ایسی باتوں کا سرچشمہ کتاب (قرآن)، اور سنت (حدیث) ہے یا جو کچھ قرآن

دوسرے عقل کے ذریعے حاصل کیا گیا ہو۔ علمائے علوم شریعہ کو چار تقسیم کیا ہے۔

(۱) فقہ جس میں عبادات، لین و دین، میراث، گھر کا انتظام، ملکی انتظام اور آداب زندگی کا ذکر ہوتا تھا۔

(۲) تفسیر جس میں قرآن کے ناوہ الفاظ کی شرح، اسباب نزول، تعارض کمال فیصل کی چیز، مانع و نسخ کا بیان وغیرہ وغیرہ۔

(۳) سیر، جس میں رسول قبول کی عادات شریفہ، آمد و رفت، جنگوں اور شواہد وغیرہ کا بیان۔

(۴) رقائق، جس میں رقت آمیز وعظ، دعائیں، جنت و دوزخ کا ذکر، عمل کی فضیلت، ہمت کرام کے اوصاف اور پرہیزگاری کا ذکر ہو۔

ان علوم کے حاصل کرنے والے علماء کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے۔

(۱) بعض ایسے علمائے جنہوں نے ایک ہی فن میں مہارت پیدا کی۔

(۲) بعضوں نے دو میں۔

(۳) اور بعضوں نے تمام فنون میں۔

صالح بن مزاحم نے تفسیر امام ابو حنیفہ، مالک اور شافعی نے فقہ، ابن اسحاق اور وہابی

نے غزوات (جنگ نامی) واعظوں اور صوفیوں نے رقت آمیز موعظہ تصنیف کئے۔ ابن عباس و بہت سے علموں کے جامع تھے۔

صحابہ کرام میں عبداللہ بن عباس، امام تفسیر، عمر، علی، ابن مسعود، ابن عباس، امام فقہ

اس زمانے کے بعد اور علمائے ان علوم پر غور و فکر کی نظر ڈالی لیکن ان کے پیش نظر صرف

دو ہی چیزیں تھیں۔ قرآن اصدیق، لہذا انہوں نے قرأت قرآن کے مختلف طریقوں پر کتابیں تصنیف

کیں (جسے علم قرأت سبعہ، عشرہ وغیرہ کہتے ہیں)، ان میں سات یا اس سے زائد مذہب پیدا

ہو گئے۔ چند مذہب تو روایت حاصل کئے گئے اور بعض کا علم کلام عرب اور علم الفرائض کے ذریعے

سے ہوا۔ مصنف ثنائی کو سامنے رکھ کر انہوں نے قرآن کا رسم الخط ایجاد کیا۔

پہلے پہل ان علماء نے جلد ادغیر سے احادیث کی صحیح ترتیب کا کام شروع کر دیا پھر ان کی
 کی نظر سے دوسرے فنوں کی طرح ڈالی۔ (دوسرے فنون یہ ہیں)

(۱) وہ جو حدیث صحیح کو تقسیم سے۔ مشہور کو غیر مشہور سے۔ معلول کو اس کے غیر سے متنازعہ
 صحیح بخاری، مسلم، متذکر حاکم، مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور دارقطنی۔

(۲) وہ جو حدیثوں کو فقہ اور اس کے ابواب پر تقسیم کر دے۔ جیسے کتب شافعی، ابن ماجہ
 حنفی، شرح سنہ وغیرہ۔

(۳) وہ جو حدیثوں کی تقسیم صحابہ کے لحاظ سے کرے اور یہ کتب نہ نیکہاتی ہیں جیسے سنہ
 بیہقی، مسند بزار وغیرہ۔

(۴) ایک فن اسرار الرجال کا ہے۔ در او یا۔

تضعیف و عادل کی بحث اور حدیث کے دور الفادہ۔

(۵) کتب احادیث کی ترتیب دوسری کتابوں

(۶) کتب صحاح کے نوٹ پر جیسے صحیح ابی عوانہ اور اسماعیلی۔

(۷) مشکل حدیثوں کی یادداشت۔ وہ مختلف حدیثوں میں تطبیق۔ اور اصول حدیث کا بیان۔

(۸) متن حدیث کی شرح جیسے ابن حجر کی شرح بخاری پر۔ نووی کی مسلم پر اور اس کے علاوہ

مجتبىٰ سے شرح جو حدیث سے باہر ہیں۔

دشاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "خدا کا بھڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے اسرار حدیث کی

بل اور مفصل طور پر بیان کرنے کی توفیق عنایت کی۔ میں نے ان اسرار کو اپنی کتاب حجة اللہ الباقیہ

میں جمع کر دیا ہے۔"

پھر یہ علماء مذکورہ چاروں علموں کی طرف توجہ ہوئے۔ خاص طور پر تفسیر کی طرف زیادہ توجہ

کی اور ہر فن کے عالم نے تفسیر لکھی لیکن اس طرح کہ غوی نے غوکہ۔ لغوی نے لغت کو۔ مؤرخ

نے مناسب قصوں کو۔ قاری نے قرأت کو فقہ نے فقہ کو۔ معانی جانتے والے نے معانی کو۔

کلام جاننے والے نے کلام کو۔ اور صوفی نے تصوف کو زیادہ دخل دیا۔ اس وجہ سے تصانیف کی کثرت ہو گئی اور ہر جگہ پھیل گئیں

اس کے بعد ان تمام فنون کو عمل کرنے کا ارادہ کیا۔ رازی، بیہناوی اور نیشاپوری نے ایسا ہی کیا۔

علم فقہ میں غور و فکر نے انہیں اس نتیجہ پہنچایا کہ اصول فقہ اور علم جہل یا سرفہ خلاف کو مستقل علم کی صورت سے دی۔ لیکن ہونے والے واقعات چونکہ کسی خاص حد پہنچ کر رک نہیں جاتے اس لئے متقدمین کی تصانیف کافی نہ ہو سکیں۔ لہذا انھوں نے ذریعے استنباط کیا فتاویٰ اور واقعات جمع کئے۔ پھر اقوال و اسباب کی باہمی ترجیح و اولیت کو پیش نظر رکھا۔ پھر علم المذہب کی تحریر اور حکایت اقوال و اسباب کے یقینی ہونے کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر ہر فرقہ کی تائید میں عقلیات و نقلیات کے پیش نظر تصنیفات کیں۔

وہ مذاہب جن میں تخریج و ترجیح کو بکثرت استعمال کیا گیا تھا چار تھے۔

(۱) لوگوں کے دلوں کو پاکیزہ بنانے کے لئے دو طریقے اختیار کئے۔

(الف) وعظ و نصیحت اور رقت آمیز قصوں کو کتابی صورت میں مرتب کیا۔ ممبروں پر شیخ پر اثر و عطا کہنا شروع کیا۔

دب، آخرت کو درست کرنے کے لئے چند قواعد کی بنا ڈالی اور انہیں عام کتابوں کی طرح، فصلوں اور بابوں کی شکل میں مرتب کیا۔ جیسے احیاء العلوم (غزالی)، صباۃ کرام، تالعیق، عطا اور صوفیا کی تاریخ کی طرف توجہ کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے یا تو ہر ایک شیخ کی سیرت اور اس کے اقوال کو الگ الگ لکھا۔ ایسی کتابوں کو مقامات اور ملفوظات کہتے ہیں۔ یا سب کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ جیسے مشائخ چشتیہ، علماء اخلاف یا ایک زمانہ اور ملک کے لوگوں کے حالات کی جگہ ایسی کتابوں کو طبقات کہتے ہیں۔ اس میں کچھ تو تاریخ اور کچھ قصہ اسرار رجال کا شامل کر دیا گیا۔ اس خاکسار (شاہ صاحب) نے بھی اپنے محترم باپ۔ چچا اور بعض اور اہل عربین کے چید حالات

تو اپنی کتاب انفاس العارفین میں جمع کیا ہے۔

(۲) بعض لوگوں نے اوراد و وظائف میں۔

(۳) بعض نے حالات و کیفیات میں۔

(۴) بعض نے صوفیا کرام کے رموز اور بغیر حالات کی صورت میں ہوتے ہیں، کے بیان میں کتابیں لکھیں۔

پھر خود صوفیا کرام ہی کے طریقت میں مختلف گروہ ہو گئے۔ اور ہر مسلک پر رسائل لکھے گئے۔

الف) بعض نے آنحضرت صلعم پر درود شریف پڑھنے کے بارے میں تصانیف کیں جیسے دلائل الخیرات۔

ب) بعض نے حزب اور مناجات لکھی۔

جب مذہبی تشقت و انتشار ہوا۔ مگر کیا۔

تک پہنچا۔ یہ مباحثہ معتزلہ شیعہ فلاسفہ اور اہل کتاب سب ہی نے وریمان بڑھا۔ ان میں یونانیوں کی ضرورت کبھی نصرت دین کے خیال سے بھی ہوتی تھی۔ اس کے لئے باقاعدہ سائنس قائم ہوئیں۔ لیکن چونکہ یہ کوئی معمولی کام نہ تھا اس لئے قطعی اصول و ذریعہ خوش بیانی اور خوش فکری کی بھی ضرورت تھی۔ اور اس کمال کا بغیر تعلیم و تعلم حاصل ہونا بظاہر ناممکن ہی سا ہے۔ لہذا علم کلام (اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے) مرتب کیا گیا۔

علم کلام کی ایجاد کی طرف سب سے پہلے معتزلہ نے توجہ کی۔ اس طرح پر کہ فلسفہ سے حدود رسم۔ قیاس و مقولات عشرہ اور الہیات سے امور عامہ کی بحثوں کو لے لیا اور اس کے ساتھ صفات۔ نبوت اور معاد کی شرعی بحثوں کو شامل کر دیا۔ پس فلاسفہ کے وہ اصول جو شرعی قواعد کے خلاف نہ تھے انہیں باقی رکھا۔ اور جو ایسے نہ تھے انہیں بحال کر دوسرے اصول ان کی جگہ قائم کر دیے۔ علم کلام کو فلسفہ سے سبب ضبط کرنے کے یہی معنی ہیں۔

اہل سنت والجماعت میں سب سے پہلے جس شخص نے علم کلام کے بارے میں غور کیا وہ
ابو الحسن اشعریؒ ہیں۔ مذہب اعتزال سے آپ کے رجوع کرنے کا قصہ مشہور ہے۔ نیز آپ جلتے
تھے کہ اصول کس طرح بنائے جاتے ہیں اور پھر ان سے فروعات کس طرح اخذ کی جاتی ہیں۔ آپ
اسی طریقے پر چلتے رہے۔

پھر ابو نصر اور ابو علی وغیرہ نے ان اصولوں کی جو اسلام کے مخالف تھے تاویل کر کے
اسلامی قواعد کی صورت میں فلسفہ سے مطابقت دی۔ اس لئے مسلمانوں کو ان کے کلام کی
نقل و تردید کی ضرورت ہوئی۔ علم کلام اسی طرح برقعہ لگایا۔ اس کی وسعت روز افزوں تھی۔
لیکن مشکلین کا قلبی تذبذب دور نہیں ہوا۔ وہ اسی کی فکر میں غلطیاں دیکھ رہے تھے۔ نوبت بایںجا
رسید کہ وہ علم کلام ”حق صریح“ سمجھنے لگے۔

جب اصحاب حدیث نے یہ دیکھا تو اہل سنت کے عقیدے کے موافق بہت سے
رسائل لکھے اور ان میں صرف وہی حدیثیں لیں جن سے یہی مسائل استنباط ہوتے ہوں۔
صوفیائے کرام نے ابتداءً انھیں روز و اشارات کی طرف توجہ کی جن کو حالات سے
تعبیر کرتے ہیں۔ پھر حالات سے معارف کی طرف پیش قدمی ابن عربی اور آپ کے شاگرد واصلیہ
درجہ ہائے انہ نے کی۔ اور اس وقت سے اس علم کی بہت سی شاخیں ہو گئیں جن کا تعلق علوم
اشراقیہ سے ہے۔ اس لئے مثال۔ ناسوت اور لاہوت وغیرہ کا استعمال ان کی اصطلاح
میں بہ کثرت ہوتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے نزدیک جس شخص نے
سب سے پہلے لوح۔ قلم۔ امر اور خلق کا ان مذکورہ معانی پر اطلاق کیا ہے وہ فارابی ہے۔
پھر ان کے تبعین نے صوب ضرورت ہر باب کی طرف توجہ کی۔ باہم مناظرے بھی ہوئے
یہاں تک علوم شرعیہ کی تقسیم کا ذکر ہے

علوم حکمت | علوم حکمیہ کی حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی اولاد جب زمین پر پھیلی اور متفرق
گروہ ہو کر جدا جدا مقامات کو اپنا وطن بنایا۔ ہر خطہ میں ایک جماعت آباد ہوئی۔ وہاں تہذیب

ہندوؤں کی مناسباتی کے اعتبار سے جن کا تعلق شہری اور خانگی انظامات سے ہوا وہ ان کو بھی
 میں متعلق شہرستانی نفس سے ہے نیز ان نکات کو جن کا تعلق طب - ادویہ اور بیاریوں سے ہو
 ہندوؤں کو بھی جو نجوم - کہانت - قیافہ اور حساب سے متعلق ہیں - نیز وہ نکات بھی جو جسمانی اور نفسی
 ریاضتوں کے سلسلے میں آتے ہیں -

اب لوگوں میں جو صنعتیں بھی موجود تھیں ، وہ اجتماعی طور پر پائی جاتی تھیں - اسی لئے
 اگلے اور پچھلے گروہوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کا ان فنون کی طرف میلان نہ ہو بلکہ جن اہل
 نے حکومت کی شکل اختیار کر لی اور وہاں ان علوم کے حاصل کرنے کا رواج بھی پڑ گیا - تو پھر ان
 علوم میں ان کو ادوروں سے زیادہ ہارت ہو جاتی تھی
 فریدوں کے زمانے سے لے کر آنحضرت ﷺ
 جاتی تھی اور وہاں کے حکما تمام باتوں سے زیادہ
 اندر رکھتے تھے -

اس امر پر اتفاق ہے کہ اسکندر سے تقریباً تین سو سال پہلے یونان میں یوٹ - بڑے نسب
 اور تحصیل علم کی خاطر بڑے صابر اور اس کے ولدا وہ تھے - ان علوم میں خوب خوب واد فکر دی
 آخر علم طب کے ذریعے انھیں سعدی - نباتاتی اور حیوانی اشیا - ان کے خواص اور ان کے افعال
 طبعی کا علم ہوا نیز اس علم نے ان کو اس طرف بھی متوجہ کیا کہ موالید ثلاثہ کے معجون مرکب جسم میں
 غذایت اور نو کے لحاظ سے طبیعت کیا کیا تصرفات کرتی ہے پھر انھوں نے فضائی اور مادیاتی
 اشیا وغیرہ کی تفتیش کی - آخر انھوں نے ان تحقیقات سے چند نکتے اور حکایتیں حاصل کر لیں جنہیں
 سمجھدار لوگوں نے محفوظ کر لیا اور پھر رسالوں کی شکل دے دی - علم نجوم نے انھیں سیارات کی
 تحقیق کی طرف متوجہ کیا اور چونکہ غیر حسابی قاعدوں کے جانے اس کا یاد کرنا مشکل تھا - لہذا ان
 قواعد کو ترتیب دیا گیا تاکہ تحصیل علم نجوم کے لئے وسیلہ بن سکیں - سلسلہ تحقیق ہماری آئینہ آئینہ
 اور حساب کا بھی فنون میں شمار ہونے لگا - مزید برآں ریاضت و عبادت نے جو انبیاء سابقین

ل ہوئی تھی ثمرات نفس کے معلوم کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ مگر نچا اس اور اک نے دیکھ کر
بہرقت تک پہنچایا۔ پھر ان حقائق کی لوگوں کو خبر دی نیز رسائل تصنیف کے جن کا ذکر
دیکھ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی دلچسپیاں بڑھ گئیں۔ بحث و مباحثہ شروع ہو گئے
کہ فن مناظرہ کے تمام حربوں کو استعمال کرنا پڑا۔

ارسطو جو کہ بہت ہی صاحب الرائے متین۔ سنجیدہ اور جنگ و جدل سے متنفر تھا۔
اس کا زمانہ آیا تو اس نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ مباحثہ حدود و برہان کی تشریح کر دی
۔ نیز شروع و جدل اور برہان کا باہمی فرق بتلادیا جائے۔ آخر اس نے قواعد کی وہ ترتیب
بے غلطی بلا چون و چرا تسلیم کرے۔ اس کا یہ طریق عمل خلیل نحوی سے ملتا جلتا تھا جس نے
اکو ایجاد کیا تھا۔

ارسطو نے کیا یہ کہ مذکورہ تینوں علوم کو علم طبعی سے الگ کر دیا۔ اور اس میں کچھ اور
کے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دی۔

اس نے اشتراقیوں کے کلام کو دیکھا جو مناقضہ۔ تعقید اور اضطراب سے ملوث تھا۔ کچھ
بصاف معلوم ہو جاتا تھا کہ حدود و برہان کی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ تو اس نے ایک بہت
مختصر بات کہہ ڈالی جس نے تردوات کا خاتمہ کر دیا۔ اگر اسکندر نہ ہوتا تو تصانیف کی
انہ ہوتی اور نہ لوگوں ہی کو اس طرف توجہ کا شوق ہوتا۔

بطلمیوس علم ہیئت و نجوم کا بڑا ماہر تھا ان علوم میں اس کی تصنیفات بہترین ہیں۔
اس نے اپنے زمانے کے ایک بادشاہ کے لئے اصول ہندسہ میں ایک کتاب لکھی۔
یہ کا ماہر تھا اس نے اسی فن میں بہت کچھ لکھا۔ جالیکنوس نے اس کی تشریح کی اور
حدود تک پہنچا دیا۔

دورِ جاہلیت اس حالت میں ختم ہوا کہ ان کے پاس یہ کتابیں اور رسائل تھے مفسرین
تک کے اعتراف کے ساتھ ساتھ وہ ان کی تفصیل میں مشغول تھے۔ اور ان کے مباحثہ

میں اپنی لمبی کا اظہار کرتے تھے۔

موسیقی کے متعلق یہ خیال ہے کہ صناعات کے زمرے میں داخل ہے علوم میں نہیں۔ ہاں ایک جماعت نے جب دیکھا کہ مسائل کے منتشر ہونے کے باعث موسیقی کی تحصیل دشوار ہے تو انہیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک رسالے میں ان کا اعداد کو جمع کر دیا جائے یہ لہذا اس فن میں کتابیں اور رسالے تصنیف کئے گئے۔

اس کے بعد حکما میں اس بات پر بحث۔

فنون سے سرور حاصل ہوتا ہے اور بعضوں سے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ چونکہ اس قسم کی بحث کا

علومِ حکمیہ میں داخل کر دیا جائے۔ جب اسلام کا دور آنا اور میں سے بہت حصہ یورپ اور عربی میں منتقل کیا تو مسلمانوں نے اس کے انتشار و پراگندگی پر غور کیا جب ابو علی کا زمانہ آیا تو اس نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ اور بعض باتوں پر دونوں کا از خود اجتماع ہو گیا۔ لیکن بعض باتوں میں شارع علیہ السلام کی مصلحتوں پر انکا ہی نہ ہوئی۔ نہ سلسلہ کلام کے مقدمہ پر۔ آخر اپنے اپنے طریقے پر جو کچھ میں آیا بیان کرنا شروع کر دیا۔ ابو علی نے کتاب الشفا میں ان علوم کی ترتیب و ایضاً بڑی خوبی کے ساتھ بحث کی۔ نیز حکمت نظری کو چار پر تقسیم کیا۔

(۱) منطق۔ اس میں نو ابجاث رکھیں۔

کلیات خمس۔ مقولات عشر۔ قضایا۔ قیاس۔ مباحث حدود برہان۔ خطابت۔ جدل۔

شعرا و رجالہ۔

(۲) طبیعیات۔ اس میں آٹھ ابجاث رکھیں۔

سماع طبیعی۔ کون و فساد۔ کائنات جو سعادہ۔ نباتات۔ حیوانات اور نفس۔

(۳) ریاضیات۔ اس میں چار بخشیں۔

ہیئت۔ حساب۔ ہندسہ اور موسیقی۔

سے حاصل ہوئی قحی ثمرات نفس کے معلوم کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ مگر کیا اس اور اک نے جو کہ دنیا اور معرفت تک پہنچایا۔ پھر ان حقائق کی لوگوں کو خبر دی نیز رسائل تصنیف کے جن کا ذکر کنا بیشہ ہو چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی دلچسپیاں بڑھ گئیں۔ بحث و مباحثہ شروع ہو گئے یہاں تک کہ فن مناظرہ کے تمام حربوں کو استعمال کرنا پڑا۔

ارسطو جو کہ بہت ہی صاحب الرائے مہتمم۔ سنجیدہ اور جنگ و جدل سے متنفر تھا۔ جب اس کا زمانہ آیا تو اس نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ مباحثہ حد و برہان کی تشریح کر دی جائے۔ نیز شر و جدل اور برہان کا باہمی فرق بتلادیا جائے۔ آخر اس نے قواعد کی وہ ترتیب رکھی جسے عقل بلا چون و چرا تسلیم کرے۔ اس کا یہ طریق علی خلیل نحوی سے ملتا جلتا تھا جس نے عروص کو ایجاد کیا تھا۔

ارسطو نے کیا یہ کہ مذکورہ تینوں علموں کو علم طبعی سے الگ کر دیا۔ اور اس میں کچھ اور اضافہ کر کے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دی۔

اس نے اشراقیوں کے کلام کو دیکھا جو مناقضہ۔ تعقید اور اضطراب سے ملوث تھا۔ کچھ والے کو صاف معلوم ہو جاتا تھا کہ حد و برہان کی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ تو اس نے ایک بہت کھلی اور مختصر بات کہہ ڈالی جس نے تردوات کا خاتمہ کر دیا۔ اگر اسکندر نہ ہوتا تو تصانیف کی یہ کثرت نہ ہوتی اور نہ لوگوں ہی کو اس طرف توجہ کا شوق ہوتا۔

بطلموس علم ہیئت و نجوم کا بڑا ماہر تھا ان علوم میں اس کی تصنیفات بہترین ہیں۔ اقلیدس نے اپنے زمانے کے ایک بادشاہ کے لئے اصول ہندسہ میں ایک کتاب لکھی۔ بقرا و طب کا ماہر تھا اس نے اسی فن میں بہت کچھ لکھا۔ جالیانوس نے اس کی تشریح کی اور انتہائی حدود تک پہنچا دیا۔

دورِ جاہلیت اس حالت میں ختم ہوا کہ ان کے پاس یہ کتابیں اور رسائل تھے اور ہنرمین کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ وہ ان کی تحصیل میں مشغول تھے۔ اور ان کے مباحثہ

میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔

موسیقی کے متعلق یہ خیال ہے کہ صناعات کے ذریعے میں داخل ہے علوم میں نہیں۔ ہاں ایک جماعت نے جب دیکھا کہ مسائل کے منتشر ہونے کے باعث موسیقی کی تحصیل دشوار ہے تو غرض اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک رسالے میں ان قواعد کو جمع کر دیا جائے لہذا اس فن میں کتابیں اور رسالے تصنیف کئے گئے۔

اس کے بعد حکما میں اس بات پر بحث

نعموں سے سرور حاصل ہوتا ہے اور بعضوں۔

متعلق گفتگو ہوئے لگی۔ چونکہ اس قسم کی بحث

علوم تکیہ میں داخل کر دیا جائے۔ جب اسلام کا دور آیا اور میں سے سے مسلمانوں نے عربی میں منتقل کیا تو مسلمانوں نے اس کے انتشار و پراگندگی پر غور کیا جب ابو علی کا زمانہ آیا تو اس نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ اور بعض باتوں پر دونوں کا از خود اجتماع ہو گیا۔ لیکن بعض باتوں میں شارع علیہ السلام کی مصلحتوں پر آگاہی نہ ہوئی۔ نہ سلسلہ کلام کے مقصد پر۔ آخر اپنے اپنے طریقے پر جو سمجھ میں آیا بیان کرنا شروع کر دیا۔ ابو علی نے کتاب اشفا میں ان علوم کی ترتیب و تالیف بڑی خوبی کے ساتھ بحث کی۔ نیز حکمت نظری کو چار تقسیم کیا۔

(۱) منطق۔ اس میں نو ابجاث رکھیں۔

کلیات خمس۔ مقولات عشر۔ قضایا۔ قیاس۔ مباحث حدود و برہان۔ خطابت۔ جدل۔

شرا ورمخالطہ۔

(۲) طہیحات۔ اس میں آٹھ ابجاث رکھیں۔

سماع اطبعی۔ کون و فساد۔ کائنات جو سعادون۔ نباتات۔ حیوانات اور نفس۔

(۳) ریاضیات۔ اس میں چار بخشیں۔

ہیت۔ حساب۔ ہندسہ اور موسیقی۔

(۴) الہیات۔ اس میں دو شعبیں۔

امور عامہ اور معرفت باری تعالیٰ و عقول۔

ختم کتاب پر اسرارِ شریعت کو بیان کیا جیسے جزا سزا۔ نبوت۔ عبادت۔ تدبیر منزل اور سیاست مدن۔

اگر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ ابو علی نے ذات باری۔ صفات اور کلام باری کے متعلق جو کچھ بحث کی ہے وہ بہت گہری تھیسی ہے۔ اس لئے کہ محض ظن و تخمین سے کام لیا گیا ہے طبعیات میں فلاسفہ کے کلام کا فشا عناصر و موالید میں اکثر حادثات کے اسباب کی تشریح ہوتی ہے۔ جن کا ظہور حدیسی ہوتا ہے

علوم محاصرہ | ضرورتاً یا رسا انسانوں کے لئے یا اس لئے کہ انسانوں کا ایک گروہ ان سے طبیعتاً لیا ہو۔ جو قواعد کلیہ۔ مفید صنعتیں اور دھپ رکاتین مرتب کی گئی ہیں۔ ان کا نام علوم محاصرہ ہے انھیں میں سے بعض میں سے بعض علوم ایسے بھی ہیں جن سے اشیاء کی بیگنی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ حوادث و دنیا مشلا فتح شکست۔ ارزانی و قحط وغیرہ کو ان کے آنے سے پہلے جاننے کے متمنی ہوتے ہیں۔ یہ علوم نجوم۔ کمانت۔ فال۔ خواب کی تعبیر۔ رمل اور جفر وغیرہ ہیں۔

کچھ ایسے علوم بھی ہیں جن سے مزاج میں اعتدال اور بیماریوں کا دفعہ ہوتا ہے اور اور ان کی ضرورت بالکل عیاں ہے مثلاً طب۔ تعویذ اور پالو جانوروں جیسے گھوڑا۔ اونٹ بکری گائے۔ گدھا۔ ہاتھی اور کبوتروں کا علاج۔

انھیں میں نادری صنعتوں کا شمار ہے جیسے تیر اندازی۔ خوش خطی۔ کیما۔ موسیقی۔ طباطبائی اور کسانانی فنون حکمت بھی انھیں میں داخل ہیں۔

حکمت ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے عمدہ اخلاق۔ تدبیر منزل اور سیاست مدینہ کی کفایت معلوم ہوتی ہو۔ قدیم حکماء واقعی اور فرضی حکایتیں و خیالوں اور پرندوں اور درندوں کی زبانی

اسی غرض سے مرتب کرتے تھے۔ پھر ان کی کوشش ان حکایتوں سے عجیب عجیب نئے ہم پہنچاتی تھی۔

علوم محاضریہ میں... بادشاہوں اور ہونے والے عجیب و غریب حکایتیں۔ شہروں کے حالات۔ پہاڑوں اور درختوں کی کیفیات داخل ہیں۔

نہایت کی معرفت یعنی ترکی عربی۔ فارسی اور سندھی وغیرہ۔ اور مختلف نسلوں کی پہچان یہ بھی علوم محاضریہ کا ایک جز ہے۔

قومی اشعار ان کا طریقہ تحریر۔

ان کی کتابوں کی روایت۔ اور ان کے

ان سب کا شمار علوم محاضریہ میں کیا گیا ہے۔

ان اوراق میں جن امور کے تذکرہ کا ہم نے ارادہ کیا تھا یہ ان کا نامہ جز اول و آخر جدا ہی کے لئے تمام اوصاف لائق و زریا ہیں۔

دہرست ان علوم کی جن کو علماء عرب نے مرتب کیا یا ان میں اضافہ و تشریح کی۔

علم لغت۔ علم مناجیح۔ علم صرف۔ علم شتقاق۔ علم الاعراب۔ علم تالیف۔ علم بدیع۔ علم عروض۔

علم قافیہ۔ علم خط۔ فقہ۔ تفسیر۔ سیر۔ رقائق (نصائح و مواعظ) تہذیب و تہذیب۔ تفسیر حدیث فقہ و ترجمہ کے لحاظ سے۔ تفسیر حدیث صحابہ کے لحاظ سے۔ علم اسرار الرجال۔ جمع و تعدیل۔ تخریج۔ کتب احادیث۔ تخریج۔

احادیث بطرز صحیح۔ ضبط احادیث مشککہ۔ جمع احادیث مشککہ۔ اصول حدیث۔ شروح کتب۔ اصول فقہ

علم جدول۔ معرفۃ الخلاف۔ علم الترجیح۔ فتاویٰ۔ علم المذاهب۔ علم الکلام۔ علم اخلاق۔ تدبیر منزل۔

ریاست مدن طب۔ معرفت ادویہ۔ نجوم کہانت۔ قیافہ۔ حساب۔ ہیئت۔ موسیقی۔ علم القراءات علوم

محاضریہ (ان کے علاوہ اور بہت سے علوم عقلیہ و نقلیہ جن کی ایجاد یا ترقی و تجدید میں عربوں کو دخل

حکیم مولوی سید سعید احمد صاحب اسعد ٹونکی برہما

حکیم صاحب سلف صاحبین کی یادگار اور آخری عہد اسلامی کے تمدن کے علم بردار تھے۔
خانہ دانی علم و فضل کے ساتھ ذاتی فضل و کمال سے آراستہ، مروجہ علوم و فنون عربی و فارسی کے علاوہ
فن طب اور اردو فارسی شاعری کے مسلم استاد تھے۔

آپ کے والد ماجد مولوی حکیم سید احمد علی صاحب سیاب بن مولنا سید محمد علی صاحب دافنا
رامپوری المتوفی ۱۲۸۵ھ خلیفہ محضرت سید احمد صاحب بریلوی کے برابر اور خود مولنا حکیم سید سعید علی
صاحب رامپوری کو آپ کا خاندان سادات بخاری سے تھا۔

ولادت سنہ ۱۲۸۵ھ ٹونک میں ہوئی، اپنے والد بزرگوار و دیگر اہل فضل و کمال سے جو
ان دنوں ٹونک میں تھے علم و فضل حاصل کیا، سنہ ۱۳۰۵ھ میں جو پال گئے۔ وہاں بڑے بڑے فضلاء
تحصیل علوم و فنون کی۔ مثلاً قاضی شیخ محمد صاحب مچلی شہری، شیخ حسین عرب صاحب یانی وغیرہ
فن طب میں کمال پیدا کیا، نابھنی و ٹنٹیس میں نسرید مصرغے۔ ذہانت، قوت حافظہ، طباعی
اور ذکر میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ جو اس کی ذکاوت و تیزی میں ضرب اشل تھے علاج و طب
میں وہ کمال تھا کہ دور دور کے لاعلاج مریض آتے، ایک مرتبہ ہاتھ رکھ کر پوری کیفیت بیان کر دیتے
تھے، اکثر امراض میں سول سرجن ان کی رائے و مشورے سے کام کرتا تھا۔ جراحی کے مشکلات میں
خصوصاً ان کا مشورہ قابل قدر خیال کیا جاتا تھا۔ بہت سے مہر کے کے علاج ایسے کئے اور مایوسوں
کو ان کے ذریعے وہ شفا حاصل ہوئی جو زبان دعوام و خاص ہے۔ برص و دیگر لاعلاج بیماریوں
میں انگریزوں کے پاس آتے یا باہر لو کر علاج کراتے اور اکثر کامیاب ہوتے تھے۔

سنہ ۱۳۱۵ھ میں حج بیت اللہ کے لئے گئے اور ایک سال تک وہاں رہے جس میں اہل
علم و فضل سے خوب صحبت رہی۔ شیخ احمد مغربی اور علامہ شیخ محمد سہارنپوری وغیرہ سے خاص التماس

والفتمی عرب کے قبائل سے بھی آمدورفت اور تعلقات و روابط پیدا کئے، وہاں طب کی وہ خواہش و قدر دیکھی کہ حدیثان سے باہر۔

اخلاق و عادات میں نہایت منکسر المزاج، سادہ اور رحم دل تھے خلیق خدا کی نفع رسانی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرتے، نریب و امیر سب کو ایک نظر سے دیکھتے جبکہ غریب کو زیادہ خیال کرتے تھے، مریض کو دیکھ کر اگر قابل علاج ہوتا تو

کرتے، بلکہ اپنے پیسے سے کچھ خدمت کر دیتے۔
علاج سے دست بردار ہو جاتے اور اکیلے

کا یہ بہانہ ہے۔ اسے فلاں نسخہ استعمال کر۔

ریاست سے جاگیر و سخاوت بھی مگر دربار میں زیادہ آمدورفت نہ رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں سادگی کے ساتھ خود داری استغفار اور بچائی بہت تھی۔ مال و زر کی طمع غلبہ نہ تھی، اس لئے ایسے تمام مقامات سے جہاں دین کو دنیا پر قربان کر دیا جاتا ہے بہت پرہیز کرتے تھے ہمیشہ اہل علم و فضل سے محبت و مودت کا سلسلہ قائم تھا۔ مولانا سید عرفان صاحب مرحوم اور ان کے بھائی مصطفیٰ میاں مرحوم بنیرگان سید احمد صاحب بریلوی سے خاص اخلاص تھا، اتباع سنت میں خاص کوشش کرتے اور اہل توحید سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اکابر و فضلاء کے مجال مجلس میں اس طرح بیانات بیان کرتے تھے کہ گویا کوئی محفوظ چیز دہرائی جاتی ہے۔ ایسا خوش بیان قوی الحافظ بہت کم دیکھا گیا۔

سلسلہ سے ایک آنکھ میں پانی اتر آیا تھا، پھر دوسری میں بھی برسات میں ایک آنکھ بنوائی جو کچھ دنوں کے بعد خراب ہو گئی، دوسری آنکھ سلسلہ میں بنوائی مگر وہ تیار نہ تھی۔ اس کے بنوانے میں بے حد تکلیف ہوئی اور جو کچھ بصارت تھی وہ بھی جاتی رہی، اس سے سخت صدمہ پہنچا اور زندگی سے دل تنگ ہو گیا، خصوصاً نازک کے اوقات کی معرفت نہ ہونے پر سخت افسوس کیا کرتے تھے !

فارسی۔ طب وغیرہ میں بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں حکیم سید یحییٰ میاں خلیف اکبر اور
 سید احمد میاں نواسہ طب و فارسی میں اور مولوی سید شرف الدین صاحب، مولوی عبدالرحمن
 صاحب فارسی میں۔ سید عیسیٰ بیل بچھلے صاحب زادے شعر و شاعری میں خاص کر قابل ذکر ہیں۔ تاریخ
 مہکالنے میں خاص جہارت رکھتے تھے، بہت لوگ اس فن میں بھی ان سے تلمذ رکھتے ہیں، مضافاً
 عبید اللہ البصیر کو خاص کمال حاصل ہوا ہے۔ جناب حکیم صاحب کی پہلی اہلیہ سے دو یادگار ایک لڑکا
 ایک لڑکی باقی ہیں اور دوسری زوجہ سے پانچ اولاد تین لڑکے اور دو لڑکیاں زندہ و آباد ہیں
 - تالیف کی طرف بہت کم توجہ تھی بعض کتب تاریخ دسیر کا ترجمہ کیا ہے اصحاب بدر کے حالات
 میں ایک کتاب تیار کی تھی جو اب تک شائع نہ ہو سکی، فارسی، اردو کی نظموں کا بہت بڑا ذخیرہ
 چھوڑ گئے جن کی بابت کوشش ہو رہی ہے کہ یکجا جمع کر دی جائیں۔

وفات سے عرصہ قبل اطلاع دیتے تھے کہ اب میں پانچ چھ ماہ کا بہان ہوں، اور ایسا
 ہی ہوا۔ گذشتہ سال ذوالقعدہ ۱۳۸۷ء میں بی بی نے عبداللہ میاں کی والدہ کو بلا لیا تو ان کو
 فرمایا ”بیٹا میں چاہتا تھا تم یہاں رہو، تو مولوی میاں میری وفات کے وقت یہاں آجائیں
 گے، اور میری نماز جنازہ پڑھائیں گے، گماب تم ہانتی ہو اللہ حافظ! اشار اللہ شہر کے میدان میں
 ملیں گے۔ میں اب پانچ چھ ماہ کا بہان ہوں“ ایسا ہی ہوا۔ ۲۹ ربیع الآخر ۱۳۸۷ء اتوار
 کے روز عصر کے وقت دار فانی سے دار باقی کی طرف رحلت کر گئے اور ام عبداللہ بیاری
 کی وجہ سے ٹونک دیپنچ سکیں، اللہ وانا الیہ راجعون۔

وفات سے قبل خود اپنی تاریخ اس طرح لکھ گئے، گویا غیب سے اطلاع مل چکی تھی، اور
 اور اس کا پورا یقین ہو چکا تھا۔

تاریخ ہے سہری میری رحلت کی بجائے بھوہاے اللہ و لکھ و کیونچیا (بجائے تھیں)
 ایک مصوری دما نیسیا بیچو پراں اک اور ہے۔ ر بی باد بیچو پراں بجا
 علی خیز کے قطعہ پر فارسی میں یہ قطعہ بھی لکھوایا ملاحظہ ہو۔

بود این باب یارب قطعہ از روضہ فضاں
سعدتہ ہشتاد سالہ آرسید اینجا
مشتوق قرب مولیٰ از فلق دارہ می گشتم
سرم بآستان بارگاہ دورید اینجا

قطعہ تاریخ وفات از جناب مولوی حکیم نایب الرحمن صاحب سہ انتہوی علی
طبع سہا ز کثرت رنج و ملال و غم
تاریخ انتقال بگو ششم سر و ش گفت

قطعہ تاریخ وفات از صاحبزادہ بیرون

تمی جو تاریخ ولادت مصد فیض دلی
نام فیض: اس کا پایا عیسوی سال وفات
تھاربع الثانی اور تاریخ تمی اتھیسویس
یک ہزار و سہ صد و پنجاہ سن ہجری تھے او
اس سنہ ہجری میں تھانیر میں تھا بینام
دفتر فیض و سخا کا ست گیا عالم ہونام
چھپ گیا زیر زمین وہ علم کا ماہ تمام
روز کشیدہ تھا وقت عصر جب آیا پیام

بیداری کا انعام

(۱)

بھینامانی اللہ کے نام پر! یہ تھی وہ آواز جو فضا پر رات کی تاریکی مسلط ہوئی، ”گلی تمام جان مکے ایک بند مکان کی ڈیوڑھی پر محمود کے منہ سے پہلی مرتبہ نکلی، جب اس کی جھوک اور ضمیر میں زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ جھوک کا تقاضہ تھا کہ جس طرح بھی میرا آئے۔“ تنور شکم کو پرکڑ، غیرت کہتی تھی کہ دوسرے کے آگے دست سوال دراز کرنے کے مقابلے میں مر جانا بہتر ہے۔ آخر پیٹ کی آگ کے شعلوں نے دامن غیرت کو داغدار کر دیا۔ اور محمود اندھیری رات کا سیاہ نقاب چہرے پر ڈال کر ایک شاندار مکان کے سامنے سے گذرا جس کے برآمدے میں چند خوش باش احباب اپنے لمحاتِ وصیت سے اطمینان کے ساتھ فائدہ اٹھا رہے تھے۔

درمیان میں خوبصورت بھنوی میسر ٹرپی ہوئی تھی جس کے چاروں طرف کرسیاں بھی بچنی تھیں۔ میسر پر ”سوڈا واٹر“ کی چند بوتلیں اور بادوہ تاب سے بھرے ہوئے متعدد کالج کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ حقہ کی سلسل صدائیں دروازوں کی چوٹوں کو چیر کر سڑک پہاڑ ہی تھیں اور بجلی کے قہقہے اپنی پروں شاعروں سے راستے کو روشن کر رہے تھے۔ محمود آہستہ آہستہ برآمدے کے سامنے آیا، اس نے یہ خطرہ دیکھا اور اپنی گزشتہ زندگی پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر سر سے پیرنگ روگیا۔ . . . کاش نوجوانوں کا بے پردہ گردہ جو آئندہ چل کر سیکڑوں نفوس کی بربادی کا باعث ہو گا۔ مجھے دیکھ کر عبرت حاصل کرتا اور مجتاز زہر کے یہ خوش رنگ پیالے انسان کو دنیا میں کسی کام کا نہیں رکھتے۔

اس نے چاہا کہ ان کا اپنی شکستہ حالی پر توجہ کرے اس کے بچوں میں حرکت کے آثار

بیدار ہوئے۔ زبان نے جنبش کرنے کا ارادہ کیا لیکن الفاظ نے ساتھ نہ دیا اور اس کا وہ سوال جو حیات کے خون کو کھولتا ہوا لب تک آنا چاہتا تھا دل کا دل میں رو گیا۔ وہ تیزی سے چلنے لگا اور غلبت کے ساتھ پیاس ساتھ قدم چلنے کے بعد چڑھت کر کے وہ ایک دروازے پر گرکا اور چاہتا کہ سوال کرے لیکن خاندانی وجوہات، پاپا کی عزت و شہت نے اس کے دامن کو جھٹکا دے کر کہا۔ محو کیا محض ایک روٹی کے لئے اتنا سہجے کے چند سوال کے معاوضے میں اپنی خاندانی نام و نمود کو فروخت کرے۔

ماہیت نہی گناہ کو بھی ثواب کر دیتی ہے لیکن۔
کے تمام آلام کا بہترین علاج ہے۔ مگر زندگی

میں اس کو اپنے ہی ہاتھوں تباہ کر دوں۔ دوست۔
جی گزریا جو خطرہ بار بار پیش آتا ہے انسان اس کا خوف مٹ جاتا ہے۔ اور پھر وہ اس سے کوئی اندیشہ محسوس نہیں کرتا۔ محمود کے سامنے دو مرتبہ غیرت و ضرورت کی کشمکش ہو چکی تھی ضرورت بڑھ رہی تھی اور غیرت اسی اعتبار سے مغلوب ہو کر کمزور ہو رہی تھی جس طرح آگ کی معمولی سی چٹکاری پر بہت سی لکڑیاں ڈال دی جاتی ہیں اور وہ ان کے وزن سے دب کر خود ہی بجھ جاتی ہے۔ اسی طرح ضرورت کے بوجھ سے محمود کی غیرت دب گئی تھی اب اس میں تاب نہ تھی کہ وہ ضرورت کے مقابلے میں صف آرا رہ سکے۔

محمود پھر ایک دروازے پر گرکا اور ڈیوڑھی میں منہ ڈال کر پوری قوت سے آواز بلند کی
”تھینا مائی اللہ کے نام پر!“

مگر میں سے آدمیوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں بہنوں کی جھنجھار محمود کے کانوں میں پیام اسید پہنچا رہی تھی مگر اس کی پہلی صدا بیکار ثابت ہوئی اس نے چاہا کہ اب اس دروازے کو چھوڑ کر آگے بڑھ جائے لیکن پھر بھی اسی ناگوار فرض کو انجام دینا تھا پھر ہیں کیوں نہ اس کی تکمیل کر لی جائے۔ اس نے پھر اپنے لیے میں سلطانہ لوج پیدا کر کے دہی ”ٹھہرے طلب“

بلند کی چونکہ اس مرتبہ وہ ذرا دلیر بھی ہو گیا تھا، غیرت کا نشہ پہلی آمادہ کے بعد کچھ کم ہو چکا تھا اس لئے اس مرتبہ اس کے مطلق نے خوب کام دیا، اگرچہ آواز میں فن سوال کی پوری ہمارے زمین سے نہیں۔ وہ سوال کرنے کے بعد تھوڑی دیر تک منتظر رہا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس نے بہت کدے کیسری مرتبہ پوری قوت سے اسی سوال کو دہرایا مگر اس کا جواب پھر نہایت تلخ اور دل شکن تھا اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا تھلو۔ آگے بڑھو کیوں کان کھاتے ہو!

محمود کی غیرت و محبت پر یہ ایسی کاری ضرب تھی کہ اگر امید اس کا ساتھ نہ دیتی تو وہ اس سے زیادہ بے غیرتی پر آمادہ نہ ہو سکتا۔ دروازے کی سیڑھیوں کو طے کر کے سر تک پہنچا اور اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ اب کیا کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ اس کے داغ میں یہ بات آئی کہ دنیا میں جہاں تنگ نظر اور کم ظرف لوگوں کی کثرت ہو وہاں ارباب خیر اور صاحبان بہت کی بھی کمی نہیں، بدستی سے بچے پہلی مرتبہ نہایت ناپاک نفوس سے واسطہ پڑا کہ انھوں نے مجھے عام ساتلوں کی طرح جھڑک دیا اور ان کے بے درد و غلوب میری درد بھری آواز سے متاثر نہ ہوئے جو بہت حد تک میری قلبی کشش اور دماغی کوفت کی آئینہ دار تھی لیکن بہت ممکن ہے کہ آئندہ اس کی تلافی ہو جائے۔ جب یہ حرکت کی ہو تو مقصد حاصل ہونے سے پہلے اس کو چھوڑ دینا افسوس نہیں، پھر بھوک بھی دقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھی اور اب یہ عالم تھا کہ سنت گرننگی سے پاؤں اٹھانا بھی مشکل تھا۔

جہاں تک اس کے پیروں کی قوت نے مجازت دی وہ چلتا رہا دس پندرہ منٹ گزر جانے پر وہ ایک موٹر پر کھڑا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ قریب کے دروازے میں کسی شخص کے داخل ہونے کی آہٹ ہوئی وہ اس دروازے کے پاس پہنچا اور اس نے پھر ایک مرتبہ وہی آواز بلند کی، تقریباً دس منٹ کے بعد ادھیڑ عمر کا ایک آدمی جس کے چہرے سے شرافت و نرم دلی نمایاں تھی ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں گرم گرم پلاؤ کی پلیٹ لئے ہوئے باہر آیا اس نے سر سے پیر تک محمود کو دیکھا اور ایک خاص شفقت کے ساتھ پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے

گھا۔ یہ اس کو یہیں بیٹھ کر کھا لو۔

محمود کا سر جکڑانے لگا۔ اس کا داغ مغل ہو گیا۔ سارے بدن میں آگ سی جلتی ہوئی معلوم ہونے لگی اور اسی حالت میں اس کا ہاتھ پہلی !۔ اس کھانے کو لینے کی غرض سے اٹھا جو دو گھنٹے کی گدگداری کے بعد حاصل ہوا تھا اگرچہ اس کا ضمیر اب بھی اس نزدیکی پر ملامت کر رہا تھا۔ مگر اس وقت اس نعمت غیر مترقبہ کو ٹھکرا دینا دیا ہی تھا جیسے گلا کٹ جانے کے بعد جینے کی آرزو کرنا اس واسطے چارو ناچار اس نے رکابی لے لی اور کھانا شروع کر دیا۔ یار دلت کا فاقہ اور اس پر مزید پلاؤ کے بڑے بڑے تھے۔

ہو گئی۔ صاحب خانہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر اس کے حواس پریشان ہو گئے۔

محمود کی گردن ڈھیلی ہو کر ایک طرف کو لٹک رہی تھی۔

تو اس کے گر جانے میں کوئی شک نہیں۔

ارے کیا تم بیمار تھے! صاحب خانہ نے نبض پر ہاتھ رکھا، کمزوری پہرے ہی سے ظاہر تھی۔ چہرہ ہوشی میں نبض کا ساقط ہو جانا کوئی تعجب خیز امر نہ تھا، ذرا اسی دیر میں محمود کے چاروں طرف گھر کے آدمیوں کا ہجوم ہو گیا۔ کوئی منہ پر پانی کے جھینٹا مار رہا تھا، کوئی چائے کی پیالی لئے کھڑا تھا کسی کے ہاتھ میں نکلتا تھا کوئی شازہ جھنجھوڑ کر اُسے ہوشیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب کو یہی خیال تھا کہ اس طرح ان کے دروازے پر دم توڑ دینا قیامت سے کم نہیں۔

معلوم کیا الزام لگایا جائے۔

محمود کے منہ سے نجف سی آواز نکلی۔ ”پانی“ — فوراً پانی حلق میں ڈال لیا۔ خدا خدا کر کے محمود اٹھ کر بیٹھا، اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

صاحب خانہ کے سخت اصرار پر اس نے صرف اتنا کہا کہ میں چارو دقت کا بھوکا ہوں اس سے زیادہ اپنا کوئی حال ظاہر نہیں کیا۔ یہ معلوم ہو جانے پر کہ محمود کی عشی نتیجہ تھی سخت بھوک میں

دفعہ قتلِ غذا کے سلسلے میں پہنچ جانے کا۔ اس کے واسطے چائے اور اٹھوں کا انعام کیا گیا۔

(۲)

میرٹھ کے مشہور رئیس اور ممتاز دولتمند ”قاضی اشفاق حسین“ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، ان کی پاک طہنتی، ان کا بے ریا اخلاق، اور ان کی مخلصانہ قومی خدمات ایسی نہ تھیں کہ ہندوستان کا کوئی آدمی ان کے نام کے ساتھ لفظ ”مولانا“ کا اضافہ نہ کرتا ہو۔ وہ شہر کے سب سے بڑے تاجر اور سربراہ اور وہ بزرگ تھے۔ ان کا مالیشان محل شاہ پیر دروازے میں مرج امام تھا۔ روزانہ شام کے وقت ان کے دروازے پر سالوں کا ہجوم ہوتا اور قاضی اشفاق حسین اپنی نورانی داڑھی میں گنگھا کرتے ہوئے گھر سے برآمد ہوتے، ہر طرف سے دیکھا کا شور پیدا ہوتا اور ہر ضرورت مند قاضی صاحب کی فیاضی سے فائز المرام ہو کر واپس جاتا۔ عام طور پر مشہور تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا نصف حصہ غریب تقسیم کر دیتے ہیں ممکن ہے کہ اس میں تھوڑا بہت مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے سینے میں ایک ایسا درد مند تھا جو انہائے غصے کی غیبت و افلاس اور بیکسی و بیچارگی پر ہر وقت تڑپتا رہتا تھا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ نہایت خیر کریم انفس اور پاک نصلت آدمی تھے۔

قاضی اشفاق حسین کے بہت بچے تھے کوئی اولاد نہ ہوئی اور دولتمند ہو کر بھی وہ اگر کسی چیز کے لئے بے چین رہتے تھے تو صرف اولاد کے لئے ان کے احباب نے ان کو شورہ دیا کہ وہ عقد ثانی کر کے اپنے دامن آرزو کو گوہر مقصود سے پر کر لیں لیکن بیوی سے انھیں غیر معمولی محبت تھی وہ ہرگز یہ نہ چاہتے تھے کہ اپنی وہ سالہ رفیق زندگی کو صدمہ پہنچا کر اپنی تنہا حاصل کریں وہ اس قسم کے شوروں پر باوجود یہ نطیق اور محلِ مزاج ہونے کے بھی جی نہیں ہوئے بلکہ نہ رہتے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ اولاد کی آرزو اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب دوسری شادی کی جائے تو وہ چہرہ پر غصے کے آثار نمایاں کر کے کہتے، یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ میں اپنا دل خوش کرنے کی غرض سے اس غریب و ایک دائمی اذیت میں مبتلا کر دوں جو میری ذات پر سب

سے زیادہ اعتماد رکھتی ہو اور پھر اس کی کیا ضمانت ہو کہ عقد ثانی کے بعد میں صاحب اولاد ہو گا
اگر اس وقت بھی قیمت نے ساتھ نہ دیا تو میرے لئے تو دنیا بھنم ہو جائے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ قاضی صاحب میں جلد اوصاف انسانی بدرجہ کمال موجود تھے اور سب
خوبیوں کے ساتھ قدرت نے انہیں مستقل فراہمی بھی غصب کی عطا فرمائی تھی اگر ان کی جگہ کوئی دوسرا
شخص ہوتا تو اس کا متزلزل ہو جانا یقینی تھا لیکن یہ قاضی صاحب ہی کا دل گردہ تھا کہ انھوں نے
اس طرف ذرا توجہ نہ کی اور موجودہ بیوی کے ساتھ اپنے بچہ پالان و قیام کو کبھی سست نہ ہونے دیا۔

دنیا میں صرف استقلال ایسی چیز ہے
اگر کوئی شخص حقیقی سسر نہیں حاصل کرنا چاہتا ہو تو
کا اصول زندگی ہی یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں

زندگی میں اکامی سے وہ ہمیشہ ناواقف رہے۔ چنانچہ اس

ساتھ دیا۔ اور شادی کے پورے چودہ سال بعد ان کی بیوی کے بطن سے ایک نہایت خوبصورت
اور تندرست بچہ پیدا ہوا جس کو ”محمود حسن“ کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اگرچہ قاضی صاحب نے محمود کی تربیت میں نہایت بیدار غرضی اور احتیاط سے کام لیا اور
اور اس میں شک نہیں کہ اگر ان کا سایہ محمود کے سر سے نہ اٹھتا تو وہ دنیا میں بہترین اوصاف
کا انسان ہوتا لیکن خدا کو منظور نہ تھا کہ محمود کی زندگی ”حیات پدر“ کا جواب ہو اور اس طرح ایک
بے نظیر چیز کی مثال اس کی قیمت کو کم کر دے۔

محمود ابھی آٹھ سال ہی کا تھا کہ قاضی صاحب کا انتقال ہو گیا، اولاد سب سے زیادہ
جس عمر میں اس باپ کے اتناغ کی محتاج ہوتی ہے حقیقتاً وہ یہی عمر ہے اس عمر میں بچے کے
اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے اور اس کا سنگ بنیاد ماں باپ ہی کے ہاتھ سے رکھا جاتا ہے اگر بنیاد
کو کافی مستحکم نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ عمارت پائدار نہ ہو گی جس طرح باغ کا سرسبز پودا جس کی جڑیں زمین
میں اچھی طرح پیوست نہیں ہوں گی اور جو اپنی غذا جذب کرنے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا، مالی

کی مولیٰ سی فخلت سز شک ہو جا ہو۔ اسی طرح ایک ہونہار بچہ کی اخلاقی حیثیت بالکل تباہ ہو جاتی ہے اگر اس کی ابتدائی تربیت پر کافی توجہ نہ کی جائے۔

قاضی صاحب کے مرتے ہی ان کے گھر کا رنگ بدل گیا۔ گھر میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان کی مسند پر بیٹھا اور ان کا صحیح بائین ہوتا۔ اس لئے محمود کی ماں نے اپنے بھائی کے لڑکے "بشیر حسن" کو بلا کر اپنے یہاں رکھ لیا اور کاروبار کی نگرانی اس کے سپرد کر دی۔

بشیر بھی نوجوان تھلا گھر اس کی تعلیم بہت اعلیٰ تھی تاہم جس اہلیت کا آدمی اس کام کے واسطے چاہیے ہو سکتا تھا وہ قریب قریب اس میں موجود تھی اس لئے آتے ہی تمام کاروبار تجارت پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اور نہایت دانشمندی سے جملہ امور کی نگرانی کرتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمدنی میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی بلکہ بحیثیت مجموعی بشیر کی موجودگی سے قاضی صاحب کی تجارت کو فروغ ہو گیا۔

قاضی صاحب زیادہ تر چڑے کی تجارت کرتے تھے، چڑے کی شناخت اور اس کی خرید و فروخت میں بشیر کو پہلے سے کافی مہارت حاصل تھی چنانچہ میرٹھ ایسے شہر میں جہاں یہ کاروبار کسی فن کے نقطہ نگاہ سے نہیں کیا جاتا۔ بشیر بہت زیادہ کامیاب ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ بشیر قاضی صاحب کی تہذیبی حیثیت کے لحاظ سے ان کا بہترین جانشین تھا لیکن دوسرے اوصاف اس میں بالکل مفقود تھے۔

خصوصاً محمود کی تربیت سے وہ مجرمانہ تقاضا روا رکھتا تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بشیر نے شروع ہی سے محمود کو ایک زبردست حریف سمجھا اس لئے ابتدا ہی سے یہ انتظام کیا کہ اس کی دماغی قابلیتوں پر جہات کا پردہ چڑ جائے تاکہ وہ جوان ہو کر بھی بشیر سے بے نیاز نہ ہو چنانچہ اس نے محمود کو لہو و لعب میں مشغول کر دیا۔ ٹیبلٹ، سینما رقص و سرود کی طرف اسے متوجہ کیا۔ یہ چیزیں محمود کے لئے بے انتہا جاذب و کشش کا سامان رکھتی تھیں، اس کی نگاہوں میں یہ قوت نہ تھی کہ وہ ان کے تاریک پہلو تک پہنچ سکیں۔ وہ صرف ظاہری سطح کو دیکھتا تھا جو ایک زبردست قوت تغیر کی حامل تھی۔

تھوڑے ہی دنوں میں محمود میرٹھ کی ادبائش جماعت کا ایک سرگرم رکن بن گیا۔ اس کی ماں نے بہت کوشش کی کہ محمود کی اصلاح ہو جائے۔ لیکن اس کی ہر کوشش بشیر کی مائید و

اہلو کی محتاج تھی اور اس کا یہ عالم تھا کہ وہ دانستہ اس معاملہ خاص میں کوتاہی کرتا تھا اور
 محمود کی گم کردہ راہی کو اپنے لئے نشان منزل سمجھتا تھا۔ محمود کی ماں جب زیادہ پریشان ہوئی
 تو وہ کہہ دیتا کہ محمود قاضی صاحب کی تنہا نشانی ہے۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں اس پر سختی کروں۔
 اور تکلیف پہنچا کر اس کے اخلاق کو درست کروں۔ یہ وہ بہتہ تھا جو خصوصاً عورت پر ایک عورت کے
 جذبات محبت کو برا نگہتہ کرنے کی غرض سے استعمال کیا جاتا تھا اور اس کی کامیابی یقینی تھی۔
 تمام کاروبار پر بشیر عادی تھا۔ محمود کو بیٹے کے لئے ایک عرصہ تک یہی خیال رہا کہ

تمہی جو اس کے دھچپ مشاغل کے لئے کانٹا

مول لیتا اس نے اس طرف کبھی توجہ ہی نہ

محمود کی غم کے ساتھ ساتھ بشیر کی حرص

اس کے لئے مایوسی و نامرادی کا وہ پیام لا رہا ہے جو ایک دن اس کو وہ ہمت نہ ملی اس سے
 مسند سے نیچے اتار دے گا۔ اگرچہ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ محمود کو اتنا ہوش کبھی نہ آئے گا کہ وہ اس
 کی عیارانہ چالوں سے آگاہ ہو۔ لیکن یہ بھی مقتضائے عقل و دانش کے خلاف تھا کہ بشیر محض اسی
 خیال کی بنا پر اپنے مستقبل سے غافل رہے۔

بشیر نے ددریانی کے لحاظ سے اپنا سرمایہ محفوظ کرنا شروع کیا۔ تمام نقد روپیہ اس کی
 تحویل میں رہتا تھا اور پہلے میں دو چار ہزار کی رقم الگ کر لینا کوئی مشکل کام نہ تھا، بشیر کی طبع
 اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس نے اعتدال سے کام لینا بھی چھوڑ دیا اور وہ بڑی بڑی رقموں پر غاصباً
 لگا ہیں ڈالنے لگا جس کا انجام یہ ہوا کہ سرمایہ کم ہونے لگا جس کے باعث تجارت میں بھی اخطا
 کے آثار نمایاں ہوئے۔ رفتہ رفتہ بشیر کی تجارت باطل گر گئی اور وہ اپنی ساکھ قائم نہ رکھ سکا بعض
 مطالبوں میں قاضی صاحب کے چند مکانات بھی قرق ہو گئے۔ آخر میں مجبوراً بشیر نے ایک دلوٹے
 کی حیثیت سے اپنا کاروبار بند کر دیا۔ اب وقت آگیا تھا کہ بشیر اپنا دامن بچا کر محمود سے جدا ہو جا
 چنانچہ اس نے محمود کی ماں سے کہا کہ یہ کام اب میرے ہاں کا نہیں جب تک ہو سکا میں نے

آپ کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی۔ اب میں قطعاً مجبور ہوں، روپیہ میرے پاس باقی نہیں بچا، مگر ہر طرف سے بھروسہ کر رہے ہیں۔ دوکان کو بند ہونے آج ایک ہفتہ ہو گیا۔ میں کسی صورت میں آپ کے یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ میری رائے میں آپ کے پاس جس قدر نقد سرمایہ ہو اس کو محفوظ کر لیجئے اور غیر متعلقہ جائیداد کو فروخت کر کے قرض ادا کرنے کی تدبیر کیجئے۔ اس بعد جو کچھ بچے اس کو اپنے مصارف اور گزاراوقات کی غرض سے اپنے قبضے میں رکھئے تاکہ محمود کو اس پر دست برداری کا موقع نہ ملے۔

محمود کی شادی ہو چکی تھی، مگر اس سے اس کی زندگی میں کوئی خوشگوار انقلاب نہ ہوا تھا۔ بلکہ ناپاک صحبتوں کے اثر سے وہ ”بادشاہ“ کے برعکس کو بھی سرمایہ تصور کرنے لگتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کی فضول خچیاں حد سے تجاوز ہو چکی تھیں، آتش سیال کی پرستش کے واسطے جس ماحول کی ضرورت ہو وہ محمود نے پیدا کر لیا تھا۔ اس کے گھر میں ہر وقت ایک ہنگامہ قرض و سرود اور محشر تاؤ و نوش پارتا تھا اس کی ماں نے بہت سہی کی کہ محمود کے سر سے یہ سودا بھل جائے اور وہ اس خطرناک وادی سے نکل کر منزل حیات کے جادہ مستقیم پر گامزن ہو لیکن جس دماغ میں بیابان کا مفہوم ”چشتانِ عشرت“ اور بربادی کا ترجمہ نشاطِ زندگی ہو اس پر کہ جنون و جہالت کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔ اگرچہ وہ غریب اپنے مقصد اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن اپنی جان اس نے اس کے نذر کر دی۔

ماں کے مرنے پر گھر کے سب اختیارات محمود کو حاصل ہو گئے۔ اس کی بیوی ”ربیعہ“ میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ شوہر کی بکروی پر زبان اعتراض دراز کر سکے۔ اس کو اب نہ عظمت کی تلخ گفتاریوں کا اندیشہ تھا نہ اصحابِ بھرتیوں کا خوف۔ وہ گھر میں بھی آزاد تھا باہر بھی آزاد۔ ربیعہ چونکہ باقی تہارہ گئی تھی اس کی ٹھکانہ ساس باقی نہ تھی کہ اپنی منصفانہ باتوں سے اس کا غم غلط کرتی رہے اس لئے وہ محمود سے اجازت لے کر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی۔ جو پنجاب میں کسی جگہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ ربیعہ کے جاتے ہی محمود اور زیادہ بے لگام ہو گیا اگرچہ

اس پر بیلاہر ربیعہ کا کوئی اثر نہ تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں وہ صحن چیزوں کو خاص اس کی ملک سمجھتا تھا۔ اب ان سب پر وہ قابض ہو گیا۔ اس میں کچھ چیزیں ایسی تھیں جو اس کے مقصد میں خاص طور پر مفید ثابت ہوئیں، رفتہ رفتہ وہ وقت آیا کہ محمود نے باپ دادا کی ہر چیز کو فریادگار عیش پر عینیت چڑھا دیا۔ پہلے غیر منقولہ جائداد، پھر گھر کا قیمتی اسباب، اس کے بعد سکونتی مکان، اور سب سے آخر میں محمود نے اپنی غیرت و عیت ان تباہ کاریوں کی مذہم کی۔ قلعہ کی معمولی معمولی رقمیں جو اس نے شراب کے خالی پیالے

کی نرض سے ساہوکاروں سے حاصل کی تھیں، پہنچ گئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ محمود گھر سے بے گھر

ربیعہ جس دن سے گئی تھی، محمود نے اس کو پیچھا

تھی، مگر اس کے سرشتان عیش میں ربیعہ کے واسطے کوئی گنجائش نہ تھی۔

جب محمود کی جائداد بیلاہر ہو گئی، اس کا سارا سامان فروخت ہو گیا تو اس کے حواس رت ہوئے اور آنکھیں کھل گئیں، لیکن اب سوائے منہ چھپا کر فرار ہو جانے کے کوئی چارہ کار نہ تھا، ممکن تھا کہ ربیعہ سے اس کو کچھ مدد مل جاتی، لیکن جس بیوی کو کبھی محبت کی نظر سے نہ دیکھا تھا ضرورت کے وقت اس کے سامنے ہاتھ پھیلا نا اُسے گوارا نہ تھا۔

عرصہ حیات محمود پر تنگ تھا مگر موت کو اس کے وجود سے نفرت تھی، وہ ہفتوں تک دیوانہ وار جنگلوں میں پھرتا رہا۔ مگر یہاں بھی اس کی سوزش قلب کا کوئی علاج نہ تھا، بالآخر مجبور ہو کر اس نے ترک وطن کا ارادہ کر لیا۔ اس نے دہلی کے راستے پر پیدل چلنا شروع کیا اور جس دن وہ دہلی کی آبادی میں داخل ہوا ہے دو وقت کا بھوکا تھا۔

وہ صبح چار بجے دہلی پہنچ گیا تھا یہ وہ وقت تھا جب محمود دہلی کے دوران قیام میں پارسی تھیٹر میل کمپنی میں رات بھر دل بہلانے کے بعد قیمتی موڑ میں سوار ہو کر اسپرل ہوٹل کی طرف روانہ ہوا کرتا تھا، جس شہر میں وہ پوری شان امارت کے ساتھ داخل ہونے کا عادی تھا اور جس کے آئین

چند عورتیں بیسیوں ابواب اس کے غیر مقدم کی رسم ادا کرنے جمع ہو کر تے تھے آج وہ بچے
چراغے لباس میں نہایت نیکی کے ساتھ اس میں داخل ہو رہا تھا اور کتوں کی خوشاک آوازیں اس
کے استقبال میں بلند ہو رہی تھیں۔

وہ دن بھر شہر کے کم آباد محلوں میں بھرتا رہا شام کو جو کہ اس کا برا محل ہو گیا، پوسے
چار وقت سے اس کے پیٹ میں کوئی چیز غذا کی قسم سے پہنچی تھی اس کے ہاتھ پیروں کی گیس کھینچ
رہی تھیں، معدے سے شعلے بلند ہو رہے تھے جن کی حدت سے زبان باہل سوکھ گئی تھی۔ انسان
ہر تکلیف میں تھوڑا بہت صبر کر لیتا ہے مگر جو کہ اس سے خدا پناہ میں رکھے جو زبردست سے زبردست
آدمی کو نہایت ذلیل کا رو دایوں پر آمادہ کر دیتی ہے۔

مزدوری سے محمود کو عار نہ تھا، کیونکہ اس شعلے کو وہ اپنی آئندہ زندگی کا سہارا بنا چکا
تھا لیکن اس کا وقت تھانہ طاقت! مجبوراً صرف ایک وقت کی روٹی حاصل کر لے کے اس نے
دنیا کے ذلیل ترین پیٹے ”گداگری“ پر اعتماد کیا۔

(۳)

محمود نے صاحب خانہ کے کہنے سننے پر وہ رات وہیں بسر کی لیکن یہ طے کر لیا کہ بہت جلد
کسی کو اطلاع کئے بغیر ہی چلا جاؤں گا۔ اس کا میزبان نفیات انسانی سے باخبر تھا۔ وہ محمود
کی صورت دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ آدمی شریف مگر مصیبت زدہ معلوم ہوتا ہے اب اس کی
باتیں سن کر یقین ہو گیا کہ اس کی غیرت اجادت نہیں دیتی کہ وہ دن کی روشنی میں اپنا آپ کو ایک
معمولی گداگر کی صورت میں ظاہر کرے، چنانچہ اس نے محمود کو زیادہ مجبور نہ کیا۔

محمود صبح چار بجے کے قریب بیدار ہوا تو دیکھا کہ پٹنگ کی برابر میں ایک چھوٹی سی میز رکھی
ہوئی ہے جس پر کشتی میں کھانا اور چائے رکھی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں میزبان کا شکریہ
ادا کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ چلے پر آمادہ ہوا لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب
اس نے اپنی جیب میں غیر معمولی وزن کا احساس کیا۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ پچاس روپے کا نقد

کی ایک پڑیہ میں بندھے ہوئے جیب میں پڑے ہیں۔ اب اس کا، راوہ ہوا کہ اپنے غیر مبزران کا
 فکریہ ادا کر کے یہ روپیہ اس کو واپس کر دے۔ مگر جس کاغذ میں روپیہ لپٹا ہوا تھا اس پر لکھا تھا۔
 ”امید ہے آپ یہ روپے قبول کر لیں گے اور اب تو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ
 بھی نہیں کیونکہ اتفاقاً آج میں بھی بارہ بجے شب کو رنگون، دانہ، دریا، ہل،
 اب میری روانگی کا وقت آگیا اور میں جا رہا ہوں، مگر ایک فراش کے علاوہ
 کوئی نہیں جو یہی آپ کے منہ سے کاغذ منظر کرے۔“

ہی ہے جیسے کنویں میں ڈال دیا

نہیں بھیج سکتے، ایسی حالت میں

اگرچہ محمود نے صرف ایک وقت کی۔

نیت یہ تھی کہ وہ اس پینے کا پھر کبھی نام نہ لے۔ لیکن اب یہ روپیہ بھی چارہ ناچار اس کو لینا ہی پڑا۔
 اس مکان سے نکلے ہی اس نے اپنے ارادے میں بلندی محسوس کی اور قلب میں جوش مل کا
 اٹھ اٹھو اور یا اسے نظر آیا۔ وہ پہلے تو دن نکلنے کے انتظار میں ادھر ادھر پھرتا رہا پھر بازار پہنچ کر
 اس نے چالیس روپے کے جوئے خرید کئے اور وہاں سے سیدھا اسٹیشن کیا۔ جہاں دو گھنٹے قیام
 کر کے اس نے اپنے لئے ایک معتقد زندگی اور ایک شاہ راہ عمل تجویز کی۔

چالیس روپیہ کا سرمایہ بظاہر کچھ بھی نہ تھا مگر قوی ارادہ اور ولولہ عمل ایسی چیز ہے
 جو ذرے کو پہاڑ بنا دینے کی نبردست طاقت رکھتی ہے، محمود نشہ عمل سے سرشار تھا، ارادے
 کی شراب کا خمرا اس کے دماغ میں قوت پیدا کر رہا تھا۔ اور وہ ان حالات میں کامیابی کے
 بہت قریب ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے طے کر لیا کہ میں یہاں سے لمبی جاؤں گا اور وہاں پہنچ کر اپنی تجارت کو فروغ
 دوں گا، ہر چند سرمایہ میرے پاس نہیں لیکن جو ارادے بے سرو سامانی کے عالم میں قائم کئے
 جاتے ہیں وہ اکثر کامیاب ہوتے ہیں، میں کو برگ و نوا سے فائدہ نہ اٹھا سکا، قینابے لوائی

نہیں ہے سرور سامانی مجھے اس آئے گی۔

بیسویں میں ایک ہفتے کے اندر ہی اس کے سب جوتے فروخت ہو گئے جس کے بعد اس کے نوے روپے حاصل ہوئے دہلی میں جس دوکان سے محمود نے جوتے خریدے تھے اس سے یہ قرضہ ہو گئی تھی کہ آئندہ اگر ضرورت ہوئی تو اسی نرخ پر وہ جس جگہ سے چاہے گا مال طلب کر سکے گا چنانچہ اس نے یہ روپیہ اس دوکان کو بھیج کر اسد مال کی کہ مال فوراً بھیج دیا جائے۔ اب اس نے بیسویں کی ایک دوکان پر یہ روپیہ پر مزدوری شروع کر دی۔ بارہ دن کے بعد جب پارسل وصول ہوا تو وہ مزدوری سے چھ روپے پیدا کر چکا تھا جس میں سے چار روپے نقد اس کی جیب میں موجود تھے۔ اس نے مزدوری برابر جاری رکھی، صرف شام کو تین چار گھنٹے کے لئے وہ کسی اچھی جگہ اپنی دوکان لے کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ اتنے وقت میں جو کچھ فروخت ہوتا تھا اس کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھتا تھا اور مزدوری کے سلسلے میں اپنے کھلنے پینے کے مصارف دے کر لے لیتا تھا۔

چونکہ بیسویں میں دہلی کے جوتوں کی یہ پہلی دوکان تھی لہذا کوئی وجہ نہ تھی کہ محمود کا یہ کاروبار اتنے بڑے شہر میں فروغ نہ پاتا۔ ایک سال کے میر پھیر میں محمود نے ہزاروں روپے پیدا کر لئے اس نے شہر کے ایک بڑے بازار میں ایک شاندار دوکان کھولی، اور اب کثرت سے دہلی کے جوتے اس کے یہاں موجود رہتے ہیں جن کو وہ ہندوستان کے باہر بھی مصر، سوڈان، افریقہ وغیرہ بھیجتا رہتا ہے، اس نے اسی کے ساتھ کپڑے کی تجارت بھی شروع کر دی ہے جس میں اس کو کافی منافع ہوتا ہے۔

اگرچہ محمود بظاہر بہت مطمئن ہے اور اس کی حیثیت اب اس قدر مضبوط ہو گئی ہے کہ اس کو اس طرف سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ ہر وقت کسی خیال میں محو رہتا ہے۔ وہ اقتصاد کی جنگ میں جتنا کامیاب ہو رہا ہے وہاں لگش میں اتنا ہی مغلوب ہوتا جا رہا ہے۔ وہ رسید کی مفارقت کو اپنے لئے نہایت تکلیف دہ خیال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انچو جینز این کا قرض ادا کرنے کی اسے سب سے زیادہ فکر ہے۔

حقیقتاً ان ہی وجوہ سے وہ ہر وقت پریشان اور مضطرب رہتا ہے بظاہر اس کو جس قدر اطمینان ہے اتنا ہی وہ دل میں بے چین ہے۔

(م)

محمود کے لئے ربیعہ کا بلایا کچھ دشوار نہ تھا، وہ اگر معمولی طور پر جی اُسے یاد کرتا تو ربیعہ اپنی عورت نہ تھی کہ محمود کی بدسلوکی کا انتقام لیتی، وہ اپنے گال کی تلخ اگر محرو کی زبان کی بے چین سے جدا ہو گئی تھی تو تروس پہاڑ بن کر داپس بھی آ سکتی تھی ہر چند پانی کی گستاخ موہیں کہ نہ لے سکتی تھی یعنی نہیں کہ وہ موجوں کے ان تھپڑوں سے نہ میں کھلتا ہے اور وہیں مرجھا کر اپنی شکل نگاہ سے نوت ہے۔

ربیعہ بھی محمود ہی کو اپنی کشتی حیات کا اندھا تھتی تھی اور محمود کی بے انتہائی کو اپنی بہت سی تعبیر کرتی تھی، لیکن محمود کے لئے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ وہ ربیعہ سے بے انتہا شرمندہ تھا۔ اُسے اس کے بلانگی جرات ہی نہ ہوتی تھی، جس زمانے میں محمود میرٹھ میں مقیم تھا اور اس کے پاس کافی سرمایہ تھا اس کو اطلاع دی گئی تھی کہ ربیعہ کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا ہے اگر دیکھ جاؤ۔ مگر اس نے ادھر کوئی توجہ نہ کی تھی، اس کے بعد بیاری کے حیلے سے بھی اُسے بلایا گیا مگر محمود نہ گیا۔

ان حالات میں اُسے بہت نہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی اُس بیوی کو جس کا قلب اس کی بے انتہائی سے مخرج ہے دعوتِ اتفاقات دے۔ مگر یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہ بیوی اور بچے کو بھول جائے۔

اس نے ابک دن ربیعہ کو اپنے تمام حالات قلمبند کر کے بھیج دئے پر بھی کچھ دیا کہیں نے شخص شرم کی وجہ سے نہیں بلایا اگر تعین باوجود میری بداملائی کے مجھ پر رحم آ سکتا ہو تو پچھلی باتوں کو ایک نصبت انسان کی بکواس اور بیار آدمی کا ہڈیاں سمجھ کر بھلا دو۔ اور خدا کے لئے میرے نور انیس کو لے کر چلی آؤ۔ میرے کاشانہ حیات کا دروازہ تھکے لئے ہر وقت کھلا ہوا ہے اور صرف تمہاری میرے گھر میں کمی ہے۔ خط لکھنے کے دسویں روز محمود کو اُسے اطلاع دی گئی کہ ربیعہ پہلی روانہ ہو چکی ہے۔ اسٹیشن پر

سوارى کا انتظام کرو۔

محمود وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی انٹرن پہنچ گیا، پنجاب ميں کے بيمى اسٹيشن پر دسکتے ہي
 ليک ادھير عمر کے آدمى نے کھرکى سے سر محال کر زور سے کہا ”مستر محمود“۔ اس آواز کى صدا
 باز گشت ابى فضا ميں گونج رہى تھی کہ محمود دوڑ کر زمانے دٲبے کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے تعجب کى
 کوئى انتہا نہ رہى جب اس نے ربيعه کے ساتھ آنے والے آدمى کو غور سے دیکر معلوم کيا کہ يہ اس کا
 وہ مخير مير بان ہے جس کے دروازے پر اس نے اپنا طویل روزہ افطار کيا تھا۔

يہ بھی ليک اتفاقى بات تھی کہ عارف نے معمولى توقف کے بعد مسکو کو پہچان ليا۔ ربيعه نے
 محمود کو دیکھتے ہی عارف کو اشارے سے بتايا کہ يہى محمود ہيں تو عارف پر سکتے کى سى کیفیت طارى
 ہو گئی، ان کے حافظے ميں محمود کى دو سال قبل کى ميت اس طرح محفوظ تھی جيسے کوئى ہوشيار حصہ
 آيسے پر تصوير بنا ديتا ہے مکن تھا کہ عارف اس کو اپنے ذہن دو مانع کا ليک مغلطہ سمجھ ليکن جب
 محمود نے بھی ان کو متعارفانہ بگھاہوں سے دیکھ کر ان کا خير مقدم کيا تو کوئى وجہ نہ تھی کہ وہ اپنے
 خيال کو غلط سمجھ۔

عارف محمود کے کاروبار کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس قدر جلد رتق کى کرنے پر انھوں
 نے بہت تحمين کى جس کا محمود نے ادب کے ساتھ شکر يہ ادا کيا اور پھر پچاس روپے کا نوٹ پیش کر کے
 عارف سے کہا کہ اب اپنا يہ عطيه واپس کر ليے۔

عارف نے کہا ميں اس معاملے ميں ربيعه کى اجازت کا پابند ہوں کيوں کہ ميں رقم سے يہ روپے
 آپ کو ديگيا تھا اس ميں ميرے علاوہ ربيعه اور ان کے بھائى بھی شريک تھے۔ ہم تينوں کے مشترک
 سرمایہ سے تجارت ہوتى تھی اور جس روز آپ کى مجھ سے ملاقات ہوئى ہے۔ اسی دن مجھے بھی
 ”نمک“ کى تجارت ميں پندرہ ہزار کا نفع ہوا تھا۔ اسی سناٹے سے ميں نے اپنى ذمہ دارى پر
 پچاس روپے نم کو ديتے تھے ليکن اب يہ روپے خيرات کى مد ميں درج ہو چکا ہے۔ ميں اس کو کسى
 طرح اپنے اختيار سے واپس نہيں لے سکتا۔ اور نہ ليک سائل کو يہ حق پہنچا کہ وہ دو سال کے بعد کسى

یہ اسے واپس کرے۔

جب ربیعہ کے سامنے یہ قصہ بیان کیا گیا تو محمود نے اس کی پوری تفصیل بھی اسے سنائی۔ جس کو سن کر ربیعہ بہت روئی، آخر میں یہ روپیہ غریبوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ اور اس طرح محمود اپنے سر سے ایک بوجھ ہلکا کرنے میں کامیاب ہوا۔

ربیعہ کے بھئی آنے کے بعد محمود نے ایک اخبار میں پڑھا کہ جنہیں ریشہ میں سکن یہ تھوڑے دنوں کا چہ بتائے گا ان کو پانچ سو روپے انعام دیا جائے گا۔

اس نے محمود نے فوراً بشیر کے ساتھ اپنی قرابت کی

سینچے دسج تھا وہ حیران تھا کہ بشیر کے ورثہ اور اعزہ کے

بعد جواب آیا کہ بشیر حسن نے ایک معقول جائیداد اپنی اولاد سے

خانہ ان ولس طاعون میں تباہ ہو گیا اس نے جستجو کی جا رہی ہے کہ اس خاندان کا کوئی فرد زندہ موجود ہو تو وقف کی آمدنی اس کے نام منتقل کی جائے ورنہ وقف عامہ میں شامل کر دی جائے گا۔

دور کے دو عزیزوں کے نام پہلے دریافت ہو چکے ہیں لیکن آپ بہت قریب کے عزیز ہیں لہذا آپ کو پانچ سو روپیہ ماہوار کے تین سو روپیہ ماہانہ ملا کر دیں گے، دو سو روپیے دوسرے اعزہ کو دے جائیں گے، بشرطیکہ انھوں نے اپنا حق قرابت ثابت کر دیا۔

چونکہ آخر میں بعض کارروائیوں سے اور اپنے خیر خواہوں کے کہنے سننے سے محمود پر پھر کی عیاریاں شکست ہو چکی تھیں اس نے اس روپے کو اس نے بشیر کا عطیہ خیال نہ کیا بلکہ ایک نیک نیت کے بعد اپنی ”بیداری کا انعام“ سمجھ کر قبول کر لیا۔

غزلیات

از حضرت جگر سمر و آبادی

کام آخر جذبہ بے اختیار آہی گیا
ہائے یہ حسن تصور کا فریب رنگ بے
دل نے اک نالہ کیا آج اس طرح دہلا
ہاں نہ لے، لے خدائے عشق تو فتنہ
جب مجھ میں نہ گئیں، اللہ ری طرح فتنہ
ہائے کا فرول کی۔ یہ کا فرخوں آگنیا
اس طرح خوش ہوں کسی نے وعدہ نہ کیا
دور سے کر دہی بدلی تھی کدلی کا گڑ

دل کچھ اس صوت سے ترپا اکو پیار آہی گیا
میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آہی گیا
بال بکھرائے کوئی ستانہ وار آہی گیا
پھر زبان بے ادب پر ذکر یار آہی گیا
دیکھا کیا ہوں، وہ جان انتظار آہی گیا
تم کو پیار آئے نہ اسے مجھ کو پیار آہی گیا
درحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آہی گیا
دفتار پر وہ اٹھا اور پردہ طار آہی گیا

جان ہی دے دی جگر نے آج ہائے یار

عمر خیر کی بقراری کو قرار آہی گیا

کس نظر سے آج وہ دیکھا کیا
حسن سے بھی دل کو بے پروا کیا
تو نے سو سو رنگ سے پروا کیا
وہ بھی نگلی اک شاعری برق حسن
لذت نا کامیابی۔ الاماں
اب نظر کو بھی نہیں دم بھر قرار
خون دل۔ خون تنہا۔ خون شوق
اُن کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی

دل مرا ڈوبا کیا اچھا کیا
کیا کیا لے عشق تو نے کیا کیا
دیکھنے والا مجھے دیکھا کیا
میں بے اپنی نظر سمجھا کیا
تو نے ہر مرد کو فردا کیا
اس نے بھی انداز طعینہ کیا
آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا
جس طرف دیکھا کیا دیکھا کیا

مجھ سے قائم ہیں جنوں کی غمتیں

میں نے صراحت کو جگر سمر کیا

تنقید و تبصرہ

کتاب:

تفصیل البیان فی مقاصد القرآن - مافی الاسلام نقشب و نگار: کامیاب مطبع

تفصیل البیان فی مقاصد القرآن | مولفہ مولوی سید ممتاز علی صاحب

مجلد، لکھائی چھپائی اعلیٰ درجے کی۔ قیمت

سٹے کا پتہ: دارالاشاعت پنجاب لاہور

اس کتاب کے اب تک چار حصے بنی ہوئے

ہر جن میں سے دو زیر طبع ہیں اور دو زیر تالیف۔

مولفہ نے اس کتاب میں قرآن کریم کی آیات کو بہ ترتیب موضوع و عنوان فراہم کیا ہے۔ اس سلسلہ پر قرآن کو اول سے پڑھا شروع کیا۔ ہر ہر آیت جس میں موضوع کے تحت میں آسکتی ہو یا جس میں موضوع کے تحت میں آنی مناسب ہو اس کے تحت میں لکھی گئی۔ جو ان موضوعوں کے تحت میں نہیں آسکی اس کے لئے ایک نیا موضوع یا عنوان قائم کیا گیا اور اس کے ذیل میں لکھی گئی۔ یہ انتخاب قرآن مجید کی ہر آیت کے متعلق کیا گیا۔ یہاں تک کہ جملہ آیات مضمون دار مرتب ہوئیں۔ اس مجموعے کی ضماوت قرآن مجید سے زیادہ ہو گئی اور ہونی بھی چاہئے تھی کیونکہ ہر آیت کم سے کم ایک بار تو ضرور کسی موضوع کے تحت میں آنی اور بہت سی آیتیں جن میں مختلف پہلوں پر مختلف عنوانوں کے تحت میں دو دو یا تین تین بار آئیں۔ یہ چاروں حصے ہم نے مطالعہ کئے۔ اس سے قبل مولوی عبید اللہ صاحب کی اقتباس الانوار اور توفیق وحید الزمان کی ترویج القرآن بھی ہماری نظر سے گزر چکی ہیں لیکن ان کے مقابلے میں یہ کتاب بہت زیادہ مفید اور کارآمد اور اپنے مقصد کو پورا کرنے والی ہے۔

درحقیقت ایک حصے سے طالبان قرآن اس ضرورت کو نہایت شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں کہ آیات قرآنی بہ ترتیب مضامین مرتب کی جائیں جس کی وجہ یہ ہو کہ قرآن کی جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں خواہ وہ عربی میں ہوں یا فارسی یا اردو میں خائف قرآنی سمجھانے سے قاطبہ قاصر ہیں کیونکہ وہ ایک ایک آیت

کی تشریح کرتی ہوئی مل جاتی ہیں اور بہت کم ان حقائق سے بحث کرتی ہیں جن کا وہ آیت ایک حصہ
 ہوتی ہو۔ صورت یہ ہے کہ قرآن میں ایک حقیقت کی تعلیم ایک آیت میں شروع ہوتی ہے دوسری جگہ
 کسی سورۃ میں اس پر کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ پھر تیسرے مقام پر کوئی استثنائاً قید یا شرط بڑھائی جاتی ہو
 پھر کہیں مکمل بات تمہ ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مسئلہ قرآن کے مختلف مقامات میں پھیلا ہوتا ہے۔ اس کی پوری
 حقیقت سمجھنے کے لئے ان جملہ آیات کو ایک جگہ فراہم کرنا ضروری ہے تاکہ مکمل حقیقت ذہن میں آ سکے۔
 اس لئے علوم قرآن تفاسیر میں نہیں ہیں بلکہ خود قرآن میں ہیں اور آیات کو آیات کے ساتھ ملانے سے وہ
 سمجھ میں آتے ہیں چنانچہ بعض لوگوں نے اسی ضرورت سے قرآنی آیات کی توبہ شروع کی جن میں
 سے اب تک سب سے بڑی اور بکار آمد کوشش یہ کتاب ہے جو زیر تنقید ہے۔ اس کا پہلا حصہ
 کتاب العقائد ہے جس میں اللہ کی ذات و صفات اور اس کے افعال کے متعلق آیات ہیں۔ دوسرا
 حصہ کتاب الاحکام ہے جس میں فقہی احکام کی آیات جمع کی گئی ہیں۔

تیسرا حصہ کتاب الرسالہ ہے جس میں قرآن اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق جملہ آیات
 فراہم کی گئی ہیں۔ چوتھے حصے میں بس کا نام کتاب المعاد ہے قیامت اور اس کے متعلقات کی آیات
 ہیں۔

کتاب میں پہلے ہر موضوع بطور عنوان کے اور لکھا گیا ہے۔ پھر اس کے تحت میں متعدد ضمنی موضوعات
 حاشیے میں قائم کی گئی ہیں۔ پھر اس کے ذیل میں آیات نقل کی گئی ہیں جن کا شمار اور سورۃ کا شمار
 نیچے دیا گیا ہے۔ اس کا حوالہ دینے کے لئے وہ قرآن درکار ہو جس میں ہر آیت کا شمار لکھا ہوا ہو۔

یہاں غنما مجھے یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اگر باب مطالعہ جو قرآن چاہتے ہیں ان کو چاہئے کہ
 آیات کے اندر ان کے شمار بھی ضرور لکھا دیا کریں۔ اُس میں ان کے لئے کوئی وقت نہیں ہے اور بڑی آسانی
 سے وہ اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں کیونکہ صرف ہندسہ ہی لکھنا تو ہے۔

مؤلف کی محنت جاننا ہی اور ان کے غلوں کی قدر کرتے ہوئے میں اس کتاب کے نقص
 اور خامیوں کی طرف بھی ایک نظر ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ کتاب ابھی زیر ترتیب ہے اور مؤلف نے
 کھامی ہے کہ احباب جو مشورہ دیں گے ان پر میں کاربند ہوں گا۔ اس لئے ممکن ہے کہ میرے مشورے کچھ
 مفید ثابت ہو سکیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مؤلف نے عنوانات کی ترتیب کسی علمی اصول پر نہیں رکھی۔ پہلے
 حصے کا نام انھوں نے کتاب العقائد رکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جملہ عقائد کے متعلق آیات

چھل گئی مگر صرف اللہ کی وجود کے اثبات اور اس کے صفات ہی پر حصہ ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا حصہ احکام فقہیہ کے متعلق شروع ہو جاتا ہے۔ پھر تیسرا حصہ کتاب الرسالۃ ہے یعنی رسول اللہ اور کتاب جو عقائد میں سے ہیں احکام کے بعد آتے ہیں علیٰ بن احوط کا حصہ معاد بھی عقائد ہی کا حصہ ہے۔ حالانکہ کاکوئی عنوان نہیں قائم کیا گیا ہے۔

پہلے حصے میں ایک باب آخر میں تھنا اور قدر کے متعلق اور دوسرے حصے میں کتاب احکام یعنی دوسرے حصے میں دہرا گیا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ذات الہی کے متعلق کوئی عنوان نہیں تھا۔ کتب و زیادہ تعلیمات موجود ہیں۔ علم جو صفات اذیلی سرخیوں میں لکھا گیا ہے اور علم غیب جو علم مطلق ہے۔ میں آیات کے استنباط کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں سب سے پہلے یہ ہے۔ ”مشرکوں کے اعمال اکارت ہیں“ اور ارتداد کے تحت میں ہے ”مومنین کے اعمال راجحان ہیں“ لیکن کفر کے تحت میں اس سرخی کو چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ آیات موجود ہیں۔ سورہ ابراہیم میں ان الذین کفروا اعلمہم کرا د الایہ سورہ نور میں ہر الذین کفروا اعلمہم کسراب الایہ معلوم نہیں یہ آیات کس ذیل میں لکھی گئی ہیں۔

تیسرے حصے میں کتب سادہ میں سے قرآن۔ تورات اور انجیل کے ذکر کے ساتھ زیور اور صحف ابراہیم وغیرہ کا بھی ذکر لازم تھا۔

شق الحمد والی آیت پیش گوئیوں میں بھی دین ہے اور علامات قیامت میں بھی۔ اسی صورت میں ایک ہی معنی کا تعین لازمی تھا۔ کوئی آیت قرآن کی دو مختلف معنوں میں لینا صحیح نہیں۔ یہی معاملہ الذین آیتنا ہم الکتاب یہ فرقہ الایہ کے متعلق کیا گیا ہے حصہ دوم صفحہ ۱۳۱ میں یہی آیت مجھے کے بارے میں ہے اور حصہ سوم صفحہ ۲ میں یہی آیت رسول کے متعلق ہے۔ حالانکہ اس کا مفہوم ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ملاہ بریں اسی معنوں کی دوسری آیت جو سورہ انعام میں ہے یعنی الذین آیتنا ہم الکتاب یہ فرقہ کیا فرقہ انما ہم الذین خسروا انفسہم فہم لایومنون۔ یہ نہ کہے کے متعلق ہے نہ رسول کے ذیل میں ہے نہ قرآن کے۔ سورہ ص کی آیت ”کتاب انزلناہ الیک مبارک لیتذکروا آیاتہ ولیتذکروا لوالیہا“ قرآن مبارک کتاب ہے کی سرخی میں درج کی گئی ہے حالانکہ اس کو مقاصد قرآن کے تحت میں بھی درج کرنا لازم تھا۔

مفسرین اللہ کی شے میں سورہ وافی کو نقل کرنا اور اس میں آیت و وجہ تک مثلاً فہی کو حذف کرنا
 نہایت مجاہدہ و تکیہ کا اس میں اللہ نے ایک حقیقت بیان کی ہے جو کسی دوسری آیت سے نہیں مل سکتی۔
 چوتھا حصہ کتاب المعاد ہے۔ اس سے پہلے عالم برزخ ہونا چاہئے تھا جس کے متعلق وہاں میں تعلیمات
 پر مبنی ہیں۔ معاد میں نفع تصور بار اول اور نفع تصور بار دوم کے الگ الگ عنوانات قائم کئے ہیں۔
 پہلے پہلے کی آیات دوسرے میں اور دوسرے کی آیات پہلے میں خلط ملط کر دی ہیں۔ نفع تصور بار اول
 میں آیت ۱۲ مبنی و اشرف الارض نور بہا و صبح کی ہو حالانکہ خود قرآن میں اس آیت کی پشانی پر
 لکھا ہوا ہے کہ یہ نفع تصور دوم کے تحت میں ہے۔ اسی طرح صفحہ ۶۶ کی ساتویں آیتیں نیز آیت ۱۲ جو نفع
 دوم میں درج ہوئی ہیں فتح اول کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسماء کہیں کہیں القیامہ کے معنی میں بھی آگیا ہے جس
 نے بہت غلطیاں کی ہیں۔ خاص کر اس وجہ سے بھی کہ اسماء کہیں کہیں القیامہ کے معنی میں بھی آگیا ہے جس
 کو وہ تیز نہیں کر سکے۔ اس لئے اس میں نہایت غائر نظر ڈال کر امتیاز کرنا چاہئے تھا۔
 یہ تقاضا اس لئے میں نے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آئندہ حصوں تیر آئندہ اشاعت میں
 ان کی اصلاح کی جائے تاکہ یہ کتاب زیادہ مفید ہو سکے۔ ورنہ اس کتاب کی خوبی اور موفی کی
 محنت کو میں نہایت قابل قدر سمجھتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اس خدمت قرآن کے صلہ میں اللہ
 ان کو دین اور دنیا دونوں میں کامیاب کرے گا۔

ما فی الاسلام | مصنف مولانا اصغر علی صاحب روحی پروفیسر و آیات و ادبیات اسلامیہ کالج لاہور۔
 تقطیع ۱۳۱۲ھ حصہ اول ضخامت ۱۱، صفحہ قیمت ۵۰ حصہ دوم ضخامت ۸۴ صفحہ قیمت ۵۰
 کھانی چھاپنی اور کاغذ معمولی۔ غالباً مصنف سے مل سکے گی۔
 مولانا روحی صاحب نے اس کتاب میں مذہب کے جملہ جہات عقائد و اعمال پر ربط و تفصیل کے تحت
 بحث کی ہے اور نہایت شستہ عبارت میں فلسفیانہ طریق پر مذہب جمہور یعنی اہل سنت کی حمایت
 کی ہے بلکہ حمایت کا حق ادا کر دیا ہے۔ چونکہ ایک مدت سے وہ عقائد و آیات اسلامی کے مسلم رہے ہیں
 اس لئے ان کی بحثیں نہایت غور و خوض اور کافی عرصے کے مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے اپنے مفقود
 ان جو یہ تعلیم یافتہ اصحاب کو رکھا ہے جو مذہب سے ناواقف کی وجہ سے اس کی تعلیمات پر اعتراض
 یا اس سے اعراض کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عقائد و مسائل کے اثبات میں فلسفیانہ استدلال
 کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جاہل اسلامی مسائل میں انہوں نے سرسید کی غلطیاں دکھائی ہیں اور بالخصوص

”بہ اعتقاد نیچہ“ کو جواب دینے کی کوشش کی ہو۔

اس سے پہلے اسی قسم کی ایک کتاب مولوی عبد القیوم صاحب دیل جانڈہ نے ”دین کامل“ کے نام سے لکھی ہو جس کے اوپر جامعہ کے صفحات میں تنقید ہو چکی ہو۔ میرا خیال یہ ہو کہ یہ طریقہ دین حق کو سمجھانے کا نظری ہو جو اس کو فلسفیانہ بحثوں میں الجھا کر بہت کچھ فکاوک پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ علماء سلف نے اس استدلالی طریق کو عقیم اور بے نتیجہ اسی وجہ سے قرار دیا ہو کہ اس سے نہ کسی مسلمان نا اہل کیا جاسکتا ہے نہ اذعان اور یقین پیدا کیا جاسکتا ہو۔ مثلاً جو کہ خود ہی اپنے ثبوت میں مولانا راجی کے پچاس صفحہ لکھا جاسکتا ہو۔

مولانا نے اس کتاب کے سرورق پر یہ آیت

خیال ہوا تھا کہ اپنی اس کتاب میں وہ غالباً قرآن کی تعلیمات بیان کیا ہیں۔ مگر پڑھ کر عوام مسلمانوں کے عقائد فلسفیانہ لباس میں جلوہ گرہ کر گئے ہیں۔ جہاں فلسفہ ساتھ چھوڑ دیا ہے وہاں بزرگوں، صوفیوں اور بالخصوص شعراء کے اقوال سے اس کی تلاقی کی جاتی ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کا حریف مخاطب ان لوگوں کو محبت تسلیم کرے۔

سوال قبر ریح اور بدن ہر دوسے پر سماع میت وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن پر علماء اور بزرگوں کے اقوال سے مولانا نے شہادتیں پیش کی ہیں۔ تبیب یہ کہ سماع میت پر حضرت عائشہ ام المومنین کے استدلال قرآنی کی انھوں نے تردید کی ہے کہ آیت میں سماع کی نفی ہے نہ کہ سماع کی حلالیت۔ اگر وہ غور کرتے تو قرآن میں بہت سی آیتیں سماع کی نفی پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً

وَأَذِّنْ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ
 جَنُّ تَوْمِ الْاَلٰہِ کے ماسوا پکارنے ہو وہ کج گوی کے جھلکے
 ان تَدْعُوہُمْ لَاسْمٰوٰہِ وَاَعَاکُمُ الْاٰیۃ
 بھی الگ نہیں ہیں اگر تم کو پکار گئے تو وہ تماری پکار نہیں سنیں گے
 اہل شرک اللہ کے اسماء جن لوگوں کو پکار گئے تھے ان میں مردہ بزرگ اولیا۔ بلکہ انبیاء وغیرہ سبھی ہیں۔
 ان کی نسبت تصریح ہو کہ وہ نہیں سنتے۔ ایسی صورت میں اگر قرآن اور حدیث میں تعارض ہے تو محفوظ ہے
 یہ کہ حدیث میں تاویل کی جائے نہ کہ قرآن میں۔

اسی طرح ایصال ثواب کے مسئلے میں بھی انھوں نے قرآن کے خلاف فیصلہ کیا ہو جو یہ تصریح کر رہا ہو کہ
 ”لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا اَسْمٰی“ اور ”ہَلْ تَحْزَنُوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ“
 ہدی کی آمد کا عقیدہ جس کا اشارہ بھی قرآن میں نہیں ہو اور جو حدیثیں اس کے متعلق ہیں وہ

پیشین اہل سنت و جماعت میں انکو نزدیک دینی ہے اور تعجب یہ کہ اس کے نسب اور نام تک ہم اہل سنت سے تسلیم کرانے پر مصر ہیں۔

تصوف کے نقوت میں بھی جس کے نام تک سے قرآن یا حدیث آشنا نہیں ہیں انھوں نے عین جزوہ صرف کئے ہیں اور اس کو اسلامی تعلیمات کی حقیقت قرار دیا ہو۔ مکافضہ کے اثبات میں سرسید پر یمن طعن کر کے بزرگوں کے اقوال سے سندیں پیش کی ہیں۔ مگر کشف تو ہر ایک ماہر فن کو اپنے فن کے متعلق ہوتا ہو۔ اس کو دین کے ساتھ کیا خصوصیت ہو۔

ان کے نزدیک ہر مسلمان کو شیخ کی بھی ضرورت ہو حالانکہ قرآن اس کو نہایت خطرناک بتاتا ہے۔
 "وان قطع اکثر من فی الارض فیضک عن سبیل اللہ" دنیا کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر تو ان کی اطاعت کو تو وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے، دوسری آیت میں تصریح اس کی ممانعت ہو۔ "اتبعوا ما نزل الیک من ربکم ولا تتبعوا من دونه اولیاء" اسی کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے اور نازل کیا گیا اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو، حقیقت یہ کہ قرآن کے ہوتے ہوئے شیخ کی تلاش کرنا بعینہ ایسا ہی ہے جیسے آفتاب کے ہوتے ہوئے چراغ ڈھونڈنا، سول پاک نے جو بیعت کی تھی وہ امامت کی حیثیت سے تھی چنانچہ ان کے بعد صحابہ کرام میں سے صرف وہی لوگ بیعت یقینے تھے جو خلافت یا امارت کا منصب رکھتے تھے۔ دیگر صحابہ سے بیعت لینا مطلقاً ثابت نہیں ہو۔ پیری او مریدی کی بیعت مسلمانوں میں اس وقت شروع ہوئی جو جب تار کے غلبہ کے بعد ان کی دینی صلاحیت فوت ہو گئی اور ارشاد و ہدایت کا منصب دنیا کمانے کا ذریعہ بن گیا۔

غرض یہ کہ جو عقائد جو اعمال اور جو رسوم مسلمانوں میں مذہب کے نام سے پھیلے ہوئے ہیں مولانا رومی نے اپنے فلسفے میں ان کی حمایت کی کوشش کی ہو۔ اور مخالفین کو نہایت سخت جملہ بعض مقامات پر سخت لہجے میں مخاطب فرمایا ہے۔

حقیقت یہ کہ قرآن کریم نے پانچ ہی اجزاء ایمان قرار دئے ہیں۔ اللہ۔ رسول۔ ملائکہ۔ کتاب اور یوم آخران کے سوا کوئی چٹا عقیدہ قرآن میں نہیں۔ مسلمانوں نے ان کے اوپر سیکڑوں عقائد اضافہ کئے بلکہ نتیجہ سوائے ہلاکت اور غضب الہی کے اور کچھ نہ ہوا۔ کیونکہ یہ سب الگ الگ فرقوں کے خیالات تھے جن سے امت کی وحدت فنا ہو گئی۔ تعجب ہو اگر مولانا روحی جیسا شخص بھی اسی سے عبرت نہ لے اور اسی گیر کا فقیر بنا رہے جو ترکستان کو بجاتی ہے۔

تشریح و تفسیر | جناب جلیل احمد صاحب جلیل قندہاری کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ - حجم ۲۴ صفحہ - قطع ۱۰/۱۱
کھانی اور سطر سجدے کی چھاپنی اور کاغذ عمدہ - مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس - قیمت ۷۰ - مصنف سے کاغذ اناؤ
کے پتے سے مل سکتی ہے۔

اردو داں پبلک جلیل قندہاری صاحب سے فائدہ بخاک کی حیثیت سے واقف ہے۔ ان کی چند متفرق نظمیں بھی اردو کے ممتاز رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان کی نظموں کا مجموعہ اس تک نہیں چھپا تھا اس لئے ان کے شاعرانہ جوہر لوگوں پر اچھی طرح نہیں آتے تھے۔ اس مجلے کے پڑھ کر اہل ذوق کو بیدار ہوگی کہ نئی نسل میں ایک ایسا شاعر موجود ہے جس کی زبان میں سہرت کی زبان کی قساوت اور شادابی اور خیالات میں وہ درد اور آواز ہے جو غزل کی جان ہے۔

کتاب کے ساتھ حضرت احسن مارہروی کا لفظی کالج علی گڑھ کا مقدمہ بھی ہے جس میں جلیل صاحب نے پڑھ کر اس کلام کا نصف دو بالا ہو جاتا ہے۔ ہم نمونے کے طور پر چند اشعار درج کرتے ہیں جنہیں انتخاب نے چھانا ہے۔

باغ میں چاندنی چھپ سکتی ہے
آکھ بے اختیار روتی ہے
بے قرار ہی ہمارے دل کی حیف
نام عشاق کا ڈبوتی ہے

فکر پوشیدگی راز میں ہیں دیوانے
سی رہا ہے کوئی دامن تو گریباں کوئی

خوشی کے چند دن تھے جو خوشی میں کٹ گئی لیکن
حیات غم حیات جاوداں معلوم ہوتی ہے
بھرے آتے ہیں آنسوؤں کے حال گریہ بیل
ارے دل! یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے

مست چلے ہیں دل سے کچھ کچھ داغ ہائے آرزو
پھر چپک اٹھیں نہ اس ظالم کو ہنسا دیکھ کر

جلوہ دکھلاتی ہے اپنا زیر دامن سماں
نوع و سبب برق یعنی دختر ابر بہار
آج ہوتی ہو دل میں ایک خلش
آج کھلتا ہے راز راحت کا

کیسا دیرانہ ، کیسی آبادی ؟ اقتصاد اور کچھ ہے وقت کا
 عمر ساری طالی میں گزری اللہ اللہ فریب رامت کا
 لیکن ہے وجہ راحت دل لیکن کا اعتبار کب تک
 دل مرحوم کی اٹھان کی شان ہائے اس ہو دہار کی باتیں

ڈرایا اس قدر طوفان بحر زندگی گانی نے کہ ہم ساحل کو بھی موج لب ساحل بھجوا دیں
 بیویوں نے پیہم دل سرود کر دیا ہے اب آرزو کے بدلے اک داغ آرزو پر
 منزل کا ہوش کچھ ہے نہ ہے راہ کی خبر لے جائے کس طرف دل دیوانہ دیکھئے
 ایک نظم ”برکھارت“ کے چند اشعار۔

باغ میں پریاں جھول رہی ہیں حسن پر اپنے پھول رہی ہیں
 دھانی ساڑھی اونچا دامن ترجمہ نظریں شیکھی چتون
 بنیں ریلے جب متوالی ہنسی انوکھی بات نرالی
 سرے وہ انجیل کا وصل جانا مٹا کر وہ سر کو جھکانا

کامیاب مطالعہ | از سید عیسیٰ صاحب ایم اے ، بی ٹی لکچرر رزیننگ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ، جم پٹنہ
 قیمت ۱۲ روپے کا پتہ میران منزل ، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ یا مکتبہ جامعہ علیہ - قرو باغ - دہلی۔

اس ریلے میں مصنف نے جو اسکول کیمپڈ اسٹراور ڈھنگ کالج کے لکچرر کی حیثیت سے طالب علموں
 اور معلموں دونوں کی تعلیم کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ مطالعے کے نقیاتی اصولوں کو بہت سلیس و مختصر
 زبان اور دلنشین انداز میں بھجایا اور ایسے کرتا ہے ہیں جن سے کام لے کر طالب علم کم سے کم محنت کا
 زیادہ سے زیادہ نتیجہ حاصل کر سکتا ہو۔ ہندوستانی طالب علم کو طلب علم میں بہت بڑے طریقے سے
 محنت کرتے ہیں۔ سارا بار حافطے پر ڈال دیتے ہیں اور وہ بھی اس طرح سے کہ نفسی قوانین کی ضروری خلاف
 ورزی ہوتی ہو۔ حافطے کا ٹھکانا آڑی سوار کے ہاتھ سے لگام کے جھٹکے اور چابک کھاتے کھاتے انٹارٹیل
 چلے ہو کہ کسی طرح نہیں چلتا۔ اس کتاب کے مطالعے سے طالب علموں کو اس مرکب پر پورا قابو حاصل ہو سکتا ہو
 اور وہ ایک اشارے سے جدھر جائیں موڑ سکتے ہیں۔ ہم ذیل میں اس کی فہرست درج کرتے ہیں جن کو
 کتاب کے مضامین کا پورا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) طالب علم کی حیاتی صحت (۲) مطالعے کے ٹیپکال روئے کا تعین (۳) مطالعے کی مختلف قسمیں۔
 (۴) مطالعے کو کامیاب بنانے کے طریقے (۵) حافظہ اور اس کی ترتیب (۶) حفظ کرنے کے صحیح طریقے (۷) امتحان اور اس کی تیاری۔

دنیا کی رفتار ممالک غیر

جرمنی کا قرضہ | ڈاکٹر برنگ وزیر اعظم جرمنی کا جو اعلان سال میں جرمنی کے قرضے کے متعلق شائع کیا ہے اس دنیا میں بھل پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری درخواست پر ڈاکٹر زومرے نے جرمنی کے شہر راتلورسٹر شہر کے آئینے کا اسٹاک مارٹ کی ہندوستانی شاخ کے جنرل جرنل۔

جرمنی کے ذمے بیرونی قرضے دہتم کے

(الف) سیاسی قرضے (تاوان جنگ)

(ب) تجارتی قرضے (بیرونی بینکوں سے)

سیاسی قرضوں کا تصفیہ پہلی بار ۱۹۲۳ء میں ڈائیس (Deutsches Reich) نے کیا۔ یہ ۱۹۲۹ء میں ایک اور تصفیہ ہوا جو "یونگ" (Young Plan) کے نام سے مشہور ہے۔

تاوان جنگ کا مطالبہ اس بے بنیاد دعوے پر مبنی تھا کہ لڑائی جرمنی نے شروع کی اور اس میں سراسر اسی کا قصور تھا۔ صلح نامہ ورسائی (Versailles) کے بعد اس

تک متعدد فرانسیسی اور انگریز سیاست دان اس دعوے کی ترمیم کیے ہیں۔ مگر فرانس ہنوز ان مطالبات پر مصر ہے۔

"یونگ پلان" کی رو سے جرمنی سالانہ تک تقریباً دس کروڑ پاؤنڈ (ڈیڑھ کروڑ روپے) سالانہ دیوے کا پابند کر دیا گیا۔

۱۹۲۳ء میں دنیا کے ماہرین تجارت پر یہ بات روشن ہو گئی کہ جرمنی کے لئے اس خطرہ رقم کے ادا

کرنے کی سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ اسے سالانہ قسطاً تاوان کے مساوی رقم کا مال باہر بھیجے

کی اجازت دی جائے۔ بجائے اس کے ہوا یہ کہ یورپ، امریکا اور ایشیا کے ملکوں نے بھاری مائینی ٹھوس

لگا کر جرمن مال کی درآمد کو روک دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب جرمنی غیر ملکی بازاروں میں اتنا مال نہیں بیچ سکتا، جتنا

فرانس، انگلستان، امریکا کے سیاسی مطالبات ادا کرنے کے لئے بھیجنا ضروری ہے۔ مجبوراً اسے یہ رقم غیر ملکوں

سے اور زیادہ قرضہ انگلستان اور امریکا سے قرض لینا پڑی۔

اس طرح ایک چکر سارن گیا جس میں سے نکلنے کی کوئی جگہ نہیں۔ جرمن حکومت نے اپنے ملک

کے لوگوں پر خصوصاً صنعت و حرفت اور تجارت پر بھاری ٹیکس لگائے۔ صنعتی کارخانے اور تاجر باہر کے

کے بغیر یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انھوں نے انگلستان اور امریکا کے بھروسے اپنے حکمت اراضی کی ضمانت پر اور جرمن قوم کی محنت اور بخاشی کی سادہ پر بد یہ فرض لینا ضروری کر دیا۔

عموماً غیر سرکاری قرضہ انگلستان اور امریکا سے لئے گئے۔ یہ قرض کی رقم ٹیکس کی صورت میں جرمن حکومت کو ادا کی جاتی تھی اور وہاں سے تاوان کی صورت میں پر غیر ملکوں میں چلی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ میں قطع ہو گیا کیونکہ اب دنیا کی عام اقتصادی مشکلات کی وجہ سے بین الاقوامی قرضوں کا ملنا ممکن تھا جو وہی سلسلہ سے اب تک بین الاقوامی ماہرین کے کم سے کم عین کمیشن مقرر کئے جا چکے ہیں جنہوں نے اس مسئلے پر اچھی طرح غور کر کے یہ فیصلہ کیا اور مختلف حکومتوں کو اس سے آگاہ کر دیا کہ جرمنی یا تو اپنا سیاسی حق ادا کر سکتا ہے یا تجارتی قرضہ۔ دونوں قرضے ساتھ ساتھ نہیں لے سکتا۔

سب سے زیادہ سیاسی پیچیدگیاں سیاسی قرضے میں پڑتی ہیں کیونکہ تاوان جنگ میں سے ۲۰ فیصدی فرانس کو دیا جاتا ہے۔ مگر تجارتی قرضہ قریب قریب سو فیصدی ایسا ہے جو جرمنی کے تاجروں اور کارخانوں نے انگلستان اور امریکا کے بینکوں سے لیا ہے۔ چنانچہ صرف انگلستان کے بینکوں کا غیر سرکاری قرضہ بیس کھرب پاؤنڈ (تین ارب روپیہ) تک پہنچ گیا ہے۔

قرض اب صورت حال یہ ہے۔ اگر جرمنی سیاسی قرضہ (تاوان جنگ) ادا نہ کرے تو حکومت فرانس کا ہیٹلر میں بڑھتے ہوئے لیکن فرانس کے لئے ان مشکلات کا برواشت کرنا ممکن ہے۔ وہ آج کل دنیا کا سب سے دولت مند ملک ہے لیکن اگر جرمنی اپنا تجارتی قرضہ نہ دے تو انگلستان اور امریکا کو تنگ دیکھ جائیں گے یعنی ان دونوں ملکوں کا پورا مالیاتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

جیسا ڈاکٹر بروٹنگ نے اپنے اعلان میں کہا جرمنی سیاسی قرضے کے ادا کرنے سے بالکل معذور ہے مگر وہ تجارتی قرضہ ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔ جرمنی کے اس روپے نے انگلستان اور امریکا کی تجارت محفوظہ رکھتی ہو گئی ہے میں فرانس کا نقصان ہے۔ اسی لئے انگلستان اور امریکا کو فرانس کی مخالفت کر رہے ہیں اور فرانس کی ہیبت نہیں کہ جرمنی سے جنگ کا اعلان کرے کیونکہ یہ گویا انگلستان اور امریکا سے یعنی تقریباً کل ہند دنیا سے حکم کھلاؤ یعنی سول لینا ہے۔

اس صورت حال میں جو زبردست خطرہ نہاں ہے اس کا تجربہ فرانس کو ابھی سے ہونے لگا ہے۔ چنانچہ آج ہی خبر آئی ہے کہ فرانس کی حکومت کو ایک ایسی متحدہ قومی مجلس دراز تیب دینے میں کامیابی نہیں ہوئی جو وہ ناز دلانا

حکومت کا مقابلہ کر کے خصوصاً امان جگہ کی اس کانفرنس میں جو دو تاق میں ہونے والی ہر حصے کے اس نے
اس نے استغاثہ دیا۔

ان امور سے صاف ظاہر ہو کہ اگر اب یورپ میں کوئی جگہ ہوئی تو اٹھکٹان برسنی کے خلاف نہیں ہو سکتا
بلکہ اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گا۔

ہندوستان

صوبہ متحدہ میں عدم ادائیگی لگان کی تحریک [پچھلے عرصہ ہوا، صوبہ متحدہ کے بعض اصلاح پس کا نگریں کی طرف سے عدم

ادائیگی لگان کی تحریک اٹھائی گئی جس سے ہندوستان کے

ہو گیا جو۔ صوبہ متحدہ مثل دوسرے صوبوں کے نہیں

بلکہ یہاں پر دونوں کے درمیان زمیندار دن کا ایک طبقہ

کا طبقہ انگریزی حکومت کا پیدا کردہ ہو گیا ہے۔

مسئلہ جس سے سر دست بحث نہیں۔ اصل واقعہ یہ ہو کہ اس سبب سے

ہیں؛ (۱) کاشتکار (۲) زمیندار اور (۳) حکومت۔ ان پر یہ عناصر کے باہمی اشتراک عمل اور توازن پر

صوبے کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ ان عناصر کو باہم ایک دوسرے کی نیت سے جو

درجہ حاصل ہونا چاہئے وہ اس وقت نہیں ہو لیکن اس باہمی اشتراک کی تکمیل میں کسی عنصر کو سرے سے خارج

کر دینے کی کوشش کرنا اس صوبے کی زندگی کو شدید نقصان پہنچائے بغیر ممکن نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ گزشتہ کچھ عرصے سے دنیا کا عام معاشی نظام بہت کچھ بگڑا ہوا ہے اور مسئلہ کی

تحریک سول نافرمانی نے ہندوستان کی عام تجارتی حالات اور اس کی وجہ سے اجناس کی ارزانی نرخ نے صورت

متحدہ کی اقتصادی حالت کو اور بھی خراب کر دیا ہے۔ بیرون ہند اور ہندوستان کی عام کساد بازاری کی وجہ سے

گزشتہ فصل ریش کی پیداوار کاشتکاروں کے ہاں جوں کی قوں پڑی رہ گئی اور ان کے فروخت نہ ہو سکنے

کی وجہ سے روپیہ ان کے لئے غما ہو گیا ایسی صورت میں جب ادائیگی لگان کا دت آیا تو کاشتکار یہاں نقدی

ادا کرنے کے اجناس کے سوا کچھ نہ پیش کر سکے۔ لیکن غلے کے دانے سکے تو بن نہیں سکتے تھے، تھوڑی بہت جو

کچھ بھی اجناس نقدی کی صورت میں تبدیل کی جا سکیں وہ ارزانی نرخ کے باعث بہت کم قیمت ثابت ہوئیں اور

اس نے تحیف اور عدم ادائیگی لگان کا سوال پیدا ہوا۔

صوبہ سندھ میں مخصوص اس نوعیت کا سوال پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہ ایک تمام تہذیبی صوبہ ہے۔ یہاں کی آبادی کا ۶۹ فیصدی حصہ ایسا ہے جو تمام حوزہ امت و کاشتکاری زندگی بسر کرتا ہے اور ۶ فیصدی حصہ جو جڑی طور پر گزارا کرتا ہے۔ اس صوبے کی زراعت سے متعلق کل آبادی زمین بلقوں پر مشتمل ہے۔ (۱) زمینداروں کی تعداد کوئی بارہ لاکھ ہے اور جن میں بیڑہ رائے ہے جو خود بھی کاشتکاری کرتے ہیں۔ (۲) کاشتکاروں کی تعداد ۵۵ لاکھ ہے جو بذات خود کاشتکاری کرتے ہیں اور اپنی پیداوار کا ایک حصہ (خواہ بصورت غنہ یا بصورت نقد) زمیندار کو بطور لگان دیتے ہیں (۳) مزدور جن کی تعداد ۵۰ لاکھ ہے جو صرف اجرت پر کھیتوں میں کام کرتے ہیں اور اپنی کوئی ملک یا حق کاشت نہیں رکھتے۔

صوبے کی یہ زراعتی مشغلات کچھ آج نئی نہیں بلکہ ایک زمانے سے چلی آتی ہیں۔ سادہ و دشواریوں کے علاوہ کہ جن کا کلی اندازہ لگان ارضی آج تک نہیں کر سکے، ایک بہت بڑا مسئلہ اس صوبے کی اضافہ آبادی کا ہے۔ زیادہ سے زیادہ قدیم اعداد جو یہاں کی آبادی کے سلسلے میں وہ اکبر بادشاہ کے زمانے کے ہیں اور اس وقت اس صوبے کی آبادی ۲ کروڑ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ پھر انگریزی عہد کی ابتدا یعنی ۱۸۵۷ء میں بھی تعداد جو ۳ لاکھ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اس سلسلے کی تازہ مردم شماری سے یہ تعداد ۱۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ہو جاتی ہے، گویا ہر سو سال یہاں کی آبادی میں ۷۰ فیصدی کا اضافہ ہوتا رہا ہے، گھاس کے ساتھ ساتھ یہاں کی مزدور زمین کا رقبہ بھی بڑھتا رہا ہے، لیکن وہ آج تک کبھی ۱۶ فیصدی سے بڑھنے نہیں بڑھا۔

یہی حکومت کی طرف سے ذرائع آبپاشی میں توسیع اور طریقہ کاشت کی ترقی سے پوری کی جاتی رہی ہے اور کچھ عرصے سے حکومت کے تمام میلانات مزارعین اور کاشتکاروں کی حمایت اور تائید میں رہے ہیں۔ اب تک زمینداروں کو اپنے کاشتکاروں کو بے دخل کرنے کا جو حق حاصل تھا ان کے اس حق میں بہت کمی کر دی گئی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس وقت ۱۹ فیصدی کاشتکاروں کو روٹی کاشتکار ہیں، یعنی وہ اپنا حق کاشت اپنے بعد اپنی اولاد کو منتقل کر سکتے ہیں۔ ۲۹ فیصدی ایسے ہیں جن میں زمینداروں کو حاصل ہونے والی زندگی میں انھیں اس زمین کا حق کاشت سے محروم نہیں کر سکتا جس پر وہ کاشت کرتے چلے آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت کم تعداد ایسی رہ جاتی ہے جن میں ضرورت پڑے بغیر زمین حاصل کر سکتا ہے۔ رسد و بیگار کا ایک نہایت تکلف و حق جو ایک عرصے سے چلا آتا تھا وہ بھی بجز کسی خاص علاقہ کے کام طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اور کوئی زمیندار اپنے اسامیوں سے بلا اجرت خدمت یا بلا قیمت غلہ نہیں لے سکتا۔

حال میں ایک بڑی چیز جو حرامین کے حقوق کو محفوظ کرنے اور زمینداروں کی دست و پاڑیوں کو روکنے کے لئے کی گئی ہے، وہ قانون لگان آراضیات صوبہ آگرہ ہے جو سن ۱۹۲۶ء میں زمینداروں کے منفعہ خالص کے باوجود سوریاجی اور سرکاری ممبران کے اتفاق آراء سے پاس ہوا تھا۔

یہ تمام تحفظات اور مراعات ہیں جو گزشتہ کچھ عرصے سے مزارعین اور کاشتکاروں کے ساتھ ہوتی رہی ہیں اور جن سے اس صوبے کے اندر اس طبقے کی حالت اُچھڑتی چلی گئی ہے۔ لیکن گزشتہ سال کے اندر نرخ اجناس میں ۲۰ سے زائد فیصد اضافہ کی گئی ہے۔ ایک نئی صورت حال پیدا کر دی ہے جس سے کاشتکار پورا لگان ادا کر

مستندہ نے اس کے لئے یہ کیا کہ ۱۹۲۶-۲۷ء کے کل مطالبہ

ایک کروڑ ۱۰ لاکھ کی کمی کر دی، یعنی تقریباً ۱۷ فیصدی

۳۰ سال قبل کے مطالبے سے ۴۰ لاکھ یا ۱۷ فیصدی کم ہو گیا

۴۰ کروڑ ۱۲ لاکھ کی کمی ہو گئی ہے۔ یعنی گویا کل مطالبات لگان پر ۴۰ کروڑ ۱۲ لاکھ سے کم ہو گئی ہے۔

یہ رعایتیں حکومت کی طرف سے خیرہ کتنی ہی فیاضی کے ساتھ کی گئی ہوں کاشتکاروں کی مالی و تنہائی کو رفع کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ زمینداروں کی خصوصاً چھوٹے زمینداروں کی حالت بھی قابلِ رحم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کانگریس کی عدم ادائیگی لگان کی تحریک کا شکار سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہی ہوں گے۔ کاش کانگریس کے کارکنوں میں اور ان لوگوں میں کوئی مفاہمت ایسی ہو سکتی جس سے کاشتکاروں کی مشکلات واقعی رفع ہو جائیں۔ مشکل یہ ہے کہ اقتصادی مسئلوں کے ساتھ سیاسی مصلحتیں ایسی جھگڑتی ہیں کہ جو اگر ہیں آسانی سے سلجھ سکتی تھیں وہ اور پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔

عالمِ اسلامی

مؤتمر اسلام

گزشتہ جیسے کہ سب سے اہم واقعہ مؤتمر اسلام کا وہ عظیم الشان اجلاس ہے جو قدس الشریف میں منعقد ہوا اور جس کو سیاسیات حاضرہ میں بلاشبہ ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سے پہلے بھی مصر و حجاز میں مؤتمر کے دو اجلاس منعقد ہو چکے ہیں لیکن ان کا تعلق زیادہ تر ہنگامی واقعات سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عالمِ اسلامی کے

باہمی ربط و ضبط کے لئے ان سے کوئی خاص نتائج مرتب نہیں ہوئے۔ برعکس اس کے، مجلس قدس کے مقررہ
 میں ایک نہایت اہم اور ضروری مقصد پیش نظر تھا اور وہ یہ کہ مسلمانان عالم کہیں وقتی اور مقامی مصروفیتوں
 کے خیال میں اپنے ملی اور تمدنی مصالح کو فراموش نہ کر دیں۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت عجیب ہے اول
 تو ان کو اسلام سے بطور ایک تمدن یا نظام اجتماع کوئی ربط یا تعلق باقی نہیں رہا۔ مذہب کی حیثیت ان کے
 نزدیک کم و بیش ایک مجموعہ عقائد یا فکری عبادات کی سی ہو گئی ہے اور اس میں وہ قوت موجود نہیں رہی جو
 ان کے انفرادی نشو و نما یا اجتماعی زندگی کے قیام کا باعث ہو۔ ثانیاً ان کی وطنی اور مقامی ضروریات و دن بدن
 ان کی توجہ کو اپنی طرف جذب کر رہی ہیں اور نہ مثلاً ان کی حالت اس قدر پست ہو گئی ہے کہ وہ دنیا کے سیاسی
 اور معاشی حالات کی تعمیر اپنے دین مقدس کی روشنی میں نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شخص مذہب کا نام لیتا
 ہے تو وہ گھبرا اٹھتے ہیں اور ان کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے کہ شاید اس کا مطلب ان کے
 سیاسی اور ملی مصالح کی نفی ہے حالانکہ سیاست اور خدمت ملک و وطن میں ان کا رویہ مذہب اور تمدن
 کی طرف سے کچھ ایسی بے اعتنائی پیدا کر دیتا ہے جس سے یہ بالکل بڑھکھٹ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس
 حماقت آئینہ کشمکش میں گرفتار رہیں کہ آیا ان کی اجتماعی حالت اسلام کی بدولت سدھرے گی یا اول ان کی
 اجتماعی حالت ٹھیک ہو جائے گی اور پھر اسلام کو ترقی اور سر بلندی نصیب ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں
 مقاصد الگ نہیں ہیں جیسا کہ غلطی سے بعض لوگ سمجھ لیتے ہیں بلکہ وہ ایک ہی مقصد کے دو مختلف اجزاء ہیں
 جن کی تکمیل اور نشو و نما ساتھ ساتھ ہوتی ہے ہم کسی ایسی ترقی کو صحیح معنوں میں دینی ترقی سے تعبیر نہیں کر سکتے
 جو اس کے پیروؤں کے انفرادی اور اجتماعی نشو و نما کے لئے فلاح و کامرانی کا پیام نہ لائے نہ ممکن ہے
 کہ اول ایک قوم اسلام کا اصول حیات ترک کر دے اور پھر کسی دوسرے طریق سے آزادی اور ترقی کی طرف
 قدم بڑھا کر اس کی خدمت کا دعویٰ کرے۔ اسلام اور مسلمانوں کی دنیوی کامیابی میں ایک ایسا ربط قائم ہے
 کہ ایک کے ترک سے قدرتنا دوسرے کا ترک لازم آئے گا۔ لہذا اگر باب موتر کی یہ کوشش کہ مسلمانان عالم
 کے لئے عقائد و مسلمات یا وطنی اور ملی ضروریات سے الگ کچھ ایسے ذرائع و وسائل تلاش کئے جائیں جن سے
 ان کے قوائے ملی میں اس قدر تازہ حرکت پیدا ہو سر اسر متحرک شائق و مبارک باد ہو یہ کہنا کہ دنیا سے
 اسلام کے موجودہ حالات اس نئی تحریک کے لئے کہاں تک امید افزا ہیں۔ ایک علاج کا مبالغہ ہے اس
 لئے کہ اگر ہماری موجودہ فضا اس قسم کی تحریکوں کے لئے کچھ بہت زیادہ مساعد نہیں لہذا نظریہ جمالات اس
 کی کامیابی کے آثار کم ہیں تو یہ بھی ممکن نہیں کہ مجزاس قسم کی کسی تحریک کے ہم اپنے حالات میں کوئی خوشگوار

تہذیبیہا کر سکیں۔ جہاں تک اربابِ موتر کو فراستِ ایٹمی حاصل ہو اور وہ تعلیماتِ اسلامی پر بصیرت کی نظر رکھے جس میں اسی قدر مسلمانانِ عالم کی ضروریات کے متعلق ان کا اندازہ صائب اور ٹھیک ہو گا۔ اور جہاں تک اخصاص و ہمت کے ساتھ وہ ان کے اتمام میں سرگرم عمل رہیں گے اسی قدر ان کی کامیابی یقینی ہو۔ ہماری رائے میں بطور ایک تہبیدی اور افتتاحی اجلاس کے موتر کا انعقاد نہایت کامیاب رہا اور اگرچہ ابتدا ہی میں اس سے کوئی بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لینا دانشمندی سے بعید ہے لیکن موتر کے مختلف جلسے اور اس کی کارروائیاں ہمت افزا ضرور ہیں۔

البتہ یہ امر نہایت افسوسناک ہو کہ موتر کا یہ اجلاس جس قدر اہم تھا اتنا ہی اس کے متعلق مذہبیاتی جگہ راز و خفا سے کام لیا گیا۔ ایک تو مسلمانوں کی ذاتی بہداشت بدگمانی کی مصیبت تھی کیا کم نمی اس پر طرہ یہ ہوا کہ خبر رسائی مصیبت کے طرہ دار، جہاں تک ممکن تھا اپنے اصول و قواعد جس سے موتر کے متعلق کوئی صحیح خیال قائم کرنا دشوار تھا۔

بھئی نہیں اور ہمیں تو غلط۔ البتہ شرکائے موتر کے باہمی اختلافات کو خصوصیت لے ساتھ شہرتِ ذی لہجی اور وہ ناگوار واقعہ جو ایک مصری مندوب کی بدولت ابتدائے موتر میں پیش آیا اس کے متعلق خوب خوب نگاہیں لگوانے سے کام لیا گیا۔ موتر کی ساری کامیابی اور ناکامی کا دار و مدار اسی ایک مندوب کے طرز عمل پر دہشتہ تھا۔ اجلاسِ موتر سے پہلے ہی مغرب کی خبر رسائیاں انہیں اس مبارک تحریک کے بارے میں حتیٰ الوسع مبالغہ آمیز بیانات اور گمراہ کن اطلاعات شائع کرتی رہیں۔ اول خلافت کا مسئلہ چھیڑا گیا۔ پھر فتنہ اٹھایا گیا کہ فلسطین جامعہ اہلِ حریف بنا چاہتے ہیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد یہ اطلاع موصول ہوئی کہ مسلمانانِ عالم نے موتر کی دعوت پر کسی گرجہ بخشی کا اظہار نہیں کیا، نہ کوئی اسلامی ریاست اس کی کارروائیوں میں حصہ لینے کا ارادہ کرتی ہو۔ مثلاً جب اجلاسِ موتر سے کچھ مدت پہلے مفتی سید امین الحسینی قاہرہ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں انھوں نے انکار مصر سے موتر کے بارے میں اظہار خیال کیا ہو تو اس پر جریدہ "الکشمیسین" کے نامہ نگار مصر نے جس انداز میں تنقید فرمائی وہ یہ تھا :-

... قاہرہ میں عام خیال یہ ہو کہ فلسطین کی مجوزہ اسلامی یونیورسٹی اذہر کے مقابلے پر قائم کی جا رہی ہے ... مفتی فلسطین کہتے ہیں کہ اس یونیورسٹی کا مقصد صرف اس صیہونی جامعہ کے اثرات کو زائل کرنا ہی جو قدس میں موجود ہے ... انھوں نے یہ

بھی کہا ہے کہ موترے مقصد و مسلمانان فلسطین کی حالت کو مستحکم اور قومی بنانا ہر تاکہ وہ
 صہیونوں کو اپنی اس خواہش میں کہ ان کو مقدسہ ان کے تصرف میں آجائیں کامیاب
 نہ ہونے دیں۔ الحاج امین اس معاملے میں صریحاً غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں
 ... ان کو مقدسہ کا مسئلہ محض ان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ... اس لئے کہ اس کا
 تعلق صرف دیوار گریس سے ہے جس کے بارے میں ”ہندب دنیا“ (داوین ہارسہ
 میں) جمیعت اقوام کی خاص مجلس کا فیصلہ قبول کر چکی ہے۔ ... مسلمانان مصر
 پر سید امین الحسینی کی اس کوشش کا جو بیانیاتی پر مبنی ہے کوئی اثر نہیں پڑا۔ ... یہاں
 ہر شخص کو یہ بدگمانی ہے کہ مفتی فلسطین قدس کو خلافت کا مرکز بنا چاہتے ہیں حالانکہ
 مصریوں کو ... خود اس کی خواہش ہے۔“

گو یا ایک ہی وقت میں موتر کے متعلق وہ تمام نئے پھیڑ دئے گئے جن سے اس کے مقاصد کو
 نقصان پہنچنے کی توقع تھی۔ مسلمانان عالم کی باہمی رنجشوں اور ان کے رہنماؤں کے ذاتی اختلافات کا
 مسئلہ تو اب بہت پرانا ہو چکا ہے۔ اس کی بجائے باہر جا شہرت کے ساتھ ہی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ ایک
 طرف خلافت اور ازہر کے نام سے ام اسلامیہ میں باہم رقابت کا جذبہ پیدا کیا جائے اور دوسری طرف
 مغربی ائمہ سیاست موتر کے وجود کو اپنے افواہ و مقاصد کی راہ میں ایک زبردست خطرہ تصور کریں۔ چنانچہ
 جہاں موتر کے بظاہر ناکام جلسوں کی تصویریں نہایت مسرت اور اطمینان کے ساتھ کھینچی گئیں وہاں دہلی زبان
 میں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑا۔

... یہ خیال کرنا نادانی ہو چکی کہ موتر بالکل ناکام رہی۔ ... جوں جوں زمانہ گزرتا
 جائے گا۔ یہ حقیقت آشکارا ہوتی جائے گی کہ یہ موتر اعم اسلامیہ کے اس عزم کی تمہید
 ہے کہ وہ اپنے نظم و ضبط کی طرف متوجہ ہوں۔ جو نہی یہ تحریک زیادہ بکروار لوگوں
 کے ہاتھوں میں آئی جیسا کہ یقینی ہے، اس سے مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کی سیاست
 متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گی۔ یہ خیال ہے جو بہت سے مغربی اہل الرائے حضرات
 نے ظاہر کیا ہے اور ۲۰۰۰۔“

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت جب ممالک اسلامی ایک دوسرے کی حالت سے قطعاً بے خبر
 ہیں۔ جب ہمارے اجزائے ملی میں ایک طوفان انتشار و ناہنجار مذہب سیاست کا حامل رہا ہو نہ سیاست

ایک مرتبہ یہ اور جہاں تک ممکن تھا آپس میں تباہ خیالات بھی کیا۔ ممکن ہو کہ ان دونوں لوگوں کو
 کوئی چیز غیب نہ ہو۔ اس اور کا تو جناب صاحب کو بھی اختلاف ہو کہ یہ ایمان کہنی کی حالت بہت کم تر ہے مگر
 کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ مگر کی تمام کارسایوں کو ایک ہی وقت میں روح اور ولولہ عمل کا اظہار ہوتا ہو
 انھار اب موتر نے اپنے قول میں اس بات کو بھی ملح ثبت کر دیا ہو کہ وہ مسلمانوں کی ضروریات کے ساتھ
 اسلام کے بند و برز مقاصد سے ناواقف نہیں۔ اس کے لئے صرف اس سرور آمیز واقعہ کی طرف اشارہ
 کر دینا کافی ہوگا۔ کہ طبع اسلامیہ کی وحدت اور اسلام کی بے تعصب اور تفریق و انتشار سے بالآخر
 روح کے تقاضے پر ایک خمی رہنمائی سید محمد حسین الکاظمی نے جامع اقصیٰ میں امامت فرمائی اور تمام
 عناصر موتر نے ان کے پیچھے فریضہ مانا دیا۔ ہمارے رائے میں موتر کا انعقاد نہایت مناسب موقعہ پر
 عمل میں آیا ہو اور اس کا جو جس سرزمین سے وابستہ ہو اس کے رہنے والے ان تمام خاصہ عمل
 اور ملکات ذہنی کے مالک ہیں جو عزت و کامرانی کی شرط ہیں اور جن کے ہوتے ہوئے کوئی سعی و کوشش
 کام نہیں رہ سکتی۔ ممکن ہو کہ ہم اپنی فرسودہ سیاست یا بے روح زندگی کی بدولت موتر کے مستقبل سے
 ہامید ہوں لیکن ہم اپنی بے بصری اور کوردستی سے بڑھ کر ان بلند ہمت اور مالو العزم لوگوں کے قولے
 عملی و فکری پر اعتماد رکھنا چاہتے ہیں کہ قدرت نے ایک حساس دل اور بے مین طبیعت خطا کی ہو اور جن
 کی سمیت دینی اور ذوق جہاد و حریت ایک عالم میں سلم ہو بفضلہ تعالیٰ موتر میں وہ پختہ کار اور ریختہ ہاں سیاست
 بھی شامل ہیں جن کا فہم و تدبیر و عزم و احتیاط اعتراض و التا ہو اور اس میں وہ بالغ نظر اور نکتہ بین ارباب
 بصیرت بھی شریک ہیں جن کو زندگی اور اس کے حقائق پر غیر معمولی دسترس اور جوہر حاصل ہو یقین ہو کہ عالم
 اسلامی کے ہر حصے میں اس تحریک کا دلی جوش اور سرگرمی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ البتہ اس کی کامیابی
 کا راز صرف اس اسلوب ذہنی پر منحصر ہے جس کی طرف موتر کے فلسفے پر علامہ اقبال نے اشارہ کیا تھا بہت
 مندوبین کا اوداع کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا ان سے بڑھ کر حقائق کی ترجمانی کا دعوے سارے کے ہوتا ہو
 فرمایا:۔۔۔ اسلام کو اس وقت دو خطرے پیش ہیں ایک احاد و مادیت اور دوسرا ملینیت و قومیت کا،
 بچے ہیں کہ اسلام کی پاک اور مقدس روح ان دونوں خطرات کو شکست دے سکتی ہو۔۔۔ بچے اسلام کے
 دشمنوں کو امتلا و غیہ نہیں جتنا خود مسلمانوں سے۔۔۔ حضرت سرور کائنات صلیم کی ایک حدیث وانا مظلوم من الانبیاء
 واتم علی من الامم۔ میں یہ بھی اس کا خیال کرتا ہوں تو میری گردن خرم و ذمات ہو جبکہ جاتی ہو۔ کہا آج
 ہم مسلمان اس تعالیٰ ہیں کہ جناب صاحب صلیم ہم پر فخر کریں، البتہ جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کر لیں
 جو رسول اللہ صلیم نے ہیں عنایت فرمایا تھا تو ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ حضور ہم پر فخر کریں۔۔۔

شذرات

اردو اکادمی کو بلا کچر جس کا اعلان ہم پچھلے پرچے میں کر چکے ہیں، رنجوری کو ہوا۔ علاوہ جناب مقرر کے باہر کے ارکان ہیں سے جناب خواجہ غلام الہی الدین صاحب جناب بگل حسین صاحب، جناب یوسف گلزان صاحب اور جناب محمد نعیمی صاحب تہا تشریف لائے تھے۔ مقامی ارکان اکادمی اردو بلی کے دوسرے علم دوست حضرات بھی موجود تھے خصوصاً کالجوں کے طلبہ بہت کافی تعداد میں شریک تھے۔ جلسے کا افتتاح خواجہ غلام الہی الدین صاحب صدر جلسہ کی تقریر سے ہوا۔ موصوف نے حاضرین کو کچر دوس کے اس سلسلے کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔ جو اکادمی نے شروع کیا اور اکادمی کی علمی خدمات کے متعلق بہت اذکار و سیدر نکالے۔ اس کے بعد

دہلج الدین صاحب کا تعارف کرایا۔ یہ صاحب علی گڑھ کے

بی۔ اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور اسی سال سرکار

ٹریننگ کے لئے دہلی کے بھیجے گئے اور اول نمبر پر کامیاب

کالج میں معاشیات اور نفسیات کے پروفیسر ہیں۔ آپ کی ادبی

متعدد مگراں قدر ترجمے شائع کر چکے ہیں۔ گزشتہ سال ہندوستانی اکیڈمی نے آپ کی ایب تالیف "نفسیات مذہب پر انعام دیا ہے۔ آپ کے اسلوب بیان کی یہ خصوصیت ہے کہ دقیق علمی مضامین کو ایسے دلپذیر اور دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں گویا پتھر کو پانی کر دیتے ہیں۔

جناب صدر کی تقریر کے بعد سید و ہاج الدین صاحب نے اپنا فاضلانہ مقالہ "نفسیات مذہب" پر پڑھا جس کا خلاصہ آئندہ ہفتے رسالہ جامعہ میں شائع ہوگا اور پورا کچر رسالے کی شکل میں تین پارہے کے اندر چھپ جائے گا۔

آخر میں جناب صدر نے فاضل مقرر کا شکریہ ادا کیا اور کچر کے موضوع کے متعلق حاضرین کو اپنے خیالات کو مستفید فرمایا۔ جلسہ جناب شیخ الہامیہ کی تقریر پر ختم ہوا جس میں موصوف نے اکادمی کی طرف سے جناب صدر اور فاضل مقرر کی خدمت میں تحفہ سپاس و امتنان پیش کیا۔

اکادمی کا دوسرا کچر ۱۴ فروری یوم یکشنبہ کو منعقد ہوگا۔ وقت کا تعین ابھی نہیں ہوا ہے۔ حضرات اہلکین کو دعوت ناموں کے ذریعے سے اطلاع دے دی جائے گی۔ جناب قاضی عبدالغفار صاحب سابق مدیر جمہور، جمال الدین افغانی کی سیرت پر تقریر فرمائیں گے جس کے متعلق موصوف مدت کو تحقیق و

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جانب

زیر ادارت

ڈاکٹر

مولانا اسلم حیدر چوہدری

جلد ۱۱ | بابۃ ماہ فروغ

صفحہ

فہرست مضامین

۱۰۲	مولوی وہاب الدین صاحب بی۔ اے	۱۔ نفسیات مذہب
۱۶۰	۲۔ مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط
۱۶۲	پروفیسر محمد حبیب صاحب ایم۔ اے، آکسن	۳۔ ایران جدید
۱۳۶	جناب عبدالقادر صاحب سروری۔ ایم۔ اے	۴۔ انقلاب سے پہلے اردو شاعری کی حالت
۱۳۲	مولانا اسلم حیدر چوہدری	۵۔ غزل
۱۴۵	ایمیل زیدال۔ مترجمہ ابو حمزہ سید زبیر حسنی صاحب	۶۔ مکالمہ عالم ارواح
۱۵۶	۷۔ غریب خانے میں
۱۶۴	۸۔ قرآن حکیم و مسلمانوں کا موجودہ برتاؤ ظلم، جناب شوق دہلوی از مکہ منسلک
۱۶۵	۹۔ تنقید و تبصرہ
۱۶۰	ش۔ رقی	۱۰۔ دنیا کی رفتار، دھن، ہندوستان
۱۶۶	ن۔ ن	۱۱۔ " (دب، عالم اسلامی)
۱۸۲	" - "	۱۲۔ (دج، مالک غیر)
۱۸۶	۱۳۔ شذرات

(محمد حبیب بی۔ اے، آکسن، پرنٹرز و پبلشر نے دفتر سالہ جامعہ قزلباغی کو شائع کیا)

نفیات مذہب

یہ اس خطبہ کا خلاصہ ہے جو سید و ہاج الدین صاحب بنی لے، بنی ٹی پر قمر عثمانیہ کالج
اوزنگ آباد نے اردو اکادمی کے جلسے میں، جنوری ۱۹۳۲ء کو پڑھا تھا۔ امید ہے
کہ پورا خطبہ دو تین چھپنے کے اندر رسالے کی شکل میں چھپ کر اور ارکان اکادمی کی
خدمت میں پہنچ جائے گا۔
(مدیر)

مذہبیت یا حاسہ مذہبی، فطرت انسانی کے سرستہ اسرار میں سے ہر جن کی تحلیل و شمار
ہے۔ اس کی نزاکت اور لطافت، علمی موٹنگائیوں کی تحمل نہیں ہو سکتی۔ یا یہ کہے کہ خشک طبیعت
اس کی عقدہ کشائی کی صلاحیت اور اہلیت نہیں رکھتی، اور مذہب کے علمی مغش کو قدم قدم پر یہ
طنہ سننا پڑتا ہے کہ

از بے خبری، بے خبراں معذورند ذوقیت دریں بادہ کہستان داند
مذہب کو ٹٹولنا صرف انجان جگہوں میں قدم رکھنا ہی نہیں ہے، بلکہ انسان کے متاع دل
اور روحانی سرمایہ پر ہاتھ ڈالنا ہے۔ بقول میر

یہ کارگاہ ساری، دوکان شیشہ گر ہے

کچھ مذہب ہی پر موقوف نہیں نفس انسانی کی تمام تاثرات، تمام جذبات، تمام وجدانات
اسی نوع کے شخصی اور سرستہ راز ہوتے ہیں۔ ان کی پوری پوری حقیقت اور معنویت سے اگر
کوئی واقف ہوتا ہے تو صرف وہ نفس جو انہیں آغوش میں پال رہا ہو۔ دوسرا انہیں سمجھ ہی نہیں سکتا
غریب فلسفی اور نفیات داں اپنا ہی کھاتا ہے ہوسے دور کا دور ہی کھڑا رہتا ہے۔ وہ زیادہ سے
زیادہ ان تاثرات کی توجیہ کر دے گا۔ ان کی تقسیم و تقسیم کر ڈالے گا۔ کوئی سوئی سی اصطلاح تیار کرے
اور بس۔ اس سے زیادہ کا وہ اہل نہیں۔ محض وقت نظر اور نظری طبیعت اس کے کام نہیں

کی وجہ تک کہ وہ دیرسا ہی بیٹا جاگتا، فردزان، رنشدہ و چندہ شعلہ احساس اپنے دل میں نہ پیدا کرے۔
 موضوع پر بحث کرنے سے پہلے اقبال کی زبان میں میری دعا صرف یہ ہو کہ:
 یارب! درون سینہ دل باخبر بدہ و زیادہ نشہ را لگرم، اہل نظریہ

مذہب کی تعریف [اثرات و رویدادات کی تعریف مذہب: "شوارب" ہے، یہ دنیا میں ہر اس کیفی اور ذوقی ہیں، ہم زیادہ سے زیادہ ان کے مظاہر ہیں، لیکن ان کی کوئی جامع و مانع تعریف کرنا آگے۔
 اتم حاسہ نہایت کی تعریف کا ہے۔ خود عالمان اور رہنما نشان معرفت

معلوم شد کہ بیچ معلوم نیست کہہ کر چپ ہو جاتے ہوں، توفیات وال ایک تعریف پر کیونکہ قائم اور متفق ہو سکتے ہیں۔۔۔۔۔
 مذہبیت کے لازمی عناصر میں، عل، ایمان اور مذہبی اثرات، لیکن ان تینوں کی ہم آہنگی ضروری ہے، محض عقیدہ غیر عمل صلح کے، مذہب کے مفہوم سے اتنا ہی مستبعد ہے، جتنا کہ محض اخلاقی عمل بغیر ایمان اور ایمان کے۔ پس ان مختلف اجزاء کا سوا ضروری ہے۔ چونکہ ہماری بحث کسی خاص عرفی مذہب سے نہیں بلکہ ان کی قدر مشترک یعنی حاسہ مذہبیت سے ہے، اس لئے ہم اس کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ "انسان کے وہ تمام افعال تاثرات اور تجربات جو اس عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں کہ ایک ہستی بزرگ و برتر موجود ہے جو حقیقت کا سرچشمہ اور نجات کا مدار ہے" یہ تعریف ہمارے موضوع کے لئے بہت سوزوں ہے، اس لئے کہ جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، ہمارا تعلق خاص خاص مذاہب اور ان کے مخصوص ارکان و عبادات و دیگر ادارات سے نہیں، بلکہ عباد اور معبود کے تعلق سے ہے جو معنی اس حاسہ روحانی سے جو ہر شخص میں موجود رہتا ہے، خواہ وہ عمال و عبادات مذہبی کی شکل میں ظاہر ہو یا نہ ہو، عالم لاہوت کے تعلق ہو، یا ناسوت کے، شریعت ہو یا طریقت، منصور کا نعرہ "انالہی، ہو

یہ اس لئے کہ عین حقیقت و شہادت میں کا تصور ملانا اسے روکنے کا ہے۔

انہی حقیقت پر ایمان [عشق مجازی کی طرح عشق حقیقی، جسے ہم نے ماسہ نہر ہی کہا ہے، کوئی ایک جذبہ نہیں، بلکہ وجدان ہے اور مختلف جذبات سے مرکب ہے۔ وجدان اور جذبے میں یہ فرق ہے کہ وجدان کوئی خاص جذبہ نہیں بلکہ ایک مجموعی ذہنی کیفیت یا رجحان نفس کا نام ہے جس کے ماتحت مختلف ادوار میں مختلف جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔

اگر سوال کیا جائے کہ مذہبیت کی امتیازی خصوصیت کیا ہے تو عام فطرت میں اس کا جواب یہ ہے کہ مذہبیت کی بنیاد یہ عقیدہ یا ایمان ہے کہ ہمارے اس عالم مجاز و موسسات سے بالاتر ہمارے نظام کائنات سے اس قدر اعلیٰ ایک ان دیکھا نظام موجود ہے، جس کے منشاء کے ساتھ خود کو مطابقت کرنا انسان کا خاص فرض ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خود اس

دیکھے جانے بن سوچے جانے پہچانے، بن بوجھے

وجود کا احساس انسان کے نفس میں کیونکر ہوتا ہے۔ جب ہم ایمانی کیفیت کے اثر پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ماتحت وجود باری تعالیٰ کا احساس (تصور نہیں، بلکہ احساس) ایک حقیقت محسوس کی طرح انسان کے ساتھ رہتا ہے، بقول امام غزالیؒ کے

”مطرقہ تصوف پر کار بند رہنے سے ایک ایسی وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس

کی حیثیت ایک صریح ادراک کی سی ہوتی ہے، جیسے کہ انسان خود اپنے ہاتھ سے کسی چیز کو ٹھول رہا ہو“

افضل ایامی سے ان دیکھی حقیقت، دیکھی جالی، سمجھی بوجھی حقیقتوں سے زیادہ حقیقی بن جاتی ہے اور جس طرح ایک تقاطع کی جنبش سے گرد و پیش کی آہنی اشیاء بمقابلیت سے بھر جاتی ہیں، اسی طرح سے ایمانی تقاطعیت انسانی شعور کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتی ہے اور اس کے حواس پر غالب آ جاتی ہے، کائنات کا ہر ذرہ تجلی زار نظر آتا ہے، صفات الہی، رحیمی و کربہی، جباریت و نہایت مدلی و احسان محض تصورات نہیں بلکہ محسوسات بن کر دنیا میں ہر طرف محیط نظر آتے ہیں۔

ایمان ہائے کلمہ نفسی | اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود یہ ایمانی کیفیت جس سے ان دینی حقیقتات موجود بن جاتی ہے، کیا چیز ہے؟ عقیدہ یا ایمان کے پانچ نفسی محرکات، ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں یعنی (۱) سب سے پہلے روایت بچپن کی تعلیم اور ماحول کا اثر ہے ہم اثر پذیری یا انصافیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ (۲) دوسرے فطرت کے حسن و جمال کا تصور اور کائنات کے توازن اور ہم آہنگی کو دیکھ کر بمدر فیاض کا یقین۔ اسے ہم فطری نصیر کہہ سکتے ہیں (۳) قرآن سے اخلاقی کشائش کا احساس اور اس سے ایک اعلیٰ اخلاقی مقصد۔

داعی تاثری عنصر، مثلاً انسان میں مذہبی جذبات :-

صوفیانہ کیفیت نفسی اسی عنصر میں آتی ہے (۱)

نظام کائنات کی باقاعدگی اور ترتیب سے یہ عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔
صاحبِ مشیت ہستی ضرور ہے ہم اس ترتیب سے فرداً فرداً ان عناصر غیبیہ سے بحث کریں گے۔
(۱) روایتی عنصر یا اثر پذیری۔

انسانی سیرت کی تشکیل میں تفکر اور استدلال کا دخل اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی عادتوں، اس کے اخلاق اور اس کے معتقدات کو سانچے میں ڈھلنے والے زیادہ تر ماحول تعلیم اور تربیت کے اثرات ہوا کرتے ہیں۔

ہمارے مذہبی عقائد میں بھی بہت زیادہ دخل بچپن کے ماحول اور تعلیم و تربیت کا ہوتا ہے کوئی بچہ ذاتِ باری تعالیٰ کا ایمان عقلی ثبوت سے نہیں بلکہ ماں کی گود میں، یا خاندان والوں کے افعال و اقوال کی وجہ سے حاصل کرتا ہے اور اس طرح جن بنیادیں قائم ہوتی ہیں وہ اٹل ہوتی ہیں۔ دوسروں کے علاوہ، انسان خود اپنے نفس پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ دعا اور عبادت کا اثر اسی قسم کا خود آفریدیہ اثر ہوتا ہے۔ انسان جب صدقِ دل سے دعا مانگتا ہے تو اپنے قلب میں طمانیت اور سکون کا اثر پاتا ہے۔ عبادت میں خضوع و خشوع سے نفس میں انکساری اور فروتنی پیدا ہوتی ہے۔ مرشد کے سامنے حاضر ہو کر خشکیں بیان کرنے سے نفس کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ ارشادِ ہدایت سے نفس کو رہبری ملتی

ہے۔ مشرقِ زمین میں یک سوئی پیدا ہوتی ہے۔ ہر مذہب کی عبادت کا فلسفہ زیادہ تر اثر پذیر ہی ہے۔ زمین میں آگ ہے۔ عبادت کے ارکان و قواعد ایسے ہوتے ہیں جن سے نفس کی اثر پذیر ہی بڑھ جاتی ہے۔ جسمانی طہارت و پاکیزگی کا انعکاسی اثر ذہن پر پڑتا ہے۔ عبادت گاہوں کی خاموش فضا احترام کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ حضورِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ عبادت کے اوقاتے تسکین ہوتی ہیں۔
 الا بکراۃ تظلمن العلوب۔

صرف عقیدہ یا ایمان، بلکہ ہر قسم کے مقدمات اور ہر قسم کی تعلیم بھی اسی انفعالیات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک عالم کے علمی مقدمات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں بھی یہی عنصر موجود ملے گا۔ نفسیات جدیدہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہو کہ آج اس نے یہ حقیقت ثابت کر دی ہے کہ انسانی زندگی عقل اور استدلال کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی جذبات و وجدانات کی۔ نظامِ نفسی ارسطو اور مل کے منطقی قوانین کا اتنا پابند نہیں ہے جتنا دالہائے جذبات و وجدانات کا۔ انسانی زندگی میں جو کچھ خوش گواری پائی جاتی ہے، ہمارا مذہب، ہمارا ادب، ہمارے فنونِ لطیفہ سب کا سرچشمہ یہی غیر فکری عناصر ہیں اور یہ انسان کے لئے باعثِ تنگ نہیں ہیں۔

(۷، نظری عنصر)

مناظرِ فطرت اور حسنِ قدرت کا دخل عقیدہ یا ایمانی کیفیت پیدا کرنے میں ہمیشہ رہا ہے۔ اس وقت بھی جب کہ انسان وحشی اور غیر تمدن تھا، اس کے پاس مذہبی سہارا نہ تھا اور نہ روحانی سرمایہ، وہ فطرت کے جمال میں حسنِ ازل کی جھلک دیکھتا تھا، پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی پکار پکار کر اسے ایک وجود کی طرف متوجہ کرتی تھی، سویرج کی خشکیوں میں چاند کی ٹھنڈک میں صبح کی صبا و شام کی طماعت میں اسے آیاتِ الہی نظر آتی تھیں اور وہ اپنے عقیدے کا اظہار ان کی پرستش سے کرتا تھا۔ آج اگرچہ ان محدود اور مخصوص معنوں میں مظاہرِ پرستی دنیا میں نہیں پائی جاتی، لیکن فطرت کے حسین مناظر اب بھی دیکھنے والوں سے احترام اور عقیدت کا خراج وصول کرتے ہیں۔ سخت سو سخت دل بھل جاتے ہیں اور بے حس لوگ بھی ”قبّارک اللہ اسن الخالقین“ پکار اٹھتے ہیں۔

اس ایمان آؤں اس احساس فطرت میں ہیں میں قسم کے نفسی تجربات نظر آتے ہیں، احساس رحمت الہی، احساس توازن کائنات اور احساس حسن و جمال، یہ تین اجزا انسان کے دل میں الہامی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔ اس کیفیت کو صوفیانہ کیفیت نفسی بھی کہتے ہیں۔

(۳۔ اخلاقی عنصر

انسان کو عالم صغیر کہا گیا ہے اور عالم کبیر کی طرح یہ عالم نہ بھی جزئی ہے نہ کلی۔ (مجموعہ بحار کونین و نشاط) ہے۔ ایک طرف تو انسان کے طبعی مقتضائے خواہش

ہیں اور تسکین چاہتے ہیں، دوسری طرف عالم ف

مقتضائے دل کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ اس سے متصادم

کا اخلاقی قانون، اولاً جب کوئی انسان، اپنے نفس میں متضاد جذبات و خواہشات ہمارے سامنے

ہے، کچھ رجحانات ایسے پاتا ہے جو اسے اتباع قانون کی طرف مائل کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں

جو اسے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی پر آمادہ کرتے ہیں اور ابھارتے ہیں تو وہ برخود قیاس کے تعلق سے

مجبور ہو کر جس کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں، تاہم یہ رجحانات کو ”خیر“ اور ترویجی خواہشات کو ”شر“

سمجھا ہے اور انھیں دو علیحدہ علیحدہ قوتوں سے منسوب کرتا ہے، یعنی روحانی خیالات اور شیطانی خیالات

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ انسان اس تضادم کے احساس ہی سے فطری طور پر یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور

ہوتا ہے کہ اس اخلاقی دائرہ گیر میں انسان کو راہ ہدایت پر قائم رکھنے اور شر سے بچانے کے لئے ایک

اعلیٰ مقصد کا وجود ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی جماعت کا اخلاقی قانون اور عدالت کے

تاویسی قوانین ایک حد تک انسانی کردار کی نگرانی کرتے ہیں لیکن صرف انھیں کا اثر انسان کو خیر پر

قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ ان قوانین سے زیادہ و زیادہ وہ اخلاق پیدا ہو سکتا ہے جو لوگوں میں

Daylight Morality ”ہلے کا اخلاق“ کہتے ہیں یعنی اگر کوئی دیکھتا نہ ہو، اگر خود نہ دیکھتا

کا اندیشہ نہ ہو، قانونی شکنجے سے بچے کا موقع ہو تو پھر انسان بدی کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی سلیم اعلیٰ شخص

اس اخلاق کو اچھا نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے وہ تقاضائے فطرت سے اس عقیدے پر مجبور ہوتا ہے کہ

صحیح معنوں میں ضبط اخلاق صرف ایہی ہوا کرتا ہے یعنی ایک سچی و بصیرت مند و غیرستی پروردگار کے سامنے جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اور جس کی طرف ہر انسان کو آخر میں جانا ہے۔ بعض مواقع اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کے تمام افعال کا سرچشمہ محبت الہی ہوتی ہے، اور بعض مواقع میں ماسہ مذہبی کی محرک غیثت الہی ہوتی ہے۔ کسی کو شان رحیمی و کرمی کے تصور میں ایمانیت کا لطف آتا ہے تو کسی کو جباریت اور قہارت کے تصور میں کسی کی مذہبیت میں تولا، غالب ہوتا ہے تو کسی کے یہاں قویہ کوئی پابندی ضرورت سے تسکین قلبی حاصل کرتا ہے تو کسی کو جاودہ طریقت میں اپنا مطلوب مل جاتا ہے غرض ثقہ، شریعت اور قویہ میں اخلاقی عنصر نایاں ہوتا ہے یعنی ذات باری تعالیٰ کو ایک اعلیٰ مقصد بہنا عقوبت الہی کے خوف کو ہر وقت سامنے رکھنا امر بالمعروف نہی عن المنکر، تصوف، طریقت اور تولا میں تاثری عنصر غالب ہوتا ہے، یعنی محبت الہی اور عشق حقیقی کے جذبات قلب پر وارد کرنا، ایمانیت کا جزو دونوں میں ہے۔ فرق صرف نظر لیتے ہیں ہے

(۴) داخلی تاثری عنصر۔

مذکورہ بالا بحث ہمیں خود بخود مذہبیت کے داخلی تاثری عنصر کی بحث کی طرف لے جاتی ہے۔ نفیات میں تاثرات کی اصطلاح، جذبات، وجدانات اور حسی حیثیات کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اگرچہ فلسفہ مذہب، یا الہیات کے نام سے، مذہب میں عقلی عنصر داخل کرنے کی کوشش ہمیشہ کی گئی ہے اور جب تک انسان، انسان ہو اور اپنے عقیدے کے لئے دلیلیں و دعوے ڈالتا رہے گا، اس وقت تک یہ کوشش بھی جاری رہے گی، لیکن مذہبیت کو طہارت اور غلطی کی خرابی پر چٹانے کی اس کوشش کے باوجود، نفیات مذہب کا مطالعہ انسان کو جس نتیجے پر پہنچاتا ہے وہ یہی ہے کہ ماسہ مذہبیت ہمیشہ ہر شخص کی جذباتی اور تاثری حیات شاعرہ کا ایک راز ہے، اور سرسراہٹ ایک انفرادی اور شخصی چیز ہے، مذہبیت کی جڑیں اگر کہیں ملیں گی تو صرف تاثرات کی گہرائیوں میں فلسفہ اور الہیات کی حیثیت زیادہ سے زیادہ وہی ہے، جو ایک متن کے کسی غیر زبان میں ترجمہ کی ہوتی ہے۔ غرض مذہب کا اساس ”سوز و گداز“ ہے اور چونکہ اسی کو اصطلاح میں تصوف کہتے

ہیں، اس لئے اس حصے میں ہماری بحث خاص طور پر تصوف ہی سے ہوگی۔

اگر ہم اپنے دل سے یہ سوال کریں کہ انسانی زندگی کی خاص الخاص غرض اس کی سب سے بڑی قوت محرکہ کیا ہو، تو جواب ملے گا کہ خوشی کی تلاش، خوشی کس طرح حاصل کیا جائے، کہاں و کھوڑھی جائے، کس طرح قائم رکھی جائے۔ یہی خواہش آدم تا ایں دم، بنی نوع انسان کے تمام افعال کی اصلی محرک رہی ہے جس حد تک کہ خدا سے لولگانا، اور اس کی رضا جوئی انسان کے نکلین دل کو، جو عقل جستجو اور کاوش فکری کا زخم خوردہ رہا ہو، مسرت سے مالا مال کر سکتی ہے، اس حد تک وہ زبانِ بیدار کرنے میں موثر ہوتی ہے۔

اسی طرح جذبہ مسرت کا عکس یعنی غم کا تاثر بھی انسان

رکھتا ہو۔ دنیا گزشتنی و گزشتنی ہو، مایا جال ہے۔ یہاں،

کے دم توڑنے کا نظارہ ہو، وارو گیر ہے۔ رستخیز ہے۔

سرخپہ کی طرف لے جاتا ہے، وہ نجات کی تلاش کرتا، اور خدا کو پالیتا ہو اگرچہ بادی الطہمیں۔ دونوں پہلو، مسرت اور غم، رجائیت اور قنوطیت ایک دوسرے سے متضاد نظر آتے ہیں۔ لیکن حاسہ مذہبیت کے بیدار کرنے میں دونوں یکساں طور پر موثر ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب میں ہیں یہ دونوں اجزا سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان دو اساسی تاثرات کا جو اثر مذہبیت پر پڑتا ہے۔ اس کی اس مختصر بحث کے بعد اب ہم ان تاثرات کی بحث کرتے ہیں جو تصوف کی کیفیت نفسی میں پائے جاتے ہیں۔

تصوف | اصطلاح تصوف کی تشریف کی کوشش میں نہیں کروں گا۔ اس سے میری مراد نفس کی وہ ناثری کیفیت ہے جب عبد اور معبود کے درمیان وجدانی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے، اب خواہ اس کیفیت میں رقت و سوز گداز کا پہلو نمایاں ہو، یا مسرت آمیز وجد و حال کا۔ اس صوفیانہ کیفیت نفسی کی بہترین مثال اگر کچھ ہو سکتی ہو تو وہ عشق کی کیفیت ہو۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ عشق مجازی کا معروض ادنیٰ اور محسوس ہوتا ہے اور عشق حقیقی کا معروض ایک تصور ہوتا ہے جس میں محسوسات کی کیفیت چلی

صحیح منزل میں ضبط اخلاق صرف ایمان باللہ ہی سے ہو سکتا ہے یعنی ایک سچی و بصیرت خیز سستی پر ایمان لانے سے جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اور جس کی طرف ہر انسان کو آخر میں جانا ہے۔ بعض مباح اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کے تمام افعال کا سرچشمہ محبت الہی ہوتی ہے، اور بعض مجالہ میں عامہ مذہبی کی محرک غیثت الہی ہوتی ہے۔ کسی کو شان رحیمی و کریمی کے تصور میں ایمانیت کا لطف آتا ہو تو کسی کو جباریت اور قہارت کے تصور میں کسی کی مذہبیت میں تولد غالب ہوتا ہے تو کسی کے یہاں شریعت کوئی پابندی ضرورت سے تسکین قلبی حاصل کرتا ہے تو کسی کو جادہ طریقت میں اپنا مطلوب مل جاتا ہے غرض ثقہ، اشریت اور توحیح میں اخلاقی عنصر نمایاں ہوتا ہے یعنی ذات باری تعالیٰ کو ایک اعلیٰ مقصد سمجھا عقوبت الہی کے خوف کو ہر وقت سامنے رکھنا امر بالمعروف نہی من المنکر، تصوف، طریقت اور تولد میں تاثری عنصر غالب ہوتا ہے یعنی محبت الہی اور عشق حقیقی کے جذبات قلب پر وارد کرنا، ایمانیت کا جزو دونوں میں ہے۔ فرق صرف نظر لیتے ہیں ہے

(۴)، داخلی تاثری عنصر۔

مذکورہ بالا بحث ہمیں خود بخود مذہبیت کے داخلی تاثری عنصر کی بحث کی طرف لے جاتی ہے۔

نفیات میں تاثرات کی اصطلاح، جذبات، وجدانات اور حسی حیثیات کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اگرچہ فلسفہ مذہب، یا الہیات کے نام سے، مذہب میں عقلی عنصر داخل کرنے کی کوشش ہمیشہ کی گئی ہے اور جب تک انسان، انسان ہو اور اپنے عقین اور عقیدے کے لئے دلیل و معروضہ تیار ہے گا، اس وقت تک یہ کوشش بھی جاری رہے گی، لیکن مذہبیت کو علیت اور فلسفے کی خواہ پر چڑھانے کی اس کوشش کے باوجود، نفیات مذہب کا مطالعہ انسان کو جس نتیجے پہنچاتا ہے وہ یہی ہے کہ ماحشر مذہبیت ہمیشہ ہر شخص کی جذباتی اور تاثری حیات شاعرہ کا ایک راز ہے، اور سراسر ایک انفرادی اور شخصی چیز ہے، مذہبیت کی جڑیں اگر کہیں ملیں گی تو صرف تاثرات کی گہرائیوں میں فلسفہ اور الہیات کی حیثیت زیادہ سے زیادہ وہی ہے، جو ایک تن کے کسی غیر زبان میں ترجمہ کی ہوتی ہے۔

غرض مذہب کا اساس "سوز و گداز" ہے اور چونکہ اسی کو اصطلاح میں تصوف کہتے

ہیں، اس نے اس حصے میں ہماری بحث خاص طور پر تصوف ہی سے ہوگی۔

اگر ہم اپنے دل سے یہ سوال کریں کہ انسانی زندگی کی خاص الخاص غرض اس کی سب سے بڑی قوت کون کیا ہو، تو جواب ملے گا کہ خوشی کی تلاش، خوشی کس طرح حاصل کیا جائے، کہاں دھونڈھی جائے، کس طرح قائم رکھی جائے۔ یہی خواہش آدم تا ابن دم، بنی نوع انسان کے تمام افعال کی اصلی محرک رہی ہے جس حد تک کہ خدا سے لڑ لگا، اور اس کی رضا جوئی انسان کے غلبین دل کو بوجھلی جتواور کاوش فکری کا زخم خوردہ رہا ہو، مسرت سے اللہ کی تسبیح و تہلیل کرتا رہا، پیدا کرنے میں موثر ہوتی ہے۔

اسی طرح جذبہ مسرت کا عکس یعنی غم کا تاثر بھی

رکھتا ہو۔ دنیا گزشتنی و گزشتنی ہو یا جاں ہے۔

کے دم توڑنے کا نظارہ ہو، واروگیر ہے۔ رستخیز ہے۔ یہ خیال بن انسان کے دل اور باطنی مسرت سے سرخسہ کی طرف لے جاتا ہے، وہ نجات کی تلاش کرتا، اور خدا کو پالیتا ہو اگرچہ بادی النظر میں یہ دونوں پہلو، مسرت اور غم، رجائیت اور فنوئیت ایک دوسرے سے متضاد نظر آتے ہیں۔ لیکن حاسہ مذہبیت کے بیدار کرنے میں دونوں یکساں طور پر موثر ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب میں ہیں یہ دونوں اجزا سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان دو اساسی تاثرات کا جواز مذہبیت پر پڑا ہے۔ اس کی اس مختصر بحث کے بعد اب ہم ان تاثرات کی بحث کرتے ہیں جو تصوف کی کیفیت نفسی میں پائے جاتے ہیں۔

تصوف | اصطلاح تصوف کی تشریف کی کوشش میں نہیں کر دیں گا۔ اس سے میری مراد نفس کی وہ تاثری کیفیت ہے جب عبد اور مبود کے درمیان وجدانی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے، اب خواہ اس کیفیت میں رقت و سوز گداز کا پہلو نمایاں ہو، یا مسرت آمیز وجد و حال کا۔ اس صوفیانہ کیفیت نفسی کی بہترین مثال اگر کچھ ہو سکتی ہو تو وہ عشق کی کیفیت ہو۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ عشق مجازی کا ماحول مادی اور محسوس ہوتا ہے اور عشق حقیقی کا ماحول ایک تصور ہوتا ہے جس میں محسوسات کی کیفیت لپ

جاتی ہے۔ اگر صوفیانہ واردات قلب کی نغیاتی تشریح کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سب ذیل چار خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ صوفیانہ کیفیت نفسی کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ناقابل اظہار اور ناقابل بیان ہوتی ہیں۔ وہ

دل من و اند و من و اتم و واند دل من
کا مصداق ہوتی ہیں۔ انسان اگر اسی نفسی حالت کو بیان کرنا چاہے تو صرف مثالوں سے اپنا مطلب سمجھا جاسکتا ہے، بقول غالب

بتی نہیں ہے، بادۂ وساغر کے بغیر
جس طرح سے موسیقی سے کوئی کن رس ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے، یا عشق کی کیفیت کو کوئی
ماشق ہی سمجھ سکتا ہے، اسی طرح صوفیانہ کیفیات نفسی کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسی قسم کے
واردات قلب پر طاری ہوئے ہوں۔

۲۔ دوسری خصوصیت صوفیانہ کیفیت نفسی کی یہ ہوتی ہے کہ ان میں کسی قدر وقوفی یا ادراکی
صفت بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی ایک خاص قسم کی بصیرت افروزی بدۂ دل وا ہو جاتا ہے، اور اس
ذوالہے راز کے محرم ہو جاتے ہیں۔ ان حالتوں میں غایت درجہ کی تجلیت اور معنویت ہوتی ہے جس کا
اثر اس کیفیت کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ انسان اپنی زندگی کے ان بصیرت افروز لمحات کو کبھی
فراموش نہیں کر سکتا۔ کوئی عقلی دلیل یا منطقی بحث ان پر حقیقت لمحات زندگی کی معنوی قدر و قیمت
کو کم نہیں کر سکتی۔

۳۔ تیسری خصوصیت صوفیانہ کیفیت نفسی کی یہ ہے کہ وہ عارضی اور خواب آسا ہوتی ہیں۔
وہ بجلی کی طرح کوند کے غائب ہو جاتی ہیں اور انسان ”لب تشہ تعمر“ ہی رہ جاتا ہے۔

۴۔ سب سے آخری خصوصیت ان کی اضطرابیت اور انفعالییت ہے۔ اگرچہ خارجی ذرائع
سے انسان اپنے نفس کو ان کیفیات کے زوال کے لئے تیار کر سکتا ہے، مثلاً بعض جسمانی ریاضتوں یا

ہمنوں سے، یا موسیقی اور بخور کی مدد سے، یا دھیان اور سادھی کے ذریعے سے لیکن جب ایک رتیبہ یہ حالت طاری ہو جاتی ہے تو اس وقت نفس کی کیفیت سراسر انفعالیّت کی ہوتی ہے۔

رشتہ درگروں، اگنہ دوست می برد ہر جا کہ ٹھسہ خواہاوت

وہ ایک باطنی قوت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہوتا ہے، خیالات پر بھی اسی قوت کی نظرانی ہوتی ہے۔ قوت ہاوی سلب ہو جاتی ہے۔ اکثر تو شدتِ آخر کی وجہ سے ہوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ چونکہ اکثر دماغی امراض میں بعینہ وہی منظر ہر نظر آتے ہیں جو صوفیاء کی کیفیات نفسی میں مثلاً انہماک کی حالت میں آدمی نئی نئی فکلیں دیکھتا ہے، اور نئی نئی آوازیں سنتا ہے۔ صریح کی۔ امت پر جو نفس نہایت اسامات ہوتے ہیں، ہسٹریا کی حالت میں رقت قلب بڑے

کی صورت میں اعضا جسمانی معطل ہو جاتے ہیں، اس سے کوئی بات نہیں ہے کہ وہ صوفیاء کی کیفیات نفسی کو بھی خاص خاص

وہ سمجھتے ہیں کہ گویا ایسا کرنے سے ان کیفیات نفسی کی ساری معنویت غائب ہو جاتی ہے۔ جیمس نے جو اتفاق رائے امیکہ کے اس صدی کے سب سے زیادہ مستند اور متبحر عالمِ انبیات ہیں، اپنی کتاب *Varieties of Religious Experience* (تجرباتِ مذہبی کی گونا گونی) میں جس سے میں نے بھی بہت کچھ استفادہ کیا ہے، اس طرزِ خیال کا نام ”طبی مادیت“ رکھا ہے، اور اعتراضات پر گہری نظر ڈالی ہے، میں انھیں کے الفاظ آپ کے سامنے بیان کئے دیتا ہوں اور چونکہ یہ کسی ”عربی“ کے لفظ نہیں، بلکہ ایک مشہور روزگار فلسفی اور ماہرِ علمِ نفس کے الفاظ ہیں، اس لئے امید ہے کہ ہمارے معترضین ان پر غور کریں گے، وہ لکھتے ہیں :-

”طبی مادیت سینٹ پال کی مذہبیت کا خاتمہ یہ کہہ کے کر دیتی ہے کہ دھن کی شرک پر جو مکاشفہ کی حالت ان بطاری ہوئی تھی وہ ”تفنن موخری“ کے ناسور کی وجہ سے تھی اور وہ صریح کے مریض تھے، سینٹ ٹیریس (St. Teresa) کے تقدس کا چلغ یہ کہہ کر گل کر دیتی ہے کہ وہ ہسٹریا کی مریضہ تھیں، سینٹ فرانسس کو یہ کہہ کر ختم

کہتی ہو کہ اخل کی طرف راجع ہونے کا میلان ان میں موروئی تھا۔ جارج فاکس
 جو نفرت تھی اور روحانی صداقت کے لئے اس میں جو بے یقینی پیدا ہو گئی تھی اسے اعتدال
 اختیار بتاتی ہو۔ کارلائل کے اقوال میں تنوعیت اور مایوسی کے جو سرپائے جاتے
 ہیں ان کی وجہ اس کا اعتدال قرار دیتی ہو اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس قسم کے نام
 نفسی حیوانات جسم کی مرض پذیری کے نتائج میں اور بعض غدد کے غیر طبی۔ فاعل
 کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بعد طبی مادیت بڑے مفروضات کے ساتھ
 کہتی ہو کہ دیکھا میں نے ان تمام بڑی بڑی برگزیدہ ہستیوں کی قلعی کھول کے رکھی ہے
 اس کے بعد پروفیسر ولیم جس فرماتے ہیں :-

”اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ واردات ذہنی کے اس طرح محض واقعاتی بیان
 سے ان کی روحانی معنویت پر کسی قسم کا بھی اثر پڑتا ہے؟ ویسے تو ہمارے ذہن کی کوئی
 حالت اسے منع ہو یا اعلیٰ، صحیح الدماغی کی وجہ سے ہو یا عصبی امراض کی وجہ سے، انبساطی
 ہو یا مزینہ ایسی نہیں ہے کہ کوئی نہ کوئی جسمی تغیر اس کی وجہ نہ ہو۔ علمی نقطے بھی ان
 جسمی تغیرات کا اسی طرح نتیجہ ہوتے ہیں جس طرح کہ مذہبی تاثرات، اور اگر واقعات کا پوری
 پوری طرح علم مہجائے تو شاید ہم کو کتر دہرے کے دہریت آمیز خیالات میں بھی جگر کے
 فعل کی خرابی اسی طرح نظر آئے جس طرح کہ آج (طبی مادیت کو) اس مینوٹسٹ میں نظر
 آتی ہو جو اپنی روحانی نجات کے لئے بے چین ہے!“

آخر میں وہ اپنی قطعی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں :-
 ”الغرض نفس کے کسی مذہبی تاثر کی جسمی وجہ بیان کر کے یہ دعویٰ کرنا کہ اس طرح اس کی
 اعلیٰ روحانی قدر و قیمت میں فرق آگیا ہو۔ سراسر ایک بے تکی مادہ فیر منطقی بات ہو۔ اگر
 یہی صحیح ہو تو پھر تو ہمارے کسی خیال اور کسی تاثر میں شک کسی علمی نقطے میں بھی

کسی قسم کی حقیقت باقی نہ رہتی، اس لئے کہ ان سب پر یکساں طور پر انسان کے جسم کی حالت کا اثر پڑتا ہے۔ پس ہمیں چاہئے کہ اس کل معاملے پر دیات کے ساتھ غور کریں، جب ہم کسی نفسی کیفیت کو دوسری نفسی کیفیتوں پر ترجیح دیتے ہیں تو کیا ہم وجہ سے کہ ہمیں اس کے جسمی مقدمات معلوم ہیں۔ مگر نہیں، بلکہ ہماری اس توجہ کے صرف دو وجوہ ہوتے ہیں اولاً تو یہ کہ ہمیں ان نفسی کیفیات سے فوری مسرت ہوتی ہے یا پھر کہ ہم سمجھتے ہیں کہ انجام کا یہ ان کے نائنائی ہماری زندگی سے ملنے یا آؤنا ہوں گے۔ الغرض

نفسی کیفیات کا ہماری رایوں کے مطابق یہ
یہی وہ معیار ہیں جن سے کسی خیال یا اثر کی

صوفیانہ حالت کی بسیط ترین مثال تو وہ کیفیت ہے جو کہ ہے۔ وہ شعر ہم پہلے بھی سن چکے ہیں لیکن ایک دقت ایسا آتا ہے جب وہ دال میں تراؤ مولد نفس کے تاروں کو ایک خاص انداز سے چھیڑ دیتا ہو۔ اس شعر کی معنویت جیسی اس حالت میں ہم پر آشوب ہوتی ہے، پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک نیا ہی جہان معنی ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح بعض منظر قدرت، خوشبوئیں، روشنی اور اندھیرے کا جوگ، سطح سمندر پر دھوپ پھاؤں کا نظارہ، پھولوں کا گلنا، یہ سب باتیں بھی نفس انسانی کے کل پرزوں میں کوک بھرتی ہے۔

اس کے بعد دوسری منزل یہ ہو سکتی ہے کہ ہم پر بعض اوقات دفعتاً اور بغیر ہمارے علم اور ارادے کے ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہم ایک نئے مکان میں داخل ہوتے ہیں یا ایک اجنبی شخص سے ملتے ہیں یا ایک بالکل ہی نئی بات سنتے ہیں لیکن ذہن میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ جیسے ہم اس مکان یا شخص کو پہلے کہیں ضرور دیکھ چکے ہیں یا اس بات کو پہلے کہیں ضرور سن چکے ہیں۔ آپ میں سے اکثر حضرات اس کیفیت نفسی کا تجربہ کر چکے ہوں گے۔ اس کا کوئی نام نہیں رکھا جاسکتا، بس یوں سمجھئے کہ

انچہ می ٹیم، بیداری است یارب یا بجزاب
 کی سی حالت ہوتی تھی جس میں ذرا دیر کے لئے ہی سہی لیکن ہمارا ادراک غیر معمولی طور پر وسیع ہو جاتا
 ہے۔ چارلس گلس نے اپنے متعلق لکھا ہے:-

”جب میں میدانوں میں ٹہلنے کے لئے نکلتا ہوں تو اکثر یہ باطنی تاثر میرے نفس پر پڑتا
 ہوتا ہے کہ ہر چیز جو مجھے نظر آرہی، کچھ نہ کچھ معنی ضرور رکھتی، بشرطیکہ میں اسے سمجھ سکوں
 اور بعض اوقات یہ احساس کہ میرے گرد و پیش حقائق و معارف ہیں، جنہیں میں سمجھ نہیں
 سکتا، اکثر مجھ پر ایک ناقابل اظہار کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ کیا تم نے کبھی میسوس نہیں
 کیا ہے کہ تمہاری اصلی روح تمہارے نفس کی آنکھوں سے بجز صرف چند مقدس لمحات
 کے پوشیدہ رہتی ہے؟“

اس کے بعد خالص تصوف مذہبی کی منزل آتی ہے۔ ہر مذہب میں ہیں صوفیاء خیالات نظر
 آتے ہیں، اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ان میں عجیب و غریب یک رنگی نظر آتی ہے۔ سینٹ
 ٹیرلیا کے واردات قلبی پڑے جو ان کی کتاب *The Anterior Castle* میں بیان کئے گئے
 ہیں اور پھر ان کا موازنہ و مقابلہ سلمان صوفیہ اور ہندو یوگیوں کے تجربات سے کیئے تو ایک ایسی
 یکسانی اور مشابہت نظر آتی ہے کہ انسان اس اعتراف پر مجبور ہوتا ہے کہ ان لمحات زندگی میں
 واقعی ایک عجیب و غریب روحانی مغویت پائی جاتی ہے۔

اسلام میں تصوف کے مختلف مذاہب کے متعلق آپ حضرات کے سامنے مجھے کچھ عرض کرنے
 کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں صرف حضرت امام غزالیؒ کی خود نوشتہ سوانح عمری سے ان کے
 ان ذاتی تجربات کو آپ کے سامنے پیش کئے دیتا ہوں جو صوفیاء کی کیفیت نفسی پیدا کرنے کی کوشش
 میں انہیں ہوئے۔ چونکہ سلمان صوفیہ میں اس قسم کی خود نوشتہ سوانحیں بہت کم پائی جاتی
 ہیں، اس لئے امام غزالیؒ کے واردات قلب کی تشریح خود ان کی زبان سے سننا خالی از غفلت
 نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں:-

”تصوف کی غایت یہ ہر کہ دل ماسوا اللہ سے ہٹ کر صرف باری تعالیٰ کے تصور میں محو ہو جائے، چونکہ میرے لئے نظریہ عمل سے زیادہ آسان تھا، اس لئے میں نے شروع میں تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اور جو کچھ کتابوں کے پڑھنے یا سننے سے حاصل ہو سکتا تھا، وہ سب حاصل کیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ نظریہ تصوف کا نام نہ صرف جزو ایسا ہے کہ اس کی حقیقت کسی مطالعے سے نہیں آسکتی، بلکہ عملاً بھی بہت آہستہ و آخٹار آہو سکتی ہے۔ مثلاً غور کر۔

اور ان کے اسباب نفس سے واقف ہونا

اور صرف یہ علم رکھنا کہ نئے کے اسباب کیا ہیں۔

نشہ پیدا کرتے ہیں اور فی الواقع حالت نشہ میں ہونے میں کس آئینہ آسان کا فرق ہے۔ وہ انسان جو نشہ میں ہوتا ہے وہ نہ تو نشہ کی تعریف جانتا ہے اور نہ اسے اس سے سروکار ہے کہ نشہ کو علمی بحثوں سے کیا تعلق ہے، لیکن طبیب اگرچہ نشہ میں نہیں ہوتا مگر اس کی ماہیت اور علامات سے واقف ہوتا ہے۔ یعنی یہی فرق ترک لذات کی ماہیت سے واقف ہونے اور خود تارک لذات ہونے میں ہے۔ غرض کہ جہاں تک کہ الفاظ سے تصوف کی ماہیت معلوم ہو سکتی تھی، وہ میں نے حاصل کر لی، لیکن جو کچھ باقی تھا وہ ایسا تھا جو کسی مطالعہ یا قال سے حاصل نہ ہو سکتا تھا، بلکہ ضرر خود کو وقف حال کرنے اور تقویٰ کی زندگی بسر کرنے سے اس کی حقیقت کھل سکتی تھی۔“

مطور بالا سے آپ حضرات کو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ کیفیات میں تصوف کی اصطلاح کسی

خاص محدود معنی میں نہیں، بلکہ وسیع ترین معنوں میں استعمال ہوتی ہے، مذہبی اور غیر مذہبی ہر قسم کی صوفیانہ کیفیات نفسی اس کے مفہوم میں داخل ہیں، یعنی ایسی تمام کیفیات نفسی جو اپنی بصیرت افروزی، انفعالیات، ناقابل بیان ہونے کی خصوصیت اور عارضیت کی وجہ سے دوسری کیفیتوں سے متماثر ہوں۔ یہ حالت کسی خاص طبقے یا ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہندویت، بودھ، یا اسلام

بودہ مت ہو یا عیسائیت ہر مذہب کے صوفیانہ تاثرات میں ہیں ایک سی کیفیت نظر آتی ہے، جب ایک اس وجہ سے ہو کہ اس کی قدر مشترک یعنی ایمان باللہ وہی ایک ہو۔

(د) عنصر عقلی

اب ہم ایمانیت کے عناصر خمسہ میں سے پانچویں عنصر، یعنی عنصر عقلی سے بحث کرتے ہیں۔ اگرچہ مذہبیت سر اسر ایک نفسی اور تاثری چیز ہے، تاہم عنصر عقلی کا دخل بھی اس میں کچھ نہ کچھ ضرور ہو۔ اور اگر ایمان آفرینی میں نہیں تو کم از کم ایمانی کیفیت کی توجیہ میں عقل و استدلال سے ضرور کام لیا جاتا ہے عقلی استدلال کی بھی اکثر صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے انسان وجود باری تعالیٰ کا ثبوت پاتا ہے، یا اگر ثبوت نہیں پاتا تو لادری کہہ کر چپ ہو جاتا ہے جو خود اثبات واجب الوجود کی ایک سلیبی منسل ہی ہے بقول مالکی۔

بجما ہے پرے تجھ کو اور اک کی سرحد جس قوم نے رکھا ہے، انکار و اتیرا۔
سب سر پہلی دلیل جو وجود مطلق کی پیش کی جاتی ہے وہ ایک استخراجی قیاس منطقی ہے فلاسفہ میں سے ڈیکارٹ (Descartes) اور لائب نٹز (Leibnitz) نے اس قیاس سے اثبات واجب الوجود کے متعلق استنباط کیا ہو۔ ڈیکارٹ کی دلیل مختصر یہ ہے۔
تصور الہی ایک مکمل ہستی کا تصور ہے۔
وجود ایک کمال ہو اور عدم وجود ایک نقص۔
ایک کامل ہستی میں صفت وجود کا ہونا ضروری ہو۔
پس خدا موجود ہے۔

دوسری عقلی ویلیں تجربات انسانی سے ماخوذ ہیں، مثلاً علت و معلول کے سلسلے سے وجود باری تعالیٰ کا ثابت ہونا، دنیا میں کوئی معلول بغیر علت کے نہیں ہو سکتا اور ہر علت کے لئے بھی کوئی نہ کوئی سابقہ علت ضرور ہونی چاہئے، اور اس طرح یہ سلسلہ علت اول یعنی خدا پر جا کر ٹھہر آتا ہے۔ ایک اور دلیل یہ ہے کہ اشیاء عالم کی ہر چیز کی ایک خالق کے وجود کا پتہ دیتی ہے، مثلاً ذری الحیات کی ہر

ترکبی میں ہیں بہت سی باتیں ایسی ملتی ہیں جن کی توجیہ محض طبی قوانین سے نہیں ہو سکتی، مثلاً ان کی زندگی اور ان کی جبلتیں، ان کے وجود کا منشاء نظام کائنات میں صرف اپنے بقائے ذات کے علاوہ اور کچھ ضرور ہے تمام اشیاء میں ایک واحد نظام کا فرمانفر آلت۔ اثرات کے لباس میں وحدت جلوہ گر ہو، غرضکہ ان مختلف صورتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب سے آخر میں اثبات واجب الوجود کی ابتداء کے ضمن میں کی جا چکی ہے، یعنی اخلاقی اقتصاد ہونے کے لئے خدا کے وجود کو ضروری سمجھنا

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان دلائل کے بیان کرنے سے یہ مطلب یہ نہیں ہو سکتا حقیقت کو بھی یہ دلیل قابل قبول ہیں یا نہیں، میرے اس مقالے کے وجودہ حصے میں وہ ایک نیا نیا فیاتی مسئلہ ہے، یعنی یہ کہ ایمانیت پر استدلال اور عقلیت کا اثر کیا ہوتا ہے؟ مجھے امید ہے کہ سابقہ بحثوں سے میرے سامعین یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ انسان کے عقیدے پر زیادہ تر اثر ہمارے آثار و جذبات کا پڑتا ہے اور بہت کم عقل و استدلال کا لیکن اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ عقل کا حصہ باطل ہوتا ہی نہیں ہے۔ معتقدات کی بنیاد خواہ آثار و جذبات ہوں یا جذبات، لیکن ان کی جرح و قبح نقد و نظر میں زیادہ تر عنصر عقلی ہی کا دخل ہے بے ربط عقائد و خیالات کو کوئی ذہن قبول نہیں کر سکتا ایسے عقائد جو ہمارے مجموعی علم سے میل نہ رکھائیں، درجہ قبولیت حاصل نہیں کر سکتے۔ عقلیت کے معیاروں کے خاص خاص صورتوں میں مفید ہونے میں کے کلام ہو سکتا ہے، ہمارا سارا فلسفہ اور ہمارے تمام علوم صحیحہ عقلیت کے معیاروں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن۔

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مکانے وارد

کیا فرض ہے کہ انسانی زندگی کی سی ایک پیچیدہ اور مختلف الیشیات چیز بھی انہیں معیاروں سے جانچی جائے۔ اگر مجموعی حیثیت سے انسان کی حیات نفسی پر نظر ڈالے تو معلوم ہوتا ہے کہ عقلیت اور منطقیت صرف اس کے ایک جزو کی تشفی کر سکتی ہے اور بس، یعنی صرف قوائے استدلالیہ کی ان

قرآن کی جو چرب زبان ہیں، دلیل بازی خوب کہلتی ہیں، منطق بگھاڑ لیتی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ہم
 کی دوسری خاموش، لیکن طوفانی کیفیتیں بھی ہوتی ہیں، یعنی آپ کی پوری غیر شعوری زندگی، آپ
 کے رجحانات، معتقدات، الہامات فطری، اثرات اور وجدانات ان سب کے متعلق عقلیت کسی
 قسم کا ادا مانہیں کر سکتی۔ اس کے مقدمات صفر سے دیکر لے، جب تک کہ پہلے ان سب زبان قبول
 سے مندرجہ قبولیت نہ پالیں، تسلیم ہی نہیں کئے جاسکتے۔

حضرات یا دور کے کہ جس طرح عقلیت عقیدے کی دنیا کو متزلزل نہیں کر سکتی، اسی طرح
 سے محض عقلی دلیل اور منطق سے عقیدے قائم بھی نہیں ہوتے۔ اثبات واجب الوجود کے متعلق
 منطقی دسیلوں سے کسی کو اس کا یقین نہیں پیدا ہو سکتا۔ نرمی منطقی ہمیشہ ایسا ہی کیفیت نہیں پیدا
 کر سکتیں۔

ہندوستان میں جب سے انگریزی تعلیم اور مغربی سائنس کا رواج ہوا، ایک تعلیم یافتہ طبقہ پیدا
 پیدا ہو گیا ہے، جسے اس وقت تک چین ہی نہیں آیا جب تک کہ وہ صحف سماوی سے نیٹوں کا کلیہ
 کشش ثقل اور ڈارون کا نظریہ ارتقاء ثابت نہ کرے، حاسہ مذہبی اور ایمانیت کو ان کو ششوں پر ہی
 کبھی ہو، اس کے اثرات اور وجدانات ہی اس کے لئے کافی شہادتیں ہیں۔ وہ ان غلصہ، لیکن کم گرو
 راہ عقل و دانش کے پتوں سے اکبر کی زبان میں کہتی ہے۔

شعر میں کہتا ہوں، ہے تم کرو

سائنس کو صرف کلیات اور تمیمات سے مطلب ہے، وہ ابر رحمت کو عمل حرارت و تقطیر کہتی ہے، اسے
 اس سے کیا بحث کہ غریب کسان اسے کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس کا نقطہ نگاہ سراسر غیر شخصی ہے
 سائنس کا خدا صرف عمومی قوانین کا خدا ہے، بقول حمیس کے ”وہ توک فروشی کرتا ہے، خوردہ
 فروشی نہیں کرتا“ غرض دنیا کے مذہب میں سائنس ہو یا عقلیت، دونوں کے پاؤں ”پائے چوبیا
 سخت بے تکلیف بود“ کے مصداق ہیں، حاسہ مذہبی ایک شخصی راز ہے، اور زیادہ تر شخص کے
 جذبات اور تاثرات پر منحصر ہے، اور یہ دل کی انجان گہرائیوں میں پرورش پاتے ہیں، اور انسان

کے حل پر اپنا رنگ چڑھاتے ہیں

نفس انسانی کا مطالعہ ہمیں جس نتیجے پر پہنچاتا ہے وہ یہ ہے کہ نفس کی کچھ باطنی مشکلات تپتی
 نہیں اور وہ ان کا حل تلاش کرتے ہیں، حاسہ مذہبی، یا ایمانیت ہی ایک ایسا جامع اِغْثِیَاتِ حَلِّ ہو
 جو روح کے اکثر امراض کے لئے نسخہ شفا کا حکم رکھتا ہے، انسان اپنی ترکیبی نفسی کے اعتبار سے بلکہ
 اپنی باطنی ضروریات کے تقاضے سے اس حل پر پہنچنے پر مجبور نہیں۔ چاہے نام مختلف ہوں، لیکن
 و عبادات میں فرق ہو، نظریے الگ الگ ہوں لیکن ہر مذہب کی قدر مشترک یہی حال مذہبی ہو
 یہ جس کسی میں اور جہاں کہیں پایا جائے، کم از کم اتنا ہی قابلِ قدر ہے۔
 اس حقیقت کو سمجھ لیں، تو ہم میں دوسروں کے مذہبی عقائد
 کہ خواہ ہم ان کے ہم خیال نہ ہوں لیکن ہمارے دل میں ان کے
 جو جائے اور ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ
 ایک پُرانیست دین بزم کا از پر تو آں ہر کجا می نگری، ایچھے سانتمہ امد

مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط قاضی عبدالغفار صاحب کے نام

برادر ام السلام علیکم - خدا تہیں تندرست رکھے اور خوش اور اسی طرح صداقت و صبر پر قائم۔ آگت میں چند دن کے لئے ایک دور سنسری پر لطف مگر وقت و مقابلہ طلب آگیا تھا۔ اسی زمانہ میں تم کو بھی شکایت کا موقع ملا تھا۔ میں نے اس کے بعد ہی تم کو ایک مفصل و مشروح خط یہاں کے حالات کا لکھا تھا جس میں ان سنسری صاحب کے عہد نظامی کے حالات بھی شامل تھے۔ مگر پھر اس خیال کو بچاڑ ڈالا کہ نئے سنسری صاحب کا طرز عمل بالکل مختلف تھا اور جب حالات ماضیہ بدل گئے تھے تو پھر ان کا تذکرہ بھی عبث تھا۔ اس کے بعد تم کو خط لکھا مگر بھائی مجھے اس شفا خانہ "امن" کی "سین فلارنس ٹیٹنگل" بنا پڑا۔ بیگم صاحب پہلے علیل ہوئیں پھر گلزار کو انٹرکٹ ہوا۔ پھر میں دن وہ اچھے ہوئے اسی دن بیگم صاحبہ پھر علیل ہوئیں اور رفتہ رفتہ خدا خدا کر کے ان کو شفا ہوئی تو مستحکم کے ہمراہ ان کے دونوں بھائی آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیچارہ سواد اپنے خاتمہ ساتھ انٹرکٹ لایا۔ اس عمر میں یہ مرض نہایت خطرناک ہوتا ہے اور سوائے زرسنگ کے کچھ علاج ہی نہیں۔ چنانچہ اپنا سارا تجربہ تیمارداری کا کام میں لانا پڑا۔ شوکت صاحب بھی حواریہ لائے۔ پیر میں پھر ڈیا بلی۔ جوش میں آگئے۔ ہم نے لاکھ کہا کہ ہمارا مرہم لگاؤ۔ اچھے ہو جاؤ گے مگر نہ مانا۔ جب گویا نہ بذات تراوش کئے بغیر نہ ہے اسٹنٹ سرجن سے چیرا گویا۔ اس میں لیکن کچھ مادہ فاسد داخل ہو گیا۔ (Eczthema) میں مبتلا

(۱) بیماری بخار

یہی ہی میں سے نکالا جا ہے۔ تنہا تو ذکر کیا ہے۔ خود گورنٹ کے عہدہ دار اس کو بآسانی
 بکھڑکتے ہیں کہ شوکت جہیں ملاوہ راجپور کے گاؤں کے ٹھیکہ کے بس میں سے چارو
 ہزار روپے کا گورنٹ خود چھ سو کے قریب ماہانہ دیتی تھی اور میرے لئے مستحقین
 کے یہ ڈھائی ڈھائی سو کہاں تک کافی ہو سکتے ہیں۔ امید ہے کہ جس رزاق نے رزق میں
 پہلے قرائی عطا فرمائی تھی وہی آج بھی عطا فرمائے گا۔ اور الاؤنس میں اضافہ ہو جائے گا۔
 اور منسٹر چ گورنٹ ادا کرے گی۔ بغیر "allowance" کے سخت مشکل
 ہوگی۔ مگر ہم آخر پیدا ہی کس لئے کئے گئے ہیں جانتے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں
 ہمارے بھائی ہیں جنہیں ہماری ایسری کی روزی اور رزق قارون کا خزانہ معلوم ہوتا ہو
 اگر وہ زندہ رہ سکتے ہیں اور خدا کا شکر بجا لاتے ہیں تو ہم یہ کیوں نہیں کر سکتے۔

جب سے یہ معلوم ہوا کہ خود لارڈ چانسلر سابق قانون تحفظ ہند کو گورنٹ اور
 کونسل واضح آئین و قوانین کے اختیارات قانون سازی کے باہر سمجھتے ہیں۔ اور انڈیا
 آفس کو خود اس کا اعتراف ہی خیال ہوا ہے کہ اس کے متعلق کچھ کارروائی کروں چنانچہ منظر کو
 بلائیے۔ ڈپٹی کمشنر نے احتیاطاً گورنٹ سے بھی استعواب کر لیا ہو۔ اور گورنٹ نے
 انہیں اطلاع دیدی کہ منظر شوق سے آسکتے ہیں۔ نہ معلوم پیارہ کو فرصت بھی مل سکے
 گی یا نہیں۔ اگر محرم میں آگئے تو اچھا ہوگا۔ ارکوبال بچے بانگی پور گئے۔ آج شب کو والدہ
 آرہی ہیں۔ ارہی کو حیات آگیا۔ اس لئے دل نہیں گھبرایا اور یہاں تو عقیدہ ہے کہ

انساں بجائے خود بھی ہواک مشیر خیال

ہم انجن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اب زیادہ نہیں لکھتا۔ اب سلسلہ پھر جاری ہو گیا ہے اس لئے متوقع رہو کہ مزید
 خطوط پھر آیا کریں گے۔ کہو (میں نے) تو شاید اب نہ آتا ہو۔ کیا (میں نے) (میں نے)

بھی بند ہو گیا۔ اخبار اور رسالے جو ضرورت سے زائد ہوں بھجوا کر دو۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔ خوب کام کر رہے۔ والد ب اوقات رشک آتا ہے۔ اگر اپنی قتل نہ سمجھو تو کہوں کہ اردو کے محمد علی ہو۔ یہ غصے ختم ہوں گے تو نہ معلوم اخبار کی پھر ضرورت بھی رہے یا نہیں لیکن اگر سب کچھ نکالنے کے بعد پھر بھی اخبار نکالنا پڑا تو ہمدرد ہو گا اور تم۔ میں تو فیشن لے لوں گا اور صرف زبان کے چٹا رکھے لیا کروں گا۔ جیسا تو سلام کتاب ہے۔ شوکت جہاں فرماتے ہیں کہ میرے سر پر قرآن امین کا بھوت سوار ہے۔ خدا

کے اس کا کلام بھجوا دو۔ صداقت کے چند مداح یہاں کا اظہار کرتے ہیں۔ میاں حسرت کی غزل کیا خوب در

(انجمن صنفیہ) کے چند اشعار موعظہ قطع کے لایا بواب میں۔ شوکت د

(بھائیو سلام علیکم) کو ایک کارڈ لکھیں بجواب ان کی مکمل چٹھی کے کہ میری رائے ہے کہ بہتر تو یہ ہو کہ آپ سرے سے گلگتہ جائیں ہی نہیں۔ اور اگر ”علی بخت“ کا اس قدر شوق ہے تو یہاں چلے آئیے۔ ہم دونوں بھائی کافی سالہ فراہم کر دیں گے۔ اچھا خلعت تہہ

محمد علی

ایران جدید

ہندوستان کی افوسناک فرقہ وارانہ کشمکش نے وہ سنگین ماحول کرنے کیلئے جس کی تیسرے قب کو ضرورت تھی مجھے اس موسم گرما میں ایک ہمسایہ قوم کے آغوش میں پہنچا دیا۔ مجھ وہاں پہنچکر باپوس نہیں ہونا پڑا۔ ایرانی اپنے مکی مراہل کو ملے کرنے میں ایسی ہوشمندی اور دست نظر سے کام لے رہی ہیں جو ہم سب کے لئے ایک اچھی خاصی مثال بن سکتی ہے۔ ہندوہی اور فرقہ وارانہ اختلافات جن کی وجہ سے ہندوستان میں آپس کے مناقشات روز بروز بڑھتے جلتے ہیں ان کا ایران میں نام بھی نہیں وہاں تمام فرقے بحیثیت ایرانی باشندے کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کو استوار کرتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ایرانی قانون ازدواج ہے جو کہ گذشتہ ستر میں پاس کیا گیا ہے، یہ قانون تمام ایرانیوں کے لئے ہے جس میں مسلمان، پارسی، عیسائی اور یہودی سب شامل ہیں اور تمام ملک نے اس کو دل سے قبول کر لیا ہے۔ نابالغوں کے لئے جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو جسمانی لحاظ سے شادی کے قابل نہیں شادی کرنا قانوناً جرم قرار دیدیا گیا ہے، علاوہ ان نابالغوں کے جن کی شادی ہو، تمام وہ اشخاص جو اس قسم کی شادیوں کے ذمہ دار ٹھہریں، سزائے قید کے مستوجب قرار پاتے ہیں جس کی میعاد ۳ سال تک رکھی گئی ہے۔ نکاح اور طلاق کی رجسٹری کرنا ضروری ہے اور اس کی فروگذاشت کے جرم میں شوہر کو چھ ماہ کی سزائے قید ہو سکتی ہے۔ شادی کے وقت شوہر اور زوجہ کو حق ماحل ہوتا ہے کہ نکاح نامہ میں ایسے شرائط تحریر کرالیں جن کے مطابق فریقین کے آئندہ تعلقات کا فیصلہ ہو کرے گا۔ جانین کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملت اور شریعت کے قدیم روایات پر قائم رہیں۔ یا کوئی جڑی بھیا اختیار کر لیں۔ بجز اس صورت کے کہ نکاح نامہ کے شرائط خود ازدواجی تعلقات کے منافی

پہلے ان شرائط کا غاؤسہ کاری عدالتوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے جن میں علماء کے طبقہ کو کوئی دخل نہیں ہو، نواح کے رسم و رواج کا تعلق جہاں تک قانون سے ہو اس کو طبقہ علماء کے ہاتھ سے قریب قریب بالکل نکال لیا ہے۔ اور یہ تعلیمیافتہ ایرانیوں کی عین خواہش ہو کہ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ لارڈ کرزن جیسے سیاحوں کی رائے ہو کہ ایرانی فریبی اور ناقابل اعتماد ہوتے ہیں لیکن یہ ان کے ساتھ مصیبتنا انصافی ہے۔ ایرانی لوگوں کی تعریف کرنے میں الفاظ کا طواریاں بندہ نیتے ہیں لیکن یہ محض ان کی خوش خلقی کا ایک راز ہو۔ ورنہ ان الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ آپ کو شکل سے کوئی قوم ملے گی جس کے ہر طبقہ کے لوگوں میں یکساں طرز و اخلاق اور مروت اس قدر پائی جاتی ہو جتنی کہ ایرانیوں کی ہیں گالی گلوچ یہودہ الفاظ سننے میں نہیں آتے، اگر۔

مساشرتی زندگی سے مقابلہ کریں تو دو باتوں میں نمایاں فرق پائیے۔

کافرق ہے، نہ مختلف طبقوں میں بیچ ادب۔ نہ بڑے بڑے امراء کا کوئی طبقہ ہو جو دولت سے سرشار ہو، نہ فاقہ مستوں کا کوئی طبقہ ہو جو بالکل تباہ حال ہو۔ اس لحاظ سے ایرانیوں میں جتنی یک رنگی ہو اتنی مشرق کے کسی دوسری قوم بلکہ شاید دنیا کی کسی قوم میں نہ ہوگی۔ مسلمانوں کے درود سے قبل ایران میں ذات پات کی خفیف سی جھلک پائی جاتی تھی۔ لیکن سامیوں کی فتوحات نے اس کی بھی پوری طرح بیخ کنی کر دی، اس کے بعد پھر کسی ذات پات کا رواج نہ ہو سکا۔ اب وہاں کے تعلیمات طبقہ اور عوام الناس کے درمیان کوئی ظلیج حائل نہیں۔ تمام ایرانی اپنے ملک کے ہر باشندہ کو اپنا ہم مرتبہ سمجھتے ہیں اور مساوات کا بتاؤ رکھتے ہیں۔ اسی قسم کی سوسائٹی میں تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات نہایت سرعت کے ساتھ عوام الناس تک پہنچ کر ان میں خود بخود اثر کر جاتے ہیں اس کے علاوہ بخلاف ہماری قوم کے ایرانی جدید روشنی اور خیالات کو قبول کرنے اور اختیار کرنے پر بالخصوص زیادہ مائل ہیں کسی نئے خیال کے وہ اتنے ہی گرویدہ ہوتے ہیں جتنی ہم اس متغیر دور میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ایمان سلسلہ تغیرات سے پر ہو جس کی کوئی مثال ہمارے ملک

کی اس شخص کا شکل جو قرون وسطی کا ابتدائی زمانہ تصوف کی نشوونما میں گزرا اور اس کے بعد صفوی
 خاندان کی شہنشاہیت کا دور دورہ رہا بالآخر دونوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اور اب ان کا کوئی نام
 نگاہیں باقی ہے تو صرف تاریخ و ادب کی کتابوں میں۔ ورنہ آج کل تو قوم پرستی یا ملت پرستی کا دور
 ہے۔ ۲۰-۲۱ فروری کی درمیانی شب میں آدھی رات گزری تھی کہ رضا خاں پہلوی نے دو
 کہ اب اے حضرت پہلوی اول کے نام سے مشہور ہیں، پھر ان پر دستخط حاصل کر لیا۔ ایران کے اکثر
 مورخین تاریخ جدید کا آغاز سی دن سے کرتے ہیں۔ اس صورت حال کا جس کو ایرانی انقلاب کے نام
 سے یاد کیا گیا ہے نتیجہ تو یہ ہوا کہ ایک مستقل دولت ملیہ کی تاسیس و تشکیل کی گئی۔ اور دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ان
 کی طرز زندگی اور خیالات میں ایک نیا نقطہ نظر نمایاں طور پر پیدا ہو گیا جسے ہم اصطلاحاً مغربیت کہہ
 سکتے ہیں۔ سلطنت پہلوی کی گزشتہ گیارہ سال کی حکومت میں تقریباً وہ تمام باتیں جن کا نقل و قرون
 وسطی سے تھا یا تو معدوم ہو گئیں یا نہایت سرعت کے ساتھ معدوم ہو رہے ہیں۔ علماء یا مجتہدین جنہیں
 ایرانی اخوند کہتے ہیں۔ ان کا سیاسی بساط سے غائب ہو جانا تمام اصلاحات کے لئے سب سے پہلی اور
 ناگزیر شرط تھی۔ ۱۹۰۶ء کے دستور اساسی اور اس کے بعد ۱۹۰۷ء کے ضمنی دستور (complementary
 constitution) دونوں نے مجتہدین کی حیثیت کو مستحکم کر دیا تھا تاہم ملک کے اخوندوں کو حق دیدیا گیا تھا
 کہ وہ اپنی جماعت سے ۲۰ اشخاص منتخب کر دیا کریں مجلس ان ۲۰ منتخب شدہ اشخاص میں سے ۶ برلن
 کی ایک مذہبی کمیٹی مقرر کر دیتی تھی جس کو اختیار حاصل تھا کہ وہ مجلس کے منظور کردہ قوانین کو مذہبی مصالح
 کی بنا پر مسترد کر دے اس کے باوجود بھی اکثر اخوندوں نے خود دستور کو غیر مذہبی اور حرام قرار دیدیا
 بعد میں ان کے سرگرمہ لوگوں سے دستور پر چربیہ کو مستحکم کرانے گئے، مذہبی کمیٹی کا بظاہر ناکامیاب ہونا
 اور اس سے حکومت کے مسئلہ ہو جانے کا اندیشہ ہوا اس لئے اس کو توڑ دینا پڑا ۱۹۰۷ء میں جمہوریت
 کی تحریک ایران میں نہایت شد و مد کے ساتھ اٹھائی گئی لیکن اخوند نے فتویٰ دیا کہ یہ بھی حرام ہے
 آخر مجلس نے اس شکل اور شکل کو قبول کر لیا کہ قدیم خاندان شاہی کو ختم کر کے رضا شاہ پہلوی
 کے سربراہان حکومت رکھ دیا۔ یہ ایک کہلی ہوئی بات ہے کہ جب تک ان مسائل میں اخوندوں کا دخل تھا

ہو سکتا تھا کہ ایران نئی روشنی کے مطابق نہیں ہو سکتا تھا یہ بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اس زمانہ میں سرکاری عدالتیں قریب قریب باطل اخوندوں کے ہاتھوں میں تھیں لیکن ان عدالتوں کا طریقہ کار اس قسم کا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی کوئی قدر و منزلت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ رشوت ستانی اور بدکرداریوں کی کوئی حد نہ تھی ان عدالتوں کے ضابطے اور شہادت کے اصول نہایت قیاسی تھے۔ گواہ کے قابل اعتبار ہونیکا انحصار اس قسم کی باتوں پر تھا کہ وہ کتنے سچے لطف دیکھتا ہو یا اس کی ڈاڑھی کتنی لمبی ہے۔ علاوہ بریں رویت ہلال معاہدہ اور قتل، غزوہ، مسافرت، الزوم، معاملات کے لئے ایک ہی قسم کی سنی شہادت درکار ہوتی تھی۔ چنانچہ کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک فیصلہ کن صورت اختیار کریں چنانچہ فیصلہ کر لیا۔ رضا شاہ اور ان کی گورنمنٹ کی خواہش ہوئی

کا خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن دول خارجیہ نے مقول وجوہ کی بنا پر اس سے انکار کیا اور کہا۔ ہرگز نہ۔ ہم اس تجویز پر راضی نہیں ہو سکتے جب تک ایرانی عدالتوں کو مذہبی طبقہ کے ہاتھوں سے باطل نکال نہ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان کے لئے اس امر پر راضی ہو جانا ممکن تھا کہ غیر ایرانیوں کے مقدمات بھی اسی قانون کے ماتحت فیصلہ ہو اگرچہ جو اخوندوں یا مذہبی پیشواؤں کا بنایا ہوا تھا۔ عام اس سے کہ وہ قانون اچھا ہو یا بُرا۔ قانون اور عدالتوں کا از سر نو ترتیب دینے کا نازک اور مشکل کام شاہ نے ایک قابل ترین ایرانی یعنی وزیر عدلیہ آغا اختر علی خان کے سپرد کیا۔ مذہبی عدالتیں اب بھی باقی ہیں کیونکہ از روئے آئین ان کو کسی وقت توڑا نہیں جاسکتا لیکن ان کے تمام قانونی اختیارات سلب ہو گئے، اب ایران میں ایک درجن سے زیادہ مرتب شدہ قوانین اور ضابطہ جات نافذ ہیں بالعموم کہا جاسکتا ہے کہ نفس امری قوانین کے اصول اسلامی شریعت سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ قانون شہادت اور ضابطہ عدالت کی ترتیب میں فرانسیسی قوانین کی تقلید کی گئی ہے۔ اخوندوں کی جگہ قانون جدید کے ماہرین حاکمان عدالت کے عہدوں پر مامور کئے گئے ہیں۔ اس کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تمام تبدیلیاں عوام الناس کو اپنی مرضی کے خلاف زبردستی ماننا پڑیں ایسا ہرگز نہیں ہو بلکہ واقعہ یہ ہے

کے کسی ایک باشندہ کو بھی اپنے مذہبی پیشواؤں کے طبقہ پر اعتماد باقی نہیں۔ اگر ان مذہبی
 طبقوں کا میں چلتا تو یہ شرارت آئینہ فتوے جاری کر دیتے لیکن زمان میں اتنی محنت ہو اور نہ انہیں
 اس کا موقع ہو۔ ان میں سے بعض نظر بند کر چکے گئے ہیں اور باقی خاموش ہیں بجز المدارس کے علماء
 کے کہ نے اپنے اس سخت ترین آزمائش کی وقت کوئی جری آدمی پیدا نہیں کیا اور سب ملکوں کی طرح
 ایران میں بھی ایسے لوگوں کی کوئی عزت نہیں کی جاتی جو اپنے عقائد کی خاطر مصائب برداشت کرنے کی
 محنت نہیں رکھتے۔

مذہبی علماء کے طبقہ کے فنا ہو جانے کے بعد ایران کو اس بات کا موقع ملا کہ ملکی معاملات
 میں ترقی کی جدید راہ پر چل سکے۔ ملک کے مالی انتظامات کو ڈاکٹر طس پان اور ان کے امریکن ساتھیوں
 نے سنبھال لیا۔ ان کے سر نو ترتیب دیا اور اب یہ کام ایک نہایت قابل وزیر مالیات تھا
 قائم ققی زادہ کے ہاتھوں میں ہو جو کئی سال کی جلا وطنی کے بعد اپنے ملک کی خدمت کے لئے
 طلب کئے گئے ہیں۔ اسی طرح نظام حکومت کا قریب قریب ہر شعبہ از سر نو درست کیا گیا ہے۔
 رضا شاہ نے پہلے اپنی وزارت جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد عہد بادشاہت میں سالہا
 سال کی جدوجہد سے خود سہ قبیلوں کی قوت کو باطل توڑ دیا۔ اور ملک کے ایک گوشہ سے
 لیکر دوسرے گوشہ تک امن اور سکون پیدا کر دیا۔ تمام ملک میں جا بجا پولیس کی چکیاں قائم
 ہیں اور ایران کی پولیس نہ صرف اپنے کام میں مستعد ہے بلکہ شایستہ اور خوش خلق بھی ہے
 اور اپنے گواہل ملک کا ملازم سمجھتی ہو نہ کہ مالک و مخدوم۔ حکومت ایران بھی اور قومی حکومتوں کی
 طرح باشندگان ملک کی نجی زندگی میں بہت زیادہ دخل ہو۔ اس لئے کہ نظام حکومت کی
 اصلاح بغیر قوم کی اصلاح بیکار ہوئی ہے۔ چنانچہ ہر ایرانی کے لئے اپنے نام کے ساتھ ایک
 خانہ دانی نام کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔ اول سے ہر وقت اپنے پاس پروانہ شہریت رکھنا پڑتا ہو
 جس میں پولیس اس کی زندگی کے خاص خاص واقعات یعنی پیدائش، نکاح، طلاق، موت وغیرہ
 کا باقاعدہ اندراج رکھتی ہے۔ لوگوں کی پوشاک کے متعلق بھی خاص خاص قاعدے ہیں جن کی

پابندی خرمندی ہے۔ سو لڑو کے قانون کے بموجب ہر ایرانی مرد خود اس کا مذہب کچھ بھی ہو ایران کی قومی پوشاک پہننے پر مجبور ہے جس سے مراد پہلوی ٹوپی اور یورپین کوٹ ہو۔ کار اور گاڑی لگانا لازمی نہیں جو شخص اس قانون کے خلاف ورزی کرتا ہو اس کو ایک مہتہ کی سزائے قید ہو سکتی ہے یہ کہنا بے سود ہے کہ اس قانون کی ہر شخص پابندی کرتا ہے۔ دیہاتوں میں یہ پوشاک یورپین پوشاک کی ایک نہایت بدنام نقل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پھر آج اور اندر گزشتہ صدیوں میں مردوں کے لباس کا میاں اسی قدر بلند ہو چکا کہ یورپ کے دارالسلطنت

ایران کے مصلحین اس بات کا بڑا خیال رکھتے ہیں کہ

بظہر باین اسی وجہ سے اگرچہ ایران میں گزشتہ ۱۰ سال کے

رومنا ہوئیں لیکن ان اصلاحات کا رد عمل کسی جگہ ظہور میں نہیں آیا۔

کی طرف سے اصلاحی پالیسی کا یہ رخ آزادی نسوان کے معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ نہیں غور ہے۔ ہم نے جو مفہوم ہم سمجھتے ہیں جس کے ذریعہ سے عورت کو بغیر ساعت مقدمہ تمام عمر کی سزا سے قید دیدہ جاتی ہو وہ مفہوم ایران میں کبھی نہیں سمجھا گیا۔ وہاں عورتوں کو شہر میں نکلنے، خرید و فروخت کے لئے باہر اور ایک دوسرے کے مکان پر جانے آنے کی ہمیشہ اجازت رہی۔ قاجار کے عہد میں زمانہ صفوی کی قدیم خوبصورت نسوانی پوشاک کے بجائے مغربی فحش قانون کی پوشاک رائج ہو گئی، جو حد درجہ حیا سوز اور ناشائستہ تھی۔ گزشتہ چند سال کے اندر اصلاحات کے سلسلہ میں معمولی مغربی پوشاک اختیار کر لی گئی قبیلوں اور گھاؤں کی عورتیں اب بھی قدیم پوشاک میں نظر آتی ہیں یہ ہندوستانی لنگے کے مانند ایک لانا کرتہ ہوتا ہے۔ قصبات اور بڑے بڑے شہروں میں عورتیں فراک اور سوٹ پہنتی ہیں اور باہر نکلنے وقت ایک سیاہ برقعہ جس کو چادر کہتے ہیں ڈال لیتی ہیں۔ چہرہ اکثر کھلا رہتا ہے باریک سی نقاب پڑی رہتی ہے۔ اسی سلسلہ کے متعلق آیات قرآنی کا یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ ان میں چہرہ چھپانے کا حکم نہیں ہے، بلکہ عورت کی زینت یعنی جسم اور کپڑے چھپانیکا ہے، آزادی نسوان کی رفتار بہت تیز ہو۔ پھر ان میں عورتوں کی ایک بہت قلیل روشن خیال جماعت نے چادر بھی ترک کر دی ہے۔ آئندہ پانچ سال کے اندر یا شاید اس سے بھی پہلے قدیم طرز معاشرت کا باطل

مہماتان مجھ جاتی نہ رہے گا۔

اب ہمیں ایران کی موجودہ قومی حکومت پر نظر ڈالنا ہے۔ سترہ سالہ میں مظفر الدین نے ایران کے دستور و سیاسی کے بنیادی قوانین پر دستخط کئے اور دوسرے سال ان کے بیٹے محمد علی کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ دستور اساسی کے اس منیمہ پر دستخط کریں جس میں علاوہ دیگر امور کے اس کا بھی اعلان تھا کہ فرمانروائی جمہور کا حق ہے محمد علی شاہ نے دستور اساسی کی خلاف ورزی کی متواتر کوشش کی جس کا انجام ان کے اخراج کی شکل میں نمودار ہوا اور ان کے بیٹے احمد شاہ کے زمانہ صغیر ہی میں تمام اختیارات تمام دفاتر و ستوری قاتدین کے ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ یہ زمانہ ایران کے لئے بہت خوشگوار تقاریریں اور انگلستان کے غالب اثرات نے آزادی ایران کو حرف غلط بنالایہ ملک کے نظم و نسق میں ابتری پیدا ہو گئی اور عاقل حکومت کی حالت بگڑ گئی، باقاعدہ فوج کی تعداد کو بھی مشکل سے ہزار تک پہنچتی ہوگی۔ البتہ ایران کی نصف رقم معضہ کر لی جاتی تھی جو بجائے اس میں مرکزی حکومت کے احکام ٹھکرا دئے جاتے اور ان سے اغراض بڑا جاتا تھا۔ محصولات کا وصول کرنا دول خارجہ کے اثرات کی وجہ سے مشکل ہو گیا تھا۔ اور موروثی گورنران اور سرداران قبائل سرکاری مطالبات کا ایک حصہ بھی مشکل سے ادا کرتے تھے اور رہنمایان قوم بجائے اس کے کہ نظم و نسق میں اصلاح کی کوشش کرتے اپنی جیبیں بھرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ بمصائب ایران کا کسی کو بھی غم نہ تھا، کوئی مدبر اتنا دیانت دار نہ تھا کہ دوسرے کی قلعی کھول سکے۔ بدترین کا یہ گروہ جس میں صرف بھی ایک خوبی تھی کہ وہ تمام بد اعمالیوں کو سراہتا رہتا تھا برابر سر اقتدار رہا یہاں تک کہ موسم سرما میں ایک رات ان میں کا ہر ایک اچانک گرفتار کر لیا گیا۔ رضا شاہ نے جو انقلاب برپا کیا اس کی تمام اہمیت اس میں مضمر ہے کہ اس نے بڑے بدترین کے جتنے کو توڑ دیا اور اس کی جگہ قومی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ ملک کی دستوری حکومت کے بادشاہ احمد شاہ ۵ سال اور رہے لیکن تمام اختیارات جدید پارٹی نے اپنے ہی ہاتھوں میں رکھے۔ رضا شاہ نے پہلا کام یہ کیا کہ فوج اور پولیس کی از سر نو تعلیم کی اور ان کے ذریعہ سے باغی سرداروں کو دبانے

شروع کیا اور ملک میں پھر امن و امان قائم کیا یہ کام انہوں نے غیر معمولی قابلیت سے انجام دیا اور دولت ایران یعنی مرکزی حکومت کا عطا شدہ اقتدار سب پر قائم کیا، گذشتہ ۱۱ سال کے اندر دولت ایران کی تشکیل جدید طرز پر کی گئی جس میں مذہبی طبقہ کا کوئی دخل نہ رہا۔

ایران کے دستور اساسی کی تعریف میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہو سوائے مذہبی تحفظات کے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، یہ دستور باطل، بلجیم کے دستور اساسی کی نقل جو اس کی بہت سی دفعات ناقابل عمل ثابت ہو چکی ہیں، ۱۹۰۶ء و ۱۹۰۷ء میں جس کمیٹی نے اس پر تیار کیا تھا، اس کا نہ صرف سابقہ تجربہ اس کا نہ تھا۔ اس لئے قدرۃ اس نے مغربی ممالک

نزدیک جدید ترین اور بہترین تقاضے ۱۹۰۶ء کے آئینی اور بوجہ کرسپسٹ ڈالیدی لیکس اور جنگ عظیم کے زمانہ میں اس

کے مقابلہ میں پہلوی حکومت کو معنی اوقات (دکٹیٹر شپ) کہا جاتا ہے بلکہ یہ سچ ہے۔ اس کے اوائل اور منشا شاہ اور ان کے عال نے اپنے تمام اختیارات اسی طریقہ پر حاصل کئے۔ کیونکہ مجلس نے ان کو سخت خرابی پر مجبایا اور دستور اساسی کی ان ترمیمات کا جن کی رو سے بادشاہت نے خاندان میں منتقل ہوئی یہ مفہوم بھی تھا کہ رضا شاہ اپنی اصلاحات کا کام شروع کریں گے دوسرے یہ کہ سوا دستور اساسی کی ان دفعات کے جن کو آئینی حکومت نے ناقابل عمل قرار دیکر رد کر دیا تھا، مثلاً سینٹ ضلع اور صوبے کی کونسلوں کا قائم کرنا، رضا شاہ نے اپنے تمام زمانہ حکومت میں بنیادی قوانین کی حرف و منشا نہایت دیانت داری کے ساتھ پابندی کی ہے جس بات سے دولت ایران پر ڈکٹیٹر شپ کا الزام لگایا جاتا ہے وہ یہ ناقابل انکار حقیقت ہو کہ مجلس کے لئے انتخابات کا طریقہ ایک باطل اصل اور بے معنی ہے۔ دستور اساسی میں مجالس وضع قوانین کے دو ایوانوں کی شرط تھی۔ ایک سینٹ ۶۰ ممبروں کی جن میں سے نصف تعداد بادشاہ کی نامزدگی کے لئے مہینہ مہتی اور نصف قوم کے انتخاب کے لئے۔ اور دوسری منتخب شدہ مجلس شوریٰ ملی جس کے ممبروں کی تعداد دو سو تھی سینٹ کبھی وجود میں نہیں آئی۔ اور فی الحقیقت ایک ایسے ملک

اس وقت امر اور اس کا احترام دونوں مفقود ہوئے اور دوسرے ایوان کی گنجائش نہیں
 رہی۔ مجلس کے ممبروں کا انتخاب دو سال کے لئے ایک یا متعدد قطعہ ہائے انتخاب سے
 کیا جاتا ہے۔ موجودہ مجلس جو انیسویں مجلس ہے، ۱۱ ممبروں پر مشتمل ہے۔ دستور اساسی نے مجلس
 کے اختتام دینے کے لئے جو دو مسکروں میں مجالس وضع قوانین کو عموماً نہیں دیتے جاتے
 بلکہ ان کے لئے اور انتظامی امور کے سپرد ہوتے ہیں۔ کسی دوسری حکومت سے کوئی مصلحت
 نہیں کی منظوری کے جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تمام منشورات جو دوبارہ ملازمت سرکاری منت
 وخت و معاشی رعایات بحق اشخاص غیر ملکی یا باشندگان جاری ہوں تا وقتیکہ ان کو مجلس منظور نہ
 کرے تا جاؤ سب سے جاتے تھے۔ حکومت کسی غیر ملکی شخص کا تقریریں منظور کی مجلس عمل میں نہیں کر سکتی
 بلکہ یہی بیکار ہے کہ مجلس کو مالیہ پر پورا اختیار حاصل ہے اور وزیر مجلس کے سامنے جوابدہ ہیں۔
 مکان مجلس کو اس وقت بشرح ۳۰۰ تومان (دقیقہ ۶۰۰ روپیہ) مشاہرہ تھا ہے لیکن یہ امر
 قابل ملاحظہ ہے کہ ایران میں سرکاری ملازمت کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ صرف ۳۱۲ تومان ہے
 بلکہ ان کے صد کی تنخواہ ۹۰۰ تومان ہے اور وزیر اور کی ۷۰۰ تومان (۴۰۰ روپیہ) مجلس کا عام اجلاس
 قریب قریب دو بار ہر ہفتہ میں ہوتا ہے۔ اجلاس بہت مختصر ہوتا ہے جو کبھی شاذ و نادر میں گھنٹہ سترہ بجو
 جاتا تھا۔ قریب بھی بہت مختصر ہوتی ہیں لیکن اگر کوئی ممبر ادا و شمار اور واقعات سے مسلح ہو کر
 طرح طرح کی تقریر کرے تو آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ ایران کی مجلس کے محاسن و مساویب کے
 بارے میں جو بھی خیالات ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ مجلس اپنے زرق برق لباس و حسن اخلاق
 کے لحاظ سے دنیا میں بہترین مجلس ہے۔ ایوان مجلس کے باہر اکثر ارکان مجلس آپ کو عبثاً آمیز احساس
 و مداری کے ساتھ حلیشان باغ بہارستان کے قریب چل قدمی کرتے ہوئے نظر آئیں گے
 بلکہ صرف ایک ہی بار ممبروں کی جماعت سفیدہ انداز میں گنت گو کرتی ہوئی دکھائی دی اور میں
 میں مجلس کے عجب چلتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔ موضوع بحث مولانا جامی رحمہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا
 کتاب تھا جو سال ہی میں بامدہ ہوا تھا۔ ایوان مجلس کے اندر مباحثے کوئی جوش نہیں ہے بلکہ

مجلس میں داخلہ دینے میں کوئی مخالفت پارٹی نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھیں باخوشی
نوبت میں آتی یہ طبعی مذاکرات (کارروائی) کا ایک شلٹ حصہ صرف آداب و انقباض پر مشتمل ہوتا
ہے جس کا عام اجلاس نمائشی ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بس ان فیصلوں کو کچھیں اور
کچھ جانچ لیں صرف درج کارروائی کر دیتا ہے مجلس ہر چھڑ مہینہ اپنے ممبروں سے ہر وزارت کے
لئے اشارہ ممبروں کی ایک کمیٹی یا کمیشن مقرر کرتی ہے۔ اور ممبران میں بالفاظ دیگر کثیران تمام
سرکاری محکمات کے تیار کردہ قوانین و ضوابط پر بحث و مباحثہ کرتے۔

کو مجلس کا اجلاس عام منظور کر لیتا ہے۔ ممبروں کو مزید نقد

کے بجائے منعقد کرنے کا حال میں انتظام کیا گیا ہے۔ پارلی

اس کے گرد و پیش سے نمائشی ہونا ظاہر ہوتا ہے حکومت

منوالیتی ہے ترکوں کی قوم پرور جماعت کے مانند ایرانیوں کی کوئی جماعت جس ہے ہم دو

کو ایرانی انتخابات عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ کل بالغ اشخاص کو دوت وہی کا حق حاصل ہے۔ البتہ سنگین

جرم کے سزا یافتہ لوگ اور پولو لئے جوان انحال کیوجہ سے اس نوبت کو پہنچے ہوں۔ اور سیاسی

مجرم حق ووٹ سے محروم ہیں لیکن قانون کی یہ فیاضی بیکار ہو جاتی ہے اس لئے کہ پہلے سے کوئی

فہرست انتخاب کنندگان کی تیار نہیں کی جاتی۔

ہر ملکہ انتخاب میں انتخاب کا انتظام ایک مجلس کے متعلق ہوتا ہے جس کو مجلس نظارت کہتے

اور یہ حکومت کی طرف سے مقرر کیا جاتی ہے۔ مجلس نظارت مختلف حلقوں میں ماتحت کمیٹیاں ووٹ

جمع کرنے کے لئے مقرر کر دیتی ہے۔ امیدواران انتخاب کی باقاعدہ نامزدگی کا کوئی طریقہ

وہاں رائج نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر سرکاری حکام اور مجلس نظارت رائے دہندوں کو

ہدایت نہ کریں۔ تو ان کو یہ بھی معلوم ہو کہ کتنے امیدوار مقابلہ کے لئے کھڑے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے

کہ رائے دہندہ وقت مقررہ پر حاضر ہوتا ہے۔ اپنے ساتھ ایک سفید کاغذ کی پرچی لاتا ہے جس پر

اس امیدوار کا نام پہلے سے لکھ دیا جاتا ہے جسے وہ منتخب کرنا چاہتا ہے۔ ہر شخص کے حق رائے دہندگی

اس وقت اور ایسی جگہ کرتی ہے اور اس کے بعد اسے دھندلا دیتی
 ہے۔ بالآخر اسے شاری ہوتی ہے۔ اور کامیاب امیدوار کو ایک نشست
 دے دی جاتی ہے۔ یہ بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ کل کتنے ووٹ اسے اور اس میں سے کامیاب
 ہو کر کتنے ووٹ ملے اس قسم کے طریق انتخاب پر تنقید کرنا محبت ہے۔ ظاہر ہے کہ انتخاب
 کے وقت کی فہرست نہ ہونے کی وجہ سے اس کا موقع نہیں رہتا ہے کہ اگر کسی شخص کو اسپر کوئی
 شخص دیکھتا تو فی چارہ جوتی کرتی ہو تو کہ کوئی یہ شہر لوگ ان کے ایک ایسے حق سے محروم کر دیا
 گیا ہے جو قانوناً ان کو حاصل ہے۔ پھر چونکہ امیدوار باضابطہ نامزد نہیں کرواتے۔ اس لئے عطا گویا
 کیا ہے عامہ کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ مجلس نظارت اپنے فرائض بیکدوش اور قابل تعریف وطن
 پرستی کے جذبہ سے انجام دیتی ہے کہ جس سے جو یہ چیاں نکلتی ہیں ان کی تعداد عموماً ان لوگوں
 کی تعداد سے کئی گنی زیادہ ہوتی ہے جو اسے دینے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے
 کہ قانون کے مطابق کوئی امیدوار بغیر کلی اکثریت کے منتخب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اگر مجلس نظارت
 کوئی تو یہ ذکر ہے تو کوئی امیدوار کسی منتخب ہی نہیں ہو سکتا۔ امیدوار کی نامزدگی کا کوئی طریقہ قائم
 نہیں ہے۔ وہ کسی ایک وقت سو سو امیدواروں کو ایک ایک حلقہ سے ووٹ دینے جاسکتے ہیں۔
 اس لئے مجلس کو وہی کرنا پڑتا ہے جس کی اس صورت میں ضرورت پڑتی ہے۔ بعض فرضی اشخاص
 کی طرف سے چریاں کس میں ڈال دی جاتی ہیں اور مجلس ان کو نظر انداز کر دیتی ہے یہ سب شک کہ اس
 شہر کا وقت آ جاتا ہے۔ پھر پریوں کے شمار میں البتہ پوری دیانتداری سے کام لیا جاتا ہے
 اکثر تعلیم یافتہ لوگ اس قسم کے انتخابات کو تسلیم کرتے ہیں مگر بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کسی تبدیلی کے
 خواہاں ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ انتخابات کے لئے ایک صحیح نظام قائم کرنے کی راہ میں بہت
 بڑی دشواریاں بھی ہیں۔ ایران کی آبادی بہت تھوڑی اور بکھری ہوئی ہے تقریباً ۱۱۰ اشخاص فی
 مربع میل اور یہ تو ہے اس لئے عام رائے دہندگان کے لئے علانیہ باطل نامن ہے کہ وہ تمام
 انتخاب تک پہنچ سکیں اکثر لوگوں کو تین یا چاروں کا سفر پیدل یا خیر پٹے کاٹنے کا اس کے

ہندوستان میں ہے کہ اگر انتخاب کا کام باقاعدہ طور پر ہو تو کہیں سیبی تجارت کو آگے بڑھنے کا موقع ملے اور یہ لوگ آسانی پر دوئی طاقتوں کے ہاتھ تک جائیں۔ برصغیر اس کے قومی حکومت اس بات کی کوشش کرتی ہو کہ جن امیدواروں کو وہ منتخب کرے وہ اپنے انتخاب کو بہت محنت لگاتے ہیں۔ اور وطن دوستی کا ثبوت دیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ پہلوئی حکومت کاظم ہی اس وجہ سے ہوئی کہ ایران اصلاحات اور جدید تہذیب اور ترقیات کی راہ پر گامزن ہو جس قوم نے ۱۹۲۵ء میں اپنی مجلس موسسہ میں رضا شاہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے لائسنس کی تکمیل کے لئے کوشش جاری رکھیں اس قوم نے اگر شاہ کے حکم کو مانا تو نہ کیا۔ منطوق یہی تو یہ کسی طرح قابل اعتراض نہیں کہا جائے۔

جمہوری اصول پر منتخب کردہ مجلس سے بجائے مدد۔

رتقار اگر اسی طرح جاری رہی اور اس رتقار کی سر۔

شروع کی ہیں ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کم از کم دس سال صرفت ہوں گے۔ ایران کی غیر ذمہ دار اور نیم دستوری حکومت نے ملک کو جو فائدہ عظیم پہنچایا ہے اس سے کوئی شک نہیں کر سکتا۔ ایران کے اکثر ادارات اس سے باطل مطلق ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ اصلاحات کا دور جب ختم ہو جائے گا تو موجودہ حکومت کی بجائے انگریزی نمونہ پر ایک آئینی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔

انقلاب سے پہلے

اردو شاعری کی حالت

سید الیک باب جو جملہ اردو صاحب سرودی کی کتاب "بدید اردو شاعری" کا جو مغرب
 طبع ہو کر شائع ہوئی وہی ہے

ادبیات کا خلق قوم کی زندگی کیساتھ اس قدر گہرا ہو کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا نا ممکن ہے۔
 اردو کی حیثیت پر جتنے انقلاب آفریں واقعات گزرتے ہیں ان سے قومی شاعری بھی متاثر ہوتی ہے۔
 جب تک ایک ہی قوم اور ایک ہی زبان کی شاعری مختلف زمانوں میں جدا جدا رنگ رکھتی ہے۔
 مگر قومی شاعری کے ارتقا کا مطالعہ کیجئے تو پچاس کے زمانہ سے کچھ سال بعد سے لے کر سولہویں صدی
 کے وسط تک کا زمانہ بہت ہی مختصر اور قسط سالی کا دیکھا مگر اس کے بعد ملکہ الایمیت کی حکومت کا زمانہ آتا ہے
 پھر انگریزی ادبیات کا زریں دور ہے پھر مسلمانوں کی تحریک انگریزی ادب اور شاعری کا میاں بہت
 پہلے لگا تھا۔ اسی طرح اطالوی ادب میں بھی سولہویں صدی کے وسط کا زمانہ آتا ہے۔ ماروئی اور
 پرفیو دسکر شاعروں سے قطع نظر کہ کے شاعر انتقامیہتوں کی خوابیدگی کا زمانہ ہے۔ اردو شاعری
 پر بھی اس کی مختصر حیات کے دوران میں کئی موافق اور ناموافق زمانے آتے جاتے رہے۔ اور
 اسی خلق کی وجہ سے اردو شاعری اور ادب کا میاں گھٹنا بڑھتا رہا۔

اردو شاعری نے اپنی پیدائش سے لیکر اب تک کئی لباس بدلے۔ نہایت سرسری اور
 عام مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم تین دور اس شاعری کے گزرے ہیں۔ سب سے پہلے
 چھٹی پیدائش میں یہ زیادہ تر ہندی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی سرزمین اور اسی معاشرہ کے کاتب
 ہوتے تھے اس کا غیر ہوا ہے۔ بعد میں حاکم منلوں کی زبان یعنی فارسی سے یہ اس قدر متاثر ہوئی کہ ظاہر
 ہوتا ہے کہ ان دونوں کا قلم سے یہ فارسی شاعری کا مشق معلوم ہونے لگی۔ پھر چھٹی پیدائش میں کا قلم

ہندوستان پر تو مغربی شاعری کی طرف یہ زیاں سے زیادہ اٹل ہوتی گئی۔ گویا اردو شاعری کے بھی وہی تین دور ہیں جو خود ہندوستان کی تاریخ کے سبب جلتے ہیں۔

اردو شاعری پر موجودہ انقلاب آنے سے پہلے اس کی جو حالت تھی اس پر ہم بیان تفصیل سے کرکشی ٹوانا چاہتے ہیں۔ اس باب کا مطالعہ موجودہ دور میں اردو شاعری کی اصولی تبدیلی کے اسباب، قارئین کو کام پر اچھی طرح ظاہر کر دیگا۔ اور اس سے یہ فائدہ حاصل ہو گا کہ ہم انقلاب سے قبل کی شاعری کا موازنہ جدید شاعری کے ساتھ آسانی کر سکیں گے۔

اردو شاعری کا یہ دور انیسویں صدی کی ابتدا سے لگا تھا۔ ۱۸۵۷ء تک رہا۔

اس زمانہ میں اردو شاعری کا تعلق زیادہ تر لکھنؤ سے رہا۔

دہلیوں کی سرپرستی نصیب ہوئی رہی۔ اس دور کی یہ

میتزل کا نمونہ ہے۔ دہلی کی شہنشاہی کے خاتمے نے ایک

کی سیاسی اور معاشرتی فضا میں دوڑا دی تھی۔ اس سبب سے اردو شاعری بے حد متاثر ہوئی۔

اس زمانے میں بھی اردو کے بہت سے قابل قدر شاعر پیدا ہوئے۔ لیکن چند سستی مثالوں کے سوا

جن کی ذاتی قابلیت مدوجہ شاعری کے تمام سین ہمنوعی اور رسمی اصولوں کو توڑ کر بلند ہو گئی۔ شاعری

کی اہمیت ہمتی اور پچھو والی ہوئی ایک سلسلہ داستان ہو۔ رنگین۔ سلیمان۔ ظفر۔ قائم۔ ہمت۔ منون،

حسرت۔ قدرت۔ بیداد۔ ہدایت۔ فراق۔ ضیا۔ بقا۔ حزیں۔ بیان۔ رن۔ نقیر۔ ناسخ۔ برق۔ مجسم

آباد۔ وزیر۔ رشک۔ قہر۔ تیر۔ سماعت۔ اختر (داج علی شاہ)۔ اسیر۔ امانت۔ اقلی۔ ذکی۔ درخشاں

المنی۔ انیس۔ دبیر۔ عشق۔ عشق۔ صابر۔ رشید۔ اوج۔ غالب۔ ذوق۔ مومن۔ مجروح۔ بیت۔ شیفہ

داغ، اس دور کے طویل القدر شعرا ہیں، غیر مشہور شاعروں اور زلنگاروں کا شمار تو حساب

بہر ہے۔ ہاں اہم بات ان فہرست کے ناموں پر نظر ڈالیں تو ہم ان کی کثرت سے متاثر ہونے لگیں

نہیں ہو سکتے۔ اور اگر ہر شاعر کے کلام کو انفرادی طور پر جانیں یا ان کا تقابلی مطالعہ بھی کریں تو

ہم ان کی مخصوص ذکاوت، کلام کی کثرت اور اس کے صوری تنوع سے بے حد مرعوب ہوتے ہیں

میر کا لہجہ قدسی، دماغ کو چھوٹے۔ یہ خاک کے میرے ہیں۔ اور انہیں اس
 غزل کے مصداق شاعری زندہ ہو۔ لیکن اس طویل فہرست کے کسی دوسرے جیسے بڑے شاعر
 کا یہ کام تیر، درد، سودا، سوز، اثر نہیں۔ بلکہ انشا، مصحفی، جرات اور شاہ نصیر ہی کے
 کام کے سامنے رکھتے! اس کا بادو کیسا غائب ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اس دور کے شاعر قدما کو
 میر سے زندہ سمجھتے، انہیں کی ہم نامی اور ہم نوائی کے طفیل میں شاعر مشہور ہوئے۔ ورنہ اکثر
 محققوں میں شریعت ان کے کلام سے کوسوں دور ہے۔

غزل گوئی اردو کے قدیم اور جدید شاعروں کا بڑا مقبول مسئلہ رہا ہے، غزل کے ارتقاء
 کو دیکھتے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء سے لیکر تیر اور سودا تک اس میں جو ترقی ہوئی، وہ انہیں پرستہ
 ہو گئی۔ انشا، جرات اور مصحفی تیر کا اتباع کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی غزلیں بھی کم و بیش غزل کے
 تمام لوازمات سے پُر ہیں غزل اور قصیدہ کو میر اور سودا نے انتہائے کمال تک پہنچا یا تھا۔ ہم
 ان کے بعض معاصر شرا جیسے درد، سوز، اور اثر وغیرہ یا ان کے بعد ہی آنے والے شاعر جیسے انشا
 جرات، مصحفی، شاہ نصیر میں سے ہر ایک نے اگر غزل کو ترقی دینے میں کامیابی حاصل نہیں کی تو
 کم سے کم اس کو اپنی جگہ برقرار رکھنے میں انہیں سید کامیابی ہوئی۔ درد بھی اگر میر ہی کی طرح شاعر
 غزل گوئی اختیار کرتے تو نہ اس صنف میں دست پیدا ہوتی اور نہ خود ان کا رنگ میر کے مقابلہ
 میں ہم سکتا۔ قصوف کو اپنی غزل کا موضوع بنا کر درد نے شاعری کا تنوع اور اپنی انفرادیت
 کا کام کر دی جس کا احساس خود ان کو تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ پھولے گا اس زباں میں بھی گلزارِ مرثیہ
 میں ہیں زمین شرمیں یہ تخم بویا۔ یہی حال انشا، جرات، مصحفی اور شاہ نصیر کا بھی جو جنہوں نے
 غزل کو صرف تیر ہی کے معیار پر لکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان کے کلام میں سادگی، اوج، محق،
 درد اور اثر غرض غزل کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ فرق صرف صناعی کا ہے۔ تیر کا سادگی
 وصال میں بعد بنیاض کی طرف سے عطا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس قابل تحسین جماعت کے ہاتھ
 سے غزل کی جتنی کورہ بلا کر وہ کے شعر کے لائق میں پہنچی، تو وہ نہ صرف اپنی بنیادی خصوصیت

ہندی شاعری کے ہر بلاغت اس میں شریعت کا کوئی جز و بھی باقی نہ رہا۔ خیالات اور موضوعات کا نزل میں بہت کم اضافہ ہوا۔ لیکن اپنی کامادہ ہر جگہ اپنا کام کرتا ہے۔ اس کی بدولت ہماری شاعری کو قانہ پہنچنے کی بجائے اکثر نقصان پہنچا۔ کیونکہ تاخرین کے اس گرو نے جب تیرہ ہوتا اور ان کے معاصرین اور تابعین کو انہیں کے میدان میں شکست دینے کی سکت اپنے آپ میں نہ پائی تو ان کی اپنی کافطری مادہ اس ایب کے تغیر کی طرف اُلٹ گیا اور ان کی پستی کا نامعلوم احساس ان کی غزل میں رعب و اور کشاکش پیدا ہو گیا۔ رفتہ رفتہ غزل کے شعروں کی شکل اختیار کرنے لگے۔ اور غالب کا ابتدائی کلام اس کا ثبوت ہے۔

ایک طرف تو غزل میں اپنی اور جدت طرازی :

طرف بعض شاعروں نے تیرہ اور سودا کے ریختہ کے مقابلہ میں ریخی ایجاد دی۔ جس سے جو اپنی طبیعت کے وسیلے سے حریف پر غلبہ پانا مشکل دیکھتے ہیں تو پھر وہ عورتوں کے ذریعہ انہیں مغلوب کرتے ہیں۔ غالباً ریختی نگاروں کا بھی یہی مقصد تھا۔ لیکن ریختی گویوں کا یہ منتر بھی ریختہ گویوں کے مقابلے میں کارگر نہ ہو سکا کیونکہ اس کے موجدوں ہی نے اس کو اپنے ادنیٰ اور شہوانی جذبات کے اظہار کا آلہ بنالیا۔ انشا سے لیکر آج تک کسی ریختی گو کا کلام اس طرح کے حیوانی جذبات سے خالی نظر نہیں آیا۔ اسی وصف نے ریختی کو اردو شاعری کی کوئی مستند صنف نہ بننے دیا۔ اور یہ جدت طرازی اس طرح ضائع ہو گئی۔ ورنہ فی نفسہ ریختی کوئی بری صنف نہ تھی کیونکہ ہماری سوسائٹی میں عورتوں اور مردوں کی علیحدگی اور پردہ داری کی رسم نے عورتوں کی زبان میں چند مخصوص صنف پیدا کر دیئے ہیں۔ جو مردوں کی بول چال میں نہیں آ سکتے۔ ریختی کی ایجاد ہی اگر فحش سے نہ ہوتی تو کون انکار کر سکتا جو کہ یہ ہندی شاعری کی حریف تھی۔ غزل تنزل کے اس مرحلے پر پہنچنے کے بعد ہمارے ادب کے لئے ایک بھولی ہوئی صنف ہو جاتی اگر جدید احساس پیدا ہونے سے پہلے وہی میں قدیم شائستگی کے چند علمبردار جیسے ذوق۔ غالب۔ اور دامن نہ پیدا ہو جاتے۔ ان

عصرِ قدیم ہوا۔ قدیم اردو میں مثنوی بہت مقبول صنف تھی چنانچہ اکثر مذہبی تعلیمات اور اخلاقی
 مضمون تھے، قدیم زمانہ کے شاعر مثنوی ہی میں کہتے تھے۔ انہیں شعرا نے مثنوی کی ایک شکل بھی
 سین کر دی تھی۔ شمالی ہند میں جب شاعری شروع ہوئی تو اس صنف کا رواج کچھ دنوں کے لئے
 کم ہو گیا تھا۔ میر اور سودا کا عصر دراصل غزل اور قصیدے کا عصر ہے، انہیں دو صنفوں کو ان
 شعرا نے اور ان کے تقلیدین نے خوب ترقی دی۔ میر اور سودا کی مثنویاں نہ تو فارسی مثنوی کا نتیجہ
 ہیں، اور نہ قدیم اردو شاعروں کی مثنویوں کی تقلید میں لکھی گئی ہیں بلکہ یہ عموماً مختصری ہیں جن میں کسی
 خاص واقعہ کی تصویر کھینچی گئی ہو۔ میر اور سودا کے عصر میں یا اس کے قریب ان کا زمانہ تھا۔

و خیال سے بہتر کوئی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ اردو مثنوی کی جو شکل

تدلیک خواب و خیال سے متاثر معلوم ہوتی ہو۔ ”خواب و خیال

کے کلیے جانے تک جو عرصہ گزرا اس میں کوئی قابل ذکر مثنوی نہیں۔

مقبول بنایا۔ ان کی مثنوی ”سحرالبیان“ اردو کی مثنویوں میں سب سے بلند مرتبہ ہے۔

ہمارے پیش نظر دور میں مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ وہ سب ”سحرالبیان“ کی تقلید ہیں۔ ان
 میں بعض مثنویاں جیسے مرزا محمد تقی خاں ہوس کی مثنوی ”لیلیٰ مجنوں“ پنڈت دیاندر نسیم کی مثنوی
 ”گلزار ارم“ اور نواب مرزا شوق کی مثنویاں بے حد قابل قدر ہیں لیکن ”سحرالبیان“ سے ان کو کوئی نسبت
 نہیں۔ نازک خیالیوں اور زبان کے چٹاروں نے ان مثنوی کو کتنا ہی مقبول کیوں نہ بنا دیا ہو،
 ”سحرالبیان“ کی سادگی، صفائی اور سب سے بڑا کمر اس کی شعریت ان میں کم پائی جاتی ہو۔ ”سحرالبیان“
 ہر مذاق کے لئے ہے۔ اور ان مثنویوں کو خاص مذاق ہی متاثر ہوتے ہیں۔ بلند پایہ ادبی کارنامہ
 مقام اور زمان کی قید سے اعلیٰ وارفع ہونے چاہئیں۔

واسوخت اور ”سبھا“ اس عصر کی مخصوص منظوم اختراعات ہیں۔ واسوخت خیالی اور
 تقلیدی شاعری کی ایک فرع ہو۔ اس نوع کی شاعری کا نہ تو مقصد ہی اعلیٰ ہوتا ہو۔ اور نہ اس کو
 بچے نمونے ہی پیدا ہوئے۔ اس لئے واسوخت کو نہ جب فروغ نصیب ہو سکا اور نہ اب ہو سیکے گا۔

عصر کے موجدوں نے ریختی گویوں کی طرح، اس کی بنیاد ہی ایسے زود فنا جذبات پر رکھی تھی کہ جلد ہی یہ صنف متروک ہو گئی، اور اب صرف تاریخ ادبیات کی زینت ہے۔ سب سے یقیناً قابل قدر اعتراض تھی۔ اور اگر اس عصر کا اصل اصول تقلید نہ ہوتا یا کم سے کم زمانہ استقدر جلد بدل جاتا تو توقع تھی کہ امانت نے "اندر سبھا" کی شکل میں جس فن کی بنیاد ڈالی تھی، اسے ارتقا نصیب ہوئی اس زمانے کی تقلیدی ذہنیت کا یہ حال تھا کہ مداری لال نے جب "اندر سبھا" کو سامنے بنگلہ اپنا نام لکھا۔ تو اس سے آگے بڑھنا تو درکنار خود اس کی حد تک بھی نہ پہنچ سکے اور پھر ظاہر کے لحاظ سے امانت کی "اندر سبھا" اور مداری لال کی "اندر سبھا" میں کچھ فرق نہیں۔ ان سبھاؤں کی قدر اس زمانے میں بہت ہوئی۔ مگر اس لئے نہیں کہ یہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ تھیں، بلکہ صرف اس لئے کہ یہ ایک جدت تھی۔ یہ ساون کی گھاس کی طرح پیدا ہوئیں اور ابھی نشوونما بھی نہ پائی تھیں کہ سیاسی انقلاب نے انہیں فنا کر دیا۔

اس دور کی ادبی قحط سالی پوری ہو جاتی، اگر اس میں مرثیہ جیسی قابل قدر صنف کی شہداء کا نشوونما نہ ہوتا۔ مرثیہ اسی موجود شکل میں درحقیقت اسی عصر کی پیداوار ہے اس کے موضوع میں اس قدر تنوع اور اس کے ہمارے صناع تھے کہ ان سے نہ صرف رزمیہ منظومات کی کمی پوری ہوتی ہے، بلکہ واقعات نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری کے کئی ایک قابل قدر پہلوؤں کا اردو شاعری میں اضافہ ہو جاتا۔ جب تک اردو شاعری باقی ہے۔ میر کیس اور مرزا قاسم کے نام دنیا میں آسمان کے ساتھ لئے جائیں گے۔ لیکن مرثیہ سے متعلق دو امر خاص طور سے توجہ طلب ہیں ایک تو یہ کہ انیس اور دہر کے بعد ان کی آدمی قابلیت کے مرثیہ نگار بھی اردو میں پیدا نہ ہو سکے۔ اور اسی لئے اس کے موجد اس کے خاتم بھی بن گئے۔ دوسرے مرثیہ کی شاعری درحقیقت مردہ شاعری سے بیزاری کا ایک بدیہی نتیجہ ہے۔ نیز مرثیہ کی شاعری کے طبع کا زمانہ جدید شاعری کے آغاز سے اس قدر متصل ہے کہ ہم اگر اس کو جدید شاعری کی ابتدا بھی سمجھیں تاہم قدیم شاعری سے دل برداشتگی کے آثار اس میں ضرور ملیں گے۔

مرثیہ سے ہٹ کر اس دور کی شاعری میں ہم کو کوئی چیز ایسی نہیں ملتی، جسے ہم اردو شاعری میں شاعری احساس کی ارتقاء کا ثبوت سمجھ سکیں، ہاں اس احساس کے تنزل کا پتہ بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔ اس لئے دور جانے کی ضرورت بھی نہیں، ہزل، زحل، ہر یہ وغیرہ، میسوں، پیرا اس دانے میں شعر کے نام سے پھیلی ہوئی ملتی ہیں۔ حالانکہ اس طرح کی لغویات ان میں کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، شاعری سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں۔ اور اگر ہم انہیں شاعری میں داخل کرنے لگیں تو ہم اپنی ادبیات کی بدنامی کے ذمہ دار ہوں گے۔

غرض انقلاب سے پہلے کی اردو شاعری پر ایک نظر ڈالتے سے سلہ مرزا ہوتا ہے کہ ہر صنف شعری پیدا شدگی پر ہوئی۔ بعد میں ان کا ارتقاء مضامین کے اور زبان کے لحاظ سے ان میں الجھاؤ اور ظاہری شان کی طرف ترقی اردو شاعری کا عام اصول معلوم ہوتا ہے۔ غزل جو

آتش، ناتج، اور موتن اور ایک حد تک غالب کے ہاتھوں میں پیدا ہونے والی ہے۔ مثنوی میں حیرن کے سادی سیدی صنای کی جگہ پنڈت دیانکر نسیم وغیرہ کے اعلیٰ دقیق تصنیف نے لی۔ قصیدے میں بھی یہی چیز نظر آتی ہے۔ سودا کے قصیدے کتنے ہی پر شکوہ کیوں نہ ہوں لیکن ان میں سادگی ہے، اور ذوق کے قصیدوں کی سی وقت نگاہ کا ان میں پتہ نہیں۔ خود مرثیہ پر بھی یہ اصول ایک حد تک صادق آتا ہے۔ آئیں اور دو بیرونیوں معاصر ہیں اس کا وجود سیرتیں کی سادہ پرکاری کے مقابلہ میں مرزا دبیر کی فلک چمائی قابل غور ہے۔

لیکن زندہ زبان اور زندہ ادب مخالف ماحول اور بہت شکن فضا میں بھی کہیں کہیں ہوتی حیات کا ثبوت دینے پر مجبور ہے۔ رسی مضامین اور معین اسالیب کے درمیان سے میاں نظیر اکبر آبادی کا اٹھنا، غزل کی رونق جب بگڑ چکی تھی، غالب اور داغ جیسے بالکل غزل گو شعرا کا پیدا ہونا اور جب اردو شاعری کی قلم و قسطا محدود نظر آرہی تھی، انیس اور دبیر کا مرثیہ کی رزمیہ شاعری کا علم بند کے اٹھ کھڑا ہونا، ہماری زبان اور ہماری شاعری کی زندگی کے منتشر ثبوت ہیں۔ اگر زیر

دورانِ شاعروں سے خالی ہوتا تو پھر اس میں پائیدار اہمیت کا ادب لاپتہ تھا، دوسرے سادہ
 سادہ دور کے شاعر تو اس عصر میں بہت تھے، قومی پروردگی سے اردو شاعری اس دور
 میں قدر متاثر ہوئی، شاید ہی کسی ہوئی ہو، ہر شاعر کا کلام اکثر و بیشتر یا اس انگیز جذبات سے
 پیدا ہوا اور اس طرز کو مقصودانہ خیالات سے بڑی مدد ملی، تصوف نادانف کے لئے بہت ہی مبہم چیز
 اس لئے اس دور کے شاعروں کے لئے اس رنگ میں شاعری کرنے سے بڑی آسانی پیدا ہو گئی
 تھی۔

قدیم شائستگی اور تمدن کے اس آخری دور میں ہماری ادبیات اور شاعری میں اعلیٰ پایہ
 اور ادنیٰ پایہ کارناموں کی پیدائش کا عدم تسلسل اور بلند سے بلند تر شعری احساس کی طرف ہستیوں
 کی رفتار کا منقطع ہوتا جانا اور پائیدار شاعروں کا وقفوں وقفوں سے ابھرنا اس بابت کا پتہ دیتا ہے
 کہ اس کو کسی قوت محرکہ کی ضرورت ہے۔

غزل

از مولانا حافظ محمد اسلم حیرا چوری

خود سرا پا ناز کہہ لوں اس ستم ارا کو میں	کس طرح قائل کروں گا لیکن اک دنیا کو میں
حسن نے کر دیں نمایاں عشق کی مجبوریاں	کھا گیا غش، دیکھ کر اس چہرہ زیب کو میں
سب سے بیابانوں سے میری وحشت ملے نیاز	خود جنوں کی جیب میں رکھتا ہوں اک صحر کو میں
ہوں وہ مجنوں بس مرا پل جائے دنیا میں اگر	جتنے زیور ہیں پنہا دوں لا کے سبیلی کو میں
از رویہ ہے کہ سینہ میں سمائے جس قدر	دل کے بدلے بھروں خاک شرب و بلحا کو میں
جسمِ عالم میں اسی سو ہے رواں لوح نشاط	دل سمیٹتا ہوں جہاں کا قبہ خفسہ کو میں

کاش ہو اس کے قدم تک بھی رسانی ایک دن
 چوتھا رہتا ہوں اسلم جس کے نقش پا کو میں

مکالمہ عالم ارواح

ہندوستان کا تعلیماتہ طبقہ خصوصاً علمائے دینی و اہل جرحی زیدیاں صاحب مصنف تمدن اسلام اور ان کے رسالے الہلال کو اچھی طرح واقف ہیں۔ جرحی زیدیاں صاحب کا انتقال ہو گیا ان کے صاحبزادہ ایل زیدیاں صاحب نے ایک مضمون اپنے مشاہدات و مکالمہ عالم ارواح پر لکھا ہے۔ خود مروجہ جرحی زیدیاں کو عالم ارواح سے بلا کر ایل صاحب نے گفتگو فرمائی جو مضمون کا اقتباس اور کل گفتگو کا ترجمہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش

یہ موضوع عرصہ سے ہندوستان میں بھی اہل علم کو

اکثر اصحاب کو یقینی خیال کرتے ہیں اور ان کے پاس اس

دلائل ہیں۔ اکثر اس کو دھوکا خیال کرتے ہیں۔ اکثر شیاطین و راستوں۔

ہر شخص لیتا ہے اور اس فکر میں نظر آتا ہے کہ اگر واقعی یہ صحیح ہو اور اس پر بھی اسی طرح یقین ہو سکے جس طرح سائنس کے دیگر مسائل صحیح اور قابل یقین ہیں تو انسان کو غیر معمولی ترقی حاصل ہو جائے۔

خاکسار مترجم

مضمون

کیا ارواح ہم سے کلام کر سکتے ہیں اگر ایسا ہو تو کس طرح؟ کیا انسانی جسم کے فنا ہونے پر کل چیزیں فنا ہو جاتی ہیں؟ یا روح جسم کو تل کر بھی زندہ رہتی ہے کیا اس کی زندگی مستقل ہو؟ کیا حوادث اس کو اس زمین پر پیش آئے تھے وہ اس کے حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں؟

اگر روح کا وجود آئندہ فرض کر لیا جائے۔ اور اس کی مستقل زندگی بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تو کیا یہ ممکن ہو کہ ہم اس سے گفتگو اور ملاقات کر سکیں۔

مساہلی میں جو عرصہ سے غفلت کر رہا تھا اس کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ میں بھی ایک عرصہ تک غفلت میں ایسی فکر میں مبتلا رہا تھا اب ایک عرصہ سے میں نے یہ خیال کر کے کہ اس کا قطعی فیصلہ ہو یا صل اس کی طرف سے اپنے خیال کو ہٹالیا تھا لیکن چند سال کے بعد اتفاق سے یہ مشاہدات پیش آئے کہ میں مجبور ہو گیا کہ اس کو پھر ایک مضمون کی شکل میں پیش کر دوں۔

میرے نزدیک دنیا میں انسان کے لئے اس موضوع سے بڑھ کر کوئی موضوع نہیں۔ اگر یہ خاطر خواہ مل ہو جائے تو جو کچھ ترقی اس وقت حاصل ہوئی ہو اس مسئلہ کے حل کے بعد یہ اگلی اس آئندہ ترقی کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہ ہو۔

میں جب یہ مضمون لکھ رہا تھا تو خود بھی متردد تھا کہ اس کو لکھوں یا نہ لکھوں مجھے یقین ہو کہ اس مضمون پر کہیں شک کیا جائیگا اور کہیں تکذیب کیا جائے گی۔ میرے معلومات اور مشاہدات اس وسیع میدان میں نہایت درجہ حقیر ہیں۔ یہ مضمون اس قدر وسیع ہے کہ میرے خیال و وہم سے بھی زیادہ اس میں دست ہو۔ میں اس کو سلیطہ عبور نہ کر سکوں گا۔

میں اسی پس و پیش میں تھا کہ آخر کار میں نے فیصلہ کر کے ظلم اٹھایا کہ ہر چہ بادا باد میں نے جو کچھ خود دیکھا ہے وہ ضرور لکھوں گا خواہ یقین کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

اس مضمون کو لکھتے وقت میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں اور ان میں اب بحث و مزید تحقیقات کی گنجائش نہیں ہو۔ میں نے برسوں پہلے بھی ان امور پر غور کر کے چھوڑ دیا تھا لیکن اب جو تجربے میرے سامنے ہوئے ان کو میں ضروری سمجھتا ہوں کہ دنیا کے سامنے پیش کر دوں۔ بہت سے بڑے بڑے علماء و روحانیات کے قائل ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگ اس پر یقین نہیں کرتے جو لوگ روحانیات کے قائل ہیں ان میں سے یہ لوگ جیسے سر اور لیوراج۔ سر وکیم کو کس۔ سر وکیم جس و غیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ روح کے قائل ہیں اور انہوں نے کافی غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ جسم کے فنا ہونے کے بعد بھی روح زندہ رہتی ہے۔ ان کی علمی قابلیت اور شہرت ان کی اصابت رائے کی کافی دلیل ہے۔

ان مسائل میں ردائے تحقیقات اور معلومات جدید ہو رہی ہیں۔ اور لوگ کثرت سے اب اس طرح متوجہ ہو رہے ہیں۔ اگرچہ اس کے اصول ابھی اس طرح مدون نہیں ہوئے جس طرح ریاضی و طبیعیات کے اصول مدون ہو سکے ہیں۔ نہ ان پر ابھی اس طرح یقین کیا جاسکتا ہو جیسا کہ سائنس کے دیگر اصولوں پر یقین کیا گیا ہے۔ جب ہم ان اصولوں پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جس قدر اصول علمی مروج اور مسلمات میں ہیں وہ سب شروع میں نظریات ہی تھے۔ بر وقتہ رفتہ تجربوں اور علوم نے ان کی صداقت تسلیم کی۔ اور اب وہ مسلمات سمجھے جاتے ہیں۔

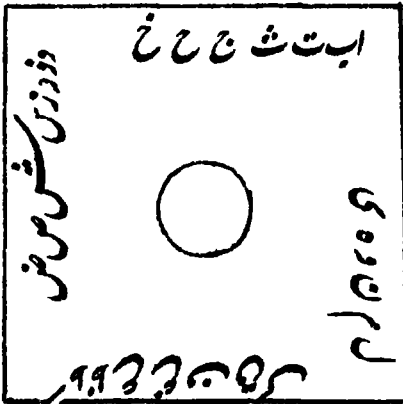
وقت ایسا بھی آئے جبکہ روحانیات کے نظریات بھی مسلمات اور اصول بھی اسی طرح ناقابل تردید ہو جائیں جس طرح آج کل ہیں۔

تردید ہو گئے ہیں۔ ان تمام حالات پر نظر کرتے ہوئے اگرچہ میں اپنا نتیجہ تو نہیں کہہ سکتا۔ مگر اس کو محض خرافات اور من گھڑت یا شبہہ بازی بھی نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ علماء روحانی ترقی کر کے کوئی مفید اور ضروری مسئلہ ایسا حل کر لیں کہ دنیا کو مفید ہو میں نے تو صرف اس موضوع پر مضمون لکھ کر اس دروازہ کو کھول دیا ہے جو اب تک مقفل تھا۔ ممکن ہو کہ ایک وقت ایسا بھی آئے کہ یہ سب معنی تفریح ہی ثابت ہو۔ بہر حال یہ ضرور ہے کہ کچھ نہ کچھ علماء کی توجہ سے اس پر گفتگو ہوگی اور کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔ اور وہ نتیجہ حقیقت میں علم کی ہر طرح خدمت ہی ہوگا۔

اس تہذیب کے بعد میں اپنا اصل مضمون شروع کرتا ہوں۔

لبنان شام میں ایک موسم گرما کے چند ہفتے میں نے گذارے۔ میرے بعض دوست بھی اس زمانہ میں وہاں تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے مشاہدات اور مکالمہ رواج کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ آج کل ان امور کی تحقیقات میں مصروف ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ ان حالات کو دیکھوں انہوں نے مجھ سے یہی کہا کہ اپنے والد مرحوم کی روح کو آپ بلائیں اور ان سے گفتگو کر سکیں اور اخبار اور امور جو صرف آپ دونوں کے علم میں ہوں گے ظاہر ہو جائیں گے۔ اس طرح آپ کو شک نہیں رہے گا۔ آپ کو شک کرنے کا توقع ہو لیکن جب ایسا ثبوت بین موجود ہو۔ تو کم سے کم آپ کو اس پر توجہ کرنا

کے لیے کہ اگر کسی کو یہ اسی وقت زیادہ بہتر ہوگا جبکہ آپ اپنے والد صاحب کی ہی روح کو بلا کر
 اسے حاصل کریں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم لوگ دھوکا دیتے ہیں یا یہ باتیں کچھ قابل لحاظ بھی
 ہیں۔ ان کے بعد اگر ایسے جلسے میں شریک ہونے پر راضی ہو گیا۔ چنانچہ میں ان کیساتھ جلسوں میں
 جاتا تھا۔ جہاں ارواح کو بلایا جاتا، اور ان کو گفتگو کی جاتی تھی۔ چند جلسوں میں تو میں کچھ
 باتیں بھی کیا یہ کہنا چاہئے کہ نہ سمجھ سکا۔ بعد میں مجھے بعض باتیں معلوم ہوئے۔ لیکن میرے دوست
 جو اس مشاہدہ کے محرک تھے ایک سال سے اس کام کو کر رہے تھے۔ انہوں نے بعض مشاہدات
 اور تجزیہ ایسے ایسے مجھے بتائے کہ عقل حیران ہوتی تھی مجھے ان کے فریب دینے یا دھوکہ باز
 جھوٹا ہونے کا گمان تک بھی نہیں ہو۔ مگر میں صرف اپنے ہی مشاہدات ہدیہ ناظرین کر دیتا تھا۔
 جو طریقہ عموماً مروج ہو وہ یہ ہے کہ ایک طرح شکل کی تختی جس کا نمونہ ذیل میں درج ہے۔



نہایت عمدہ سنگ مرمر کی ہوتی ہو۔ اور اس کے
 چاروں طرف تھوڑے مفردات لکھے ہوتے ہوتے
 ہیں۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی پیالی ہوتی ہو۔
 جو آسانی سے پھسل سکتی ہو۔ اس تختی کے سامنے
 دو آدمی جو واسطے کہلاتے ہیں، بیٹھتے ہیں۔
 ان کے ذریعہ سے روح کو گفتگو ہو سکتی ہے۔

یہ دونوں اپنی انگلیاں اس پیالی پر رکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اہل جلسہ جس روح کو طلب کرنا
 چاہیں وہ ان کو کہہ دیتے ہیں اور وہ روح کسی ایسی روح کے توسط سے طلب کی جا سکتی ہے جس کو
 پہلے ان واسطوں کی ملاقات ہو۔ یعنی وہ ان کی طلب پر پہلے آچکی ہو۔ اسی ملاقاتی روح کو پہلے
 طلب کیا جاتا ہو اور اس کو درخواست کی جاتی ہے کہ ہم فلاں روح سے ملنا چاہتے ہیں جب یہ درخواست
 ملاقاتی روح کو پیش کر دی جاتی ہے۔ اس وقت جملہ حاضرین خیال کرتے ہیں کہ وہ روح جو طلب کی گئی
 تھی آگئی۔ تو وہی دیر میں واسطوں کو معلوم ہوتا ہے کہ پیالی حرکت کر رہی ہو۔ یہ واسطہ صفر

کے آنے کی اطلاع دیتے ہیں اور جو سوال کیا جاتا ہے اس کا جواب پیالی کی حرکت و اس
روح کو کہ پیالی صرف مفردات پر حرکت کرتی ہے۔ اور مفردات سے کلمہ اور کلموں کو جملے
بنے رہتے ہیں اور جواب پورا آجاتا ہو۔ حاضرین جلسہ صرف پیالی کی حرکت دیکھ سکتے ہیں
اور کچھ نہیں معلوم کر سکتے۔ اس تفصیل کے بعد میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ واسطے
پیالی پر کچھ قدرت نہیں رکھتے۔ وہ جس طرف حرکت کرے گی یہ محض اس کی اتباع کریں گے۔
اس کی مدافعت و مخالفت نہیں کر سکتے۔ جو سوال کئے جاتے ہیں واسطے اس کو نہیں جانتے
اور اس کا معقول بلکہ ایک حد تک درست جواب آتا ہے بعض بعض سوال جواب کے واسطے
حاضرین میں سے کچھ لوگ جانتے ہوں لیکن بعض سوال ایسے بڑے
سوال کر نیوالے یا مضمونہ روح جو طلب کی گئی ہے جانتی ہے۔
یا قوت نفس یا بجلی کا یہ کرشمہ ہے لیکن یہ غلط ہے اس قسم کا کوئی تجربہ
بجلی کی روشنی میں ہوتے ہیں ان واسطوں کی حسن نیت اور پرہیزگاری کا قائل ہوں۔ میں
ان کو دغا باز فریبی نہیں سمجھتا۔

اب میں اس تفصیل کے بعد وہ مکالمہ درج کرتا ہوں جو میرے والد مرحوم کی روح
کے درمیان ہوا۔ میں نے وہ حصہ اس اشاعت سے حذف کر دیا جو جس کا تعلق میری ذات کو
اور خانگی امور سے تھا۔ کیونکہ اس سے دنیا کو کیا کچھ ہو سکتی تھی۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمام
جوابات ہمیشہ سوال کے مطابق اور بالکل ٹھیک آتے ہیں۔ میں نے پیالی کو چلتے ہوئے صرف
پر حرکت کر کے جملہ کلمات بناتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ پھر میں نے والد صاحب کی روح
سے اپنی خانگی زندگی اور اپنے ذاتی حالات کے سوالات کئے جن کی اشاعت میں مناسب
نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد میں نے کہا۔

میں۔ (والد صاحب کی روح سے) میرے خیال میں مناسب ہے کہ میں ایک مضمون
مشاہدات و مکالمات ارواح پر لکھوں کیا جناب مجھے اس ترتیب میں مدد دیں گے۔ جناب بیان

اللہ کا صانع جسم ہو جاوے کہ کس طرح زندہ رہتی ہے۔

واللہ صاحب کی روح۔ جب روح اپنے مسکن ارضی کو چھوڑتی ہے تو وہ تنہا
ایک محسوس زمین ہی کی طرح رہتی ہے۔ اور پھر رفتہ اپنے استحقاق کے بموجب رفق و بلندی
محل کرتی ہے۔ عموماً چار درجے ہیں۔ ساتواں درجہ قرب باری تعالیٰ کا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ
کچھ نیچے کے درجوں میں نہیں رہا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان درجوں میں راحت نہیں ہوتی۔
اللہ نہ ایک سینڈ ٹنڈاب ضمیر سے رہائی ملتی ہے۔

میں۔ آپ کس درجہ میں ہیں اور کیا آپ اس درجہ میں پہلی ہی دفعہ پہنچ گئے ہیں
وہ۔ الحمد للہ میں چھٹے درجے میں ہوں۔ اور یہ انسان کے لئے بڑی کامیابی ہے۔
یہاں نہ تو عذاب ضمیر ہے اور نہ فکر و غم ہے۔ بلکہ یہاں عمدہ پرسکون زندگی ہے۔ البتہ میں
وہ درجے اس درجہ میں آنے سے پہلے بھی گذر کر آیا ہوں۔
میں۔ ان درجوں میں کیا فرق ہے۔

وہ۔ جب ایک درجہ سے انسان گذر کر دوسرے درجہ میں جاتا ہے تو عذاب
ضمیر میں تخفیف ہو جاتی ہے۔

میں۔ کیا آپ نے اپنے بعض دوستوں سے بھی ملاقات کی جو مر چکے ہیں۔
وہ۔ بہت سے دوستوں کی ملاقات ہوئی۔

میں۔ مثلاً کون کون۔

وہ۔ نوم (نوم سے مراد مرحوم نوم یک شتیر سے متعلق اور دوسرے طبقہ میں ڈاکٹر
یعقوب صرف و جبران خلیل جبران اور اپنے بعض خاندانی اعضاء کا بھی ذکر کیا،
میں۔ کیا ان میں آپس میں گفتگو کرتی ہیں۔

وہ۔ ہاں میں گفتگو بھی کرتی ہیں۔ ملتی جلتی ہیں۔ آپس میں محبت کرتی ہیں۔ تعارف
ہوتا ہے ہم تم کو دیکھتے ہیں۔ ہمارے خوشی سے خوش اور ہمارے رنج و غم سے غمیدہ ہوتے ہیں۔

لیکن ہمارے رنج اور اہل دنیا کے رنج میں فرق ہو۔ وہاں کا رنج یہاں کے رنج کی طرح نہیں ہے

میں۔ آپ کو رنج کس طرح کا ہوتا ہے اور اس کا کیا اثر ہوتا ہے وہ۔ ہیں تمہارے رنجوں کا احساس ہوتا ہے اور اس احساس سے متاثر ہوتے ہیں۔

میں۔ کیا آپ تکان کو محسوس جانتے ہیں۔

وہ۔ ہاں۔

میں۔ جناب کو علم ہو کہ الہلال اپنے چالیسویں سال پر بند کریں گے کہ الہلال کے قارئین تک آپ کا مکالمہ ہو چکا ہے وہ۔ ہاں ضرور لکھو۔ میں اپنی زندگی اس کی ترقی

کے وقت بھی مجھے خیال رہا اور اس کی ترقی کی آرزو کرتا رہا میرا جیسا کہ انسان عادی ہے حالات الہلال پر آتے رہے۔ یہاں کچھ جلد مقررہ تھے جو غالباً بعض دوستوں کے جو حاضر جلسہ تھے اذان کا نتیجہ ہوں، پھر مجھے خطاب کرتے ہوئے روح نے کہا "ایل میری یہ تمام تقریر ایسی ہو کہ جو باپ اپنے اولاد سے کیا کرتے ہیں لیکن میری مرضی ہو کہ تم ضرور لکھو۔ مجھے الہلال پر فخر ہے اور یہ یاد رکھو کہ میری روح ہمیشہ زندہ ہو اور میں تمہارے ساتھ ہوں اس کے بعد جو الفاظ کہے گئے ان کی اشاعت سے میں معذور ہوں،

میں۔ اپنے عالم کی کچھ معلومات سے ہیں مستفید فرمائیے۔

وہ۔ جب انسان کی ارضی حیات ختم ہوتی ہو۔ اس وقت سے حیات سادہ شروع ہوتی ہے۔ یہ وہ حیات ہو کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ حیات یا تو جنت کی تسبیح ہوتی ہو یا جہنم کی۔ یہ ان اعمال پر منحصر ہے جو دنیا میں کئے گئے ہیں۔ یہ یاد رکھو کہ روح موجود ہے، عذاب ان لوگوں پر نازل ہوتا ہے جو حیات ابد کے قائل ہیں۔ روئیں اپنے دوستوں کو اعمال

سے باتیں بھی رہتی ہیں۔

دوسرا طبقہ

میں پہلی مرتبہ جب جناب نے تکلیف فرما کر معلومات فراہم کئے تھے۔ وہ میں نے قہقہہ دے کر کہتے ہیں کیا جناب براہ کرم اس مضمون کو مکمل فرمائیں گے۔

وہ۔ تارین کرام کو تعجب ہو گا جب وہ میرا نام جرجی زیدان دیکھیں گے لیکن میں ان کے تعجب کو رفع بھی کر دینا چاہتا ہوں۔ تارین کرام یاد رکھیں۔ میں جرجی زیدان ہوں میں تم کو تاکید سے کہتا ہوں کہ روح جسم کو جدا ہونے کے بعد بھی زندہ ہے۔ میرے پاس اس کے بہت کافی دلائل ہیں۔ لیکن یہ دلائل صرف ان ہی کو فائدہ دے سکتے ہیں جو ان کو سنیں اور سمجھیں۔ میں تم کو وہ امور یاد دلاتا ہوں جو بالکل بھلا دیئے گئے ہیں یہی خواہش کرتا ہوں کہ تم کو روح کی آئندہ زندگی کا یقین ہو جائے اور یہ ہوش آجائے کہ جس قدر اعمال دنیا میں کئے گئے ہیں بلا کم و بیش سب کا نتیجہ دوسری دنیا میں ملنے والا ہو۔

عذاب و مصائب ان ہی لوگوں پر ہوتے ہیں جو حیات ابد کے قائل نہیں ہیں تارین الہلال شاید ان سے فائدہ اٹھائیں۔

میں۔ روحوں مختلف لوگوں سے جبکہ ان کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں کس طرح گفتگو کرتی اور ایک دوسرے کی بات کس طرح سمجھتی ہیں وہ۔ آپس میں سب ایک دوسرے کے مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ ہاں زبان سے نہیں کی جاتی بلکہ اشغال فکر سے ایک دوسرے کا مفہوم ایک دوسرے کو معلوم ہو جاتا ہے۔

میں۔ کیا مرد و عورت کی شناخت بھی دھوئیں میں ہوتی ہو۔

وہ۔ بیشک بلکہ جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ بھی قائم رہتی ہیں۔

میں۔ دنیا میں جو مختلف مذاہب ہیں ان کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

وہ۔ مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں ہو۔ اپنے اپنے اعمال کی سزا سبھی کو ملے گی۔

میں کوئی مذہب سب سے زیادہ اچھا اور سچا سمجھا گیا ہے۔

وہ۔ تمام مذاہب جو خدا کے قائل ہیں ایک ہیں۔

میں۔ تو فرضاً اگر انسان خدا کا قائل نہ ہو بلکہ خدا کا منکر ہو تو۔

وہ۔ اللہ واحد کا اعتقاد تو ضروری ہو۔

میں۔ اگر اس کی عقل اس کو خدا کے وجود کا قائل کر دے لیکن اعتماد کلی نہ ہو۔

وہ۔ تو کیا پھر قائل ہونے کے بعد کہیں اعتقاد ضائع ہو جائے یا کرتا ہے۔

میں۔ اور بت کے پنجارتی۔

وہ۔ ہلاک ہوتے ہیں۔ اپنی عذاب میں مبتلا ہوتے۔

میں۔ فرض کیجئے کہ انھوں نے کبھی خدا کی بابت کہیں کچھ

وہ۔ نہ تو اس کو ہوگی لیکن اس کا انتقال ترغیظ کی طرف۔

میں۔ کیا آپ خالق کے اوصاف بیان کر سکتے ہیں۔

وہ۔ آج تک کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔

میں۔ کیا کبھی امید زیارت ہو۔

وہ۔ یقینی اور وعدہ بھی ہے۔

میں۔ کیا آپ کو مستقبل کی بابت بھی کچھ معلومات ہوتی ہے۔

وہ۔ ہم اس کی بابت کچھ کہہ نہیں سکتے۔

میں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو کچھ معلومات ہو یا نہیں۔

وہ۔ کچھ معلومات ہے سب ممکن نہیں لیکن ہم کچھ بھی اس کی بابت بیان نہیں کر سکتے۔

میں۔ کیوں؟

وہ۔ ہمیں علم نہیں ہے۔

میں۔ کیا حیوانات کی بھی رو میں ہوتی ہیں۔

وہ۔ بیک رہیں ہوتی ہیں لیکن ان کا کوئی انتقام مقرر نہیں ہے۔

میں۔ پھر وہ کہاں چلے جاتے ہیں۔

وہ۔ فضاے بید میں منتشر ہو جاتے ہیں نہ پھر ہم ان کو دیکھتے ہیں نہ ہیں ان کی
حقیقت کوئی علم ہوتا ہے۔

میں۔ کیا آپ کا کوئی مقررہ مرکز ہے۔

وہ۔ ہے لیکن میں علم نہیں وہ کہاں ہوا اور اس زمین سے کس قدر فاصلہ پر ہے۔ لیکن جو
بہت فاصلہ پر۔

میں۔ کیا میرے علاوہ کسی نے آپ کو دنیا میں طلب کر کے کچھ معلومات کی ہے۔

وہ۔ نہیں تم ہی پہلے شخص ہو جس نے مجھے بلایا۔ مدت تک ہمیں گفتگو کرنے کی قابلیت نہیں تھی
اب مجھے عالم ارواح میں واپس ہونا چاہئے۔

یہ مختصر نوٹ اس گفتگو کا جو مجھ کو اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کی روح سے ہوئی ہیں
نے تفصیلات کچھ چھوڑ کر صرف مختصر حالات اس مضمون میں درج کئے ہیں اور قارئین کرام کے
لئے یہ بحث چھوڑتا ہوں کہ وہ خود غور و فکر سے کام لیں اور سمجھ لیں کہ اس کی کوئی اصلیت حقیقت
میں ہرگز نہیں۔ میرا خیال تھا کہ میں ان لوگوں کا نام بھی ظاہر کر دوں جو ان امور کو صحیح اور یقینی تصور
کرتے ہیں لیکن ابھی تک میں خود ان کو ایسا یقینی نہیں سمجھتا۔ یہاں تک کہ علوم کے نظریات یقینی سمجھ جاتے ہیں۔
اس لئے میں ان کے نام بھی ظاہر نہیں کروں گا میں نے یہ بھی معلوم کیا کہ بعض ارواح انہی کمالات
میں کچھ فعلیات بھی کرتی ہیں۔ کچھ بھول بھی جاتی ہیں۔ تاہم جن لوگوں کو ان امور سے کوئی چسپ ہو ان کو
چاہئے کہ وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں مگر یہ کہ ہم کسی خاص نتیجہ پر جو آئندہ دنیا کے لئے مفید
ہو پہنچ سکیں۔ تمام ترقیات اسی اصول پر ہوتی رہتی ہیں۔

اس کے بعد بھی اگر ایسے امور پیش آئے اور کہیں مکالمہ کا مجھے شرف حاصل ہوا تو میں
ماہرین کی خدمت میں پیش کر سکوں گا۔

مغرب خانے میں

ابھی رات زیادہ نہیں آئی تھی، لیکن فضا تیرہ وار ہو رہی تھی، بادل چھانے ہوئے تھے، ستارے چادر ابر میں روپوش تھے، زور شور کی بارش ہو رہی تھی، بچا رکھو کا غریب خانہ بھی، جب تک چراغ مشعل راہ نہ ہو، نظر نہیں آسکتا تھا۔

عمود کی جھونپڑی میں بھی کچھ نظر نہیں آتا، ہاں ایک چراغ تھا جو بچا راہی لٹا کے موافق اس تاریکی سے چھا کر رہا تھا، ایک انگلیشی تھی جس کی آگ ٹھنڈا باقی رہ گئی تھیں جو عنقریب افسردہ ہونیوالی تھیں۔

اس تاریکی میں چند جھروکے اس طرح چمک رہے تھے۔

ادھر ادھر دیکھنے سے ایک فرش نظر آتا تھا، جس پر تین بچے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں آؤ دراز تھے۔ پاس ہی ایک عورت بیٹھی تھی جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، دل ہی دل میں زبان حال سے وہ دعا مانگ رہی تھی کہ اس کا شوہر بخیر و عافیت واپس آجائے۔ کیونکہ حسب عادت آج بھی وہ شکار کے لئے گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

بارش اب اور تیزی سے ہونے لگی، ہوا بھی بہت تیز چلنے لگی۔ جس کے اثر سے جھونپڑی بھی لرزہ بر اندام ہو رہی تھی، بچے چادر میں سکرٹے پڑے تھے، لیکن اس عورت کا دل ٹھوٹے سے کانپ رہا تھا، اس نے خیال کیا کہ بارش کا یہ تسلسل، بجلی کی یہ کڑک، ہوا کی یہ سنسنابٹ چمتوں اور دیواروں کا دھڑا دھڑ گنا۔ کوئی اچھی علامت نہیں ہے، اپنے شوہر کے متعلق اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک و ادوہام کا ایک دریا لہریں مارنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں خیال کرنے لگی کہ میں ایک غریب اور دکھیا عورت ہوں۔ میرا نہ کوئی والی ہے نہ وارث، یہ چھوٹے چھوٹے بچے ابھی اس قابل بھی تو نہیں ہیں کہ اپنی روزی کما سکیں،

پلیٹ پال سکیں، زمانہ کار ہو گرم برداشت کر سکیں۔ اے اللہ، تو مجھ ضعیف و ناتواں کے لئے اور ان معصوم بچوں کے لئے اسے پچاسے جو تیری سپردگی میں ہے۔ جو اپنی زندگی مجھے سوئپ کر رزق کی تلاش میں نکلا ہے تاکہ اس چھوٹے موٹے خاندان کا کچھ انتظام کرے..... اب تک وہ واپس نہیں آیا، نہ معلوم قسمت اس کے ساتھ کیا کر نیوالی ہو، اور کسے معلوم کہ کیا کر چکی ہو؟..... ہم شکاریوں کے بال بچوں کی زندگی کتنی الماناک اور کس قدر اندوہ افزا ہوتی ہو، وہ ہمیں تنہا چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور وہ کہ اس اتھاہ سا گرمی ہاتھ پیر مارنے لگتے ہیں جس کی نہ کوئی حد ہے نہ پایاں، اور نہ اس کے خطرات و ہلاکت سے نجات کی کوئی صورت، اسی کجنت روزی کی تلاش میں وہ ان اٹھتی ہوئی موجوں کا مقابلہ کرتے ہیں، جو موجو کے بھیڑیے کی طرح جھپٹتی ہیں، جیسے وہ گوشت کے ٹکڑے پہچانتا ہے..... اور ہم جو قسمت سے ڈر رہے ہیں کہ جانے کیا ہو، تو کہیں کچھ ہو نہ چکا ہو، کیا قسمت سے لکڑی کے چند وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بچا لینگے جنہیں چپو کہتے ہیں، تھوڑی دیر تک موجوں کے ساتھ کشمکش ہوگی اور آخر کار وہ بے حد و نہایت غار میں ہمیشہ ہیٹھ کے لئے گر جائیں گے تاکہ مچھلیوں کا شکار بنیں۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ خود مچھلیوں کی تاک میں تھے۔

اب بارش دیر تک ہو گئی تھی، ہوا بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، وہ عورت چراغ اٹھا کر دروازے کے سامنے دیکھنے لگی کہ اب صبح ہونے میں کتنی دیر باقی ہے؟ لیکن تاریکی پورے طور سے مسلط تھی، اور بارش بھی کچھ نہ کچھ ہو رہی تھی، چراغ کی روشنی ایک اور جھونپڑی پر پڑی، جس میں نہ روشنی تھی نہ حرکت، اسے یاد آ گیا کہ یہ غریب جمیلہ کی جھونپڑی ہے جس کا غورہ چنہ مینے ہوئے، ڈوب کر مر گیا تھا، اور زمانہ کے شدائد و مصائب برداشت کرنے کے لئے دو بچے چھوڑ گیا تھا، اس کے جی میں آیا کہ لاؤ فوراً جمیلہ کی خبر لے آؤں؟ اس نے

کدو کے علم کا کچھلہ مرض الموت میں مبتلا ہے، وہاں ہو چکا کہ جب اس نے دروازہ کھٹکایا، تو کوئی جواب نہ پا کر خود اس نے دھکا دیکر دروازہ کھول لیا، اپنے چراغ سے دہ پاس کی چیزیں دیکھ سکتی تھی، اپنی سامنے اسے جو کچھ دیکھا اس سے اس کا دل مڑکنے لگا، خون خشک ہو گیا، اور وہ سر تاجہ قدم کا پٹنے لگی۔

اس نے دیکھا کہ جھونپڑی ہوا کی شدت سے ہل رہی ہو، اور بارش کے پانی نے اندر داخل ہو کر تمام چیزوں کو دھو کر دیا ہے، جیلہ باصل ساکت وصامت فرش پر دراز ہے، جب اس نے پاس سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا تو کام تمام ہو چکا ہے، پانی کے قطرے اس کے سر سے اور اس کے سے ٹپک رہے ہیں، پہلے تو چپ چاپ وہ یہ دیکھ رہا تھا، اب وہ چیخ اٹھا۔

”خدا کی اس زمین پر یہ ہے، غریبوں اور بیکوں۔“

یہ ہے وہ مرتبہ رنج جہاں زندگی کو بھر شامد و نواب اور مالک و مصائب کا دور ہے۔ یہ ہے وہ پونچتے ہیں، اس کا رزار عالم میں وہ مجہول و مطر و زندگی بسر کرتے ہیں، ان کا کوئی شناسا ہوتا ہے، نہ واقع کا رنہ نوحہ خواں ہوتا ہے نہ تیار دار، اب وہ ایسی جگہ جا رہے ہیں، جہاں نہ کوئی ”ہم سخن“ نہ ”ہم نشین“، نہ ان کے جانے کا کسی کو لال ہے نہ قلق مستی کا اعزہ واقربا بھی بے پروا ہیں۔

کیا عجب ہو کہ میرا اور میری اولاد کا بھی کل یہی حشر ہو جو آج میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں؟ اس وقت تو کوئی ایسا بھی نہ ہو گا جو اس حال زاد پر چند آنسو بہا لے۔ جس طرح ان سکینوں کے لئے میں ماتم کناں ہوں کل میرا ماتم کرنے والا تو کوئی بھی نہیں۔ پھر اس نے اپنی چادر جیلہ کی لاش پر ڈال دی، اور چراغ لے کے اوہرا دھر چلا گیا تو بچے فرش خاک پر آسودہ خواب نظر آئے، ایک کے منہ پر ایک کا منہ تھا، اور ایک مصوٰانہ قسم ان کے اردو پر کھیل رہا تھا، گویا وہ موت سے جوان کے چاروں طرف مٹا رہی تھی۔

پہلے ہی اس نے بچوں کے سر پر جمید کی چادر دیکھی، اسے خیال ہوا کہ ٹھنڈے دو ٹکٹے پہلے اس
 کے جسم پر جمید تھے اپنے مرض الموت میں دیکھا ہوگا کہ پانی ٹپ ٹپ ٹپک رہا ہے، بچوں کے
 ہاتھ جکڑ رہے ہیں تو اس نے ہر ماوری سے مجبور ہو کر بچوں کے جسم پر یہ چادر ڈال دی ہوگی
 حالانکہ سب سے زیادہ وہ خود اس چادر کی حاجت مند تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تاب نہ لاسکی، اور جہاں
 بچہ ہو گئی۔

عمو کی بیوی اس ہیبت ناک اور ولد و ز منظر کو دیکھنے لگی، ہوا اس وقت بھی چل رہی
 تھی، بارش اس وقت بھی ہو رہی تھی، اور پانی کے قطرات جمید کے ماتھے سے گالوں پر اس
 وقت بھی ڈھلک ڈھلک کر آرہے تھے، گویا اپنے بچوں کے فراق میں وہ آنسو بہا رہی تھی،
 اب آثار صبح ظاہر ہونے لگے تھے، جب کچھ کچھ روشنی آنے لگی تو اس نے چراغ بجھا کر
 ایک کونے میں رکھ دیا، میت کے لئے دعا مانگی، پھر بچوں کی جانب بڑھی، ان پر وہ روئی اور
 ان دونوں کو نہایت رفیق و سکون سے اپنی گود میں اٹھالیا، اور اپنی جھونپڑی میں لے گئی
 اپنے بچوں کے ساتھ انہیں بھی لٹا دیا، اور سب پر ایک ہی چادر ڈال دی،

اس کام سے فارغ ہو کے وہ ایک جانب بیٹھ گئی، اور دل ہی دل میں کہنے لگی: معلوم
 میں نے ان بچوں کو لاکر کوئی اچھا کام انجام دیا ہے، یا بُرا، میں جانتی ہوں کہ اللہ نے
 عورت کا دل بحیرہ رقی و محبت سے بنایا ہے، وہ اسے نہیں برداشت کر سکتی کہ اس کے
 سامنے دو معصوم بچے ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں فرش خاک پر دراز ہوں، وہاں سوا ان
 کی ماں کی فرش کے ان کا کوئی رفیق نہ ہو، کوئی عورت اس حال میں تن تنہا انہیں نہیں چھوڑ سکتی
 وہی کرتی جو میں نے کیا ہے، بغیر اسے معلوم کئے کہ اس کا رروائی کا اس کی ذات پر کیا اثر ہوگا؟
 اور پھر جبکہ وہ یہ بھی جانتی ہو کہ اس کس سپری میں چھوڑ جانے کا انجام کیا ہوگا؟
 یہ منظر میں نے دیکھا ہوں اس نے مجھے حوا قب و ستاج سے بے نیاز کر دیا ہے، اگرچہ کچھ عرصہ

کے لئے یہ واضح ہو گیا کہ میں نے غلطی کی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ اس غلطی سے
میں بچ ہی سکتی تھی، میں اس کی مرغب ہوئی، کیونکہ میرا دل گوشت اور خون کا ہے، فولاد اور
پتھر کا نہیں۔

میں جانتی ہوں کہ میرا شوہر نادار ہے، تلاش ہو، فاقہ مست ہے، اور میرے بچے
خودمان شینہ کے محتاج ہیں، اب اس فقر و فاقہ کے عالم میں اپنے بچوں پر ان دو جدید بچوں
کا اضافہ کسی طرح بھی مناسب نہیں، لیکن یہ بھی کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم اپنے رات نرس کے
مقابلہ میں ان سے کھل کریں اور ان ننھے بچوں کو اپنے سامنے بھوک اور رونا دکھائیں۔
رنے دیں۔

یہ ہیں میرے خیالات جنہیں ابھی ابھی اپنے شوہر کی
اپنے اس فعل پر نہ میں متوحش ہوں نہ خوف زدہ، کہ وہ مجھ پر خفا
انہیں نکال باہر کر دیں۔

یہ کہتے کہتے وہ دفعتاً رک گئی، کیونکہ دروازہ پر کھٹکھٹانے کی آواز آئی، اس سے وہ
خوف زدہ ہو گئی، لیکن معلوم ہوا کہ یہ ہوا کی سننا مٹ مٹی، تھوڑی دیر تک وہ اپنا سر جھکائے
رہی، سر جھکائے ہوئے وہ عالم خیال میں پہنچ گئی، اس بزم تخیل میں اسے ایسے مناظر
کے سامنے آئے کہ کبھی وہ رونے لگتی، کبھی ہنسنے لگتی، کبھی غصہ ناک ہو جاتی، اور کبھی مطمئن کبھی
اس کا چہرہ کسی امید سے دکنے لگتا، کبھی مایوسی کی شخصیں اس کے ماتھے پر پڑ جاتیں، کبھی اپنا شوہر
کے متعلق اچھے اچھے خیالات اس کے دل میں موجزن ہوتے، کبھی طرح طرح کے دوسرے پیدا
ہو جاتے، غرض اسی امید و بیم اور اسی کششِ آلام و افکار میں اس کا دل جھپکولے کھا رہا تھا کہ
اتنے میں اس نے کوئی سیاہی چیز اپنے سامنے آتے ہوئے دیکھی، اس کا دل خوف اور وہم
سے زور زور سے دھڑکنے لگا، لیکن وہ دیکھتی کیا کہ اس کا شوہر کا ندھے پر جال ڈالے،
ٹپٹے پر اس کی چمڑکے چلا آ رہا ہے، اور پانی اس سے ٹپک رہا ہے، اپنے شوہر نمود کو دیکھ کر وہ

اس نے اس کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی، کچھ سمجھ کر آنکھیں جھکالیں، پھر وہ پوچھنے لگا: "کیسی گزری؟" محمود نے اپنا جال اور اس کی چمڑا ایک طرف رکھ کے کہنا شروع کیا:

"ایک رات! تو یہ ہیں نے تو آج تک ایسی رات دیکھی ہی نہیں، اور شکار کو کیا پوچھتی ہو؟ وہی بتائی مانتا آیا ہوں، اگر خدا کا مجھ پر اور تم پر فضل نہ ہوتا تو میرے ہاک ہونے میں رہ گیا تھا لیکن غم مجھ پر اس وقت تک قابو نہیں پاسکتا جب تک میں تم لوگوں کو بخیر و عافیت پاتا ہوں، بچوں کا کیا حال ہے؟

یہ شکوہ کانپنے لگی اور ٹالنے کے طور پر جواب دیا: "اچھے ہیں۔" محمود آج کیا بات ہے کہ میں نہیں اس قدر آشفۃ خاطر اور مضطرب دیکھ رہا ہوں، اچھا رات کیسی گزری؟

اس نے اپنا سر جھکایا اور کہا: "رات کو تو ان بچوں کی قصصیں سیتی رہی، اس طوفان ابرو باد کی کراک اور گرج جب ہنسی تھی تو تھاری طرے سے قسم قسم کے وہم آنے لگتے تھے، لیکن اب تو الحمد للہ کچھ نہیں ہے، اچھی ہوں۔"

یہ کہہ کے اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا، کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن کہہ نہ سکتی تھی، الفاظ جھوٹ پر آ کے رہ جاتے تھے، آخر بہت کوشش کے بعد وہ کچھ کامیاب ہوئی، اور کہنے لگی، "لیکن ایک دوسری بات ہو جس نے مجھے مضطرب کر رکھا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"تمہارے آنے سے کچھ پیشتر ہماری پڑوسن جیلہ کا انتقال ہو گیا، اپنے پیچھے وہ دو بچے چھوڑ گئی ہے جن کا اس عالم میں نہ کوئی پر سارا ہے نہ خبر گیر۔" یہ سنتے ہی محمود پر ایک اضطراب و اضطراب کی کیفیت طاری ہو گئی، وہ اپنی جگہ سے

بھٹک رہا تھا، پھر اس نے اپنی بیگی ہوئی ٹوپی بستر پر ڈال دی، سر پر کسی کبھی ہاتھ پیرتا، کبھی بالوں پر
خصل کرنے لگتا، اس کی بیوی اس پر نظر جائے اس کے خیالات و جذبات کا اندازہ کر رہی تھی
انورہ فرش پر بیٹھ گیا جو جھونپڑی کے وسط میں بچھا ہوا تھا، اور آہستہ آہستہ کہنے لگا،

خدا! اگرچہ میں علم سے بے بہرہ ہوں، جاہل ہوں، میرا یہ غضب نہیں کہ میں تیری حکمتوں
کو سمجھ سکوں، اور یہ جان سکوں کہ یہ غیب بچے اپنی ماں جیسی نعمت سے کیوں محروم کر دیئے گئے؟
لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس واقعہ کے وجود سے انکار کروں، شاید وہ لوگ جو مجھ سے زیادہ
علم و بصیرت رکھتے ہیں، تیری ان مصیبتوں اور حکمتوں کو اس سے زیادہ سمجھ سکیں، اقتنا میرا سمجھ
سکتا ہوں،

بلاشبہ میں تہی دست و نادار ہوں، بے نوا اور

میری زندگی مصائدات و اتفاقات کی رہین منت ہے۔

مجھ پر اور میرے بچوں پر ایسے کڑے دن گزرتے ہیں کہ ہیں قوت لایوت ہی میری، اور
لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں، وہ ان مٹیوں پر اس کو زیادہ کڑھتا ہو بتنا فقر و فاقہ کے عالم
میں وہ دکھ محسوس کرتا ہے،

پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا اور کہا،

”میں سخت متاثر ہوں، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمیلہ کی روح کھڑی دروازہ کھٹکنا

رہی جو، اور ہم سے بالخاصہ وزارتی کہہ رہی ہے کہ ہم اس کے بچوں کی سرپرستی کریں ان کفالت
کریں..... لیکن میرے اللہ یہ ممکن کیونکر ہے؟ میں کروں تو کیا کروں؟

اب گویا اس کی بیوی کو ایک موقع مل گیا، اس نے کہا،

”اور مجھے تو ایسا سنا دیتا ہے کہ وہ کہہ رہی ہے، محمود! میری مصیبت تمہاری مصیبت

کو زیادہ ہے، تم اس عالم میں ہو کہ کچھ نہ کچھ کر سکتے ہو، میں اس دنیا میں ہوں کہ میرے کئے
کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔“

تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہا، بیٹھے بیٹھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، پھر

سخت سستے سال ہمارے دو بچے نذر ابل نہیں ہو چکے ہیں؟

بچوں نہیں۔

مگر آج وہ دونوں زندہ ہوتے تو ہم کیا کرتے؟

مسو! اس کے کہ ہم اپنا معاملہ خدا کو سونپ دیتے، اور اس سے استعانت چاہتے،

کیا کر سکتے تھے؟

تو ہم ان دونوں بیٹیوں کا معاملہ بھی خدا کو سونپتے ہیں، اور اسی سے استعانت

چاہتے ہیں، ہم یہ سمجھ لیں گے کہ ہمارے وہ دونوں بچے زندہ ہیں، یا یہ جان لیں گے کہ

مٹا نے انہیں از سر نو زندہ کر دیا ہے..... جاؤ ان بچوں کے پاس جاؤ اور

بھینس یہاں لے آؤ، ممکن ہے وہ بچے جاگ گئے ہوں، اور اپنی ماں کا یہ حادثہ دیکھ کر

خوف و وحشت سے وہ بیچارے بھی ختم ہو جائیں،

دیکھو! انہیں رفق و محبت سے لانا، اس طرح لانا کہ وہ جاگنے نہ پائیں، اور یہاں

وہ اپنے بچوں کے پاس لٹاؤ، وہ متظر بھی کتنا عجیب و غریب ہو گا جب وہ بیدار ہوں گے

اور ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگا..... آج سے میرے ادھر نمید اور

گوشت حرام ہے، جب تک میں اس خاندان کے کھانے پینے کا انتظام نہ کر لوں جس کا

بہت و اتفاق سے میں ہی سرور ہوں، اللہ نے چاہا تو ان پاک اور منصوم بچوں کے طفیل

ہمارا گھر روٹی اور چربی سے بھر جائے گا، ہم کھاتے کھاتے تھک جائیں گے، لیکن سامان

رستہ ختم نہیں ہو گا۔

۱۔ احسان کے ہاں علماء عراق نے بمبئی کی ملت کا فتویٰ دیا ہے، اس لئے کہ اس کا نشہ ایسا نہیں ہوتا کہ آدمی کو بے خود

کر دے، بلکہ زیادہ سے زیادہ غار پیدا کرتا ہے۔ مترجم

یہ شکر جمیلہ کا چہرہ و فورسرت سے جگمگانے لگا، وہ بچوں کی خواہگاہ کی طرف گئی،
 بچوں کے چہرے سے چادر اٹھائی، اور چپ چاپ محمود کی طرف دیکھنے لگی۔
 محمود نے جو یہ دیکھا کہ بچے تو یہاں پہلے ہی سے موجود ہیں، تو ہجوم مسرت اور فرحانیت
 سے اس نے جمیلہ کو گلے لگالیا، اور کہا ”تمہارا دل کتنا بلند، کتنا ارفع، اور کتنا اعلیٰ ہے، تم تو اس
 قابل ہو کہ تمہاری پرستش کی جائے“
 جمیلہ نے یہ سننا، اور محبت بھری نظروں کو محمود کو دیکھنے لگی،

قرآن حکیم موجودہ مسلمانوں کا برتاؤ

(جناب شوق و ہوس از کلمہ منظمہ)

کچھ اسے زینت مسندِ سبھو	اور کچھ گڑی محض سمجھے
کچھ تو سمجھے ہیں اسوٰط کی کتاب	اور کچھ جادو باہل سمجھے
کچھ اسے رشتے میں طوطی کی طرح	اس کا بس وہ ہی حاصل سمجھے
یہ تو آیا تھا ہدایت کے لئے	اس کا مقصد ہی نہ غافل سمجھے
اب عمل اور کتابوں پر ہے	اس کو سب ترک کے قابل سمجھے
کامیابیاں حریفانِ حق	اس کی تقسیم کو باطل سمجھے
منطق و فلسفہ کے سودا ئی	درس کے اس کو نہ قابل سمجھے
عقل پہ جن کی پڑے ہیں پتھر	فہم کو اس کے وہ مشکل سمجھے
ہائے اس نینت غفلتی کی قدر	خاک بھی تو نہ یہ جاہل سمجھے

+

اے خدا ہم کو عطا کر وہ دل	جو اسے رہبرِ کامل سمجھے
اور دے شوقِ عمل بھی ایسا	کسی شکل کو نہ مشکل سمجھے

تنقید و تبصیر

کتاب

مبادی فلسفہ حصہ اول یا فلسفہ کی پہلی کتاب - اشارات تفسیر القرآن
بکلام الرحمن - کتاب التوحید بیوں کے قصے

مبادی فلسفہ حصہ اول | از مولوی عبد المجید صاحب دریا بادی - تقطیع
فلسفہ کی پہلی کتاب | کاغذ نفیس مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ
فاضل مصنف کے فلسفیانہ مقالات کا یہ مجموعہ ایک دیباچہ ہے

صوبہ ذیل ہیں -

(۱) فلسفہ و غائب فلسفہ پر ایک نظر -

(۲) عقل کی منطق -

(۳) مقدمہ مکالمات بریک -

(۴) عادت و فلسفہ عادت -

(۵) نفس و مفردات نفس -

(۶) ماہیت جذبات -

اردو زبان ابھی تک فلسفیانہ مباحث سے خصوصاً فلسفہ جدید سے بالکل غیر مانوس ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی بدولت چند کتابوں کا ترجمہ تو اردو میں ہو گیا ہے مگر مستقل تصنیف کا حوصلہ سوائے مولوی عبد المجید صاحب کے اور کسی کو نہیں ہوا۔ اسے فلسفے کی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے کہ اسے اردو دانوں سے روشناس کرنے کے لئے ایسا شخص ملاحظہ کا قلم الجبے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں خشک مضامین کو دلچسپ بنانے میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ لوگ جنہیں فلسفے کے نام سے وحشت ہوتی تھی اب اس سے مانوس ہو جائیں گے۔ یہ مجموعہ مضامین جو ہمارے پیش نظر ہے فلسفے سے رسمی تعلیم کا کام تو نہیں دے سکتا لیکن

کتابوں کے دل کو بے ساختہ اس موضوع کی طرف مائل کر دیتا ہے اور یہی طلب علم کی سب سے پہلی
سب سے اہم منزل ہے۔

اس لحاظ سے یہ کتاب طالب علموں کے لئے جن میں صرف مدارس کے متعلمین ہی نہیں بلکہ کل علم دوست
حضرات شامل ہیں بے حد مفید ثابت ہوگی۔

اشارات | مصنفہ علامہ غایت اللہ خاں مشرقی باقاعہ۔ تقطیع کلاں، تعداد صفحات ۱۳۴، کاغذ چمکتا دبیر،
کھلی چھاپائی نہایت اعلیٰ درجے کی، جلد، خوبصورت۔ قیمت صرف ۱۲/-
لے کا پتہ :- ناظم دفتر تذکرہ، کمرہ شیرنگہ، امرتسر (پنجاب)۔

آج سے سات سال پہلے رسالہ جامعہ میں علامہ غایت اللہ خاں مشرقی کی مشہور کتاب ”تذکرہ“ پر
تنقید لکھی گئی تھی۔ اس طویل خاموشی کے بعد اب انھوں نے یہ اپنی اعلیٰ کتاب ”اشارات“ شائع کی ہے،
جس میں مسلمانوں کی اصلاح نفس کے لئے خدمت خلق کی تجویز اور اس کا طریقہ بیان کیا ہے اور ہر مسلمان کو
یہ صلاح دی ہے کہ وہ بطور علامت خدمتِ بیلمعنی کدال اپنے پاس رکھے۔ پھر ہر قسم کے مسلمان شام کے
وقت ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے اپنے اپنے منتخب سرداروں کی قیادت میں خاکی لباس پہن کر اور بیلمعنی کر
باقاعدہ قواعد کریں۔ پھر بلا امتیاز مذہب و ملت ہر شخص کی جس قدر ہو سکے خدمت بجاوائیں اور غروب کے
بعد جب ایک ساتھ باجماعت مغرب کی نماز ادا کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔

اس تحریک کا نام انھوں نے تحریک خاکساران رکھا ہے اور غالباً منجملہ دیگر وجوہات کے ایک ممبر
خاکی لباس اختیار کرانے کی یہ بھی ہے کہ خاکساری اس کے اندر مضمر ہے۔

اشارات میں علامہ موصوف نے اس تحریک کا مندرجہ بالا باب تفصیل کے ساتھ نہایت بلند نظری
انداز میں سمجھایا ہے جس سے ہر شخص اس تئیں پرہیز کر سکتا ہے کہ یہ اعلیٰ تحریک مسلمانوں کی اصلاح اور
ان کو ختم اور کارکن جماعت بنانے کے لئے کس قدر صحیح اور بروقت ہے۔ اس میں نہ کسی مذہب پر خاش
ہے نہ کسی قوم سے عداوت ہے، نہ حکومت سے نزاع ہے نہ سیاسی شائبہ ہے بلکہ خالص اصلاحی اور
اعلانی تحریک ہے جس میں ہر مسلمان پاکی پس پیش کے حصہ لے سکتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے علامہ موصوف
کتاب کے پہلے کلاموں کو اپنی جگہ نہیں اور سناٹا نہیں تو اگر صرف اسی ایک تحریک میں شامل

ہندوستان کو تقسیم ہے کہ اگر مسلمانوں نے عام طور پر اس تحریک میں جلی حصہ لیا تو پانچ سال کے اندر
ہندوستان کو حکومت اور سلطنت مل جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانان ہند ایک مدت سے بے عمل اور غافل ہیں اور اجتماعی اعمال اور مشاغل
جو کچھ کر رہے ہیں وہ عدم مرکزیت کے باعث غیر صالح ہیں جن سے کسی اچھے نتیجے کی امید نہیں ہے۔ یہ
دانشندانہ تحریک جس میں کسی طرف سے رکاوٹ کا اندیشہ نہیں ہے اگر چل گئی تو ساری ملت کو ایک مرکز پر
لا کر متحد کر سکتی ہے جس سے توقع ہے کہ ہماری اجتماعی قوت دوست ہو جائے گی۔

یہ کتاب ہر صاحب نظر اور دردمند مسلمان کو ضرور پڑھنی چاہیے
کہ رکھی گئی ہے کہ اس کے صرنے سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس کے
کی بنیاد عقل، اخلاق اور خالص دین پر ہے نہ کہ کسی ہنگامی یا
مسلمانوں سے قبول کر لی تو کچھ بعید نہیں کہ اس کے نتائج دی ہوں ہوں۔

تفسیر القرآن کلام الرحمن | مصنفہ مولانا ابوالوفائے رالد صاحب امرت سہری سردار جماعت اہل حدیث زبان
عربی، مکتبہ کلاں، صفحات ۴۰۲، قیمت چار روپے۔ لئے کا پتہ: نیجر اخبار اہل حدیث، امرت سہری۔

عربی زبان میں بیگز کوں تفسیر کلام الہی کی لکھی گئی ہیں لیکن ہر ایک میں انسانی تفسیر ہے یعنی آیات
کے مطالب جو ائمہ اور بزرگان دین نے مجھے یا جو رسول پاک سے روایت کئے گئے، جو اکثر خالتوں میں
صحیح نہیں ہیں، مندرج ہیں۔ مولانا ثناء اللہ صاحب نے اس تفسیر میں کوشش کی ہے کہ آیات کے مطالب
خود قرآن کی آیات سے حل کئے جائیں۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ راہ بالکل اچھوتی ہے جس پر مولانا سے
پہلے کوئی دوسرا نہیں چلا تھا۔ اس لئے ان کو اس میں جو دشواریاں اخفا پی پڑی ہیں ان کا اندازہ ہر
شخص نہیں کر سکتا۔ ایک معتد بہ حصہ ہم نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ مصنف نے کس شکل سے اپنا
راستہ آپ نکالا ہے۔ یہ اس قسم کی پہلی کوشش ہے جس میں اس سے زیادہ کامیابی حاصل کرنی مشکل تھی۔ اہل
اب راستہ نکل گیا ہے اس لئے آئندہ آنے والے اس قسم کے مفسر کے لئے آسانیاں ہو گئی ہیں کہ وہ اس
واجب میل پر خوشامحارت کھڑی کر سکے۔

فرقہ بندی کا بوجھ کہ اس تفسیر پر مولانا ہی کی جماعت کے جذبات پرست حضرات نے طوفان

معرض کر کے جو اکثر تذریکوں کے اقوال پر مبنی تھے اور بعین نامی رسائل میں شائع کیا گیا۔ اس کتاب کا حیران انگیز سلطان نجد و علامے دہلیہ تک پہنچا اور وہاں طے ہوا۔ چنانچہ وہ فیصلہ اس تفسیر کے تصنیف میں شامل ہے۔ ششہ میں ہمارے سامنے پیر سلطان کی خدمت میں اس جماعت کے لوگوں نے یہی ذکر کو پیش کیا لیکن انہوں نے سننا پسند نہ کیا اور موضوع سخن بدل دیا جس سے ہم نے یہ اندازہ کیا کہ وہ صحیح اقلب ہیں اور اس قسم کے جزئی اعتراضات سے علامہ سے بظن نہیں ہو جاتے۔

کتاب التوحید | مترجم مولانا ابو عبد اللہ محمد بن یوسف السورتی۔ تقطیع ۱۲۱۵ھ، ضخامت ۱۸۰، لکھائی

چھپائی اور کاغذ عمدہ قیمت چھ۔ مصنف سے قردوں باغ دہلی کے پتے سے مل سکتی ہے۔

کتاب التوحید علامہ محمد بن عبد الوہاب بانی تحریک نجدیہ کی وہ مشہور کتاب ہے جس نے نجدیوں کے

دلوں میں اسلامی توحید نقش کر کے ان کو بکا ایماندار متقی، حامی شرک اور حامی اسلام بنادیا۔ یہ کتاب

دراصل اس قابل ہے کہ عالم کے جملہ مسلمانوں کو اچھی طرح پڑھائی جائے تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اسلام

کس قسم کی توحید سکھانے آیا ہے اور یہ توحید کس قدر عظیم الشان نتائج پیدا کرتی ہے اور کتنی انقلاب انگیز ہے۔

سب سے پہلے یہ کتاب غالباً ۱۳۱۵ھ میں دہلی میں شائع کی گئی تھی۔ اس زمانے میں مولانا عبد الحلیم

قمر مرہوم یہاں مولانا سید نذیر حسین کی خدمت میں حدیث پڑھتے تھے۔ ان کو اس قدر پسند آئی کہ اس کا ترجمہ

کے شائع کیا۔

اب مولانا سورتی صاحب نے اس کا عمدہ عالمانہ ترجمہ کیا ہے جو متن کے مقابل میں درج ہے۔ آغاز

کتاب میں توحید کی حقیقت اور شیخ محمد بن عبد الوہاب کی مختصر سوانح عمری بھی لکھی ہے جس سے کتاب کے

تعلق بحدیث حاصل ہوتی ہے۔ جا بجا حاشیے میں توضیح طلب الفاظ اور معانی کی تشریح بھی کر دی ہے۔

ترجمہ بھی سادہ اور عام فہم ہے۔ اب یہ کتاب اس قابل ہو گئی ہے کہ عام طور پر اردو خواں طبقہ اس سے

نفع حاصل کر سکے اور مدارس اور اسکولوں کے طلباء کو پڑھائی جاسکے بلکہ میرے خیال میں ہر مسلمان کے

گھر میں اس کا ہونا ضروری ہے۔

کتاب التوحید | مرتبہ خواجہ محمد امجدی صاحب استاد تفسیر جامعہ طبعہ اسلامیہ، تقطیع خرداد، حجم ۵ جزو، لکھائی

پہلے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ طبعیہ قرول باغ، دہلی۔

اس چھوٹی سی کتاب میں خواجہ صاحب موصوف نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ان انبیاء عظیم السلام کے قصے بیان کئے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور اسی قدر بیان کیا ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ انسانی روایات نے ان قصوں پر جو اضافے کئے ہیں اور جن میں سے بڑا حصہ بے بنیاد بلکہ محض افسانہ ہے ان کو چھوڑ دیا ہے اور چونکہ یہ رسالہ تعلیمی ہے اور چھوٹے بچوں کے لئے لکھا گیا ہے اس لئے زبان نہایت سلیس اور سادہ رکھی ہے۔ زبان میں بھی سادگی مطلق نہیں ہے اور عبارت آسان ہے تاکہ بچے سمجھ سکیں

قرآن کریم میں انبیاء کے ذکر کی اللہ نے مدح فرمائی ہے اور
ذکر کیونکہ ان برگزیدہ اور مقبول بارگاہ حضرات کے حالات یہ

مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کے دل میں شروع ہی سے انبیاء کی سنائی سنیں اور ان سے اندر ایمان، سچائی، تقویٰ اور صبر پیدا ہو، دنیا کی بڑی بڑی مشکوں کا مقابلہ کر سکیں اور حق کے حامی اور مددگار بن جائیں۔ اس لئے اس کتاب کا بچوں کو پڑھانا نہایت مفید ہوگا۔ اسی غرض کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے اور جامعہ کے بچے اس کو پڑھتے ہیں۔



دنیا کی رفتار

(الف) ہندوستان

گول میز کی دستوری کمیٹیاں | پہلی گول میز کانفرنس کے اقامت پر یہ حقیقت برطانوی دربار میں پر ابھی طرح روشن ہو گئی تھی کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی شرکت کے بغیر آئندہ دستور اساسی کے متعلق تمام فیصلے سود اور بے نتیجہ ہوں گے۔ چنانچہ حکومت کی پالیسی میں تبدیلی ہوئی، گاندھی ارون بھوٹے پر دستخط ہوئے اور کانگریس نے چند شرائط کے ساتھ گول میز کانفرنس میں شرکت منظور کی۔ کانگریس کا واحد نمائندہ جب کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان روانہ ہوا تو بعض مطلقوں میں یہ امیدیں قائم کی گئیں کہ سیاسی گتھیاں شاید اس طرح جائیں۔ گول میز کانفرنس کا مقصد یہ سمجھا گیا تھا کہ ہندوستان اور انگلستان کے نمائندے ایک جگہ بیٹھ کر ہندوستان اور انگلستان کے آئندہ تعلقات اور ہندوستان کے ایک آزاد دستور اساسی کے متعلق گفت و شنید کر کے کچھ طے کریں گے لیکن جب کانفرنس منعقد ہوئی تو معلوم ہوا کہ مختلف جماعتوں، فرقوں اور طبقوں کے نمائندے ہندوستان کے مال قیمت میں سے گویا اپنا اپنا حصہ بٹانے کے لئے مجتمع کئے گئے ہیں۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ بہت زیادہ غیر متوقع نہیں ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ ہندوستان کے اہم سیاسی مسائل کو طے کرنے کے لئے برطانوی تدبیر نے گول میز کانفرنس کا جو طریقہ سوچ کر نکالا تھا وہ بھی ناکام ثابت ہوا۔

لیکن وزیر اعظم برطانیہ نے یکم دسمبر ۱۹۴۵ء کو کانفرنس کے اقامتی جلسے میں کانفرنس کی ناکامی پر ایک خاص اعلان کے ذریعے سے پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور یہ اعلان کیا گیا کہ چونکہ بعض اہم امور مقامی طور پر تحقیقات طلب ہیں اس لئے کانفرنس تو نامعلوم مدت کے لئے ملتوی کی جاتی ہے لیکن اس عرصے میں کانفرنس کی ایک مجلس عاملہ کانفرنس کے تمام کاموں کو جاری رکھے گی اور مین کمیٹیاں مقرر کی جائیں گی جو ہندوستان کا جو ضروری تحقیقات کر کے آئندہ کانفرنس کے سامنے اپنی رپورٹ آخری منظوری کے لئے پیش کریں گی۔

مجلس عاملہ دو تین کیٹیوں کے ارکان کے نام بھی شائع ہو گئے ہیں اور یہ کمیٹیاں اب ہندوستان میں پہنچا کام کر رہی ہیں۔ مجلس عاملہ کی صدمت دائرے ہند کو دی گئی ہے اور ارکان میں ڈاکٹر تیج سادہ سپر ڈسٹر جیکر، ڈاکٹر موبجے، ڈاکٹر شفاخت احمد خاں وغیرہ شامل ہیں کیٹیوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ فرہنگز کیٹی:۔ حق نیابت، حق رائے دہندگی اور تعلقہ امور کی تحقیقات کے لئے مقرر ہوئی ہے۔ اس کے صدر مارکوس آف لوتھین ہیں، اور اراکین میں منبہ دیگر انگریز اور ہندوستانی کے سر محمد یعقوب، ڈاکٹر امجد کر، سر سند سنگھ میٹھا جی شامل ہیں۔

۲۔ فڈرل فائننس کیٹی:- اقتصادی معاملات کی صفحہ

لئے۔ اس کے صدر رائٹ آریبل یوسٹس پرسی رکن پارلیمینٹ

اور فائنٹ کرنل کمر کے نام قابل ذکر ہیں۔

۳۔ انڈین سٹیش فائننس کیٹی:- یہ کیٹی دیسی ریاستوں کے اقتصادی معاملات کی صفحہ

کرسے گی اور اس کے صدر رائٹ آریبل جے۔ سی۔ سی۔ ڈیوڈسن ہیں۔ اس کیٹی کے تمام اراکین انگریز ہیں اور تعجب ہے کہ کوئی ہندوستانی اس میں شامل نہیں کیا گیا۔

ہر کیٹی کے صدر کے نام وزیر اعظم نے ایک کتبہ بھیجا ہے اور اس میں کیٹی کے دائرہ عمل کے متعلق مفید ہدایات دی ہیں مثلاً لارڈ لوتھین صدر فرہنگز کیٹی کو لکھا ہے کہ گول میز کانفرنس کی فرہنگز سب کیٹی کی مخالفت کو پیش نظر رکھ کر ایسی صورتیں دریافت کی جائیں کہ کم سے کم دس فیصدی اور زیادہ سے زیادہ پچیس فیصدی آبادی کو حق رائے دہندگی آئندہ دستور اساسی میں حاصل ہو جائے۔ وزیر اعظم کے مینوں کتبہات میں بار بار اراکین گول میز کانفرنس کی اکثریت کا حوالہ دے کر اسی کی بنیاد پر مزید تحقیقات کی ہدایت کی گئی ہے حالانکہ گول میز کانفرنس میں نمائندگی آبادی کے لحاظ سے نہ تھی اور یہ پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ کوئی فیصلہ نمائندگان کی اکثریت کے لحاظ سے نہ کیا جائے گا بلکہ آپس کے بھگوتے اور گفت و شنید سے تمام باتیں طے پائیں گی ورنہ وزیر اعظم کو جی جانتے ہیں کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت اور سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کو فعل کا یہ منفقہ فیصلہ ہے کہ آئندہ دستور میں ہر بالغ کو حق رائے دہندگی ملنا چاہئے، پھر ایک ایسے واضح اور مرتب فیصلے کو نظر انداز کر کے سب کیٹی کی سفارش کے حوالے سے حق رائے دہندگی کو زیادہ

نہیں ہے بلکہ اس سے جلد حکومت نے فرقہ وارانہ مسئلہ کا خاطر خواہ فیصلہ نہ کر دیا تو ملاوہ دستور کی کمیٹی کے چند اراکین کے اور باقی تمام مسلمانوں کو بھی کمیٹیوں سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا۔ غرض جلد حیثیت سے صورت حال کی طرح بھی خوشگوار نہیں ہے اور اندیشہ ہے کہ دستور کی کمیٹیوں کا مشترک سائنس کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ نہ ہو۔

صوبہ سرحد اور اصلاحات | گول میز کانفرنس کے آخری جلسے میں وزیر عظمیٰ نے

دستور اساسی میں صوبہ سرحد کو دیگر صوبجات کے مساوی اختیارات۔

ترتیب اور نفاذ میں ابھی نہ مانگے گئے اس لئے فی الفور موجودہ گورنر

کا وہاں نفاذ کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد ہی اصلاحات۔

شروع کر دئے گئے تھے اور ۱۹ فروری ۱۹۳۲ء کے ایک سرکاری بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ضروری انتخابات مکمل ہو چکے تھے، اپریل کے دوسرے ہفتے میں کونسل کے انتخابات ختم ہو جائیں گے اور اس کے فوراً بعد صوبہ سرحد کی پہلی مجلس آئین ساز کا اجلاس منعقد ہوگا۔

مجلس آئین ساز کل چالیس ارکان پر مشتمل ہوگی جس میں سے ۲۸ ارکان منتخب شدہ ہونگے اور بارہ نامزد۔ اٹھائیس منتخب نشستوں میں سے بیس نشستیں مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہیں، پانچ غیر مسلموں کے لئے، ایک سکھوں کے لئے اور دو زمینداروں کے لئے۔ نامزد ارکان میں سے ۶ سرکاری رکن ہونگے اور ۶ غیر سرحدی۔ گورنر کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن منجملہ سرکاری ارکان کی ہوگا، ایگزیکٹو کونسل میں صرف ایک ہی رکن ہوگا اور وزیر بھی ایک ہی ہوا کرے گا جس کا تقرر حسب دستور منتخب اراکین کونسل میں سے کیا جائے گا۔

یہی اصلاحات اگر چند سال قبل نافذ کی جاتیں تو شاید ان کا خیر مقدم کیا جاتا مالاکنہ ٹی مان کمیٹی کو تحقیقات کے بعد اچھی طرح روشن ہو گیا ہے کہ صوبجات کا موجودہ دو علی نظام حکومت بہت ناقص ہے، اس کے علاوہ یہ وقت ان اصلاحات کے نفاذ کے لئے اور بھی موزوں نہ تھا جب کہ وائسرائے کے آرڈیننس نے تمام آئین اور دستور کو معطل کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرزمین بے آئین میں آئینی وعدہ کے انتہام پر کسی حلقے کی طرف سے خوشی کا اظہار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

میں میں شک نہیں کہ صوبہ سرحد کے ساتھ ایک بڑی نا انصافیاں کی گئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت حکومت قائم کرنے کی ضرورت ہے، لیکن ملک نے گزشتہ دس سال کے اندر سیاسی تعلیم اور سیاسی زندگی کے لئے جو کام کر لئے ہیں کہ کوئی صوبہ اس فرسودہ دو علی نظام حکومت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ صوبہ جات میں مکمل ذمہ دار حکومت قائم کرنے کا فیصلہ خود حکومت نے کر لیا ہے۔ یہی صورت میں اگر حکومت واقعی صوبہ سرحد کی شکایات کو حق بجانب سمجھ کر تلافی یافتہ کرنا چاہتی ہو تو مکمل ذمہ دار حکومت کا نظام مرتب کرنا چاہئے تھا۔ لیکن ایک طرف بجائے اس کے نصف آزادی دینے والے اصلاحات نافذ کرنے میں حکومت غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے اور دوسری طرف آئین کے حوالہ آدیں اس قدر سختی ہے کہ اس کی وجہ سے تمام ملک میں بے چینی پیدا ہو گئی ہے، ایسی فضا میں اصلاحات کیوں نافذ کی جا رہی ہیں یہ سمجھنے سے تاریخ و سیاست کا ہر طالب علم قاصر ہے۔

برطانوی تجارت اور بائیکاٹ | برطانوی ٹریڈ کمیشنر مقیم ہندوستان اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ جہاں تک ہندوستانی منڈیوں کا تعلق ہے برطانوی تجارت پر ایسا نازک وقت گزرا ہے کہ اس کے مضر اثرات ایک عرصے تک محسوس کئے جائیں گے۔ برطانوی مال تجارت کی وراثت میں ۶۰ فی صدی تخفیف ہو گئی ہے اور ٹریڈ کمیشنر کی رائے میں یہ تخفیف اس قدر غیر معمولی ہے کہ اس کی وجہ صرف تحریک بائیکاٹ قرار دی جاسکتی ہے۔

گزشتہ سال تحریک سول نافرمانی کا یہی مضمر اثر تھا جس کو تنگ نظر مدبریں انگلستان نظر انداز کرنا چاہتے تھے لیکن سابق وزیر ہند اور وائسرائے نے اسی عظیم الشان تجارتی نقصان اور اس کی اہمیت کو محسوس کر کے قوم پرست جماعت کے ساتھ سمجھوتا کیا تھا۔ ایک تو عام کساد بازاری نے تمام کاروبار کو تباہ کر دکھا ہے اس کے علاوہ بائیکاٹ کی قومی تحریک نے برطانوی تجارت کو شدید ترین نقصان پہنچایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ دستور اس کی تمام تحفظات اس تجارتی نقصان کو روک سکتے ہیں؟ پھر اگر برطانیہ اور ہندوستانی قوم کے تعلقات آئندہ اسی قدر کشیدہ رہے تو کیا وہ تحفظات جو لارڈ ریڈنگ اور ہر سولہ پور مجوزہ دستور اس کی لئے تجویز کر رہے ہیں کسی صورت میں بھی برطانوی مفاد اور برطانوی تجارت کی حفاظت کر سکیں گے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ایک دوسرے پر اعتماد اور خوشگوار سیاسی

تہوں میں سب سے بہتر ضمانت ادیب سے عمدہ تحفہ ہے۔

گلتہ، بمبئی اور کراچی سے درآمد ہوا آئندہ کے جو اعداد و شمار شائع ہوتے رہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تجارت خارجہ میں پچھلے مہینوں کے اندر معتد بہ کمی ہو گئی ہے۔ اس کا اثر سرکاری مالیات پر پڑنا لازمی ہے۔ اسی لئے بھی خواہاں حکومت نے بھی گاندھی آرون سمجھوتے کے ختم ہو جانے پر پروردہ احتجاج کیا تھا لیکن معاملات اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ فی الحال سیاسی تضاد درست ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بالیکاٹ کی قوت برابر زور پکڑتی جا رہی ہے جو بالیکاٹ کے خلاف بہت زیادہ نقصان رساں ثابت ہو گئی۔ جرمنی کے تاوان جنگ پریشان کر دیا ہے اس لئے کہ اس کا معضرا اثر برطانوی ساکھ پر بہت سنگین ہے۔ برطانیہ کے لئے کچھ کم اہم نہیں، برطانیہ کی ساکھ تجارت پر۔ حکومت کو جلد یا بدیر اس حقیقت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

تبع زندگی | ہندوستان کی مخصوص آب و ہوا میں عمر کا اوسط دیگر ممالک کے مقابلے میں یوں بھی کچھ کم نہ تھا لیکن اصول حفظان صحت کی طرف سے بے توجہی نے اوسط عمر گھٹا کر ۲۵ سال سے ۲۲ سال کر دیا ہے اس کے مقابلے میں دیگر ممالک کا اوسط عمر برابر بڑھ رہا ہے جیسا کہ حسب ذیل اعداد سے ظاہر ہوتا ہے:-

۱۔ نیوزی لینڈ میں	۶۵ سال ہے
۲۔ امریکہ میں	۵۶ سال سے بڑھ کر ۵۸ سال ہو گیا ہے۔
۳۔ انگلستان میں	۴۹ سال سے ۵۰ سال ہو گیا ہے اور
۴۔ جاپان میں بھی	۴۷ سال سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

ہندوستان میں بلا مبالغہ لاکھوں جانیں ہر سال ہیسینہ، طاعون، بخار اور چھپک میں ضائع ہوتی ہیں اور اب کچھ عرصے سے تپ دق کا مرض بھی روز بروز بڑھتا جاتا ہے، چنانچہ اس مرض کے ایک بہت بڑے ماہر ڈاکٹر ممتونے اندازہ لگایا ہے کہ کم از کم دس لاکھ جانیں ہر سال تپ دق کی بدولت ضائع جاتی ہیں اور ان مرض میں جو مبتلا ہوتے ہیں ان میں سے زیادہ تعداد نو عمروں اور نوجوانوں کی ہوتی ہے۔

اس مرض کے انداد کے لئے بہت کوشاں ہیں اور آپ نے ایک بہت ہی
 قریب بقام تحریر قائم کی ہے جہاں فق کے مریضوں کا علاج خاص ان کی نگرانی
 لیکن میں تیز رفتاری سے یہ مرض اس ملک میں ترقی کر رہا ہے اس کو محسوس کہے ڈاکٹر مونس
 کہ اس صحت گاہ کے ساتھ یہ بھی انتظام کیا جائے کہ ۱۱، سند یافتہ ڈاکٹر وہاں رہ کر اس
 کی طبیعت کے متعلق تجربات کریں (۲)، مریضوں کے اعزاء اور تیمارداروں کو حفظان صحت کے
 اصول اور عمدہ غذا تیار کرنے کے طریقے بتلائے جائیں اور (۳)، عام تغذیر اور تصادیر کے ذریعے سے اس
 مرض سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہدایات اور معلومات عوام تک پہنچائی جائیں۔

ڈاکٹر متوکی یہ کوشش قابل مباد کہا ہے اور ضرورت ہے کہ دیگر مقامات پر بھی اسی قسم کی تدابیر اس
 نامراد مرض کے انداد کے لئے اور عامۃ الناس کو از خود موت کے منہ میں جانے سے بچانے کے لئے
 منتہا کی جائیں ورنہ اس طرف سے بے توجہی خود کشی کے مرادف ہوگی۔

(ب) عالم اسلامی

انتداب عراق کا خاتمہ | سیاسی مصلحتوں میں ایک مدت سے یہ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ عراق میں برطانوی
 انتداب کا دائمی عقرب ختم ہو جائے گا۔ رائٹر کی تازہ ترین اطلاعات نے اس خیال کی تصدیق کر دی ہے۔
 اس لئے کہ انجمن اقوام نے "اصولاً اس تجویز سے اتفاق کر لیا ہے کہ عراق میں انتدابی حکومت کو ختم کر دیا جائے
 لیکن اس وقت جب مستقل مجلس انتدابات کی تجاویز کے مطابق دولت عراق انجمن اقوام سے چھ ذمہ داریوں
 کو پورا کرنے کا وعدہ کرے؟ یہ ذمہ داریاں یا ضمانتیں کیا ہوں گی اس کا پتہ مجلس انتدابات کی روئداد سے چلیگا۔
 جب مجلس مذکورہ کی یہ روئداد تیار ہو جائے گی تو پھر انجمن اقوام کے بعض نمائندے برطانوی نمائندوں سے ملکر
 اس اعلان کا مسودہ تیار کریں گے جن میں مجلس کی سفارشات کا تذکرہ ہوگا۔ اس کے لئے حکومت عراق سے
 گفت و شنید کی ضرورت پڑے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس روز یہ تمام امور طے ہو گئے اس روز انتداب
 عراق کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اول تو یہ دیکھنا باقی ہے کہ انجمن اقوام حکومت عراق کی "ضمانتوں" کو کس نظر سے
 دیکھتی ہے؟ ثانیاً اگر انجمن اقوام نے عراق کی ضمانتوں کو منظور بھی کر لیا تو انتداب کا خاتمہ اسی روز ہو سکے گا؟

یہ مکتبہ ہوش بہادری انجمن اقوام میں شریک ہو جائے گی۔

اب ندایہ دیکھ لینا چاہیے کہ ان "ضمانتوں" کا تعلق جن پر انجمن اس درجہ اصرار کر رہی ہے کن امور سے ہے۔ ایک تو انجمن کو اقلیتوں کی مخالفت مقصود ہے۔ دوسرے اس کی یہ خواہش ہے کہ عدالت کا نظم و نسق اعلیٰ پیمانے پر ہو اور انتدابی حکومت کے دوران میں عراق پر جو مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا احترام کیا جائے۔ علاوہ ازیں ان میں الاقوامی معاہدوں کی پابندی بھی ضروری ہے جن میں عراق نے باواسطہ یا بلاواسطہ حصہ لیا ہے۔ یہ مسائل ہیں جو اس وقت سرفراز بن ہمدانی کی کوشش عراق اور نوری پاشا وزیر اعظم عراق کے زیر غور ہیں۔ دونوں حضرات کا خیال ہے کہ انجمن اقوام کے اجلاس میں اس سلطان کا مسودہ اور سرفراز عراق کی طرف سے تیار کر رہے ہیں۔

عراق کی آزادی کا مسئلہ ختم انتداب کا پابند ہے لیکن اس امر پر مجاہدین نے سوچ کر دی گئی ہیں جن کے پورا کرنے کے لئے ایک مدت چاہیے۔ مزید برآں ختم انتداب کے بعد بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ان ضمانتوں کی موجودگی میں آزادی عراق کی صحیح نوعیت کیا ہوگی۔ بہر حال جن لوگوں کو انجمن اقوام پر اعتماد ہے اور جو لوگ مغرب کی سیاسی کارروائیوں کے متعلق حسن ظن سے کام لیتے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ دولت عراق کو اپنے سیاسی مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی ہو رہی ہے۔ امیر فیصل نے ایک تاریخ میں تاجدار برطانیہ کا شکریہ ادا کیا ہے کہ اگر گزشتہ دس سال میں دولت برطانیہ کی اعانت ان کے شامل حال نہ ہوتی تو وہ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہوتے اور ملک منظم نہ اس عظیم الشان کامرانی پر انھیں مبارکباد دیتے ہوئے یقین ظاہر کیا ہے کہ عراق و برطانیہ کا سلسلہ محبت و مودت اسی طرح جاری رہے گا۔

سیاسیات شام | شام کے انتخابات عنقریب مکمل ہو جائیں گے۔ پچھلے مہینے وطن پسند ان شام کے رویے کے حکومت کو مجبور کر دیا تھا کہ دمشق، حمص اور حامہ میں انتخابات کا سلسلہ یک قلم موقوف کر دیا جائے لیکن اب یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ جماعت وطنین کے رویے میں ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہو گئی ہے اور حکومت کا خیال ہے کہ انتخابات کا نتیجہ اس کی توقعات کے مطابق ہو گا۔ انتخابات کا معاملہ ختم

مجلس کے لئے دستور پر غور کرنا ہوگا اور پھر اس امر کا فیصلہ ہوگا کہ آیا شام میں جمہوریت قائم کی جاسکتی ہے یا نہ۔

مقدمہ بالا سے یہ امر بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ فرانسیسی حکومت نے شامی معاملات کے متعلق کیا طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اس سے ہم احوار شام کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ بنوڑ ہنگامہ انتخابات اختتام کو نہیں پہنچا۔ انتخابات کا سلسلہ جاری تھا کہ حامد حمص اور دمشق میں ان کو ایک قلم موقوف کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وطن پسندان شام کا رویہ کچھ بہت زیادہ مستحسن نہیں تھا۔ گویا حکومت انتداب نے ایک طرف انہیں دستور کی غائش قائم کر رکھی ہے۔ دوسری طرف وہ یہی چاہتی ہے کہ احوار شام کے رشتے میں ہر ممکن مداخلت کی بنا پر کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا کر دے اور انتخابات کے خاتمے پر بہر حال اس کی اکثریت قائم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ مجلس مقلدہ میں جدید دستور کی تصدیق و عدم تصدیق اور شام میں جمہوریت یا بادشاہت کے قیام کا فیصلہ بھی حکومت ہی کے ایما پر ہوگا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مسئلے کے متعلق احوار شام کی رائے کیا ہے۔ بہر حال قارئین جامعہ انھیں صفحات میں پڑھ چکے ہوں گے کہ امارت شام کے لئے اس سے قبل امیر فیصل تاجدار عراق کا نام لیا جاتا تھا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ ممکن ہے عراق و شام کے الحاق سے ایک متحدہ ریاست قائم کر دی جائے۔ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ عباس علی پاشا معزول خدیو مصر اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ انھیں شام کا تخت حاصل ہو جائے۔ پچھلے مہینے عباس علی پاشا نے قدس اور ماورائے اردن کا سفر کیا۔ جہاں عمان میں انھوں نے امیر عبداللہ سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ امیر فیصل کے دل میں اس قسم کی کوئی خواہش نہیں کہ وہ شام پر حکومت کریں۔ یہاں سے عباس علی بیروت آئے اور اب قسطنطنیہ کا عزم رکھتے ہیں تاکہ وہ اس گفت و شنید کا حال معلوم کریں جو حکومت فرانس اور ان کے نمائندے کے درمیان اس بارے میں ہو رہی ہے۔

غالباً یہاں اس امر کا ذکر کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ خدیو معزول جدیدہ ٹائمر کے خلاف ایک دعویٰ دائر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بنائے دعویٰ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں ٹائمر نے سر ولیم ٹائن چرول کی کتاب ”مسئلہ مصر“ شائع کی جس میں ان کے متعلق بعض ایسے بیانات موجود ہیں جن پر خدیو معزول کو اعتراض ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ عباس علی پاشا اب تک اس معاملے میں کیوں خاموش رہے اس کا جواب یہ ہے کہ حکومت برطانیہ اور شاہ مصر نے ان کے تعلقات حال ہی میں ٹھیک ہو گئے

میں نے اپنے ملک کے ہمسایہ پہلی مرتبہ پچھلے سال لندن تشریف لے گئے ہیں اور غالباً اسی زمانے میں انھوں نے ٹائمز کے خلاف اپنے دعوے کے انتظامات مکمل کئے ہیں۔

نحمدہ و نصلی علیہ و آلہ وسلم | قاہرہ کا ایک پیام منظر ہے کہ توفیق رشدی پاشا وزیر خارجہ ترکی طرمان و بغداد کا عزم رکھتے ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ پاشائے موصوف سفر طرمان سے فارغ ہو کر اب بغداد تشریف لے آئے ہوں گے۔

ایران و ترکی کی باہمی رقابت اور عداوت کا افسانہ ایک مدت سے

کی بدولت یہ دو عظیم قوتیں جو اپنے مذہبی تعصب اور بے بصیرت

بنی رہیں اب ایک دوسرے کو صلح و آشتی کا پیام دے رہی ہیں

مصلحت اندیشی اور مذہبی جنون و طغیت سے بدل چکا ہے۔ بایں ہمہ اور

کچھ بہت زیادہ اطمینان بخش نہیں تھے۔ خیال یہ ہے کہ دولت ایران کردوں کے جذبہ آزادی کو اپنے

مطلب کے لئے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ کردستان ایران و ترکی کی سرحد پر واقع ہے اور باغی کرد جب

چاہتے تھے ایرانی علاقے میں پناہ گزیں ہو جاتے تھے لیکن جب سے رضا شاہ پہلوی کی حکومت نے

ملک کے اندرونی نظم و نسق کی طرف قدم اٹھایا ہے کردی قبائل کی آزادانہ نقل و حرکت میں بہت

کچھ کمی واقع ہو گئی ہے بلکہ گزشتہ دو سال کی جنگی کارروائیوں کے بعد اب ایران کی کردستانی سرحد تمام

قبائلی مفاسد سے پاک ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران و ترکی کے باہمی اتحاد کی تکمیل کے لئے اب

توفیق رشدی پاشا طرمان گئے ہیں۔ قرارداد یہ ہے کہ ترکی سرحد کے بعض اضلاع ایران کو دیئے جائیں

اور ان کی بجائے ارارات اصغر ترکوں کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے۔ کیونکہ یہی علاقہ کردی باغیوں اور

رہزنیوں کا آماجگاہ ہے۔ حکومت ایران نے اگرچہ اس کے متعلق اپنی رضامندی کا باقاعدہ اظہار

نہیں کیا لیکن توفیق رشدی پاشا کو اس سفر سے غالباً اس قسم کی کوئی مفاسد آسانی عمل میں آجائیگی۔

البتہ بغداد کا سفر ایک دوسرے مقصد کا پابند ہے۔ قارئین جامعہ انہی صفحات میں عراق و

انگورہ کے خوش گوار تعلقات کا حال ملاحظہ کر چکے ہیں۔ امیر فیصل کے سفر قسطنطنیہ کے بعد فوری پاشا

وزیر اعظم عراق براہ طلب قسطنطنیہ تشریف لے گئے تاکہ عراق و ترکی کے اتحاد کا رشتہ زیادہ مضبوطی سے

پہلے پانچ سالوں میں وہ مسند اہل کے قیام کے بعد رندی پاشا ہندو گئے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ
 تجارتی تعلقات بھی قائم ہو جائیں۔ ترکوں کی خواہش ہے کہ ایرانی تجارت میں وہ اندر نہ
 اپنی اہمیت قائم کریں۔ آج سے آٹھ دس سال پہلے یہ خیال ظاہر کیا جاتا تھا کہ ترک فوری طور سے تجارتی
 تعلقات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی اہمیت نہیں رکھتے لیکن اب کچھ سال سے ترک نہایت کامیابی کے
 ساتھ اہمیت سے نیک چلا رہے ہیں جن میں ترکوں کے علاوہ کسی دوسری قوم کا مطلق دخل نہیں۔ رندی پاشا
 اپنے ساتھ ترکی بیگیوں کے افسر علی کو بھی لے گئے ہیں۔ طرازدون اور ارض روم کی طرح مغرب سرحد
 ایران تک پہنچ جائے گی لہذا ترکوں کے لئے موقع ہے کہ وہ اپنے نیک کی ایک شاخ طران میں کھولیں
 اور اس طرح دونوں ہمسایہ ممالک میں تجارتی روابط قائم ہوں۔ پاشا نے موصوف کا بعد و شریف لہجانا
 بھی اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔

حکومت انگورہ کی گزشتہ چند مہینوں سے انگورہ کی مالی مشکلات نے ایک نازک صورت اختیار کر رکھی ہے۔
 مالی دشواریاں دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ترکوں کو بھی یہ دشواری پیش ہے کہ وہ اپنے میزانیہ
 میں کیوں کرواؤن قائم کریں۔ لیکن ترکی میں جو کچھ ہوتا ہے پوشیدہ طور پر ہوتا ہے اور اکثر یہ پتہ نہیں چلتا کہ
 حکومت کے دفتر کیا تدابیر ہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے مجلس ملیہ کے افتتاح پر یہ اعلان کیا تھا کہ ان امور
 کے متعلق حکومت غیر معمولی ذرائع اختیار کرے گی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے ہر شخص کی آمدنی پر خواہ
 وہ ترک ہو یا غیر ترک، انی صدی ٹیکس عائد کر دیا ہے البتہ محال حکومت اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مجلس ملیہ اس
 امر پر غور کر رہی ہے کہ غیر ملکی آبادی کو ترکی حدود میں کسی کام کاج کی اجازت نہ دی جائے چنانچہ تین
 ہفتے کے اندر اندر ان سب لوگوں کو اپنے اپنے کام کاج سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ یہ نیا قانون تمام
 چیچن اور چشتوں پر عائد ہو گا قسطنطنیہ کے فوٹو گرافر تو یہاں تک کر رہے ہیں کہ انھوں نے ایک درخواست
 میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ غیر ملکیوں کو فوٹو گرافی کے پیشے تک کی اجازت نہ دی جائے۔

اس سے قبل حکومت ایک غصیہ حکم صادر کر چکی ہے اور وہ یہ کہ کابینہ وزارت تمام سامان درآمد کا
 دو ماہ کے لئے تسمین کر دیا کرے گا۔ وہ مصنوعات جو ترکی میں تیار ہوتی ہیں ان کو ننگو نامنوع قرار دیا گیا ہے
 اور قیمتات کا تین اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کی درآمد نہ ہو سکے۔ سماج دان درآمد کو مجبور کیا گیا ہے کہ

جس سے مال تنگی میں آئے آستانہ مال تنگی سے خریدی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں حکومت نے تمام ممالک کو
مجدد کر دیا ہے کہ ان کی اپنی ادا نگیزی کی رفتار ایک سی رہے گویا ترک یہ چاہتے ہیں کہ ان کے تجارتی
مہلت میں ایک توازن ماقام ہو جائے۔

جہاں تک درآمد کے تعین کا تعلق ہے اس کا طریق کار یہ ہے کہ حکومت ہر دو ماہی کے لئے درآمد کی
مقدار کو مقرر کر دیتی ہے اور اس کا اعلان بیس روز پہلے کر دیا جاتا ہے۔ بافضل ۱۹۲۱ء کی درآمد کو تعین درآمد
کی بنا ٹھہرایا گیا ہے جو گزشتہ سالوں کے مقابلے میں قلیل ترین مقدار ہے۔ باوجود اس کے درآمد دیر آمد
کا توازن شکل نظر آتا ہے اس لئے کہ ابھی تک ۲ کروڑ پاؤنڈ کی ادائیگی

حالات غلطین | معلوم ہوتا ہے کہ موثر اسلام نے جن مجالس کے ذریعہ

اپنے کام میں مصروف ہیں مسلمانان ہندوستان نے اس خبر کو مسرت کے ساتھ پڑھا۔ یہ وہ سب سے سب سے
شہنشاہیت و ملوکیت کے خلاف ایک اعلان شائع کیا ہے اور شامی عیسائیوں نے اس پر رضا مندی کا
اظہار کیا ہے کہ مجاز دلوے کا وقف پھر مسلمانوں کے ذمے کر دیا جائے۔

البتہ یہ امر کہ جامع اقصیٰ میں سے مصحف پاک کا وہ بیش قیمت نسخہ جو ایک عرصے سے وہاں رکھا تھا
دفعہ غائب ہو گیا ہے نہایت افسوسناک ہے۔ پچھلے دنوں یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ مصحف پاک کے
صوف چند اوراق غائب ہیں۔ بہر حال مصحف پاک کا یہ ایک حدیم المثل نسخہ ہے جن کو مفتی سید امین الحسینی
نے جامع عمر میں سے اٹھا کر عجائب گھر میں بچھا دیا تھا۔ یہ روایت جریدہ آئینہ کے نامہ نگار مصر کی ہے
اور اسی کا بیان ہے کہ یہ مصحف شیشے کے ایک صندوق میں رکھا تھا جس کی ایک کنجی سپریم کونسل اور دوسری
مرکشی جماعت کے امیر کے پاس رہتی ہے۔ یہ اس لئے کہ مصحف مذکور کو سلطان ابوالحسن المرینی نے تیرہویں
صدی عیسوی میں فتح جبل الطارق کے بعد تیار کیا تھا۔ پورا قرآن مجید ہرن کی کھال پر لکھا گیا ہے اور روشنائی
میں ہلکے کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ سارا نسخہ نہایت درجے فرین ہے جس سے اب تک کبھی سی خوشبو آتی ہے۔
ہر ماہ علیحدہ علیحدہ تقرری جلدیں ہیں جس کی زیبا نشاندہی اور مغربی صنعتکاری سے کی گئی ہے۔ ۶۵۰ سال
ہوئے جب یہ نسخہ قلمبند ہوا اور اس کے لئے وہی اسلوب کتابت اختیار کیا گیا تھا جو مصحف قرطیبہ کا تھا اور
اس کا مصنف بھی دراصل نسخہ قرطیبہ کا بدلہ دیا کرتا تھا۔

مالک غیر

بہ برس کی طویل گفت و شنید کے بعد اقوام عالم ایک مرتبہ پیرینیڈا میں جمع ہوئی ہیں تاکہ تخفیف کے مسئلے پر غور کریں لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مختصر ان حالات کی طرف اشارہ کر دیا جائے جس کے تحت یہ سوال اول اول دنیا کے سامنے آیا۔

ہمارے لئے ان تجاویز و تدابیر کا تذکرہ بے سود ہوگا جو ۱۹۱۳ء سے قبل امتناع جنگ کے لحوہ وقتاً فوقتاً سیاست میں مغرب کی طرف سے مختلف انجمنوں میں پیش ہوتی رہیں۔ البتہ اختتام جنگ کے قریب جب صدر جمہوریہ امریکہ نے امن عالم کا محافظ بن کر اپنے چارہ نکات کا اعلان فرمایا ہے تو ان کے ارشادات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ”اس امر کا پورا پورا اطمینان کر لیا جائے گا کہ ہر قوم سامان حرب کا صرف اس قدر ذخیرہ رکھنے پائے گی جو ملک کے اندرونی امن و امان اور اس کے دفاع و محافظت کے لئے کافی ہو۔“

اسی تجویز کے الفاظ موجود تھے۔ انجمن اقوام کے تمام اراکین اس کے پابند ہیں بلکہ مجلس اقوام کا یہ فرض ہے کہ وہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے عملی تدابیر اختیار کرے۔ ۱۹۱۹ء میں جب اسی تجویز کے ماتحت جرمنی سے تخفیف اسلحہ کا مطالبہ کیا گیا ہے تو اس وقت موسیو کلینشو وزیر اعظم فرانس نے یقین دلایا تھا کہ یہ پہلا قدم ہے جو اقوام عالم نے تخفیف اسلحہ کی طرف اٹھایا ہے لیکن کچھ مدت کے بعد خود فرانس ہی نے اس تجویز پر پورا اعتراض کیا کہ جب تک انجمن اقوام اتنی قوت حاصل نہ کرے کہ وہ کسی ایسے ملک کو جس نے اپنے ذخائر حرب میں تخفیف کر دی ہے دوسرے حملہ آوروں سے بچائے اس وقت تک اس مسئلے پر غور و کتابے کا رہوگا۔

فرانس کا یہ اعتراض ایک حد تک صحیح تھا لیکن سوال یہ ہے کہ جب جرمنی سے سامان جنگ کی تحدید کا مطالبہ کیا گیا تھا تو اس وقت موسیو کلینشو کو یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ بہر حال ۱۹۱۳ء میں یہ مسئلہ پندرہ اقوام مغرب کے سامنے آیا اور اب کے تجاویز میں یہ طے ہوا کہ اگر سوے اتفاق سے جنگ پھڑپھڑائے تو اس وقت اقوام کا ہر رکن اس میں حصہ لینے پر مجبور ہوگا۔ یہاں تک کہ اس تجویز کو منظور نہیں کیا گیا ۱۹۲۹ء

یہ دونوں ایک دوسرے کا جملہ ہوا جس میں بالآخر یہ قرار دیا مضبوط ہوئی کہ جرمنی اور فرانس دونوں کو جنگ سے بچنے پر توجہ امداد اور اشتراک عمل کا یقین دلایا جائے۔ اس اجتماع میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، بلجیئم، ہالینڈ اور چیکو سلواکیا کیسات قومی شریک تھیں۔ اگلے سال یعنی ۱۹۲۶ء سے جرمنی نے انجمن اقوام میں شرکت کر لی ہے اور اب گویا جرمنی کو بھی تخفیف اسلحہ کے مطالبہ کا ایسا ہی حق حاصل ہے جیسا دوسری قوموں کو۔ فرانس کا منشا یہ ہے کہ اس کی جنگی طاقت بدستور قائم رہے لیکن جرمنی یا ہنگری یا کسی دوسرے ملک کو یہ کیوں کر گوارا ہو سکتا ہے کہ اس کے مقابلے میں ان کی فوجی قوت برابر گھٹتی رہے بات اصل میں یہ ہے کہ انتقام جنگ پر ہر قوم نے جہاں تک ممکن تھا دوسری قوم کی شکست سے فائدہ اٹھانا چاہا اس سے قدرتا تمام یورپ میں صلح و آشتی کی بجائے بغض و عناد تیار ہوئی۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ جرمنی اور فرانس میں ایک دوسرے کے دن بدن بڑھ رہی ہے۔ دونوں قوموں میں جنگی روح کا رز

قوم اس سے اپنی گزشتہ ناکامی کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔ اس کے لئے ہر چیز خطرے کا موجب بن رہی ہے۔ ادھر اٹلی سے بھی اس کے تعلقات کچھ اچھے نہیں اور شمالی افریقہ کی سیاسی پیچیدگیاں کچھ ایسی ہیں کہ ان سے ہر وقت جنگ و جدل کا خدشہ ہے۔ مزید برآں مشرقی یورپ کی ریاستوں کی طرف سے اس پر جو پابندیاں عائد ہوتی ہیں ان سے بھی ہر لمحہ جنگ کا امکان ہے۔ لیکن اگر ان تمام وجوہ کو باطل قرار دیا جائے تب بھی فرانس کا یہ حذر ہے کہ امن یورپ کے قیام کے لئے اس کے عساکر کی موجودگی ضروری ہے۔ گویا حکومت فرانس اب وہی حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے جو اس کے نزدیک جنگ سے قبل جرمنی کی تھی اور جس کے لئے اسے اب تک ملعون کیا جاتا ہے۔ ہر کیف یہ مطلب نہیں کہ فرانس کے یہ سب ہذرات حقیقت پر مبنی ہیں اور انہیں اخلاقاً بھی جائز سمجھنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ دبیرین مغرب اگرچہ جنگ کے خطرات سے خوفزدہ ہیں لیکن ان کے اندر کوئی ایسی اخلاقی یا روحانی قوت موجود نہیں جس سے اقوام عالم کے درمیان تصادم نہ ہونے پائے۔ مغربی قوموں کی حالت تو اس معاملے میں خاص طور سے افسوسناک ہے۔ ان کا جذبہ وطنیت، ان کی ہوس استعمار اور خواہش غصب، ان کی باہمی رقابت، مقصد انتقام، پیش رفتی اور مادیت اور لاندہی اتحاد و اتفاق کی راہ میں ہر طرح سے مائل ہیں۔ ہر کیف ایک طرف فرانس کو اپنی حکمرانی کی حفاظت مقصود ہے اور دوسری

اور دوسری قوموں کا بجا طور پر پھر اسے کہ ان کی اور فرانس کی حالت میں بے فرق پیدا ہو گیا
 ہے۔ اس پر غور کیا جائے۔ اس پر غور کیا جائے کہ وہ قومیں جن کے معاملات فرانس یا جرمنی کے سے نہیں
 ہیں ان کے نام پر تخفیف اسلحہ کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ اب کے ضیو امیں امریکہ اور روس کے مندوبین
 کی ایک مجلس میں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اس ميثاق کو جو مسٹر کیلیوگ کی طرف منسوب ہے علانیہ
 کا حجب ہٹایا جائے گویا باط سیاست مغرب کے سبھی ممبرے ایک جگہ جمع ہیں اور اگرچہ بظاہر اس عالم
 کا مقصد عظیم ان کے سامنے ہے لیکن ہر قوم جو چاہتی ہے اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ تدبیر
 اور حکمت اور ان کی دنیا میں اپنی حریف قوم کو شکست دے سکے۔

ہٹلر پارٹی | جرمنی کی مشہور سیاسی جماعت ”ہٹلر پارٹی“ نے جو اشتراکیت و وطنیت کے پرچم میں اہل
 سابقہ حکومت یعنی شہنشاہی اور فوجی نظام کی حامی ہے حال ہی میں قافونی ذرائع کی مدد سے اپنا
 اثر بڑھا کر شروع کر دیا ہے۔ اس کی تصریح مشہور جرمنی صحافی جارج برن ہارٹ نے اس طرح کی ہے
 کہ اگرچہ مجلس حکومت میں اس وقت ہٹلر پارٹی کی تعداد ۴۰ فی صدی ہے جس میں آسانی دو فی صدی
 کا اور اضافہ ہو سکتا ہے لیکن ہٹلر کو یقین ہے کہ اس کے لئے مزید ۱۰ فی صدی کا حاصل کرنا ناممکن ہے۔
 لہذا ایڈولف ہٹلر کے سامنے دو ہی راہیں ہیں۔ یا تو وہ کسی موقع سے فائدہ اٹھا کر دفعہ حکومت پر قبضہ
 کر لے یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر ہر دست مغلوط حکومت قائم کی جائے اور جب وقت آئے تو پھر ہٹلر اپنے
 رفقاء کو چھوڑ کر مختار کل کی حیثیت اختیار کرے۔

ہٹلر پارٹی کی تعداد میں جس چیز نے اضافہ کیا ہے وہ جرمنی کی حدود و جہت سبب معاشی حالت ہے۔
 ہٹلر کا کہنا یہ ہے کہ اس صورت حالات کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو جرمنی کے دشمن ہیں یعنی فرانس
 اور امریکہ اور جو جنگ کے بعد سے برابر اس کا خون چوس رہے ہیں۔ ہٹلر کا دعویٰ ہے کہ جرمنی کی
 سابقہ حالت ایک مرتبہ پھر عود کر سکتی ہے۔ گویا اس وقت وہ سب لوگ جنہوں نے انقلاب حکومت
 یا نہ کی قیمت کر جانے سے نقصان اٹھایا ہے ہٹلر کے جھنڈے کے نیچے جمع ہیں یوں بھی اب تک جو
 سیاسی جماعتیں قائم ہو چکی ہیں ان سے کوئی خاص نتائج مرتب نہیں ہوئے لہذا لوگ یہ دیکھتے
 ہیں کہ اب ہٹلر ان کے لئے کیا کرتا ہے۔

شہر کی ہٹلری قوت میں اس قدر عطا اضافہ نہ ہوتا لیکن یہاں کہ ہٹلر نے اپنی تحریک کا آغاز
 اشتراکی اصولوں کے پردے میں کیا۔ اس سے بڑے بڑے تاجروں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہٹلر
 کی تحریک مزدوروں کی انجمنوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لئے مفید ثابت ہوگی لہذا انھوں
 نے ہٹلر کی مدد کرنا شروع کر دی۔ اس وقت ہٹلر کے ساتھ ہر قسم کے لوگ ہیں اور اس نے ان میں سے
 ہر شخص کے ساتھ جیسا جس نے چلا دیا وعدہ کر لیا۔ اس جماعت میں سابق والین ملک قدیم حکام متوسط
 طبقہ، مزدور، دستکار، نوجوان، اشتراکی فوٹک ہر طرح کے آدمی شامل ہیں۔ اس وقت ایڈولف ہٹلر کی
 گفت و شنید سنٹر پارٹی سے جاری ہے۔ اور خود سنٹر پارٹی بھی یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ ہٹلر کی بڑھتی ہوئی
 جماعت کو بہت دنوں تک حکومت میں حصہ لینے سے روک نہیں سکتی۔ لہذا
 وہ چاہتے ہیں کہ وہ ہٹلر کے ساتھ مل کر اس کی جماعت میں تفریق دے
 کے بعض اراکین جن میں قابل ذکر نام چانسلر برڈنگ کا ہے یہ سمجھ
 حکومت میں قائم ہو گیا تو پھر مؤیدین ہٹلر یہ کوشش کریں گے کہ پوری
 سنٹر پارٹی کے اس فرق کا خیال ہے کہ نیشنلسٹ سوشلسٹ جماعت کو باہمی منافقت کا موقع دینا چاہئے
 تاکہ وہ اس امر کا فیصلہ کر سکیں کہ آیا انھیں باقی ماندہ نیشنلسٹ سوشلسٹ طبقے کو اپنے ساتھ ملا کر حکومت
 کرنی ہے یا بہ طور سوشلسٹ ڈیموکریٹ جماعت کا ساتھ دینا چاہئے۔ اس لئے کہ ممکن ہے آئندہ انتخابات
 میں سوشلسٹ نیشنلسٹ جماعت کی تعداد کم رہ جائے لیکن اگر فان ہینڈن برگ و جارج ہدارت کی لیڈاری
 کے لئے تیار ہو گئے (جس کی رائے نے حال ہی میں تصدیق کر دی ہے) تو پھر سنٹر پارٹی ہٹلر سے اس
 امر کا مطالبہ کرے گی کہ وہ ان کے اشتراک عمل کے عیوض جنرل ہینڈن برگ کی ہدارت کی تائید کرے۔
 مگر اب ہٹلر کا ہینڈن برگ کی تائید کرنا اس کے سابقہ اقوال کے منافی ہوگا اور اس سے قدرتا اس کی
 جماعت میں تفریق و انتشار رونما ہو جائے گا۔ بایں ہمہ ہٹلر کے لئے اپنی قوت کو قائم رکھنے کا یہی ایک
 ذریعہ ہے اس لئے کہ ہٹلر کے لئے کسی انقلاب آفریں طرز عمل کا کوئی امکان نہیں اور اسے خوب معلوم
 ہے کہ اگر اس قسم کا کوئی موقع آیا تو جرمن قوم اس کی بجائے ہینڈن برگ کے ساتھ ہوگی۔

شذرات

۱۲۔ اکادمی کا دوسرا جلسہ جس کے لئے ۲۴ فروردی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی اس دن منعقد نہ ہو سکا کیونکہ فاضل مقرر کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی۔ تمام قاضی اور بیرونی اراکین کو چند دن پہلے سے تاریخ بدلنے کی اطلاع دیدی گئی تھی اور اخباروں میں بھی اعلان ہو گیا تھا پھر بھی بعض حضرات احتیاطاً ۲۴ فروردی کو بھی مختلف اوقات میں تشریف لائے۔ انہیں جو زحمت برداشت کرنی پڑی اس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔

جلسہ ۲۰ فروردی یوم شنبہ شام کو ۱۲ بجے سے ۸ بجے تک ہوا۔ عدالت سجاد اکبر ذاکر حسین غائبی نے اپنا فاضلانہ خطبہ ”جمال الدین افغانی کی سیرت پر پڑھ کر سنایا۔ قاضی صاحب اس موضوع کے متعلق عرصے سے تحقیقات فرما رہے ہیں اور آپ نے بڑی کاوش اور تلاش سے بہت کچھ نیا مواد جمع کیا ہے جو آج تک کسی کو ہاتھ نہیں آیا تھا شلا شیخ جمال الدین کے دوست اور قدر وال مسٹر بلنٹ کا لندن مجلہ مودۃ الوثائق کے متعدد نمبر دیہ رسالہ پیرس سے شیخ جمال الدین اور مفتی محمد عبدہ کی ادارت میں شائع ہوا مگر صرف چند مہینے چل سکا۔ اس کے پرچے اب نایاب ہیں“ شیخ کے خطوط مختلف اجاب کے نام ان کے خاص دوستوں کے قلمی بیانات وغیرہ وغیرہ۔ قاضی صاحب کی تقریر جس دلچسپی، توجہ اور جوش سے سنی گئی اس کی مثال علمی جلسوں میں کم ملتی ہے۔ حاضرین کی تعداد پچھلے جلسے سے کچھ زیادہ تھی اور ان میں سفارت افغانستان کے نمائندے بھی موجود تھے۔ ہم اس مقالے کا ایک حصہ ماہِ حج کے نمبر میں شائع کریں گے اور پورا مقالہ انشاء اللہ علیحدہ رسالے کی شکل میں جون تک چھپ جائے گا۔

اکادمی کا تیسرا جلسہ ۱۰ مارچ کو ۸ بجے شام سے شروع ہو گا۔ مولانا اسلم جیرا چوری حسب ذیل

موضوع پر تقریر فرمائیں گے۔

”مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر“

امید ہے کہ مولانا محمد سورتی صاحب جیسے کی صداقت فرمائیں گے۔

اس تقریر کے بعد ایک ملی مباحثہ ہو گا۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب یہ تجویز پیش کریں گے کہ ”ہندوستانی یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم مجموعی حیثیت سے ملک و قوم کے لئے مفید ہے“۔ جناب خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹرننگ کالج علی گڑھ اس کی مخالفت میں تفسیر فرمائیں گے۔ بعض اور حضرات بھی جو تسلیم کے سلسلے سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں اس موضوع پر اپنے خیالات ظاہر کریں گے۔

دربار بھوپال نے مسلمان عہدوں کی دادرسی کے لئے مسارا

زوحین کے نام سے جاری کیا ہے جو شوہر کے مفقودالخبر ہو جائے۔

یز بصورت عدم ادائے تان و نفقہ یا بصورت امراض متعدیہ خلع کے حقوق پر ہے۔

مذہب خنی میں شوہر مفقودالخبر کی بیوی کو عمر طبعی تک انتظار کی ہدایت کی گئی ہے جس کو کسی نے ۹ سال تجویز کیا ہے اور کسی نے اس سے بھی زیادہ۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں تاہ زندگی اس کے لئے رہائی کی صورت ممکن نہیں۔ مگر چونکہ مذہب خنی میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ باقضاء ضرورت دیگر ائمہ کے مسلک کو اختیار کیا جاسکتا ہے اس لئے اسی اصول کے تحت میں منظور فرمائیں گے۔ بھوپال دہلوی احکام شرعیہ یہ ضابطہ جاری کیا گیا ہے جس میں مفقودالخبر کی بیوی کو قاضی صاحب ریاست کے سامنے درخواست پیش کرنے پر مطابق مذہب مالکیہ زیادہ سے زیادہ چار سال کے انتظار کے بعد نکاح کا اختیار دیدیا جائے گا۔

اسی طرح اس کو حق دیا گیا ہے کہ شوہر کے مجذوم یا مبروص وغیرہ ہونے کی صورت میں بھی وہ تفریق کی درخواست حکمہ تقضائیں کر سکتی ہے اور قاضی صاحب بعد ثبوت دعوے کے مطابق قواعد شرعیہ تفریق کرا سکتے ہیں۔ دربار بھوپال کا یہ اصلاحی کام ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ہر طرح تحسین کا مستحق ہے۔

ہر وہ عیب جو باعث نفرت زوجین ہو اور اس سے مقصد نکاح حاصل نہ ہو تاہو
اختیار فسخ کا واجب کر دے گا۔

”ہر وہ عیب جو باعث نفرت زوجین ہو اور اس سے مقصد نکاح حاصل نہ ہو تاہو
اختیار فسخ کا واجب کر دے گا۔“
”ہر وہ عیب جو باعث نفرت زوجین ہو اور اس سے مقصد نکاح حاصل نہ ہو تاہو
اختیار فسخ کا واجب کر دے گا۔“

حالانکہ یہ ممکن ہے کہ عدلت باوجود علم ان امراض کے دور میں تنکاح کا اس وقت انداز
لے لی ہو یا اس نے ان کو عارضی سمجھا ہو اور بعد میں وہ دائمی ثابت ہو گئے ہوں یا اس نے ان کو
عاجل برداشت خیال کیا ہو اور بعد میں بڑھ کر وہ ناقابل برداشت ہو گئے ہوں۔ کیا ان صورتوں میں
فسخ اس وجہ سے کہ اس ”ناقص العقل“ نے جان بوجھ کر نکاح کیا تھا عدالت شرعی اس کی رائی
کو کوئی سبیل نہ کرے اور انسانیت کی حفاظت اور طبی اصول سب کو پس پشت ڈال کر اس کو اس بلا
میں گرفتار رہنے دے جو باعث نفرت ہے اور جس سے مقصد نکاح حاصل نہیں ہوتا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
ماہوار
دہلی
جا
زیر ادارت

مولانا اہم جہاز چوری
ڈاکٹر سید عابدین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی
جلد ۱۰
بابۃ ماہ مارچ ۱۹۳۲ء
نمبر ۳

فہرست مضامین

جناب قاضی ع

.....

- | | | |
|-----|--------------------------------|------------------------------------|
| ۲۱۹ | جناب میث پرشاد صاحب | ۱۔ جمال الدین افغانی |
| ۲۲۹ | جناب رئیس احمد صاحب جعفری ندوی | ۲۔ مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط |
| ۲۵۸ | حضرت اصغر گوٹہوی | ۳۔ گینا کے فارسی تراجم |
| ۲۵۹ | | ۴۔ رام پور کا ایک ملک الشعرا |
| ۲۶۳ | ایڈیٹر | ۵۔ غزل |
| ۲۶۱ | ن۔ ن | ۶۔ بطلن بیوی |
| ۲۶۵ | ن۔ ن | ۷۔ تنقید و تبصرہ |
| ۲۸۲ | ذ۔ ح | ۸۔ دنیا کی رفتار۔ عالم اسلامی |
| ۲۸۹ | ایڈیٹر | ہندوستان |
| | | مالک غیر |
| | | ۹۔ شذرات |

محمد حبیب بی۔ اے۔ (اگس) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قزول باغ سے شائع کیا،

جمال الدین افغانی

(یہ قاضی جہانگیر صاحب کے اس مقالے کا آخری حصہ ہے جو موصوف

نے اردو اکادمی کے جلسے میں ۲۱ فروری کو پڑھا تھا۔)

ایران میں شیخ کی علی زندگی کا اہم ترین زمانہ قشقہ سے شروع ہوتا ہے۔ وہ بادشاہ کے دربار میں ہو کر گئے تھے لیکن ان کے افکار و غرائز بادشاہ کے اثرات سے بہت دور تھے۔ وہی ایک جذبہ جوان کو متحرک اور دوس لے گیا تھا یا تنہا و خلج فارس کی طرف لے گیا وہی جذبہ ان کو ایران میں گھسیٹ کر لایا تھا اور کچھ ہی عرصے بعد اس جذبے کے مظاہرے شروع ہو گئے۔

شیخ کا بہت بڑا کام جو متحرک و ایران میں ان کی زندگی کا نشان ہے یہ تھا کہ جو جماعت یعنی جماعت علماء شہنشاہیت کی پرستار اور مددگار تھی اسی سے انھوں نے شہنشاہیت اور مطلقیت کے فائدے کا کام لیا۔ تاریخ اسلامی کے اس دور میں قدامت پسند علماء کا گروہ حقوق انسانیت کا حامی نہ تھا بلکہ مخالف تھا تاہم شیخ ہی کا وہ جادو تھا جس نے اس استبداد پسند جماعت کے قلوب کو بدل دیا اور حقوق ملت کے چوروں ہی کو ”آدمیت“ اور انسانیت کا محافظ و پاسبان بنادیا۔ شیخ کی سیاسی زندگی کا یہ سب سے بڑا معجزہ تھا!

ناصر الدین شاہ کی زندگی کے آخری چند سال ایران کے قومی مصائب اور ایرانی شہنشاہیت کے بدترین چند سال تھے۔ شاہ کو یورپ کی دلچسپیوں اور عیاشیوں نے اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور اس کی دولت یورپ کے بازاروں اور قہور خانوں میں پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ ناصر الدین شاہ کا تمیز اور آخری سفر یورپ وہ تھا جب وہ یورپ سے اپنی شہنشاہیت کے سخت ترین دشمن کو مہمان بنا کر ساتھ لایا تھا جس طرح فرعون کے محل میں موسیٰ لائے گئے تھے۔ ناصر الدین نہ صرف اپنا خزانہ خالی کر چکا تھا بلکہ اس کی رعایا کی جیبیں بھی خالی ہو چکی تھیں۔ اب مصر کی طرح یہاں بھی یورپ

کے ساتھ ساتھ ہی مشرقی تاجداروں کے مابین کو گرو رکھنے کے لئے یورپ کا ہمسایہ
بریتیش تیار ہوتا ہے اس لئے کہ وہ خوب جانتا ہے کہ تاج کے ساتھ تخت بھی اس کے گم گئے گا۔
ناصر الدین کی تنگدستی نے اس کو قرضے لینے اور یورپین سرمایہ داروں کو اپنے ملک میں ہر قسم کی
مرامات دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ سترہویں صدی میں برطانوی سرمایہ داروں کو لندن میں شاہی
بنک قائم کرنے کا شکیکہ دے دیا گیا اور اسی کے چند روز بعد تہیکو کے اجارے کا قسہ پیش آیا،
جس نے بالآخر انقلاب کے دروازے کھول دئے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۱ء کو شاہ ناصر یورپ سے
واپس آئے شیخ ان کے ہمراہ تھے۔ چند ہی روز بعد آواز سے۔

ایک برطانوی کمپنی کو دے دیا گیا۔ ہر مارچ سترہ کو ایک
کاشت کا اجارہ دیا بنایا گیا۔ تقریباً دس کروڑ کے سرمایے۔

اس اجارے کے خلاف سب سے پہلے شاہزادہ مالکم خاں نے جو لندن میں مقیم تھا
کیا اور اسی بنا پر شاہ نے ان کو سفارت کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ مالکم خاں کی زبردست
شخصیت نے اس موقع پر اپنے تمام ذاتی اثرات کو حکومت کے خلاف نکتہ چینی میں صرف کر دیا۔
وہ اپنے عہدے سے برطرف ہو کر لندن ہی میں مقیم رہے۔ انہوں نے اخبار ”قانون“ جاری کیا۔
اس اخبار نے ایرانی شناسائیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ شیخ کے مضامین بھی ”قانون“ میں
شائع ہونے لگے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ راز ظاہر ہو گیا کہ شیخ مالکم خاں کی اس تحریک کو
بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح شیخ کی زبردست آواز خط کے نفاذ میں طہران سے
لندن جاتی تھی اور لندن سے ”قانون“ کے پردے میں طہران واپس آ کر ملک کے گوشے گوشے
میں پھیل جاتی تھی۔ شاہ ان کے اصلی رنگ سے واقف ہو چکا تھا اور وہ بھی کھل کر میدان
میں آ گئے تھے۔ جانفروشنوں کی ایک جماعت ان کے حلقے میں داخل ہو چکی تھی۔ شیخ علی قزوینی
جو بعد کو قاضی عدلیہ ہوئے، مرزا آقا خاں جنہوں نے بعد کو قسطنطنیہ سے اخبار راقہ جاری کیا اور
پھر تبریز میں خفیہ طور پر قتل کر دئے گئے، شیخ احمد کرمانی، مرزا رضا کرمانی جس نے ناصر الدین شاہ

مستحقین میں پھانسی پائی، مراد مقلی خاں لہستانی اور ایسے ہی بہت سے ہم مسلح کے
 قتل کی خبریں سنیں تھیں۔ ان میں سے بہت سے وہ نام تھے جو آج بھی تاریخ انگلستان
 کے صفحات پر آب زر سے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اس جنگ آزادی میں ہمیشہ پیش آتا ہے
 حکومت کے جلد نظام دہاکین قحج کے بڑھتے ہوئے اثرات کو گورنر کرکے اور وزیر اعظم امین السلطہ
 نے بہت جلد شاہ کو قحج کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ اس عرصے میں بہت سی خفیہ انجمنیں ملک
 میں قائم ہو چکی تھیں اور شاہ اپنے کو سخت خطرے میں پاتا تھا۔ قحج بھی اب امین السلطہ اور
 شاہ کے منصوبوں سے بے خبر نہ تھے، چنانچہ انہوں نے شاہ سے اجازت چاہی کہ لہران کے
 امام شاہ عبدالعظیم کی خانقاہ میں اقامت اختیار کریں اور شاہ نے بھی اس خیال سے کہ یہ مسئلہ
 خاص دارالسلطنت سے دور ہو جائے ان کو وہاں جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن جب وہ
 شاہ عبدالعظیم میں جا کر بیٹھے تو وہاں بھی مشاہیر علماء اور عوام ہزاروں کی تعداد میں حاضر ہونے
 لگے اور قحج کی تبلیغ و تلقین کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہ مہینے اس طرح گزرے اور اس مہینے
 میں داعی حریت کی آواز ایران کے ہر گوشے میں سرایت کر گئی اور وہ ملت ایلانی کے ایک
 مسلح دستہ بے جانے لگے۔ اسی زمانے میں قحج نے ایک مکتوب شاہ کو بھیجا اور دریافت کیا
 کہ وہ کیوں ان سے بدگمان ہیں۔ لیکن اس مکتوب کے جواب میں شاہ نے شاہ عبدالعظیم میں قحج
 کو ان کے بسرِ حالات پر گرفتار کرایا اور وہیں سے ۵۰ سواروں کی نگرانی میں عثمانی سلطنت کی
 سرحد چھوچ دیا۔ قحج کے خارج البلد کئے جانے کی خبر نے تمام ملک میں آگ لگا دی اور شاہ کو
 اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ بلاشبہ قحج کا ایران سے جانا شاہ کی موت کا آنا تھا۔

قحج نے ایران سے نکلنے ہی بہت دیر عراق و کربلا اور علمائے ایران کی دہلی ہوئی آگ
 کو بھڑکادیا اور جو زمین وہ تیار کر چکے تھے اس پر اپنا کام شروع کر دیا۔ جو خطوط قحج نے علماء و
 مجتہدین کو لکھے ان میں سے ایک کا کچھ حصہ ان اوراق میں اس لئے پیش کرتا ہوں کہ قحج کے
 ان جذبات سے آپ روشناس ہو جائیں جو ایران کے مطلق ان کے ملک کو بے چین کر رہے

۱۔ حق کے لئے ہم حاکمی و ممانعت شریازی کو کہتے ہیں۔

”میں حق کہتا ہوں، یہ خدایت اسلامی کی خاطر کہتا ہوں جہاں کہیں وہ شریعت جاری ہو اور قائم ہو۔ یہ ایک اپیل ہے جو میں تمام حق پسندوں سے کہتا ہوں جو شریعت پر ایمان رکھتی ہیں اور اس کے نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہیں یعنی میں اپیل کہتا ہوں علماء اسلام سے اور یہ اپیل میں تمام علماء سے کرتا ہوں حالانکہ میرے مخاطب ان میں سے ایک بھی نہیں۔۔۔۔۔“

خدا نے آپ کو اس اعلیٰ نیابت پر فائز کیا ہے تاکہ آپ حقیقت خطیرہ کے ناپید ہوں اور خدا نے ملت بیضا سے آپ کو منتخب کیا ہے کہ آپ ان کے

۲۔ کہ شریعت اسلامی کی حفاظت و نگرانی کریں۔ اہل ایران

اپنے بیت الدین کو دیکھ کر بیتاب ہو گئے ہیں جو اختیار و کد

اور جس پر ان مفید و کفار کا قبضہ قائم ہو گیا ہے۔ مگر کسی لیڈر نے سر

اہل ایران پریشان ہیں، منتقم ہیں اور مسل ہیں۔ وہ حیران ہوتے ہیں، ان کا ایمان

متزلزل ہوتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان مجتہدین کی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں

ہوتی جن کو وہ اپنا رہنما اور اسلامی مفاد کے معاملات میں اپنا لیڈر سمجھتے ہیں اور مجھے

کام حق رکھتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ تیرا ایک لفظ ان کو مستند

کر دے گا اور تیری ہی حجت فیصلہ کن ہوگی، تیرا ہی حکم با اثر ہوگا اور کسی کی مجال نہ ہوگی

کہ تیرے حکم پر حجت زنی کر سکے اور اگر تو چاہے گا تو متفرق عناصر کو اپنے ایک لفظ سے متحد

کر دے گا اور اس طرح خدا کے دشمنوں کے دل میں خوف خدا پیدا کر دے گا اور کفار کے

ظلم سے اہل ایران کو بچائے گا۔ تیرا ہی ایک لفظ اس مصیبت و ابتلا کا خاتمہ کر دے گا

جس میں اہل ایران گمراہ ہوئے ہیں اور ان کو زندگی کی سختیوں سے نجات دے کر

راحت و آرام عطا کرے گا۔ پس دین کی حفاظت ہو جائے گی اور اس دین کے

مگر کوشش اس کو بچا لیں گے اور اسلام کا مرتبہ بلند ہو جائے گا..... اس کے بعد
 عالمِ عظمیٰ اپنے شہر بادشاہ کی قوتِ ارادی کمزور ہے، اس کی سیرت خراب ہے اور
 اس کا دل گندہ ہے۔ وہ ملک پر حکومت کرنے اور اہل ملک کے معاملات کو سدھارنے
 کے قابل نہیں ہے اور اس نے حکومت کی باگیں ایک بے دین ظالم اور غاصب کی سپرد
 کر دی ہیں جو رسول پر طانیہ استہزا کرتا ہے اور شریعتِ حق کی پروا نہیں کرتا جو امرائے
 شریعت کو خیال میں نہیں لاتا اور علماء پر لعنت بھیجتا ہے، اہلِ زہد و تقویٰ کو ذلیل
 کرتا ہے، نورِ سادات کی تحقیر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں کفار کے ملک سے واپس آنے کے
 بعد وہ باطل قابو سے باہر ہو گیا ہے، طانیہ شراب پیتا ہے اور کفار کی صحبتوں میں وقت
 گزارتا ہے۔ یہ ہے اس کا چلن۔ مگر اس کے علاوہ اس نے ایرانی زمین کا بڑا حصہ
 مع اس کے منافع کے کفار کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ (اشارہ ہے مدنیات کی طعن
 یہاں نہیں بلکہ سرکیں، کاررواں، سرائیں، باغات، کمیت سب ہی کچھ اس نے وقت کر ڈالے
 تباہی کی تمام زراعت مع زمین و عمارت کے، انگوڑی فصل مع کارخانوں
 اور سامان تجارت کے، حابون، موم، تیاں اور تنکر کے تمام کارخانے غرض سب کچھ مع
 متعلقات اس نے کفار کی نذر کر دیا ہے، اتنا یہ ہے کہ بنگ۔ آپ کیوں کہجیں گے
 کہ بنگ کیا ہے اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ دشمنانِ اسلام کو گویا ساری سلطنت دے ڈالی۔
 اب جو کچھ رہ گیا ہے اس نے روس کے سامنے پیش کر دیا
 تاکہ روس خاموش رہے یعنی مندرجہ رشت، دریائے جہرستان، سترک، انزل و خراسان
 مع تمام مکانات و مراہل اور متعلقہ اراضیات مزدومہ کے، مگر روس نے ناگ بھوں
 پڑھائی اس لئے کہ وہ توکلِ خراسان، آذربائیجان اور مازندران کی فکر میں ہے.....
 یہ ہے پہلا نتیجہ اس پاگل کے طرزِ عمل کا..... اور تو! عجب تو اسلام
 کیا تو اس قوم کی مدد کے لئے نہ اٹھے گا اور ان کو متحد نہ کر دے گا اور شریعتِ مطہرہ کی

تہمتیں ہیں ملک کس گنہگار کے ہاتھ سے نجات نہ دوائے گا؟ بلاشبہ بہت جلد
پہلا سی مملکت اختیار کے زیر اقتدار ہوگی جو وہاں جس طرح چاہیں گے حکومت کریں گے
اگر تو نے یہ موقع جانے دیا اور اے امام! اگر یہ واقعہ تیری زندگی میں پیش ہو گیا تو یقیناً
تو اپنا نام تاریخ کے صفحات پر روشن نہ چھوڑ جائے گا!

اس کے بعد شیخ نے ان مظالم کا ذکر کیا ہے جو ان کے رفیقوں پر اور خود ان پر کئے گئے۔
انھوں نے اپنے ایران سے نکالے جانے کی داستان ذرا تفصیل کے ساتھ لکھی ہے کہ جس کو:-
”اب میری داستان اور جو کچھ اس ناشکر گزار ظالم نے میرے ساتھ کیا وہ بھی

سن لیجئے۔ اس مردود نے طہران کی برف سے ڈھکی ہوئی

میرے گھیسے جانے کا مکم دیا جبکہ میں خانقاہ عبد الغفر

تھا۔ انا لہ وانا الیہ راجعون۔ اس کے ذیل خادموں

ایک بار ہزار ٹوپر سوار کرایا اور زنجیروں سے باندھ دیا اور یہ سب

جب جاڑوں کا موسم تھا برف کے ٹوفان آرہے تھے اور بہت سرد ہوا میں چل رہی تھیں

اس طرح مجھے سواروں کی نگرانی میں خائفین پہنایا گیا جہاں پہلے ہی ترک دالی سے

ٹپ کر لیا گیا تھا کہ مجھے بقرہ بھیج دیا جائے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر

مجھے آزاد چھوڑا گیا تو میں سید حائیرے پاس آؤں گا، اے امام! اور مجھے اس کے

مظالم سناؤں گا اور مملکت ایران کے حالات بتاؤں گا اور تجھ سے لے حجتہ الاسلام

مدد چاہوں گا!

شیخ کا یہ زبردست اپیل ایک کبلی کی طرح ایرانی مجتہدین کی جماعت میں سرایت کر گیا اور
ایران میں تباہی کے اجارے کے خلاف وہ شدید اور خوفناک آگ بھڑکی جس نے ناصر الدین شاہ
کا جامہ ہستی جلا ڈالا۔ اپنے جلاوطن ہونے سے پہلے شیخ نے ایران کی سرزمین پر شہنشاہیت کے
خلاف اس قدر بارود پھیلا دی تھی کہ ان کی جلاوطنی کے چند ہی روز بعد ”انقلاب“ کی آواز

یہ وقت کے گھوڑے باز تازیں گونجنے لگی۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے بظاہر اسباب شیخ کی خطبات اور مختار بادشاہوں کی جان کی دشمن معلوم ہوتی تھیں اور یہ شبہ کچھ جیسا نہیں کہ شیخ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے شدید ترین آلات حرب استعمال کرنے کو بھی جائز سمجھتے تھے۔

ہم گئے اس سیاسی مذہب سے کتنا ہی اختلاف کیا جائے لیکن ان کی بے مثال قربانیوں اور ان کے اعلیٰ انتہائے خیال کے متعلق دنیا کا کوئی وطن پرست ایک حرف نہیں کہہ سکتا۔ جیسا کہ مسعود کے حالات میں ظاہر کیا جا چکا ہے ان کی سیاسیات کا وہی رنگ ایران میں بھی تھا۔ علماء کے طبقے میں آگ لگا کر انھوں نے گویا ناصر الدین شاہ کی شمشادیت کو آگ لگا دی اور گو وہ خود اس ملک سے نکال دئے گئے لیکن اپنے بعد وہاں بہت سے سرفروش چھوڑ کر جن میں سے ایک نے بالآخر ناصر الدین سے اس کے مظالم کا خوفناک بدلہ لے لیا۔ مرزا رضا کرمانی نے اپنی گرفتاری کے بعد اودھ پھانسی پانے سے پہلے جو بیان عدالت میں دیا اس کی ایک مستحضر نقل ہم کو براؤن کے ذریعے سے ملی ہے۔ مرزا رضا خاں کے الفاظ اس کے جذبات اور ان جذبات سے شیخ کے تعلق کی ایک دلچسپ تصویر ہیں:-

”سید جمال الدین“ اولاد رسول“ نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کو شاہ عبدالعظیم کی محرم خانقاہ سے اس طرح ذلت کے ساتھ گھسیٹ کر نکالا گیا کہ ان کے جسم کے کپڑے تک پارہ پارہ ہو گئے۔ یہ تمام ذلت ان کو برداشت کرنا پڑی مگر انھوں نے کیا کیا تھا سولے سو کے؟ جو لوگ میرے عقائد و خیالات سے اس ملک میں متفق ہیں ان کی تعداد بہت ہے اور وہ ہر طبقے کے لوگ ہیں۔ علماء کی جامعیت میں، امراء میں، اہل حرفہ اور سوداگروں میں بہت سے میرے ہم خیال ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب سید جمال الدین اس شہر میں آئے تھے تو طہران اور شاہ عبدالعظیم میں ہزار ہا آدمی ان کے خطبات اور مواظعت سنتے تھے اور چونکہ وہ جو کچھ کہتے تھے وہ خدا کے لئے تھا اور محض مفاد عامہ کی خاطر، ہر شخص کو ان کے خطبات سے فائدہ

ہوتا تھا اور ان کے مواخذ کا ہر شخص گرویدہ تھا۔ اس طرح انھوں نے بلند خیالات کا بیج لوگوں کے دلوں کی زمین میں بویا اور انسان جاگے اور ہوش میں آ گئے۔ اب تو ہر شخص وہی خیالات رکھتا ہے جو میرے ہیں۔ لیکن میں تم کہتا ہوں اس خدا کی جس نے سید جمال الدین اور تمام انسانوں کو پیدا کیا کہ سوائے میرے اور سید جمال الدین کے شاہ کے قتل کے ارادے کی خبر کسی کو نہ تھی۔ سید تو اب قسطنطنیہ میں ہیں جو تمہارا جی چاہے کر دے۔

ناصر الدین شاہ کیم منی ۱۹۰۷ء کو قتل کیا گیا یعنی قسج کے ایران سے نکالے جانے کے ۶ سال بعد۔ لیکن ایران کا یہ سارا دور وہ تھا جب قسج کا ڈالنا شروع ہو گیا تھا۔ قسطنطنیہ میں بیٹھے ہوئے اپنی کوششوں کے نتیجے دیکھ کر یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاہ کے قتل میں قسج کا اشارہ موجود ہے۔

ایران نے نکل کر قسج بصرہ پہنچے اور حاجی علی اکبر شیراز

تھے مشورہ کر کے لندن چلے گئے جہاں مالکم خاں نے ایرانی شناسا بہت کے خلاف بہت زیادہ زمین تیار کر لی تھی۔ غالباً لندن جانے کا اصلی باعث وہاں مالکم خاں اور لمبٹ کی موجودگی تھی۔ ۱۸۹۷ء میں وہ لندن پہنچ گئے اور برائون کہتا ہے کہ اس کی ملاقات پہلی مرتبہ قسج سے الینڈ پارک میں مالکم خاں ہی کے مکان پر ہوئی تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے چند جلسوں میں ”ایران کے خوفناک عہد“ کے عنوان سے زبردست تقریریں کیں اور اسی زمانے میں ضیاء المآفقیں کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے بہت سے اقتباسات بعد کو النار میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ تمباکو کے خلاف علماء کا فتویٰ ایران میں شائع ہو چکا تھا اور اس فتوے کا یہ اثر ہوا تھا کہ خود شاہ کے محل میں شاہی قلیان کے لئے تمباکو میسر نہ آتا تھا۔ شاہ کو پہلی دفعہ پبلک کی آواز سے مجبور ہو کر اس ٹھیکے کو منسوخ کرنا پڑا اور بلاشبہ قسج کی یہ پہلی فتح تھی۔ علاوہ ازیں یہ فتح علماء کے لئے بھی تھی۔ ضیاء المآفقیں کے صفحات پر قسج اپنے شدید ترین جذبات کا اظہار

کہہ رہے تھے اداس میں شبہ نہیں کہ طہران میں شیعہ کی آواز کی گرج شاہ کو لرز رہی تھی، یکم اپریل ۱۹۷۹ء کی صبح سے شیعہ کی چند سطریں نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

”جب یہ بادشاہ، یہ زہر ملا سانپ، یہ گناہگار سلطنت ایران پر مسلط ہوا، اس نے آہستہ آہستہ عمار کے حقوق میں دست اندازی کرنی شروع کی، ان کے رہنے کو گھٹانے لگا، ان کے اخراجات کو کم کرنے لگا تاکہ خود مطلق العنان ہو کر حکومت کرے اور اپنے ظلم و تعدی کے دائرے کو وسیع کر سکے..... مگر حق باطل کے مقابلے میں بلند ہوا اور اس نے شاہ کے ظلم کو کھل ڈالا جس طرح کہ ہر ظالم کا ظلم کچلا جاتا ہے۔

لے اسلام کے رہناؤ، میں سچ کہتا ہوں کہ تم نے اپنے غم و استقلال سے اسلام کے وقار کو بڑھا دیا ہے، تم غیر ملکوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ اصل طاقت تمہاری ہے جس کو وہ نہ دبا سکتے ہیں نہ نظر انداز کر سکتے ہیں مگر خطرہ سخت ہے اور حالت نازک ہے اس لئے کہ شیطانوں نے اتحاد کر لیا ہے اور اب وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے اس پر تے ہوئے ہیں کہ اس گنہگار (شاہ) کو ہکا کر عمار کو خارج البلد کر دیا جائے۔“

یہ مضامین وہ عموماً ”سید“ یا ”حسینی سید“ کے نام سے لکھا کرتے تھے اور جیسا کہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ الفاظ کی سختی، دہشتی اور تلخی میں ان کا قلم کچھ کفایت شمار نہ تھا! ان کے غم اور حوصلے کی اب یہ حالت تھی کہ ایک موقع پر انھوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ ”ان بادشاہوں کا تخت سے اتارنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ پائوں سے جوتے اتارنا۔“

تقریباً ڈیڑھ سال تک اس طرح لندن میں مشغول رہ کر وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں داخل ہوئے یعنی ۱۹۹۲ء میں سلطان عبدالحمید خاں کی دعوت پر لندن سے قسطنطنیہ چلے گئے۔ وہاں سلطان نے شیعہ کے لئے ۵۰ پونڈ ایوارڈ فیض بھی مقرر کر دیا اور ان کی مدارات میں بہت زیادہ توجہ کا اظہار کیا لیکن عبدالحمید کا شیعہ کو قسطنطنیہ بلانا ایک خاص پالیسی کے تحت تھا۔ عبدالحمید خاں اپنے تخت و تاج کی حفاظت کے لئے اتحاد اسلامی کا ایک قلمہ تعبیر کرنا

چاہتا تھا۔ خلافت اسلامی کا اشتہار دے کر وہ دنیا کی عقیدہ مندی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یورپین دول کی جانب سے جو خطرات اس کے گرد پیش بڑھتے جاتے ہیں انکا علاج صرف یہی ہے کہ اسلامی ممالک کی سرحدیاں اس کے ساتھ ہوں۔ چنانچہ ان ہی منصوبوں کے تحت میں اس نے شیخ کے اثرات سے کام لے کر کہہ میں ایک انجمن کی بنیاد رکھوا دی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ شیخ کو اپنے زیر اثر رکھ کر ان کے اثرات کو جو عالم اسلامی میں مسلّمہ تھے اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں جب شیخ کے ساتھ اس کی توقعات بہت زیادہ وابستہ تھیں عبدالحمید خاں ہر موقع پر ان کے بہت بڑے عامی و مددگار کے بھیس میں دنیا کے سامنے آتا تھا۔ جب ناصر الدین شاہ نے چاہا کہ شیخ کی آواز اس

ذریعے سے بار بار دربار خلافت میں اس امر کی تحریک کی کہ شیخ چنانچہ عبدالحمید خاں نے ایک دن شیخ سے کہا کہ شاہ ایران

ایران آپ سے بہت خوفزدہ ہیں اور شیخ نے بھی سلطان کی خاطر یہ یہ۔۔۔ کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے میں شاہ ایران کو معاف کرتا ہوں۔ لیکن تیر شیخ کے ہاتھ سے پہلے ہی نکل چکا تھا اور وہ شرارہ ایران میں گر چکا تھا جس نے ناصر الدین کی حزن سہی کو جلا دیا۔ تاہم اس واقعے سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ شیخ اور خلیفہ کے تعلقات اس وقت کیسے تھے اس کے بعد بھی جب ناصر الدین شاہ قتل کر دیا گیا تو حکومت ایران نے شیخ اور بعض دیگر اشخاص کو ترکی سے گرفتار کر کے لیجا نا چاہا لیکن سلطان عبدالحمید خاں نے اوروں کو تو گرفتار کر دیا لیکن شیخ کی گرفتاری کی اجازت نہ دی۔ شیخ نے اس موقع پر خلیفہ کی حکومت سے پناہ نہیں مانگی۔ انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی بلکہ غالباً وہ اس لئے مطمئن بیٹھے رہے کہ وہ سلطان عبدالحمید خاں کے منصوبوں سے بیگانہ نہ تھے اور جانتے تھے کہ سلطان کو ابھی ان کی خدمات کی ضرورت ہے۔

کہہ کی انجمن ام القریٰ کو سلطان اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے تھے اور حجاز و عراق میں شیخ کے اثرات سے کام لیا جا رہا تھا۔ لیکن بہت جلد سلطان عبدالحمید خاں کو شیخ کی رفاقت

سے چھوٹے ہو جائے گا۔ درحقیقت شیخ کا سیاسی و مذہبی عبد الحمید کی پالیسی کا باطل مخالف تھا جو بالکل غلط تھا۔ خلافت کے نام سے عالم اسلامی کی ہمدردیاں اپنے تخت و تاج کے ساتھ وابستہ کر کے ترکی کو یورپین دول کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور شیخ اول ہی سے ہر ایک تاج و تخت کے دشمن بن گئے۔ ان کا اتحاد اسلام بالکل دوسرے معنی رکھتا تھا۔ وہ ہر جگہ شہنشاہیت اور مطلقیت کے خلاف جذبات ملی کو بیدار کرنا چاہتے تھے اور ممالک اسلامی کی بیداری کو اپنے عالمگیر اتحاد اسلام کا سنگ بنیاد بنانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک تمام اسلامی ممالک شخصی حکومتوں کے جبر و ظلم سے آزاد نہ ہوں گے آپس میں ایک دوسرے سے کوئی عملی ہمدردی نہیں کر سکتے، اس لئے ان کو کوئی دلچسپی عبد الحمید خاں کی تحریک کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ یورپ نے جس چیز کا نام چین اسلامزم رکھا وہ عبد الحمید خاں کا تیار کیا ہوا ایک بھوت تھا جس نے اس وقت کی سیاست کے لحاظ سے بعض یورپین دول کے دفاتر خارجہ کی فینڈس حرام کر دیں مگر یورپ میں جمال الدین کے چین اسلامزم پر کوئی عمیق نظر نہیں ڈالی گئی بلکہ ان کو صرف اسلامی ممالک کا ایک فتنہ پر دازا یورپین اثرات کا دشمن اور بادشاہوں کی بادشاہت کا مخالف سمجھا گیا۔ اس کے آگے بہت کم لوگوں کی نظر گئی اور مجھے شبہ ہے کہ خود براؤن اور بلنٹ بھی شیخ کی پروا و خیال کے ساتھ دور تک نہیں چل سکے۔ بہر حال یورپ کی اصطلاح میں خلافت اور چین اسلامزم کا جو مفہوم سمجھا گیا تھا شیخ اس سے بہت بلند، بہت دور اور بہت الگ جا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عبد الحمید خاں بہت جلد ان سے مایوس اور بدگمان ہو گئے اور شیخ کی زندگی کا آخری زمانہ قسطنطنیہ میں ایک گم نام قیدی کی طرح گذرا۔

”بیوک مجاہد شیخ جمال الدین افغانی کے عنوان سے اخبار وطن (قسطنطنیہ) میں چند سال ہوئے شیخ کی سیرت پر ایک مضمون شائع ہوا تھا گو شیخ کے سوانح نگاروں نے ان کی نظر بندی کی تفصیلات بیان نہیں کیں لیکن اس مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ کو عبد الحمید خاں نے اس بنا پر قید کر دیا تھا کہ خلیفہ کے صیغہ جاسوسی نے اس کو یہ اطلاع دی تھی کہ شیخ سلطان

کے بھٹ ساڈھیں کر رہے ہیں۔ اور یہ روایت بہت زیادہ قرین قیاس ہے اس لئے کہ عبدالغنیوں کی سیاست کا اس زمانے میں ہی رنگ تھا کہ وہ اپنے سایے سے بھی ڈرتے تھے اور شیخ کے متعلق شبہات کا نہ پیدا ہونا چاہیے ہونے سے زیادہ تعجب انگیز ہوتا۔ بہر حال اس زندگی کی مختصر روداد ختم ہوئی ہے۔ میں نے شیخ کے علم و فضل، قرآنی مشاغل، فلسفیانہ خیالات، عقائد مذہبی اور ان کی سیرت کے بہت سے ضروری پہلوؤں کے لئے ان مختصر صفحات میں گنجائش نہ پائی اور نہ میں اپنے سننے والوں کو بہت زیادہ تھکانا چاہتا ہوں۔ وہ خبریں سب اپنے موقع پر بیان ہوں گی، بار بار بیان ہوں گی، ہزار دفعہ بیان ہوں گی، شاید کہ شیخ کی زندگی کا کوئی پہنچ جائے! میرے پاس ان کے مضامین اور ان کے خطوط کا ایک ایک دھپ علمی و دعوت کا سامان مہیا کرے گا، لیکن اس کے لئے

ایران میں جو مہمانی سختیاں شیخ نے برداشت کی تھیں ان کا بہت زیادہ پرہوشکا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ایران سے آنے کے بعد پھر وہ اپنی کھوئی ہوئی صحت کبھی حاصل نہ کر سکے۔ قسطنطنیہ میں وہ اکثر بیمار رہتے تھے اور بالآخر دورانِ نظر بندی میں ان کو سرطان کا لا علاج عارضہ لاحق ہوا۔ اس مرض کے سلسلے میں تین مرتبہ ان کے چہرے اور گردن پر عمل جراحی کیا گیا، لیکن اپنے رب کے پیام پر لبیک کہنے کا وقت آچکا تھا۔

۹ مارچ ۱۹۷۹ء کو اس مجاہد کی زندگی کا کام ختم ہو گیا اور قسطنطنیہ کی سرزمین پر اس نے اپنی آخری منزل کو پایا۔ اب یہ بحث دور از کار ہے کہ جمال الدین کو عبد الحمید خاں نے زہر دلوادیا تھا یا نہیں۔ جتنا کام ازل نے ان کی سپرد کیا تھا وہ اس کو انجام دے گئے، دنیا والے اب جس قدر جی چاہے اس پر تنقید و تبصرے کے دریا بہا دیں، لیکن بیداری مشرق کے اس بہت بڑے پیامی کا نام اس وقت تک دنیا میں روشن رہے گا جب تک کہ دنیا آباد ہے۔ اہل نظر کے لئے یہ ایک سبق آموز داستان ہے۔

نشانِ طاش کے قریب ایک قبرستان میں شیخ کی قبر عرصے تک بے نشان رہی، انکے

جانبہ کے ساتھ بھی ۲۰ آدمیوں سے زیادہ نہ تھے، لیکن دنیا ان کو بھولی نہ تھی۔ ہندوستان کا نوڈر
 ہی کیا کہ ہم خود اپنے ملک کے مشاہیر کو مرنے کے بعد ایک ہفتے کے اندر بھول جاتے ہیں، لیکن قہج
 تو یہ ہے کہ سچ کی زندگی کا زیادہ سرمایہ مغرب میں محفوظ رہا اور عبد الحمید کے بعد ترکوں نے انکی
 آخری آرام گاہ کو پھر ڈھونڈھ نکالا۔ ایک امریکن کرہ وپتی نے ان کی قبر کے لئے سنگ مرمر کا
 ایک خوبصورت پتھر تیار کر کر بھیجا تو ایک نوجوان ترک نے ایک غیر ملکی کی اس فیاضی سے متاثر
 ہو کر قسطنطنیہ کے ایک اخبار میں لکھا کہ ۱۔

”میں نے ایک اخبار میں پڑھا ہے کہ ایک امریکن مسٹر آریں نے اس بڑے

مسلمان عالم کے لئے ایک نہایت شاندار سنگ مرمر کا مزار بنایا ہے۔ یہ امریکن کرہ وپتی

ہے مگر اس کی تازہ ترین قد رناسی نے نہ معلوم کیوں میرے دل میں مسرت اور

افسوس سے ملی ہوئی ایک حس پیدا کی۔ جمال الدین افغانی کے لئے ایک محترم و شاندار

مزار کا بنایا جانا حقیقتاً ایک ایسا اچھا کام ہے جس سے روح تسلی پاتی ہے۔ جمال الدین

اپنی تمام زندگی میں دنیاوی جاہ و جلال سے بے پروا رہا اور اپنی متواضع زندگی کے

شایان اسی کو سمجھا کہ اپنی قبر کے لئے دو گز زمین سے زیادہ نہ لے۔ اس میں فراعنہ مصر کا

غور نہ تھا کہ اپنی لاش کی حفاظت کے لئے آہرام بنوائے۔ اس لحاظ سے ایک محترم

مزار کا بنایا جانا اس کے اعزاز میں کوئی اضافہ نہیں کرتا، مگر انصاف شرط ہے۔ کیا

اس کی نگار کی مرمت کے لئے اس قدر اہتمام بھی اس کے مداحین پر لازم نہ تھا؟...

.... میں اس سے تو خوش ہوں کہ جمال الدین کا مزار اس کی ایک مادی یادگار

ہوگا مگر میرے قلب کے ایک گہرے اور مغزور گوشے میں ایک خیفہ ٹھیس لگتی ہے

اور میرا دل سوال کرتا ہے کہ جمال الدین کے مزار کو ایک ترک ایک افغان یا ایک

ایرانی نے (جسے جمال الدین کے ایرانی ہونے پر بہت اصرار رہتا ہے) کیوں تعمیر

نہ کرایا؟

یہ تو ایک ترک کا جذبہ تھا، میں اپنے ہم وطنوں سے کیا کموں۔ ان میں سے کتنے ہیں جو
 تختہ چیلے ہیں اور وہاں کسی جمال الدین کی قبر پر دو پھول چڑھانے کا ارادہ کرتے ہوں۔
 اپنے آخری لمحوں میں جب زبان بندھی اور چند آنسو بہانے والے دوست بستر مرگ
 کے قریب بیٹھے تھے، اس نے ہاتھ کے اشارے سے حلقہ بنا کر کہا تھا کہ ”میں مرجاؤں گا اور
 میری آنکھیں اسی طرح کھلی رہیں گی جس طرح تم دیکھتے ہو۔ جو الفاظ شیخ نے اپنے مرنے سے چند روز
 پہلے اپنے ہمبے سے ایک دوست کو کہے ان ہی کو میں ان سطور کا خاتمہ بناتا ہوں کہ وہ ان کے
 آخری جذبات کا بہت دردناک مرقع ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ۱۔

”من لبر موقے ایں نامہ را بدوست عزیز خود می نویسم کہ“

از ملاقات دوستان خود محروم نہ انتظار نجات دارم نہ امید جہ

مقام بیکشتہ شدن متوحش، خوشم برائیں صبر و خوشم برائیں کشتہ

آزادی نوع کشتہ می شوم برائے زندگی قوم؟

مجاہد حق کی یہ آواز حق تھی اور یہ جذبہ عالی تھا جو آندھی بن کر اٹھا، بکلی بن کر چکا اور
 اس طرح گر جا کہ مشرق کی سوتی ہوئی دنیا کروٹیں لینے لگی۔ آج وہ نہیں ہے مگر اس کا پیام
 باقی ہے۔



مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط (قاضی عبدالغفار صاحب کے نام)

Chhindwara,

(C. P.)

۱۵ دسمبر ۱۹۱۵ء

برادر عزیز - السلام علیکم -

زندہ رہو - خوش رہو - تمہارا کام روز دل کو خوش کرتا ہے -

کیا بادۂ گلگوں سے سرور کیا دل کو

داتا رکھے آباداں ساتی تری محفل کو

پہلے تمہارے سوالات کا جواب دیتا ہوں پھر راستے کی مختصر سی سرگزشت سناتا ہوں شرائط
یہاں بھی بھنبہ وہی ہیں جو لینڈٹون جاتے وقت غازی آباد اسٹیشن پر صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ کی
طرف سے موصول ہوئے تھے - یہاں کی آب و ہوا اچھی ہے مگر ہم جب یہاں پہنچے تو خلاف وقت
کچھ بارش ہو رہی تھی - غالباً اسی کے باعث میرے اعضاء میں پھر درد ہو گیا اور گواہ کم ہر گھنٹوں
میں اور کسی قدر کمزور رہی باقی ہے - حکیم صاحب نے جو ب گل آکھ کا استعمال بتایا تھا - اسے پھر
جاری کیا ہے مگر بظاہر اس سے فائدہ نہیں ہوا - چند دنوں بعد پھر رجوع کروں گا - پیشاب دن کو
تو کم آتا ہے ' فجر اور ظہر کے درمیان ایک یا دو بار ' ظہر سے مغرب تک اور بعض دن عشاء تک ضرورت
نہیں ہوتی - شب کو البتہ کوئی تین بار آتا ہے مگر دوبار تو معمول بھی تھا - بظاہر شکر نہیں آتی -

گلگتے کی زندگی کے شعلہ جو تم لکھتے ہو اس پر مجھے ذرا تعجب نہیں - عجب ملک ہر مسلمانوں
میں سخت نا اتفاق ہے - حسد اور کینے کی شدت ہے - محسنوں کا احسان مانتا کجا الٹا پریشان

کرتے ہیں۔ جس سے اندک لالچ والے پھر بھی ہونہار ہیں۔ ان سے ضرور ملتے رہنا اور چونکہ ہمارا انحصار
 زیادہ تر آئندہ نسلوں پر ہے اس لئے ان کو قومی سانچے میں ڈھالتے رہنا۔ من منڈ کے متعلق
 واقعات سے اپنے کو کما حقہ آگاہ کر لو اور مسلمانوں کے مجوزہ کالچ کی گزشتہ تاریخ سے۔ افسوس
 ہے کہ شمس الہدیٰ نے اب تک کچھ نہیں کیا اور اس کم نجت دہلی والے مولوی کو کہہ کر مدرسہ بھی
 تباہ کیا۔ ہو گلی کالچ میں فدا علی خاں رام پوری کالچ کے ایم۔ اے میرے کلاس فیلو اور عزیز
 دوست عربی کے پروفیسر ہیں ان سے خصوصاً جاکر گاہے گاہے مل لیا کر دیا تو ان کو انھیں بلایا
 کرو۔ سلطان مستقل شخص ہے اس سے ضرور دوستی ہو گئی ہوگی۔ مگر بہاری بے شکنتے کو اس پر
 کیا فخر۔ رسول اصول کا بچا ہے اور حبیب الرحمن بھی مگر یہ لوگ بھی کھلتے کے: نرات سے محفوظ
 نہیں ہیں۔ بہر حال ان سے مدد ملے گی۔ میرا ایک دوست محمد
 غالباً ملاقات ہوئی ہوگی۔ حسین الدین مرزا گھاگرے والے کا
 ملتے رہنا۔ خدا کرے کم نجت..... کا اس پر زیادہ اثر ہے۔

پیشتر ڈپٹی کلکٹر نہایت سچے مسلمان ہیں ان سے ملتے رہنا۔ ان کے بچے حبیب الدین بہت
 شبہ کرتے ہیں مگر مولانا خود بالکل غیر مشتبہ ہیں۔ کو لوٹے میں حاجی انیس صاحب دہلوی
 معروف بہ پٹیلے اے ان بزرگوں میں ہیں کہ اگر ہندوستان میں ایسے دس میں ہوتے تو
 ہماری حالت اس قدر زبوں نہ ہوتی۔ اس قدر فیاض، حیرت انگیز، محب قوم بلکہ ہمدرد نبی نوع
 انسان بہت کم لوگ ہیں۔ اللہم زد و فرد۔

Haonoo Bhayya اور Uncle Shwaraaf سے ملاقات ہوئی یا نہیں۔

دونوں ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ حسن تو سنا ہے جنوری میں مستعفی ہو کر پتے میں پرکٹس کریں گے۔
 غیر جمعی میں دھاک خوب بٹھا دی ورنہ ہر سال ساٹھ ستر ہزار کا نقصان اٹھانا پڑا جسٹس شرف الدین
 بھاپارے زیادہ قابل نہیں مگر وضع کے پابند اور بہت خلیق ہیں۔ یہ پٹنہ ہائی کورٹ کے جج ہو کر
 جائیں گے۔ حسن نے اس شرط پر جمعی قبول کی تھی کہ پٹنہ میں ہائی کورٹ ہو تو ضرور بھیجا جاؤں۔

گھنٹوں کے ساتھ دھڑے کا ایسا سہانہ علی نام بھائی کے ساتھ۔ مؤخر الذکر کو میرے علم میں قتل کرنے کے بعد میں نے کراہی اور ڈنگ نے بھی باوجود اس قدر دقتی کے اور باوجود ان خدمات کے جو علی نام نے دکھائیں صرف جی پیش کی۔ لطف یہ ہے کہ خود ان کے نے ان کے خلاف کارروائی کی۔ یہ وہ شخص ہے جسے انہوں نے اپنے سے پہلے *Knighthood* ملا دی تھی۔ مل جزا الاحسان الا احسان۔

رستے کی کیفیت سنو۔ پہلے اطلاع شروع نومبر میں ملی تھی کہ تیار رہو۔ ایک دن پہلے اطلاع دی جائے گی۔ اسی وقت روانہ ہونا پڑے گا۔ ہم نے شروع اکتوبر ہی میں لکھ دیا تھا کہ ہمارا الاؤنس بے باقی کر دینا ہو گا اور زار راہ کا انتظام کرنا ہو گا ورنہ ہم دقت مقررہ پر نہ چل سکیں گے۔ اب اطلاع پاتے ہی پھر اس کے متعلق یاد دہانی کر دی مگر باوجود سرکاری تار کے اور ہمارے تار کے ہمارا الاؤنس ۲۰ دن کا ۲۰ نومبر تک نہ مل سکا۔ دو دن بعد لنسٹون پہنچا اور وہاں سے یہاں آیا۔ بھلا ہو ایک *Old boy* کا کہ ان سے قرض لے کر وہاں کے حسابات چکائے اور وہاں کے نوکروں کی تنخواہ ادا کی۔

سفر خرچ کی کیفیت سنئے کہ حکم ایسے خزانے کے نام دیا گیا جو عالم وجود میں بھی نہ آیا تھا یعنی *Lansdown Treasury*۔ خزانہ پاؤری میں ہے جو ضلع گریموال کا صدر مقام ہے اور پیدل کم از کم دو دن کی راہ ہے۔ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو جس کے متعلق ہماری ڈاک کا دیکھنا تھا فوجی افسروں کی معرفت بنیے سے روپیہ قرض لینا پڑا ورنہ ہم لوگ چل بھی نہ سکتے۔ اس خوش انتظامی کے مدد سے جانے۔ مقام کا نام پہلے سے نہیں بتایا گیا تھا۔ ہم نے جب لکھا کہ موسم کے متعلق تک ہم کو علم نہیں ہے۔ جاڑوں وغیرہ کے کپڑے سب دہلی یا رام پور میں دوسرے اس کا فیصلہ کرنا ہے کہ معاہل و عیال کے جائیں یا بلان ان کے۔ اس کا انحصار مقام کی نوعیت اور دوری پر ہے۔ تو جواب ملا کہ موسم یا رام پور میں دہلی جیسا ہے۔ اس سے خیال ہوا کہ مقام کو سات پردوں میں رکھا جائے گا۔ لیکن یکایک ۱۳ نومبر کو اطلاع ملی کہ ۲۰ نومبر

کو چند شاخہ جان ہو گا۔ یہ معلوم وہ رازداری مادر جمیلی زہرا گھنے کا نوش (کماں سے چلا ہے بس
 اطلاع کے غنے پر ہم نے چند کارڈ دوستوں کو ڈال دئے کہ فلاں راہ سے فلاں وقت گزریں گے۔
 منہ نے بلا اشتراک سب کو بھیج دیا اس لئے کہ اس میں بظاہر کوئی مضائقہ نہ تھا۔ الہ آباد میں
 گاڑی سات گھنٹے بعد ملتی تھی اس لئے بھائی غمورے ہوساواٹ کو لکھ دیا کہ براور انم کھانا
 تمہارے ساتھ کھائیں گے۔ والدہ بیوی اور بچوں کے لئے ایک گاڑی کا انتظام کر دینا کہ الہ آباد
 جانوں نے نہیں دیکھا ہے دیکھ لیں۔ چیتا سنی کو لکھ دیا کہ تم سے 'سپرسے' اور پنڈت جی سے
 بھی ملاقات ہو جائے گی۔ چلنے سے ایک دن پہلے اطلاع ملی کہ۔

ہدایت ملی ہے کہ ہماری پارٹی کا کوئی تنفس کسی انشیشن کے باہر نہ
 نہیں آیا تھا یعنی جو حکم آیا تھا اس میں یہ شرط نہ تھی۔ اس لئے ہم
 ہم نے صاف کہہ دیا کہ گورنمنٹ نے ہم کو نظر بند کیا ہے ہمارے متعلق ہیں۔
 مگر ہمارے متعلقین بفضلہ تعالیٰ آزاد ہیں وہ کسی شرط کو نہیں مان سکتے۔ تاہم ہم نے ارادہ کر لیا کہ
 الہ آباد انشیشن پر رہیں گے باہر نہ جائیں گے۔

ہم ۲۰ کو ۱۰ بجے صبح کے روانہ ہو کر تانگوں میں چلے اور ۲ بجے سہ پہر کو کوٹ دوارہ پہنچے۔
 یہاں صبح ہی سے میری ہمیشہ (والدہ فاروق) مہ عثمان کے اور شوکت کے بچوں کے ملیں۔ دہلی
 سے صادق اور سید علی بھی آئے تھے۔ ہمارے ماموں صاحب کے خلیفہ نوشہ میاں صاحب اور
 ہمارے ماموں زاد بھائی بھی آگئے تھے۔

۶ بجے شام کو ریل چلی۔ ۷ بجے نجیب آباد پہنچے۔ حالانکہ ہم نے کسی کو اطلاع نہ دی تھی مگر
 لوگوں کو معلوم ہو گیا تو رات کے ۲ بجے تک لوگ جوق کے جوق آتے رہے اور ملتے رہے نجیب آباد
 میں چند اور اعزاء اور احباب دہلی اور علی گڑھ سے آگئے۔ ۲ بجے صبح کے ان کی میت میں مراد آباد
 کی طرف روانہ ہوئے۔ ۴ کے قریب پہنچے۔ وہاں آنریبل سید رضا علی، یعقوب، مسعود، عبدالسلام
 وغیرہ تمام احباب ملے آئے۔ رام پور سے میری اہلیہ معہ حمیدہ اور گلزار اور زائدہ کے آگئے تھے وہ

ان کے علاوہ رام پور سے بہت سے عزیز اور دوست آگئے تھے۔ جن و سواتے
 کوٹہ اور دہلی پر اثرنا شروع ہو گیا تھا۔ مراد آباد پر اور نازل ہوا۔ رام پور صبح کے ۵ بجے پہنچے۔
 وہاں پر بھی ہجوم تھا۔ حالانکہ گاڑی تین چار منٹ سے زیادہ نہیں ٹھرتی تھی۔ ہمارے لئے ایک
 Composite Carriage تھی اس میں تو ہم نے عورتوں کو سوار کرا دیا تھا۔ خود معہ احباب
 کے ایک آٹریگی خالی کیرج کو بالاب بھر دیا تھا۔ بریلی پر علی گڑھ کے احباب رخصت ہوئے۔ انصاری
 رام پور سے مراد آباد آگئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن دہلی سے نجیب آباد آگئے تھے اور مراد آباد میں
 انصاری کے ہمراہ دہلی چلے گئے۔ بریلی میں بھائی دودھ وغیرہ چائے لے کر آئے تھے شاہجہانپور
 میں بھی احباب لے اور سندیلہ میں بھی۔ لکھنؤ پہنچے تو گاڑی خلاف معمول پل کے اس طرف پٹیارام
 پر رکی مگر اس کے رک جانے کے بعد بہت سے احباب مع تقدس مآب مولانا عبدالباری صاحب
 قبلہ مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی بذللہ تشریف لائے۔ قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ معلوم
 ہوا کہ خواہش نہ تھی کہ لوگ کثرت سے ملیں مگر چونکہ یہ منشا نہ ہمارا تھا نہ ہمارے دوستوں کا تھا کہ
 ایک جم غفیر کو نمائش کے لئے جمع کیا جائے اس لئے وہی اصحاب آئے تھے جن کو ہم نے اطلاع
 دی تھی یا دہلوائی تھی۔ کانپور سے 'علی گڑھ سے اور بارہ بنکی سے احباب آئے تھے۔ راستے کے لئے
 کھانا 'میوہ اور مٹھائیاں اس کثرت سے آئیں کہ دونوں درجے بالاب بھر گئے اور بیٹھنے کو جگہ
 نہ رہی۔ بلا مبالغہ تین چار سو آدمیوں کے لئے کھالے کا سامان کافی تھا۔ راستے بھر لوگوں کو کھلاتے
 آئے پھر بھی ختم نہ ہوا اور یہاں تین چار دن کھایا اور بعض چیزیں تو اب تک ساتھ دے رہی ہیں۔
 طبع یہ ہے کہ کھانوں کی نوعیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض رہنمائی نہیں کرائے گئے تھے،
 بلکہ سوچ سوچ کر یہ منے کی چیزیں خود تیار کی تھیں۔ مولانا عبدالباری صاحب قبلہ مدہ متعدد
 احباب لکھنؤ و بارہ بنکی و علی گڑھ کے راستے بریلی تک ہمراہ تشریف لائے۔ مولانا الہ آباد کا قصد
 رکھتے تھے مگر وہاں جاتے تو ایک دوست چند دن کے بغیر نہ چھوڑتے اس لئے راستے ہی سے
 واپس ہو گئے کیونکہ زیادہ قیام کے لئے وقت نہیں بچا سکتے تھے۔ مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی

قرون مٹی کے مصلحوں کے سے بزرگ ہیں۔ ان پر جب کیفیت طاری تھی، ان بزرگوں کی تحمیل ملکہ ہم کٹر مساکرتی تھی۔ برادریم ہزاروں سپاہی اور افسرانی اپنی قوم اللہ ملک کے لئے بے دریغ جانیں دے رہے ہیں۔ جو اپنے ملک و قوم اور مذہب کے لئے سرکشت نہیں ہیں وہ بھی ایک حقیر سے مشابہت کے لئے جانیں دے رہے ہیں۔ ہم نے جن کا اس قدر غلطہ چارواں ملک عالم میں ہے ابھی کیا کیا ہے کہ مولانا عبد القہاری صاحب اور مولانا محمد ابراہیم صاحب جیسے بزرگ ہمارے استقبال فرمائیں اور تحمین و آفریں کریں یا ہمارے بے شمار دوست اتنی محبت کا اظہار کریں۔ صرف یہی تو ہوتا ہے کہ اپنے وطن اور گاروبار کو خیر باد کہنا پڑا لیکن یہ سنت رسول ہے۔ فجر کے فرائض۔

ہر مسلمان اپنے اوپر لازم سمجھے اور ہجرت کو گوارا نہ کرے، یہ کس قسم کا،
میں جبکہ ہمارا پروردگار ہم کو تشفی و تسلی دے کہ واللہ علی نصر ہم لہ۔

حق الا ان یقولوا ربنا اللہ (پروردگار تو نے سچ فرمایا ہے۔ تو ہی ہمارے)

غیر انتہا حیرن ہے۔ برادریم اس سفر سے پیشتر بھی اور اس سفر میں اور ہر جگہ جو خاطر و مدارات ان نظر بندوں کی ہوئی ہے اس کے بعد کس کو شک ہو سکتا ہے کہ علاوہ اس اجر عظیم کے جسکی بشارت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ و صحابہ وسلم (روحی خداک یا رسول اللہ) دینے ہم کو آئے تھے جو تہ عاقبت انھیں کو لے گا خود اس دنیا میں عزت و آرام بھی پابندی قرآن و حدیث میں ہے۔ معلّم کے والد (میرے خسر) نے کیا خوب کہا ہے

غفلت بڑے بڑے ہیں فرے راہ عشق میں

چل تو سہی۔ بڑھا تو قدم۔ دیکھ تو سہی

ناظر، وسیم، ولایت کو ہم الہ آباد تک لے گئے کہ، گھنٹے وہاں بھی خوب گزریں گے اتفاقاً راستے میں آرنیبل ڈاکٹر سپر دے بھی ملاقات ہو گئی کیونکہ وہ ہم سفر تھے اس طرح الہ آباد کی (قدم بندی کا بھی صدمہ نہ ہوا۔ الہ آباد سے چندا شیشن آگے مولانا رفیع صاحب (والد مہمور) لے اور چند اور اصحاب بھی لے۔ آگے چل کر خود مہمور اور کھنڈ کے سید مہمور احمد صاحب بھی لے۔ آگے چل کر

اس وقت کے ایشین پر جاتے ہوئے پرندوں کے پر جلتے ہیں۔ پلیٹ فام ٹکٹ بند اور ایشین
 کے ساتھ ساتھ ہم کو گھنٹے سے قبل ہی وہاں سے کہیں اور لے جائیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ پولیس
 کے سوا سوا آدمی پرہ دے رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ الہ آباد کے لوگوں نے ایشین پر ہیں
 garden دینے کی اجازت چاہی تھی مگر اجازت نہ ملی۔ مجبور ہو کر طور کچھ میوہ اور
 کتا ایشین ماسٹر اور پولیس کو دے آئے کہ اسے دیکھ بھال لو۔ اگر کوئی چیز خلاف قانون دستیاب
 نہ ہو تو ہمیں نظر بندوں کو دے دینا۔ الہ آباد کے ایشین کو سوائے پولیس کے (وردی والے و
 بلاوردی کے) خالی پایا۔ پولیس کے دو افسر ایک وردی میں ایک بلاوردی کے طبقہ یورپین یا یورپین
 سے ملے ہوئے تھے۔ دونوں شوکت کے شناسائی اور ایک تو دوست نکلے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ذات شریفین
 نہایت کروفر کے ساتھ تشریف لائے اور پہلے ایشین ماسٹر سے کہا کہ ان لوگوں کو ایشین سے نکال دو۔
 یہ لوگ ڈاکٹر ناظر الدین من، مسٹر محمد نسیم، مسٹر منظور احمد پیرٹران و سید منظور احمد صاحب بی۔ اے وکیل
 و شیخ ولایت علی صاحب بی۔ اے وکیل تھے۔ میں ان کی سلامت روی اور تہنات کی تعریف کرونگا
 کہ باوجود رخصت تھے اور ایسی کے وہ خاموشی کے ساتھ چلے گئے۔ چلنے سے ہنستہ والدہ نے انہیں بلایا
 اور گے لگایا اور کہا کہ بیٹا ان باتوں سے آزدہ خاطر نہ ہوتا۔ مردان آزمائشوں میں سے بہتے
 ہوتے گزر جاتے ہیں۔ ہم بھی ان سے رخصت ہوئے۔ اس کے بعد وہ ذات شریفین ہماری طرف
 تشریف لائے اور کہا کہ آپ اپنی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ یہ درخواست شوکت کے دوست پہلے ہی
 کر چکے تھے مگر ناکام رہے تھے۔ شوکت نے کہا کہ اس کی آخر کوئی وجہ۔ کمائیں آپ سے کتا ہوں
 آپ ایسا ہی کریں۔ ہم نے جواب دیا کہ ہم وہیں تک پابند ہیں جہاں تک گورنمنٹ کے احکام موصول
 ہو چکے ہیں ورنہ ہم باطل آزاد ہیں اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اتنے لمبے سفر کے بعد ایک تنگ
 جگہ میں مقید ہو کر بیٹھ جائیں۔ ہیں یہاں سات گھنٹے قیام کرنا ہے۔ اس پر صاحب موصوف
 نے کہ نہیں آپ کو ساڑھے پانچ بجے کی ایک گاڑی میں یہاں سے سٹھنا جانا پڑے گا اور وہاں
 چھ گھنٹے تک شب کی گاڑی کا انتظار کرنا پڑے گا جو یہاں سے جلیپور کو ضرور جاتی ہے۔ ہم نے

کما کہ ہم اسے احکام میں یہ داخل نہیں ہے۔ ہمیں احکام ملے ہیں کہ تین بجے کی گاڑی میں الہ آباد پہنچیں اور شب کے دس کی تقریب میں جلیبہ جائیں۔ اس پر وہ بولے کہ نہیں گورنمنٹ نے احکام بدل دیے ہیں۔ آپ کو ابھی جانا ہوگا۔ اس پر ہم نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی احکام اس قسم کے موصول نہیں ہوئے ہیں۔ جو حکم ہم کو ملا ہے اگر ہم اسکی خلاف ورزی کریں گے تو ہم تین برس کی قید باقت اور ایک ایک ہزار روپے جرمانے تک کے مستوجب ہوں گے۔ اس پر فرمایا کہ میں آپ سے کتنا ہوں کہ یہی احکام گورنمنٹ کے ہیں۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ حضور والا کی شناسائی کا یہی ہم کو شرف حاصل نہیں ہے۔ پھر ہم تحریری اور سر حکومت سے مزین احکام کے لئے روانہ ہوئے۔

دبانی ہایت کو کیوں کر قبول کر لیں۔ فرمایا کہ میرا نام *may*

ہوں اور اس اسٹیشن کا چارج میرے پاس ہے۔ میں نے جواب

مگر اس شرف نیاز مندی کے حصول کے بعد بھی ہم سرکاری احکام پر

نہیں دے سکتے۔ اس پر تھکے پن سے فرمایا کہ کیوں بے فائدہ بد مزگی پیدا کرتے ہو۔ میں نے تم سے

منایت نرمی سے کہہ دیا کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں نے جواب دیا کہ اس میں بد مزگی کا سوال کچھ بھی

نہیں ہے اور میں نے اس قدر نرمی سے آپ سے کہہ دیا کہ ہم گورنمنٹ کے احکام کے خلاف کچھ نہیں

کر سکتے۔ اس پر منایت تند و تیز ہو کر فرمایا کہ کیوں اسی راگ کو الاپے جاتے ہو۔ اس پر شوکت نے

آنکھیں دکھا کر کہہ دیا کہ بس اس لمحے میں گفتگو نہ کیجئے۔ اس پر ذرا سہوش میں آئے اور پھر کہا کہ بد مزگی

کیوں پیدا کرتے ہو میں تو منایت نرمی سے کہتا ہوں کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ شوکت نے کہا کہ آپ

کی درخواست معقول نہیں ہے میں بھی آپ سے نرمی سے کہتا ہوں کہ ہم سے تعرض نہ کیجئے اور

یہاں سے چلے جائیے۔ اس پر جاکانہ انداز سے فرمایا کہ تم مجھے مجبور کرتے ہو کہ میں اپنے احکام کی

تعمیل پھر کر اؤں۔ شوکت نے کہا شوق سے آپ ضرور گوشش کریں مگر برادر م ساڑھے تین من

کی لاش اور سوا چھ فٹ کے قد اور ڈیڑھ گز کے سینے والے سے جبر یہ تعمیل احکام کرنا آسان نہیں۔

دیکھ کر بولے کہ میں سمجھتا تھا کہ آپ لوگ *gentlemen* ہیں۔ اس پر میں نے عرض کی

کہتے ہیں کہ آپ بھی *gentleman* ہیں مگر اس "گٹھ" کے اضافے نے بین بزرگوار
 کو کھنکھایا۔ پھر کہنے لگے کہ اب میں جبر پھیل کر اٹھ گا۔ شوکت نے کہا کہ ہم تو کسی رہے ہیں کہ شوق
 سے کوشش فرمائیے۔ اس قدر گفتگو کے بعد دوسرا پولیس انسپکٹر جو دردی میں تھا آیا اور اس نے کہا
 کہ جناب والا اس مسئلہ کو آپ ہیں پر چھوڑ دیجئے۔ مسٹر *Mumay* جن کے initials "P.G." ہیں اور جن کو بقول پولیس انسپکٹر کے *Pig Mumay* کے لقب سے لوگ ملقب کیا
 کہتے ہیں اس موقع کو غنیمت سمجھ کر بیک بنی و دو گوش بدھرتے تشریف لائے تھے اور دھر کو
 واپس تشریف لے گئے۔ ہم سے پولیس انسپکٹر نے کہا کہ کچھ مضائقہ ہے اگر آپ انہیں کا کما کر لیں
 یہ بھی شوکت کا شاسائی تھا۔ شوکت نے جو جواب پہلے انسپکٹر کو دیا تھا وہی اس کو بھی دیا کہ بھائی
 یہ معاملہ ہمارے تھارے بچ کے تعلقات کا نہیں ہے۔ سرکاری احکام کا ہے۔ ہم معذور ہیں اور
 جو آزادی اس نظر بندی میں باقی رہ گئی ہے ہم قدرتی طور پر اس کی پہلے سے بھی زیادہ قدر کرتے
 ہیں۔ ہم ہرگز بلا حکم سرکار کوئی کام اپنے خلاف مرضی نہیں کریں گے۔ دوسرے ہمارے معزز ترین
 احباب کو جس باجی پن کے ساتھ اس شخص نے یہاں سے جانے کے لئے کھلوایا ہے اس کے بعد
 ہم سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے مشہور ترین رہنما اور قائم مقام ہیں۔ جو صدر
 ان کو ہوا ہو گا وہ ہیں محسوس کر سکتے ہیں۔ اس پر پولیس کے دونوں افسروں نے اعتراف کیا کہ اس
 شخص کا طرز عمل نہایت باجیانہ تھا اور علاوہ ازیں اسے اس امر سے کچھ بھی سروکار نہ تھا۔ بلا وجہ
 گھس پڑا اور حکومت جتانے لگا۔ جو پولیس انسپکٹر (*Garvin*) ہمارے ہمراہ کوٹ دوارے
 سے آیا تھا جب وہ موقع پر آیا تو اسے بھی بہت برا معلوم ہوا کہ بلا اس کی اطلاع و مشورے کے
 مسٹر *Pig Mumay* نے دست اندازی کی اور سب خوش تھے کہ خوب منہ کی کھائی اس کے
 بعد ہم *waiting-room* گئے اور وضو کر کے ظہر اور بعد ازاں عصر پڑھی۔ ناز سے فارغ ہی
 ہوئے تو اطلاع ملی کہ شوکت کے پرانے دوست اور میرے بھی تھکے کے "گھرے شناسا" مسٹر
Freemantle کلکٹر الہ آباد ملنا چاہتے ہیں۔ ہم گئے تو ہم سے کہا کہ یہ کیا جھگڑا ہے۔ شوکت

نے تمام کیفیت سنائی۔ اس پر کنا کہ بے دہن دن سے معلوم تھا کہ قمار سے سفر کا پروگرام بیاں سے
 بلا جائے گا۔ یہ معلوم تھیں احکام کیوں نہیں دئے گئے۔ بہر حال میں گھر سے چلتے وقت *Bus*
 (چین سکرٹری) سے ٹیلیفون پر پوچھ آیا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں کو ساڑھے پانچ ہی پر چلنا
 ہو گا۔ ہم نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کے احکام کی خلاف ورزی کا کون ذمہ دار ہے۔ ہم برن کے تحریری
 اور سرور احکام مانیں یا زبانی احکام جو آپ سے سننے میں آئے ہیں۔ اس پر کنا کہ برن کہتے ہیں کہ
 پروگرام تو احکام کا جزو نہ تھا صرف قمار کی سہولت کے لئے ہم رشتہ کر دیا گیا تھا۔ اس پر میں نے کہا
 کہ اگر وہ جزو احکام نہیں ہے تو ہم بیل گاڑی یا گھوڑے پر چھند واڑہ جاسکتے ہیں اور پانچ بجے ماہ کے
 مہے میں پہنچ جائیں تو مضائقہ نہیں، اس لئے کہ اگر پروگرام جزو احکام
 اس قدر حکم ملا ہے کہ ۲۰ کو لینڈ دن سے بلا سفر توڑے ہوئے چھند
Memorandum پر قائل ہوتے اور کنا کہ بہر کیف اب تو یہی حکم ہے۔

سے چین سکرٹری کا دستخط شدہ حکم ملنا چاہئے لیکن چونکہ میں تم سے واقعہ اس میں
 لیتا ہوں کہ تم وہی کہتے ہو جو چین سکرٹری نے تم سے ٹیلیفون پر کہا ہے تاہم اسے ضبط تحریر کر دو تاکہ
 برن تین برس کی قید کرنا چاہیں تو سند ہو اور وقت ضرورت کے کام آئے۔ کہا ہاں مضائقہ نہیں
 ہے میں لکھ دوں گا کہ برن نے مجھے ہدایت کی ہے۔ اس پر میں نے کہا یہ لکھئے کہ گورنمنٹ نے
 ہدایت کی ہے۔ کہا ہاں چین سکرٹری ہی کے دستخط گورنمنٹ کے احکام جاری ہوتے ہیں اس پر
 میں نے کہا کہ یہ درست ہے مگر بیاں تو احکام آپ کے دستخط سے جاری ہوں گے۔ کم از کم حکم
 لغٹ گورنمنٹ کا ہونا چاہئے۔ برن کو بحیثیت چین سکرٹری گورنمنٹ کے احکام پر دستخط کرنے کا حکم ہے
 گر وہ خود حکم دینے کے مجاز نہیں ہیں۔ پچھلا حکم ان کا دستخط گورنمنٹ کی مہر والا ہی منظر ہے کہ لغٹ گورنر
 کی نیچاہ سے یہ حکم صادر ہوا ہے۔ اس پر کچھ عرصے بعد غالباً برن سے ٹیلیفون پر پوچھ کر ایک حکم لکھ کر
 لائے کہ پروگرام بدل دیا گیا ہے۔ آپ لوگ بجائے دس بجے شنب کے آج شام ہی کو ساڑھے پانچ
 پر روانہ ہو جائیں۔ یہ حکم پالنے پر ہم نے والدہ اور بچوں کو اطلاع کرادی کہ گاڑی ابھی جائے گی۔

کی گئی جو *Handbook* کر کے ایک *Handbook* پر بیچ دی گئی تھی اگر چین میں لگ گئی۔
 ترکوں نے سامان اپنے درجوں میں سے جو کالا تھا وہ انپکٹ سے کہہ کر بھر دیا۔ مگر بچہ صاحب انپکٹ
 دہرہ روپ، جینڈون میں ہمارے منبر صاحب کو خط پڑھنے میں مدد دیتا تھا اور ہمراہ جبل پور
 تک منبر انپکٹ (*Handbook*) کے آیا بھٹائے حاجت گیا ہوا تھا بڑی شکل سے چلتی گاڑی میں بیٹھا
 اب اس کے بعد فریٹیل سے ”دوستانہ گفتگو شروع ہوئی۔ جنگ کا ذکر آیا، ترکوں کی
 پالیسی، مصر کے واپس دینے یا نہ دینے کا مسئلہ۔ یہ سب معروض بحث میں آئے۔ ہم نے کہا کہ ہم نہ کہتے
 تھے۔ چار برس سے کامیڈ نے ہمیشہ گورنمنٹ کو یہی بھلیا تھا کہ وکیو سلطان ۳۰ کروڑ ہیں، ہر ملک میں
 پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سے نہ بچاؤ۔ ان کے مذہب سے استہزاء کرو۔ ان کے مقدس مقامات
 کی طرف رخ نہ کرو۔ خلیفہ الرسول خادمِ حرمین شریفین کی محبت و عظمت ہر مسلمان کے دل میں ہونا
 لازمی ہے اور ہے۔ ان سے اچھا سلوک کرو اور ان کے دل کو موہلو تو مسلمانانِ عالم کے دل
 تمہارے ہیں۔ کیا یہ بہترین صلاح و مشورہ نہ تھا۔ مگر سراپڈ و ڈگرے پر گلیڈ اسٹون کا بھوت سوار
 تھا۔ علاوہ ازیں جوتھی کے خفٹ نے انہیں بوکھلادیا تھا۔ اس نے ان دونوں باتوں سے فائدہ
 اٹھایا اور آخری نتیجہ یہ ہوا کہ جوتھی کو تو جنگ سے روک نہ سکے مگر ترکوں کو ہاتھ سے کھو بیٹھے اور
 عالمِ اسلام کو آج ایک سخت بھان میں ڈال دیا۔ اگر بجائے کامیڈ کی ضمانت ضبط کرنے کے ہم میں
 سے چند فلسفین کو مستم خلافت کو بھیجا گیا ہوتا اور ترکوں کے ساتھ رشتہ الفت و اتحاد بھر قائم
 کیا گیا ہوتا اور مصر انہیں واپس دے دیا گیا ہوتا تو آج ردوانیاں، مصر، ایران، عراق و دین میں
 یہ طاقت کیوں ہوتی، سرحد پر کیوں شورش ہوتی اور افغانستان کی طرف سے کیوں کشاکش کا رشتہ۔
 حاکم اگر ناقص بھی نہ دیتے تب بھی خلافت نہ ہوتے اور روس کو سامان جنگ پہنچانے اور وہاں سے
 غلط عمل کرنے میں وقت نہ پیش آتی۔ روس کو قفقاز میں مشکل کا سامنا نہ ہوتا۔ منہ سے جوتھی
 ردوانیاں، فرانس، کولمبیریا و ٹیونس سے فوجیں مگانے میں سہولت ہوتی۔ اگر یزیدوں کو مشرق میں بیگری
 رہتی اور مشرق میں دشمن کا مقابلہ آسان ہوتا۔ اسی سلسلے میں ہندوستان کی سیاست کا ذکر چھوڑا۔

سول سروس کی غور و خیزوں پر دیکھنا باعث ہوا اور خصوصاً ان قوانین و افعال کے متعلق جن کا جواز
 محض جنگ کی وجہ سے ہوا مگر جن کے ذریعے سے سول سروس نے اپنے مقررین سے بدلہ لیا۔ اسی
 پہانے میں میں نے کہا "The war has been a godsend to the civilian - اس پر آپ بدیدہ ہو کر کہا:-

It is not very generous - of you . It is very
 unkind when you know we are losing our brothers
 and cousins in such large numbers . Sir
 has lost 3 sons.

اس کے جواب میں میں نے یقین دلایا کہ میرا اشارہ یوں
 بلکہ ان واقعات کی طرف جو سول سروس کی طرف سے ظہور میں آ
 تعجب ہے کہ ان کو میرا مفہوم سمجھنے میں کیوں کوتاہی ہو سکتا تھا۔ اس پر انھوں نے
 آپ کو ان واقعات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جو جنگ میں پیش آرہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ
 آپ ہمارے لئے کچھ بھی allowance نہیں کرتے۔ شوکت نے اس پر کہا کہ بھائی جان تم نے
 بھی کبھی ہمارے لئے allowances کیں۔ تم ہمیں نظر بند کرتے ہو مگر کبھی اس کا بھی خیال کیا کہ
 اس کا ہماری ماں پر محمد علی کی بیوی پر اور ہماری بہن اور بچوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ نہ علی کی دو
 لڑکیاں یکے بعد دیگرے سخت بیمار ہوئیں اور بچے کی امید نہ تھی مگر ان سے ملنے تک کے لئے نہیں
 جانے دیا گیا۔ ہمارا بزنس تباہ کر دیا گیا اور اس کے بدلے ڈھائی سو ایک کو اور سو روپے ایک
 کو ملے گئے۔ اس وقت ہمارا اور ہمارے بچوں کا خیال نہ آیا۔ جنگ تو تمہاری اپنی تھی پھر
 سول سروس نے اتنی بے حیائی کیوں رد رکھی کہ نصیب نہ منظور ہونے کے باعث جو acting
 allowances کا موقع ہاتھ نہ آیا تو اس کا بھی مساو نہ مانگا اور وصول کیا۔ اسی دوران میں
 Choice of the Turks کے مضمون پر بھی گفتگو ہوئی اور میں نے بتایا کہ جب گورنمنٹ ضابطہ

کئی دنوں میں اسی دن انگلستان کے مشہور ترین *Morning Post and* اخبارات *Daily Telegraph* اسی مضمون کی *loyalty* کی تعریف میں رطب اللسان تھے سول
 سروس کیشن اور ہندوستانیوں کو ۱۵ فی صدی سے کم ٹیکس سول سروس میں ملنے پر گنگوہری۔ اس پر
 انھوں نے کہا کہ یہ بالکل درست ہے۔ اگر حکومت ہمارے ہی ہاتھ میں رہے تو ہمارا مفروضہ غالب ہونا
 چاہئے۔ اس پر ہم نے کہا کہ *self-government* نے کیا نقصان کیا ہے جو بالکل
 ملک حکومت آپ ہی کے ہاتھ میں رہے۔ کہا کہ ہندوستانی ابھی اس قابل نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ
 تم ایسا تاں گو کہ تم ان کو اس قابل کرنا چاہتے ہو کہ وہ خود حکومت کر سکیں۔ ہم بھی اتنا رکے لئے تیار ہیں
 مگر جہان کی سست رفتاری کا مصافحہ نہیں بشرطیکہ اس کا رخ بندرگاہ مقصود کی طرف ہو۔ انھوں
 تو اس کا ہے کہ سول سروس ہماری پالیسی کی مخالفت ہے اور خود کوئی پالیسی نہیں رکھتی۔ کچھ لوگ کہہ کھلا
 ہندوستانیوں کے مخالفت میں اور کچھ ٹالے بالے کرتے ہیں۔ پھر ہم لوگوں کا ذکر آیا۔ کہا تم چند نفوس
 ہو۔ تمہاری آواز ملک کی آواز نہیں ہے *you represent only yourself*۔ اس پر میں نے
 کہا کہ کمری اگر یہ سچ ہے تو پھر وہ ڈیڑھ سو سو باہی پرے چوکی کے لئے تم نے کیوں جمع کر رکھے ہیں
 اور آٹھ آباد کے ہزاروں آدمیوں کو ملنے سے کیوں روکتے ہو۔ قائل ہوئے مگر کہا کہ تم لوگوں کو گمراہ
 کرتے ہو۔ ہم نے کہا کہ خیر تم میں سے تو قائل ہوئے کہ لوگ ہمیں رہنا سمجھتے ہیں۔ اب سوال بڑھ رہی
 اور بھی دہائی ورنہائی کا ہے۔ مگر اس کا فیصلہ کون کرے۔ ایک فرقہ خود غرض تم ایک ہم۔ خود غرضی
 میں زیادہ سے زیادہ دونوں یکساں مگر ہم ملک کی حالت سے واقف ہیں کیونکہ رات دن کالوگوں
 کا ساتھ ہے اور تم ایک دوسری دنیا میں رہتے ہو نا واقف ہو۔ اس لئے تمہارا قول تو کسی طرح معتبر
 ہو نہیں سکتا۔ غرض اسی طرح گنگوہری بیاں تک کہ گاڑی روانہ ہوئی اور ہم رخصت ہوئے۔ سب سائز
 پولیس کے لوگ، انگریز ہندوستانی اور ہمارے دوست مسٹر قمر احمد بی بی، ایل ایل بی بی (علیگ)
 جن کی طرف بعض لوگ وہ شہر منسوب کرتے ہیں ”ہو گئے پاس ایل ایل بی بی میں اگر ہم اب کے
 انجمن غازی پور سے ملنے آئے تھے اس دلچسپ مباحثے سے مستفیض ہوئے۔

مات کو ہم بارہ بجے تک نہ پہنچے گاڑی وہیں تک جاتی تھی۔ نوکرا ترگئے ہم سوتے رہے جب
 دس بجے والی گاڑی الہ آباد سے آئی تو ہم پھر روانہ ہوئے۔ صبح کو جلیپور پہنچے۔ اسٹیشن پر *Mundla*
Supdly Police لے اور *C.P. Government* کے احکام دئے۔ وہ بھی چاہتے تھے
 کہ ہم اسٹیشن ہی پر آمد اپنی گاڑی ہی میں رہیں لیکن ہم نے کہا کہ ہمیں اس قدر آزادی ضرور حاصل ہے
 کہ جیل پور کی سیر کریں اور جب تک اس کے خلاف حکم نہ ہو گا ہم اپنے حقوق کا استعمال کریں گے۔ یہ
 شخص نہایت معقول ہیں۔ خود ہی ایک نہایت نفیس موٹرنگائی جو ”کنبرا پور“ تھی۔ ہم آٹھ دس
 بھر گئے۔ ہم نے خود ہی درخواست کی کہ کوئی پولیس کا افسر ہمارے ساتھ چلے تاکہ رہنمائی بھی ہو اور آئندہ
 کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ کہیں جاکر ”بغادت“ پھیلائی۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہمارے
D. S. P. بلا یونی فارم کے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم کو مڈرنس

ہمارے ساتھ ہوا اور وہ آپ کو جانتے بھی ہیں۔ علی گڑھ کے
 یہ میرے ہم جماعت نکلے۔ خوب سیر دکھائی۔ راستے میں مرزا انور

D. S. P. جو *Hockey* کھیلنے اپنی ٹیم کے ساتھ آئے تھے مل گئے۔ وہ بھی موٹر پر آئے۔ خوب
 گپیں ہوئیں اور ہمارے ساتھ ہی رہے جب تک کہ ہم رخصت ہوئے *Mr. Latham* بھی
 ہمیں رخصت کرنے آئے۔ ان سے بھی گفتگو رہی۔ گڑادی لائق اور ضلیق ہیں اور معقول پسند۔ راستے
 میں ایک مقام *Nanipura* پر گاڑی بدلی جاتی ہے۔ یہاں چند لوگ ملے جو *Mundla*
 ضلع سے ہم نے ملے آئے تھے۔ ترجمان میں جو پروگرام چھپا تھا اس کے باعث جلیپور بھی لوگ
 اسٹیشن پر آئے اور ملے۔ راستے میں متعدد اسٹیشنوں پر لوگ جوق جوق آئے۔ شب کو یہاں پہنچے۔
 محمد عبدالولی خاں ”مجاہد طرابلس“ جو یہاں نظر بند تھے ملے اور چار پلائی۔ چونکہ کوئی شخص حکام میں سے
 رہنمائی کے لئے نہ تھا اس لئے شب کو ہم نے اور ہر ای یورپین انسپکٹر نے جو جلیپور سے آیا تھا گاڑی
 ہی میں آرام کیا۔ صبح کو ایک پولیس مجیدار کے کہنے پر کہہ بیگہ تیار ہے اور سب سامان سے آرام ہے
 یہاں آئے تو بیگہ خالی پایا۔ صرف دو کرسیاں اور ایک میز استقبال کے لئے موجود تھیں۔ مجبوری

ان کے متفقہ دو کروڑوں میں سے ایک لکھ ہوا تھا۔ ایک میں یہ مسلمانین چار اجا۔ یہاں سب نے بڑے شوق سے اس صاحب E.A.C سے ملاقات ہوئی۔ بھرت کرتے تھے کہ ہم کو بالکل غیر متعلق یہاں کے چینی گھنٹہ ساز سے ملنا چاہیے۔ مرگھا و مرچنویس کے سگے بھائی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو ہم کو گورنمنٹ ہند کی طرف سے ایک ڈیڑھ سینہ ہوا کہ عبدالجید ۵.۵.۵۷ کا ۵.۵.۶۰ شملہ سے انکو ملان کا انتظام کر گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہیں کوئی حکم نہ ملا تھا۔ ہر حال مرچنویس نے بہت غلیٹ کی اور ہم ان کے سخت مشکور ہیں۔ C.P. Government نے سامان کے لئے فوراً منظوری ان کے گھنٹے پر دیدی اور کلکتے سے فرنچر اور کانپور سے دیاں آرہی ہیں پٹنگ وغیرہ عاریتاً مل گئے تھے اب یہاں مسریاں تیار ہو گئی ہیں۔ فرنچر بھی جلد آجائے گا۔ ہر حال مردہ بدست زندہ اگرینہ بھی ہوتا ہے ہم شاکر و صابر رہتے۔ یہاں لوگوں کو اسلامی حمیت سے پڑ پایا۔ ہندو اور مسلمان سب ہم سے اچھی طرح ملتے ہیں۔

برادرم۔ غربت میں وطن کا مزا ہے۔ باقی آئندہ۔

تم آؤ تو ناگپور ہو کر آنا۔ وہاں سے صبح کو ۸ بجے گاڑی چل کر شام کو ۵ یہاں پہنچ جاتی ہے۔ واپس ہو کر ناگپور سے تہی چلے جانا۔ شوکت اور بچوں کا سلام۔ والدہ کی دعا۔ میری اہلیہ سلام کہتی ہیں۔ والسلام۔

تمارا غیر طلب اور مداح

محمد علی



گیتا کے فارسی تراجم

گیتا یا بھگوت گیتا کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں خالق و مخلوق کی جو باتیں ہیں وہ وحیقت میرے قلم سے توشیح کی محتاج نہیں۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ مختلف ہندوستانی زبانوں کے تراجم سے قطع نظر کر کے جتنی 'فرائش' اور انگلستان جیسے غیر مالک کی زبانوں میں بھی اس کے تراجم کی تعداد بگھنہیں۔

ہندوستان میں یہ دونوں فارسی کا زندہ رہا ہے۔ اس حصے میں بہت سے تراجم اور تراجم کا اردو تراجم بے شمار اشکوتہ کتابوں نے فارسی کا جامہ زیب تن کیا۔ اور گیتا جی مشہور و معروف کتاب کے جو مختلف فارسی ترجمے میری نظر کاغذ پر ملے ہیں ان میں سے بہترین ہے۔

۱، ترجمہ فیضی

اکبری مہار کے ملک اشرفیج ابوالفیض فیضی فیضی کے تراجم کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسی صاحب کمال شاعر کا ایک منظوم ترجمہ موسوم بہ شری بھگوت گیتا ہے۔ سنسکرت نسخے میں ۱۸ ادھیائے (پایہاں) ہیں۔ اسی طرح اس فارسی نسخے میں بھی ۱۸ باب تقاضا کئے گئے ہیں اور اشکوتہ کے ۱۸۰۰ اشلوکوں (اشعار) کا مضمون فارسی کے ۱۲۸۲ اشعار میں ادا کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہر ایک ادھیائے کے اشلوک اور فارسی اشعار کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ادھیائے	تعداد اشلوک	تعداد اشعار
۱	۴۷	۷۴
۲	۷۲	۱۱۷

تعداد اشعار	تعداد اشلوک	توصیائے
۷۵	۴۳	۳
۴۳	۴۲	۴
۵۸	۲۹	۵
۶۴	۴۷	۶
۵۹	۳۰	۷
۵۴	۲۸	۸
۸۲	۳۴	۹
۷۶	۴۲	۱۰
۹۱	۵۵	۱۱
۳۳	۲۰	۱۲
۷۸	۳۵	۱۳
۴۶	۲۷	۱۴
۴۳	۲۰	۱۵
۶۳	۲۴	۱۶
۵۶	۲۸	۱۷
۱۷۰	۷۸	۱۸
۱۲۸۲	۷۰۱	

۱۷ سنکرت کے بعض نسخوں میں صرف ۲۴ ہی اشلوک شمار کئے گئے ہیں۔ اس حساب سے تمام سنکرت اشلوکوں کی مجموعی تعداد صرف ۷۰۱ ٹھہرے گی۔

انہوں نے میں بعض اوقات تفصیل اور بعض اوقات اختصار سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔
 یہی سبب ہے کہ سنسکرت اشلوکوں اور فارسی اشعار کی تعداد میں کوئی خاص تناسب نہیں ہے۔
 اب سنسکرت کے ابتدائی ۱۰ اشلوکوں کا ماحصل ذیل میں علیحدہ علیحدہ دیا جاتا ہے اور ہر
 ایک کے چھوٹے فارسی اشعار درج کئے جاتے ہیں تاکہ ناظرین ملک اشعار فیضی کے ترجمے کی
 صحت اور قیادراکلامی کا کم و بیش اندازہ لھاسکیں۔

نمبر اشلوک	اشلوک کا خلاصہ	اشعار فیضی
(۱)	دھرتراشٹر نے سنجے سے پوچھا کہ جب کوروں اور پانڈوں کو گشتہ کے میدان جنگ میں صف آرا ہوئے تو کیا ہوا۔	طہ ازندہ دست آگہ بدیں سار کہ پسیہ کہ کر گھیت
(۲)	سنجے نے جواب دیا کہ درپو دمن نے جب پانڈوں کی صف آرائی	بودر مرنہ آخست در جہاں در آں جا رسیدند چوں کوروں دگر پانڈواں از پے کارزار چہانت ایں قصہ لے ہوشیار جوابش چنیں گفت کاے بادشاہ بہستند از ہر دو سو صف سپاہ

ملہ دھرتراشٹر اور ان کے ملاحی بھائی پانڈوں کی اولادوں کے درمیان مہابھارت نامی جنگ عظیم واقع ہوئی ہے
 جس پر درحقیقت گیتا کا وارد ہوا ہے۔ دھرتراشٹر کی اولاد کوروں کے نام سے موسوم ہے۔ ان میں سب سے بڑا
 درپو دمن ہے اور پانڈوں کی اولاد پانڈوں کہلاتی ہے جو یہ مہر، بیم، ارجن وغیرہ پر مشتمل ہے۔
 ملہ اصل سنسکرت لفظ دھرتراشٹر ہے۔ اسی طرح دیگر بہت سے اسرار اکثر فارسی تراجم میں اپنے واسطہ
 مناسب غالب میں ڈھال لئے گئے ہیں۔

اشعار معنی	اشعار کا خلاصہ	نظم
چوسر زند تو فوج دشمن بدید بہ نزد درو ناچار ج رسید	ایک خاص وضع پر دیکھی تو اپنے پیر و مرشد درو ناچار ج کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا۔	
گفتش بریں شکر پانڈواں نظر کن کہ ترتیب دارد چہاں در شد من بہت سالار فوج جگر دارمیش رونق کار فوج یلے ہچو بھیمے بہ پلوئے او دگر نکل و سہدیو بازوے او دگر ارجن آں چناں پلواں کہ لرزد بخوش بخود آسمان سر جادواں سانک نامدار قوی پنجہ بیراٹ دشمن شکار دگر راجہ مجدثاں بنوج گراں سیائے کیں ہچو شیر نیاں درو پدیل عصبہ رزمگاہ کنڈ گرد فوجش جہاں راسیاء رئیس رُمیاں دگر کاخی راج شہاں را از چشم اکیل و تاج	(۳) محترم استاد آپ کے شاگرد رشید نے جس خاص وضع پر صفت آرائی کی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے۔ (۴) اس جنگ میں بھیم اور ارجن ایسے عظیم امثال تیرا نماز ہیں۔ یو دھان براٹ اور درو پدے ایسے سرداران شکر ہیں۔ (۵) دھرم شٹ کیتو۔ کاشی راج۔ کنت بھوج۔ پرچت اور شتو سرداران	

نزل اشوک	اشوک کا خلاصہ	اشعار فیضی
	شکر میں۔	دگر گنت بھوج د وگر شہو یار دگر الجھن مرد میدان کار بصد زور و طاقت دگر پربت است بدلے شیراں از دہیبت است جہاں پہلواں اُتو جا رسیں دگر دھشت کیت

دوسرے ادھیائے کے اشوک ۱۴ نہایت ۲۴
روح فانی نہیں۔ جس طرح کوئی شخص بوسیدہ لباس کو ترک کرے
اسی طرح یہ روح بھی درحقیقت ایک جسم کو چھوڑ کر دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ روح
آلات حواس کاٹی نہیں جاسکتی، یہ نہ تو پانی میں گل سکتی ہے اور نہ ہوا میں سوکھ سکتی ہے
وغیرہ۔

مذکورہ بالا خیال کو ملک الشعراء نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔
تغیر مجسم است و جاں فارغ است حوادث بریں است و آن فارغ است
بگرمی و سردی تننت آشناست نہ جانت کہ فارغ ز ہر دوسراست
ہوقت معین اجل میرسد بہر نیک و بد بے غل می رسد

۱۵ مراد ابھنوپسراجن۔ یہ نام اصل پانچویں اشوک میں نہیں آیا مگر حق یہ ہے کہ اس نے میدان
کارزار میں نمایاں حصہ لیا تھا۔
۱۶ اُتو جا نام چنے اشوک میں آیا ہے۔

بچے پر مشاہدین مشکوک تھاں بھنگ اوقاتہ از دست شاں
 نماند بیک وضع بودے اگر نمی یافت فسر زند جائے پدر
 غم میں عزیزاں چرا سے خوری چرا پردہ راز را سے دری
 تن ہر کے ہم چو حسابہ بود شود بارہ ہر گاہ کس نہ بود
 چو شہدہ جامہ جانست نام خیال فنا گشتن بہت خام
 القہ میں نے منکرت کے جستہ جستہ مقامات کا مقابلہ فارسی سے کیا اور یہ نتائج
 نکلتے ہیں۔

(۱) ملک الشعرا نے منکرت گیتا کو کما حقہ سمجھا تھا۔
 (۲) فارسی میں کہیں کہیں اصل منکرت کے بعض مؤخر امور کو مقدم یا یوں کہنا
 چاہئے کہ بعض مقدم امور کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ جس طرح کوئی منکرت اس
 منکرت گیتا سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اسی طرح ہر ایک فارسی داں فارسی نسخے سے صحیح
 معنی میں مستفید ہو سکتا ہے۔

پھر یہ امر بھی کچھ اہم نہیں کہ فیضی نے جس بحر میں گیتا کو نظم کیا ہے وہ اس کے لؤنایت
 معزوں ہے اور جس دلکش اور زوردار پیرایے میں تمام کتاب ہے اس کی بنا پر میرا یہ
 قیاس ہے کہ اگر کوئی صاحب ذوق کتاب کو شروع کرے تو اس کو ختم کئے بغیر نہ چھوٹے گا۔
 فیضی نے گیتا کو اس شعر پر ختم کیا ہے۔

بکن سجدہ شکر پروردگار

کہ آمد زدست تو ایں گو نہ کار

فیضی نے یہ حدیث المثال ترجمہ کب کیا تھا اس امر کا صحیح پتہ نہ تو اس کتاب سے
 لگتا ہے اور نہ اب تک اس بارے میں دوسرے ذرائع سے کوئی معلومات حاصل ہوئی ہے۔
 اپنی ہر دلعزیزی کے باعث یہ ترجمہ مختلف مطابع سے شائع ہو چکا ہے چنانچہ مفصلہ ذیل

مطبوعات کے لئے پری نٹنگ گزٹ ہے۔

- ۱۔ مطبع آئینی الہ آباد۔ سنہ طباعت درج نہیں۔
- ۲۔ مطبع ست دھرم پر چارک جالندھر ۱۹۰۱ء۔
- ۳۔ جامع انیم پریس لاہور۔ سنہ طباعت درج نہیں۔
- ان کے سوا دو اور نسخے بھی بتائے جاتے ہیں:-
- ۱۔ عالمیادہ دربار پریس گوالیار ۱۹۱۳ء۔
- ۲۔ ہندوستان پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۲۸ء۔

(۲) ترجمہ ابوالفضل

اہل ہندو کا عقیدہ ہے کہ کاشی میں مرنے سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ آخری عمر میں کاشی آ جاتے ہیں اور بقیہ عمر کو زیادہ تر مذہبی مسائل میں صرف کرتے ہیں چنانچہ جو فارسی داں اصحاب یہاں آئے ان کی بدولت اکثر مذہبی کتابوں کی نقلیں یا ترجمے کاشی میں پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک گیتا کا ترجمہ ہے جو ملک الشعرا فیضی کے برادر خورد شیخ ابوالفضل الملقب بہ علامی کا کیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور مذہبی کتابوں کے بھی قلمی نسخے دیکھنے میں آئے ہیں جن کا ذکر آئندہ حسب موقع کیا جائے گا۔

شیخ ابوالفضل کے ترجمے کا نام ”ارجن گیتا“ ہے۔ اس کے شائع ہونے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی اور نہ غالباً اس کا ذکر کسی کتاب میں آیا ہے۔ اسی سبب سے بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے۔ میں نے اس نایاب ترجمے کا ایک قلمی نسخہ بنارس کی ’مالتی سدن‘ نامی لائبریری میں دیکھا ہے جس کی مختصر کیفیت یہ ہے۔

یہ نسخہ تقریباً ۲۹ صفحات قطعی ۱۰ x ۷ ۱/۲ انچ پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں تقریباً ۲۳ سطریں اور ہر سطر میں ۲۴ الفاظ کا اوسط ہے۔ خط معمولی ہے۔

کاتب کا نام وچہ ہے "کونرنگہ ولد گلزاری مل ابن پرنسی مل قوم اگر دالہ ساکن
شاہجاں آباد"۔

کاتب موصوف مرزا شگفتہ نجات بہادر ولد مرزا جاندار شاہ بہادر کے بیاں ملازم نے
مقام و وقت کتابت بھارج دواجی ٹولہ شہر تبارس تاریخ سلخ صفر المظفر ۱۲۳۳ھ
حاجی سلسلہ جلوس والا بادشاہ شاہ عالم غازی۔

کاتب موصوف نے اس ترجمے کو جس نے نقل کیا تھا اس کا کوئی حوالہ درج نہیں۔
اس نئے کے تعلق ضروری امور ذیل میں دئے جاتے ہیں۔

۱۔ ابتدا میں ایک مختصر مقدمہ منجانب فاضل مترجم ہے جس کے کچھ الفاظ یہ ہیں۔

”اے نکتہ گیتا کہ در انکشاف سرایر قدرت ذوالجلال و اشکشاف

حقیقت معرفت لایزال است آں را با جازت سلطان عادل و برہان کامل

دلیل قاطع خدادانی حجت سامع رحمانی قافلہ سالار راہ حقیقی و مجازی ہلال الدین

محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ شیخ ابوالفضل از زبان سنسکرت

ترجمہ بعبارت فرس و عربی نمود۔

مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ ترجمہ دراصل شہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوا تھا۔

۲۔ بعض مضمون کی ابتدائی عبارت یوں ہے۔

”دھر تراشٹ پر سید کہ لے بنے مردم ما و جماعت پانڈواں در

وقت رو برو شدن اول بچہ کارشنول شدند۔ بنجے گفت کہ جبہ جو دمن

فوجہائے پانڈواں ایستادہ دید نزد درونہ چارج آمدہ گفت لے استاد

ایں شکر عظیم کہ پانڈوان آراستہ اند عمدہ ایں سپاہ بصیم دارجن اند۔

مذکورہ بالا اقتباس و ترجمے کی دیگر عبارتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ منشور فارسی گیتا

در حقیقت منظم سنسکرت گیتا کا چرہا ہے۔

۳۔ مگر ترجمے میں فاضل مترجم کے مخصوص طرز ادا کا رنگ ہے مگر کہیں کہیں کسی سنسکرت الفاظ کو بعینہ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً دوسرے باب میں آیا ہے:-

”چوں سری کرشن ارجن را بادینا پر آب دیدند از روئے مہر بانی
فرمودند کہ اے ارجن ترا در حین محل مشکل اندیشہ کہ از نقصان عمل خیر
می دهد از کجا پیدا شدہ و ایں روش بزرگ شوک نمی رساند“

۴۔ ترجمے کا بیشتر حصہ نثر میں ہے مگر کہیں کہیں اشعار بھی ہیں چنانچہ ایک شعر ذیل میں دیا جاتا ہے۔

ہر کہ آمد بجاں اہل فنا خواہد بود
وانکہ پایندہ و باقیست خدا خواہد بود

(۳) مترجمہ مول چند

یہ ترجمہ موسوم بہ سری بھگوت گیتا رائے مول چند صاحب ستون ڈیرہ اسماعیل خاں کا ہے۔ مطبع کوہ نور لاہور سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مترجم کون تھے۔ انہوں نے کتب ترجمہ کیا۔ ان امور کا سنوڑ مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔

پورا مطبوعہ نسخہ معمولی تقطیع کے ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ سیدھی سادی فارسی نثر میں ہے مگر ترجمے میں سنسکرت الفاظ کا بعینہ استعمال جا بجا کیا گیا ہے۔ اب بطور نمونہ اس گیتا کی تھوڑی سی ابتدائی عبارت ذیل میں دی جاتی ہے۔

”آغاز سری بھگوت گیتا“

دھرم ترا شت پر سیدھے بنے مردم سن و جماعت پانڈواں در زمین

لے لگ لوک سے مراد بشت بریں۔

دھرم کھیتہ کو کھیتہ بھج جگ جمع شدہ چہ کروند۔ سچے گفت کہ دھرم جو دھرم بھج
 پانڈو دھرم را استادہ دیدہ نزد درونا چارج آمد و گفت اے اوستاد میں
 لشکر عظیم پانڈواں را درشت شد دھرم درید کہ شاگرد خود مذست بہ صنف
 آراستہ نیک ملاحظہ کن۔

آخر میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ گیتا جیسی گراں بہا کتاب کے دوسرے
 ترجمے بھی ہوئے ہوں جو میری نظر سے نہیں گذرے۔ پس اگر کوئی صاحب ذوق کراہے مگر سننے
 یا سنوں کا حال تحریر فرمائیں یا مجھے ان کا پتہ دیں تو میں بہت ممنون احسان ہوں گا۔



رام پور کا ایک ملک الشعراء

ایسا کم دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی ہستی ایک ہی وقت میں صاحب افسردہ سیم بھی ہو اور صاحب قمر طاس و ظلم بھی، انتظام مملکت اور کشور آرائی کے مراحل بھی درپیش ہوں اور افواج معانی کی سپہداری بھی ہو رہی ہو، دنیاوی و دنیویاں ”خوش باش دے کہ زندگانی نیست“ کی دعوت دے رہی ہو اور فقر و قناعت کے بورے پر ہفت درویشی بھی حاصل کیا جا رہا ہو، ایک اور ملک الشعراء ”شمن ایمان و آگہی“ اور ”رہزن نمکین و ہوش“ ہوں اور دور بہشتیوں کو نمایاں کر کے بباط عیش برہم کر دیتی ہو، کسی وقت مگر۔
 کین سر در میں محو کر دیں، تو کبھی کبھی حقیقی جذبات کی تراوش وہ در رہیں
 ”نوحہ غم“ میں بدل جائے۔

نواب یوسف علی خاں تالیم فرماں روا نے ”دارالسرور رام پور“ انہی مستثنیات میں سے تھے۔ وہ صاحب تخت واد رنگ بھی تھے اور ایک جادو نگار شاعر بھی، وہ مالک چتر شاہی بھی تھے اور اہم شمن کے تاجدار بھی۔

ان کے ماحول پر نظر ڈالئے تو اور حیرت ہوتی ہے کہ ان کے دل میں جذبات کا یہ ترنم، تخیل کی یہ قدرت، انداز بیان کی یہ پاکیزگی پیدا کیوں کر ہوئی؟ جس شخص کو بگاڑنے کے لئے معاجوں اور نذیبوں کا جھگٹ ہو خوش باشوں اور خوشامدیوں کا اجتماع ہو، بڑے سے بڑے نقاد فن اور ماہر زبان کی زبان بھی جس کے حضور میں گنگ ہو جاتی ہو، تعریف و توصیف، مدح و ستائش، اور ”عزت و راز باد“ کے نعرے جس کے کانوں میں ہر وقت گونجتے ہوں، اگر اسے اپنے مطلق ”غلط فہمی“ نہ ہو تو کس کو ہو؟ وہ اپنے ہر عیب کو بہر نہ سمجھے تو کون سمجھے؟ اگر اس پر بھی کسی شخص کو عیب دہن میں تیز باقی رہے تو اس سے بڑھ کر عاقل و فرزانہ کون ہے؟

ناظم اگرچہ ایک فرمانروا تھے، انہما خیال میں بے باک تھے، نہ ان کی کوئی گرفت کر سکتا تھا۔
 بیچے شہورہ دے سکتا تھا، لیکن بائیمہ انھوں نے وہ صن ذوق اور کمال فن پیدا کیا کہ ان کا
 محکم صاحب ذوق سلیم کو وجد و کیف میں سرشار کر دیتا ہے۔

ان کا اشبہ قلم اصناف شاعری کے ہر میدان پر لیٹا کر رہا ہے، لیکن تغزل ان کا حصہ ہے۔
 اس کی پختہ تخیل کر سکتے ہوں کر لیجے، پھر ناظم کو اس کوئی پر کیے، تو آپ اسے اپنے میار سے
 زیادہ ہی پائیں گے، بالخصوص محاکات اور سن بیان میں تو اسے یہ طولی حاصل ہے۔ وہ جو کچھ
 کہتا ہے اس انداز سے کہتا ہے کہ گویا سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے، وہ جب درد و الم کا اظہار
 کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دل کی ترجمانی ہو رہی ہے، وہ جب کسی کی بے اعتنائیوں
 اور تنگ مزاجیوں کا تذکرہ کرتا ہے تو اس حسرت و تاسف سے کہ اگر پتھر کا دل ہو تو وہ بھی موم ہو جٹے،
 اور چونکہ وہ ایک با عظمت و جبروت شخصیت کا مالک ہے، صاحب اقتدار و صاحب اختیار ہے،
 حرم سرا بھی رکھتا ہے اور محلات بھی اس نے کبھی کبھی شاہانہ نکلنت کا اظہار بھی زبان شعر سے
 ہو جایا ہے۔

میاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ جب ناظم ایک عاشق
 ناکام نہیں تھے، فراق زدہ نہیں تھے، جو رفلک کے شاکہ نہیں تھے، ”کسی“ کے شکوہ بخج جو رستم
 نہیں تھے تو ان کے ہاں اس درد و اثر، سوز و گداز اور بے تابی و بے قراری کے کیا سنی؟ انھیں تو
 امرار انھیں کی طرح ”شب وصال“ کا نقشہ کھینچنا چاہیے تھا، اپنی لغزش رندانہ کی حکایتیں مزے
 لے لے کر بیان کرنی چاہیے تھیں، لیکن یہ عجز تو کم ہے، ہے تو درد و غم کی داستان، ”بے قراری“
 فرقت کا بیان۔ اسے اگر آدرد نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے؟

یہ خیال صحیح نہیں، یہ کیا ضرور ہے کہ ناظم اگر رام پور کے فرماں روا تھے تو کشور دل بھی
 تہیز کچکے تھے؟ ہو سکتا ہے کہ دل پر ایسی چوٹ لگی ہو جس نے ان سے نشاط و مسرت کے جذبات
 چھین لئے ہوں، دربار میں، حرم سرا میں، مصاحبوں کے مجمع میں، کاروبار سلطنت میں وہ اپنا

درد میں بھول جاتے ہوں، لیکن جب رات کی تاریکی مسلط ہوتی ہو، تو وہ اپنے دل میں ایک غلش محسوس کرتے ہوں، جب لوگ مصروف خواب ہوتے ہوں، وہ کروٹیں بدلتے ہوں، جب فانوس کی روشنی کا شائبہ سلطان کو بقعہ نور بنا دیتی ہو، تو پریم کی ”اندھیری نگری“ میں یاس و حسرت کے بادل چھا جاتے ہوں، جب شب ماہ کی کرنیں بام و در کو جگمگا دیتی ہوں تو ان کا دل ویران و سنان رہتا ہو اور اس وقت ہجوم جذبات میں ان کے منہ سے نالہ موزوں نکلنے لگتا ہو جو ہسیر سننے والے کے لئے دعوت درد و اثر ہو۔ میرے اس خیال کی اس سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کا کلام اٹھا کر دیکھئے تو جس جگہ وہ دل کی بیٹی بیان کرتے ہیں، ”نہ سنا ہے نہ سنئے۔۔۔ یا پڑھنے والا ایک عجب غلش محسوس کرنے لگتا ہے“ اور نہ اگر خالی نہ۔

طلوع صبح محشر چاک چڑ میری

تو آپ لاکھ بار سنئے اور کچھ اثر نہ ہوتا، ”استادانہ پختگی“ ”مبذ پرور“

انعام آپ کے منہ سے یہ سمجھ کر نکل جاتے کہ یہ ناسخ کا مطلع ہے، اس سے معذور نا جواب ہو گا۔ میں اگر کوئی ایسا شاعر نہیں کہ نیسے اور سر دھینے، تو اسے آپ آدر دیکھئے کہہ سکتے ہیں؟ اس تمسید کے بعد اب میں اپنے اصل موضوع پر توجہ کرتا ہوں اور کلام ناظم کے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

عام عاشقانہ مضامین | ناظم کا کلام بھی ان جذبات و خیالات سے معمور نہیں ہے جو ”قدر مشترک“ کے طور پر تقریباً ہر شاعر کے اس باختلاف قوافی و ردیف ملے گا۔ اس ذیل میں ان کے جو اشارے آتے ہیں ان میں کوئی خاص بات سوا اس کے نہیں ہے کہ وہ موزوں ہیں۔ ہر شاعر کے ہاں ”مفرقہ“ کا ایک جزو ضرور ہوتا ہے۔ فی البدیہہ کہنے سے ”فرمایشی اشارے“ سے ”خواہ مخواہ طبیعت پر زور ڈال کر کہنے سے دیوان تیار ہو رہا ہو اور کوئی ردیف اس وقت تک نہ کی گئی ہو تو اس کی ”خانہ پری“ کہنے سے ایک مجموعہ تیار ہو جاتا ہے جسے حذف ہی کر دیا جائے تو اچھا ہے۔ لیکن اسے کیا کیجئے۔ ہاں کا دستور یہ ہو گیا ہے کہ موزوں صورت میں جو کچھ جس موقع پر بھی زبان سے نکل جائے اُسے

”مذہب کلمات ضرور بنایا جائے۔ غالب یہ چارے نے شارب عام سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی تھی کہ اپنے اشعار کا انتخاب شائع کرایا، باقی غیر ضروری اشعار حذف کر دے، لیکن وہ حذف شدہ اشعار اتنے سخت جان نکلے کہ ہنگامہ خدر میں بھی صبح سلامت رہے۔ بالآخر نواب صاحب بھوپال کے کہنے سے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم اس ”مجموعہ بے رنگ“ کو بھی نکال ہی لائے اور ستم یہ کیا کہ شائع بھی کر دیا۔

ماصل کلام یہ کہ ناظم کے ہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جو ان کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتے مثلاً:-

آنے کو کہا ہے اس نے ناظم کچھ تم کو ہی اعتبار ہوگا

سنا بھی تم نے تو کس سے سنا خدا کی پناہ کہا ہے غیروں نے جو کچھ وہ میرا حال نہیں

اک جہاں نشہ نماں خود آرائی ہے آپ جو چاہیں کریں اچکی بن آئی ہے

آگے ہی کا سا طور ہے کیا اب کی بار بھی باندھا ہے تم نے حمد پہ ہے استوار بھی؟

ملے گی عشر میں داد ہم کو، بندھا ہی یہ اعتقاد ہم کو ملی نہواں بھی مراد ہم کو تو پھر تباؤ کیا کرینگے؟

جلد ہم جاتا ہے ہر شخص کا نقشہ کیا سادہ دل ہو وہ بت آئینہ سیا کیا؟

ناپسی | لیکن ان مسملات سے قطع نظر کر کے ان کے اصل کلام کا بغیر غائر مطالعہ کیجئے، تو ناظم کی خصوصیات خاصہ آپ کو رفتہ رفتہ متاثر کرتی جائیں گی۔ دودا اثر، سوز و گداز، غلو و جفا کے

نہیں پہنے شہزادی نہاں سے اکثر نے ہوں گے، لیکن ناظم کی آہ جگر گداز ہم واغمن میں صاف
 ناظم رکھتی ہے اس کا ہر دل جیسا ہے نیاز دعا و دعا و دعا ہوتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے۔
 مہی کا بھی طالع کئی بار ہو چکا اچھا غم فراق کا ہمیں بار ہو چکا
 اب کیوں کی کرے تجھے کس کا لٹاؤ روئے کا نام دیدہ خوب رہو چکا
 میاں غم فراق نے جان پر بنا دی ہے "اس کی کج ادائیگوں اور سرد مہریوں نے
 اپوس کر رکھا ہے، لیکن دل ہے کہ محبوب کی طرف سے "صفائی" پیش کر رہا ہے۔ آخر خود
 اپنے نہیں مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

ناظم غلطی مہر و محبت سے چشم داشت واقف نہیں۔
 "اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا نہیں کرایا، آخر ناظم
 شاعر ہے، ندیم ہے، قصہ خواں بنے پائی نہ اٹکے دلیر
 میاں پر تو جان پر بنی ہوئی ہے مگر ناصح صاحب ہیں کہ "فلسفہ عشق" پر تقریر فرمائے
 جا رہے ہیں۔ ایسے وقت میں اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا تھا کہ
 نصیحت کا نہیں اب وقت ناصح اٹھا تاہی باتوں سے دعا کر
 اس "پاپ کی دنیا" میں ناظم کسی کو اپنا ہم زبان و ہم نشین نہیں پاتے اور پائیں کیونکر
 جب صورت مسئلہ یہ ہو

خدا بے نیاز اور بت سنگ دل کو کس سے ہم راہ پیدا کریں؟
 یہ شعر ملاحظہ فرمائیے، رنجوری عشق کا کتنا ہا کمال مرتع پیش کیا ہے،
 قاصد شکستہ پا و کبوتر شکستہ بال جانے کا خط کے وال کی عنوان نہیں
 دل لاکھ لاکھ سمجھاتا ہے کہ محبوب کی سرد مہری دیتی ہے، اس کی کج ادائیگی انتقامات
 جہاں کی غازی ہے، لیکن
 توقع ایسی ہے کہ گھٹاڑی کی پڑے ناظم کبھی بھولے سے بھی جس نے نہ پوچھا ہو کہ "کیونکر؟"

یہ سیات متنازعہ تو نگلش اضطراب و اضطرابیں گزری، شاد کامی کا زمانہ، کامی میں بسر ہوا،
اب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ”وہ“

پوچھنے آئیں گے پر حیب کہ مجھے بات کرنے کی نہ طاقت ہوگی
”وعدہ یار“ شرمندہ الینا کب ہوا ہے؛ لیکن ناظم فریب میں آگئے۔ محبوب ستم گار
ذاب آتا ہے نہ جب آتا ہے، آخر بے قرار ہو کے کہتے ہیں
وہ اپنی ضد کے ہیں پورے نہ آئیں گے ہرگز بس ان کی راہ ہم اسے غم گار دیکھ چکے
ان کا حال زار دیکھ کر ہر شخص انہیں تسلی دیتا ہے، لیکن وہ بھی ”اس کی طینت سے
واقع ہیں بالکل بجا طور سے جواب دیتے ہیں۔

یہ تیری سخن سازیاں ہیں ندیم کسی پردہ کیوں رحم کھانے لگے
عزمِ حال | ایک ناکام متنا حصول مقصد کے لئے ہر اس کا فی کوشش صرف کر ڈالتا ہے، ناظم بھی
اس سے متعلق نہیں تھے، انہیں بھی ”کوچہ رقیب“ میں ”سر کے بل“ جانا پڑا، منت اعدا،
کرنی پڑی، اپنی خود داری کا خون کرنا پڑا، اور یہ سب کچھ محض اس لئے کہ کسی کے حرمِ ناز میں
باریاب ہو سکیں، لیکن جب ان باتوں سے بھی کام نہ نکلا تو انہوں نے ایک بالکل نیا طریقہ نکالا
جسے بظاہر کامیاب ہونا چاہئے تھا۔ اب یہ خدا کو معلوم ہے کہ وہ اس میں کامیاب کہاں تک
ہوئے؟ وہ طریقہ یہ کہ انہوں نے مختلف پیرایوں میں محبوب کے جذبات پر اثر ڈالنا شروع کیا کبھی
رقیبِ روسیہ کے معائب جن جن کے بیان کئے، کبھی اپنی وفاداریوں اور جاں سپاریوں کو ضعیف
لائے، کبھی حسن و فائز بیک پر زدئے کہ اس زمانے میں وفا عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ اگر کسی میں یہ
گوہر نایاب پایا جائے تو اس کی قدر کرنی چاہئے۔ کبھی کبھی رنغ غلط فہمی کے خیال سے یہ بھی
سنادیتے ہیں کہ اگر جفا کاریوں کا یہی عالم رہا تو ایسا مخلص اور بے ریا دل کا ہے کوئے گا، غرض
ہر طرح سے سب سے پہلے تو اپنی جان نشاری اور وفاداری کا ”سکہ“ یوں بٹھاتے ہیں
دیکھ تو بھی کہ گلاب ہے یہ خوبرو لیکن تجھ کو اسے یار کس اہزان سے ہم دیکھتے ہیں

”معتلی دے رہے ہیں مگر میری زبان آلودہ شکوہ سخی نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی اپیل
کئے جا رہے ہیں کہ میری حالت تو یہ ہے کہ بات بھی نہیں کر سکتا اور تم ہو کہ ”شکوہ“ کی
شکایت کر رہے ہو“

اس پہ کیجے گمان شکوے کا بات کرنے کی جس میں طاقت ہو
کنا یہ ہے کہ ہم نے شکایت نہیں کی لیکن انداز بیان ملاحظہ ہو کہ خواہ مخواہ رسم
آجائے۔

منہ ترا دیکھنا نصیب نہ ہو منہ سے نکلی اگر شکایت ہو
یہ شعر ملاحظہ ہو
جان دی گوتڑپ کے پر تم کو اک تاشہ دکھا
محبوب پر احسان جاتے ہیں
طعن عدد، علامت، اجاب، جو رخلق دیتے نہ تم کو دل
سیمانی کا دم بھرتے ہو، ”سیح“ ایسا ہی ہے لیکن کبھی اپنے مرض غم کو بھی پوچھو کہ نیسا ہے؟
اپنی کارگزار یوں کو بھی وہ قیس و فرہاد سے کم نہیں سمجھتے اور بلا کسی انکسار کے صاف صاف
”عرض“ کرتے ہیں۔

افسانہ محنوں سے نہیں کم مراقصہ اس بات کو جانے دو کہ مشہور نہیں ہے
پوچھتے ہیں کہ بتلانیے سوا ”خاکسار“ کے اور
وہ کون ہیں کہ جو محبوب کے ستم سہہ کر زبان کو زمرہ سنج دعا نہیں کرتے؟
سب سے بڑی شکایت تو یہ ہے کہ ناظم صاحب کی طرح
نہ بذلہ سنج، نہ شاعر، نہ شوخ طبع رقیب دیا ہے آپ نے صحبت میں اپنی بارکے؟
”اعتیاد“ کبھی کبھی یہ بھی سنا دیتے ہیں کہ
جفا و دھر سے اگر بے شمار باقی ہے ادھر بھی دل پہ ابھی اختیار باقی ہے

ہو جس کے جتنے بندے تھے وہ تو جالے یار سے آشفۃ خاطر ہو کر اٹھ گئے، لیکن ایک
 عجمی صاحب کا دم تھا جو خلوص و وفا کا نام لئے بیٹھا تھا، اطلاعات غرض نہ کرتے ہیں،

سب اٹھ گئے ترے در سے خبر ہے ناظم کی ستم کشوں میں یہی دل نگار باقی ہے!
درد و اثر | درد و اثر، سوز و گداز، اور یاس و حرام کے جذبات بھی کلام ناظم کا ایک مخصوص حصہ

ہیں، جذبات جب حقیقی ہوں، درد دل جب سچا ہو، منہ سے جو لفظ نکلتا ہے اس میں درد و حسرت
 کا ایک جہان پوشیدہ ہوتا ہے، کیف و اثر کا ایک سے خانہ ہوتا ہے کہ اس شراب ناب کا ایک
 قطرہ بھی جس کے کام و دہن تک پہنچا وہ اپنے دل کی دنیا میں ایک انقلاب محسوس کرنے لگتا ہے۔
 غالب کشور سخن کا فرماں روا تھا۔ جس زمین کو اس کی جولانی سخن نے پا مال کر دیا پھر
 ہر شخص کے لئے خواہ وہ کتنا ہی قادر الکلام ہو اس کا تسخیر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اور اس قسم کی
 جرات اگر کسی سے ہو بھی تو اصل اور نقل کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے، لیکن ناظم اپنے استاد غالب
 کی ایک مشہور و معروف زمین پر قدم رکھتے ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ اس میں انہوں نے کوئی ٹھوکر
 نہیں کھائی، ملاحظہ ہو،

وہی تم ہو، وہی خبر ہے، پر انصاف کرو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد
 اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ

جب نہ ہو کوئی جفاکش تو جفا کا کیا طعن کیا کرو گرنہ کرو ترک جفا میرے بعد
 خط مرا پڑھ کے تمہیں حسرت تو آیا لیکن یہ بھی قیمت کا لکھا تھا کہ پڑھا میرے بعد
 اس شعر میں گو تو ارد کی بولتی ہے لیکن پھر بھی سن لیجئے،

کس نے اس حلقہ کا کل میں پہنچایا دل کو کون اس چشم کا بیمار ہوا میرے بعد
 یہ شعر طالب و مطلوب کی نفسیات کا صحیح مرقع ہے کہ

مل جاتے ہیں تو کہتے ہیں اچھی طرح تو ہو گویا ہمارے جی میں کچھ ارمان ہی نہیں
 دیر بار کی رسائی تک جب کوئی صورت نہیں نکلتی تو کہہ اُٹھتے ہیں،

ان کی غلوت میں مجھے بار کہاں ہے ناظم قصہ خواں کاش سنائے مرے افسانے کو
 ناصح کے طوفانِ کلم سے ہر شخص واقف ہے ناظم کو جب سابقہ پڑا تو یہ کہہ کے اپنا
 بیچا چھڑانے میں

بکے جو اس طرح کون اس کو داند نہ جانیا مجھے سودا ہی صبح پہ کیا توجہ کو بھی سودا ہی؟
 ہجر و انتظار کی کتنی میح تصویر کشی کی ہے
 وہ اپنے وعدے کے سچے ہیں انہیں گے لیکن مجالِ صبر کے تاب انتظار کسے؟
 عاشق کے حال زار کا کس قدر دردناک نقشہ کھینچا ہے
 نہ دانش درست اور نہ پیشِ بجا دل و دیدہ
 جنائے یار اور جور و دلدار سے تہمتے امید ہو چلی تھی کہ وہ
 اور تلافی تم کرے گا، عذر جن کرے گا، پیمانِ وفا بندھے گا، مجھ
 سا غر چھلکیں گے، لیکن نتیجہ نکلا تو یہ کہ

یاں آرزوئے عذرستم اور وہاں ہنوز اپنے کئے پہ یارِ پشیمان ہی نہیں
 ناظم کی وفا کیشیوں کا صلہ بارگاہِ حسن سے ملا تو یہ کہ وہ اور زیادہ ہدفِ تم بنائے گئے
 بعض لوگ ہیں کہ تسکین دے رہے ہیں کہ تمہارا خیال ہی غلط فہمی پر مبنی ہے وہ صنم حیلہ گرا ب آیا
 اور اب آیا، لیکن دل کی آواز کہہ رہی ہے

مجھ سے جگڑے ہوئے مت ہوئی ان کو ناظم بیچ والے ہیں ابھی بات بنائے جاتے
 سہل متن شعرو شاعری میں ایک اہم چیز سلاست و روانی یا بالفاظِ اصطلاح سہل متن ہے -
 ناظم اس میدان کے بھی شہسوار، یکہ تاز اور مرد میدان ہیں سہل متن کی تعریف یہ ہے کہ کلام
 روزمرہ سے اس قدر صریح ہو کہ گمان یہ کیا جائے کہ اس سے بڑھ کر آسان اور سلیس کلام ہو ہی
 نہیں سکتا۔ پڑھنے والے کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ تو کیا ہے میں خود اس سے کہیں بہتر کہہ سکتا ہوں
 لیکن دعویٰ ثابت کرنے کے لئے جب ہاتھ قلم دوات سے آشنا ہوں تو معلوم یہ ہو کہ

دل کی تہی دل سے کناسل ہے پر آسان نہیں

غیلا کر لینا جتنا آسان تعامل کر کے دکھانا اس سے کہیں مشکل ہے۔ دوسری سب سے اہم خصوصیت اس کلام کی یہ ہے کہ پانی کی طرح رواں ہو، تیر کی طرح بے پناہ ہو اور محبت کی طرح دل میں گھر کرتا ہو۔

کلام ناظم کا آپ مطالعہ کیجئے تو محسوس کریں گے کہ ناظم اس میدان کا بھی مرد میدان ہے۔ گت و گت کی روایت بہت سخت ہے، بالعموم ایسی زمینوں میں طبع آزمائی اس وقت کرتے ہیں جب ”خانہ پری“ مقصود ہوتی ہے۔ لیکن ناظم کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ الفاظ وضع اسی روایت اور ناظم کے لئے کئے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو

ہم سے جھٹتی ہے کہیں باد پرستی ناظم منہ پر داعظ کے کیا کرتے ہیں ناچار لحاظ

کیا غضب ڈھائے دیکھئے ناظم ہے براچشم خوں فشاں کا رنگ
یہ اشعار ملاحظہ ہوں،

وصال دائمی کا ہے تصور ہزار بے خزاں ہے اودیں اہوں
مزا دیتا ہے تنہائی میں رونا کہ اک دریا رواں ہے اودیں اہوں
تعل کی نہیں اب تاب زنار نبرد آسمان ہے اور میں ہوں
یہ سوراخ اتفاق ملاحظہ ہو،

خوش ہو رہے تھے ہم کہ بنایا ہے ہم نے یار دکھیا تو ان کے در پہ وہ در بان ہی نہیں
یہ شعر بغیر کسی تشریح کے سنئے،

وہ من کر دو دل کہتے ہیں پھر میں کیا کروں ناظم، خلاصہ آپ کی تقریر کا یہ ہے کہ ”مرتے ہیں“
روانی کے ساتھ جذبات کی لطافت ملاحظہ ہو،

ہم نہیں چاہتے کہ دولت ہو کون ممنون بخت و قیمت ہو

اہنس بھی نچوڑ ڈالیں گے اشک کے پوچھنے سے فرصت ہو
 شاعرانہ مبالغے کے ساتھ جذبات کی یہ تصویر کشی کتنی خوب ہے
 شب غم کی درازی قصہ کو نہ یوں سمجھ لیجے کہ یہ وہ شب ہے جس کے بعد صبح روزِ محشر ہو
 باتوں باتوں میں کتنے پتے کی بات کہہ رہے ہیں
 وفا کی ہم نے اور تم نے جتنا کی تم اچھے ہم بڑے قدرتِ خدا کی
 جنونِ عشق کے باوجود یہ ”محکم علی“ کتنی داؤد طلب ہے
 پڑھ کے خط نام غیر سے ان کو حال اپنا
 بہ ذیل ”خمریات“ یہ شعر بھی خوب ہے
 آنکھ میں نظر نہیں آتا وگرنہ آج اس کو بھی

ملا ہے سے کہے کا در کھلا ہوا ناظم پھر اور کہتے ہیں تائید کردگار کے
 قطعہ ذیل روانی، سلاست، ہجوم جذبات اور فور محبت کا کتنا کامیاب مرقع ہے !
 کل کہا میں نے کہ لے نامہ رباں ق آدمی کو آدمی سے کام ہے
 دیکھ تو کب سے یہ تیرا درد مند عشق میں رسولے خاص عام ہے
 جانتا ہے تو بھی آیا یا نہیں کوئی تیرا عاشق ناکام ہے ؟
 سن کے ساری داستان بوجے کہ ایں آپ کا یوسف علی خاں نام ہے
 اشعار ذیل بھی اپنی سادگی اور کین و اثر کی آپ ہی نظیر ہیں :-
 یوں تو چھیڑاں کو ہر کسی سے ہے پر عداوت فقط مجھی سے ہے
 دوست بن کر ہیں بناتے ہیں دعویٰ دوستی منہی سے ہے
 کیوں چھپاتا ہے حالِ رنجش غیر ہم نے بھی سن لیا کسی سے ہے
 میرا ان کا معاملہ ناظم کچھ جدا جنگ و آشتی سے ہے

اسے دل کی خود-غبری کرتے ہیں،

نہ بیاہیں نہ خیاباں کوئی کو چہ ہوگا جانتا ہوں دل صد پارہ جاں رہتا ہے
یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔ ادائیگی مفہوم کے ساتھ بے تکلفی زبان کا اتنا نادر نمونہ شاید ہی
کیں مل سکے۔

جب کسوں کیوں خفا ہو کیا باعث؟ کہتے ہیں ”پوچھنے کا کیا باعث؟“

اس سلسلے میں یہ آخری شعر بھی سن لیجئے۔

کے یہ کون کہ تم کیوں وفا نہیں کرتے؟ وہ کیا کہیں گے مگر یہ کہ ”جا“ نہیں کرتے
۔ فقد زبان ومن بیاں | ناظم جب روانی و سلاست کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ غالب کے شاگرد نہیں
معلوم ہوتے بلکہ میر تقی میر کے اسکول کے طالب علم یا میر درد کے عاشقہ نشین، یا خواجہ اثر کے
زلہ و با سلوم ہوتے ہیں یا مومن کے رنگ سے ان کا رنگ مل جاتا ہے جس کے مختلف نمونے
آپ سطور بالا میں ملاحظہ کر چکے ہیں لیکن جب وہ اپنی طلاقت لسانی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں
اپنی خطابت کا سکہ بٹانا چاہتے ہیں، اپنے جوش بیان اور زور زبان کا لوہا منوانا چاہتے ہیں
تو ذوق و سواد کے ہم عصر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ جن باتوں کو وہ صاف، سادہ اور دلنشین
الفاظ میں ادا کرتے ہیں اسی مفہوم کو وہ پر جوش، زور دار اور خطیبانہ لب و لہجے میں بھی کہہ سکتے
ہیں۔ بطور ثبوت ملاحظہ ہو۔

دنیا میں دور گنبد دوار ہو چکا

نوبت ہو تیری گردش چشم سیاہ کی

اب میرا دروک ترا وار ہو چکا

جو نادکِ نگہ کے مقابل خندگ آہ

چاہئے تجھ سے رہیں بندہ و آزاد طول چاہئے تجھ سے کریں کافر و دیندار لحاظ
نہ تجھے حشر کا اے فتنہ، ایام خیال نہ تجھے خلق کا اے شوخ ستمگار لحاظ
کہتے پر شکوہ الفاظ ہیں۔ اپنے عشق کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں۔

ابتدا و خنق میں ہوں منتی میرا آغاز اور کا انجام ہے
 اور لوگ کہے کم
 من تو لیتے ہیں نہ مانیں گرچہ بات کیوں نہیں سنتے ہو یہ کیا بات ہے؟
 اپنے محبوب سے مطالبہ کرتے ہیں
 تم کرو ہم پر بے تحاشا، محاذ کس کا ہے، خوف کیا ہے؟
 اگر ہے گریہ تو بے اثر ہے، اگر ہے نالہ تو نہ رسا ہے
 زندہ نشہ کام ساقی جو بخشش سے مخاطب ہے
 ختم بھی ہوتا تو تسلی مری ہوتی ساقی بس یہی ..
 افسانہ غم ختم نہیں ہوتا تو کہتے ہیں
 حکایت غم ہجر اں ابھی سے جاؤ شکایت تعب انتظار رہی ہے
 اپنے تئیں تسلی دیتے ہیں

مبش ہے اے دل نقان وزاری، عبث ہے لے دیدہ آشکباری
 عدد سے مانا کہ ہے لگاؤ، گردہ کس سے وفا کریں گے؟
 بڑھاپے درباں سے ربط باہم، یقین ہے اب سب رفیق اپنے
 گلی میں ان کی پھرا کریں گے، ہم ان کے در پر رہا کریں گے
 محاکات | ماہرین سخن امد نقادان فن کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ شاعری محاکات کا دوسرا
 نام ہے یا محاکات کو شاعری کہتے ہیں یعنی کسی واقعے کو بالخصوص کسی ایسے واقعے کو جو محبوب
 سے متعلق ہو اس طرح بیان کرنا کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھر جائے، یہ معلوم ہو کہ یہ واقعہ
 اپنی تمام جزئیات و تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں اور خط حاصل
 کر رہے ہیں۔ تاہم محاکات کے بھی بادشاہ ہیں، وہ جذبات کے بھی بہترین مصور ہیں، وہ احساسات
 عشق کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سماں پھر جاتا ہے مثلاً،

ہوتے ہی وہ دل کا بیاں اٹھ کھڑے ہوئے یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے سنائی

آج پھر ان سے میں احوال دل زار کہوں گا کہتے ہوئے ڈرتا ہوں پہ ناچار کہوں گا
 غصہ میں کہا ہے کہ ہم اب کچھ نہ کہیں گے گر آپ نہیں گے تو میں سو بار کہوں گا
 پیسے کئے دیتا ہوں تم آزر وہ نہ ہونا دلچسپ بیٹھے بھی میں دوچار کہوں گا
 ایک ہار نامہ اپنی رو میں ناظم کے سامنے اس غار مگر صبر و شکیب کا نام لے گئے ناظم
 اہل پڑے۔

رو کو تو سہی اب مجھے۔ لو۔ حضرت ناصح لینا ہی نہ تھا نام ”کسی کا“ مرے آگے
 شعر ذیل دیکھئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہمارے سامنے ہی ہو رہا ہے۔
 کب میں نے کسی بات پہ تکرار نکالی دیکھا مجھے اور آپ نے نکوار نکالی
 ناظم ایک بار حرم ناز میں باریاب ہوئے، وہاں جو کچھ پیش آیا ان کا مونے قلم اس کی
 نقاشی کرتا ہے۔

گیہ تھا کہ ان کی خوشامد کروں وہ اٹا مجھی کو بنانے لگے
 کبھی غیر مقدم، کبھی مرحبا زباں پر یہ الفاظ لانے لگے
 کبھی میرے قربان ہوتے رہے کبھی مجھ کو پنکھا ہلانے لگے

.....
 وہ محفل میں آئیں تو ناظم ضرور

یہ سوال و جواب ملاحظہ ہوں،

کہتے ہیں واہ آپ کی بھی کیا پسند ہے کہتے ہیں واہ آپ کی بھی کیا پسند ہے
 کئے اگر کہ طرز ستم ناپسند ہے

قلم وہ کچھ اور پھر یہ عذر بدتر از گناہ کہتے ہیں مجبور ہوں ناظم تری تقدیر سے

مشتاق نہ بن گئیں | عشق و محبت کی دنیا ایک عالم ہے ماورائے عقل و ہوش۔ ایک عاشق
 ہلکے جوہر و فرقت کے مصائب جھیلتا ہے، ہریت و ہپائی سے دو چار ہوتا ہے اور حسرت و
 الم سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس و جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا، عالم خیال میں اس کا صدر سینا
 بزمِ تحمل بعد ناز و ادا جلوہ فرما ہوتا ہے، تو وہ سوچتا ہے کہ آلامِ ہجر کی شکایت یوں کرنا چاہئے، درد
 فرقت ایسے مؤثر انداز میں بیان کرنا چاہئے کہ اس کا دل بھی موم ہو جائے، دل کی مٹی کچھ اس طرح
 پیش کرنی چاہئے کہ ”وہ“ جفا کار بھی تڑپ اُٹھے لیکن حسن اتفاق سے جب وہ موقع حاصل
 ہو جائے جب حسرتِ محکم پوری ہو رہی ہو، جب آنکھیں لطف دیدہ سے تر ہوں،
 وقت و ماغ کے تیار کئے ہوئے سارے نئے درم برہم ہو جاتے۔
 اور بیانِ دعا کی جرأت نہیں پڑتی لیکن اس منظر کے اقتدار
 کہا کیا؟ صرف حسرت دیدہ پوری کرتے رہے، زبان حرفِ شکایت۔
 حد درجہ ہوش ربا اور تکلیف دہ ہوتا ہے، لیکن چونکہ ”بعد از وقت ہوتا ہے“ اس لئے لامصل۔
 یہ مواقع ناظم کو بھی پیش آئے اور اپنی حسرت کو انھوں نے بھی مختلف اسالیب سے
 بیان کیا ہے مثلاً

کل ہم ان سے مل کے کہ آئے سب اپنا درد دل
 پھر بھی ناظم شکوہ بیداد دریاں رہ گیا

رہ تو آیا اس سے لیکن ہم نشیں دل میں کتا ہوں کہ ناظم کیا کیا؟

وعدہ پر اس سے کیوں قسم مانگی مفت بگڑی، بنی بنائی بات

بت سے ناخوش ہے تو کیوں اٹھ نہیں جاتا ناظم

دیر میں تذکرہ کعبہ و نغم کب تک ؟

اس تم گر کے ظلم سہہ سہہ کر اور ظالم بنا دیا میں نے

وہ غدر ہائے موجد نے کیا کئے ہوئے ہم ان سے گلہ کر کے شرمسار بیت
محبوب سے اختلاف | اگرچہ جذبات محبت 'والمانہ حد تک پہنچے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی کبھی
کبھی اپنے محبوب سے اختلاف بھی کر جاتے ہیں۔ اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیے، ان میں حسن بیان،
لطیف زبان، بے ساختگی الفاظ، اور واردات قلب کا جتنا مکمل نقشہ کھینچا ہے وہ تعریف و توصیف
سے قطعاً بے نیاز ہے۔

تم دیدہ گریاں کو کما کرتے ہو ناسور میں ضد سے اسے ابرگر بار کوں گا
آوارہ و سرگشتہ مجھے کہتے ہو اچھا میں بھی تمہیں بے مروت مٹا کوں گا
مگر بیٹھے ہوئے تم جو مجھے کہتے ہو محبوں میں تم کو نہ لیلیٰ اس بازار کوں گا
تم چاند سے لکڑے پہ کیا کیو نازش میں کا کل مشکیں کو شب تار کوں گا
ایک بار بزم محبوب میں جو پہنچے تو باز پرس ہوئی اور حکم دیا گیا کہ تشریف لے جائیے
ناظم رخصت ہونے سے پیشتر بالفاظ ذیل "صدائے احتجاج" بلند کرتے ہیں۔

مجلس کو توڑ دیجئے میں سب کے ساتھ ہوں لیکن مجھے نہ بزم سے تنہا اٹھائیے
شان عاشقانہ | ناظم کو اپنی عاشقانہ شان پر پندار ہے، فخر ہے اور ہلکی سی تلخ کے وہ صاف
صاف الفاظ میں ظاہر بھی کرتے رہتے ہیں اس لئے کہ محبوب کو غلط فہمی نہ ہو اس لئے وعدہ غلافیوں
اور اپنی انتہا آزمائشوں کو ظاہر کرتے ہیں،

دعدہ گر رو دے کئے جائیے گا روز محبوں کا کہ آج آئیے گا

اپنے متعلق "صفا" دیتے ہیں،

بے بس و بے شکایت میں آکے مل جاؤ سب سے ہیں یاد ستم ہائے بے شمار کے ؛
 بزمِ جن میں بلا اذن و اجازت بارِ یاب ہونا چاہتے ہیں اس لئے چاہتے ہیں کہ تعریف
 ملاقات گئے لئے کچھ فکر کر لیں، اسی گفتگو میں یہ شعر ہو گیا
 گزشتہ کی شغل جلد تراشی میں شب بے جانا ہے بزمِ یار میں کل بے طلب بے
 کہتے ہیں
 تماری ہر بات و نشیں ہے، کسی طرح کا گلہ نہیں ہے
 جوداد دیکھے تو آفریں ہے، چو خبا کہ

لے ہم بھی جھوٹا سمجھتے ہیں لیکن خوش آتی

پھر رہا ہے وہ آج کچھ خوش خوش تو نے ناظم سے کیا کس ہو گا ؛
 نسلی | ”اس کی ستم رانیوں اور جفا کاریوں کا جواب خود دیتے ہیں۔ جب ہم نشیں نہیں ملتا،
 بہرہ و فہم گار نہیں ملتا، تو اپنے دل میں خود تو جہیں اور تاویل میں کرتے ہیں، اور دل کو مطمئن
 کرتے ہیں۔ یہ تو مجاہد و تاویل بھی اپنے اندر حسرت و الم کا نہایت متنازع رنگ رکھتی ہے۔
 خوبی قسمت سے خبر ملی کہ وہ کشورِ دل کا خسرو و بعدشان کبکلا ہی آ رہا ہے، دل بانسوں
 اچھلنے لگا، ہوش و حواس رخصت ہو گئے، قوتِ فہم و فکر زائل ہو گئی، اور سہوت سے سو کر رہ گئے،
 تو اپنے نہیں نسلی دیتے ہیں کہ اس قدر اضطراب کی کیا بات ہے،
 ترے گمروہ آئے ناظم تو یہ اضطراب کیا ہے کوئی بادشاہ آیا کوئی شہسوار آیا ؟
 یہ مانا کہ نالہ تار سا ہے، آہ بے اثر ہے، لیکن
 ناظم تم ان سے روز کے جھاؤ حالِ دل کب تک نہ دیں گے از رہِ شرم و حیا جواب

فلاسی اثر آہ و نالہ پر ناقص ہے نہ دل میں ہیں آؤ یہ بھی کر دیکھیں

اچھا ہوا کہ موسم گل میں ہوئے اسیر چھوڑا ہے ہم نے باغ کو برگِ نوا کے ساتھ
رد و قبولِ خلق سے ناقص غرض نہ رکھ اچھا ہے گر معاملہ تیسرا خدا کے ساتھ

لگاوتِ غیر سے اس کی جلا کر خاک کر دیتی سمجھتے تھے کہ نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کی گاہ؟

خوفِ اثر تو نالہ سے ہے گو اثر نہیں سنتے ہیں ہم کہ ان کو ہمارا خیال ہے
شکوہ | زبان کبھی کبھی حرفِ شکایت سے بھی آہٹا ہو جاتی ہے، لیکن نہایت بے کسانہ لب و
لہجے میں،

میں تو اٹھنے ہی کو تھا بزم سے کیا ہو جاتا جام سے غیر کو دیتے تم اگر میسر بعد
شکوہ بطور طنز

میری وفا کی داد نہ جرمِ عدو سے بحث کیا خوبیاں ہیں میرے تغافلِ شمار میں

شبستاں میں رہو، باغوں میں کھیلو، مجھ سے کیوں پوچھو
کہ راتیں کس طرح کتنی ہیں دن کیوں کر گزرتے ہیں

منزل | بایں دعوائے الفت و محبت، محبوب پر کبھی کبھی ”چوٹ“ بھی کر جاتے ہیں
ان کو خیال تھا کہ نہیں گئے خبر کچھ اور اچھا ہوا مریضِ محبت، برا ہوا

خدا کا خوف ہو تو دل کی مینابی پر دم آئے وگرنہ رقصِ مرغِ نیم بسل بھی تماشا ہے

ہوتے ہی دردِ دل کا کیاں اٹھ کھڑے ہوئے یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے سنا گیا
نم فوش پہنے ہو بزم میں آنے سے غیر کے یہ بھی خبر نہیں ہے کہ ہاتھم خا گیا

آپ تو آئے تھے پوچھنے مرے آنسو کہ مر چلے گھبرا گئے تراوشِ خون جگر سے آپ؟

عذرتِ فریب و تنائے صلحِ جھوٹ صحبتِ جڑ گئی تو بناتے ہیں اب مجھے
بنے کی باتیں | تاظم چونکہ ایک تجربے کا عاشق ہیں، راہِ محبت کے گرم و سرد سے واقف ہیں،
اس لئے اس معاملے پر جوابات کہتے ہیں وہ اس شان سے کہ
کوچہِ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے

مثلاً
تباہِ امتحان و فائیں مسز اسہوز تاظم اگرچہ تجربہ

تاظم و فائے وعدہ کی امید ہے کے مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہو گیا

بہید کے معلوم کرنے کے لئے غمِ خوار ہیں عاشق زار اس کے ہیں کہنے کو میرے یار ہیں
سادہ رویوں کو غلط کہتے ہو تاظم سادہ دل ان کو بھولا کون کتا ہے بڑے ہشیار ہیں

ہے وہ تقریبِ فراق اور یہ تسید وصال وصل ہے لطفِ سوانامہ و پیغام میں ہے
چڑچھاڑ | تاظم ایک شوخ و شنگ طبیعت کے مالک ہیں، عشق و محبت میں کیسر ملکہ تو مترقا دگی
دنیا نش سے کام لینا پڑتا ہے، خوش طبعی اور پر لطف سخن آرائیاں اور زیادہ باعثِ کلفت

ہماری ہیں لیکن تاہم اس غم و الم کی فراوانی کے باوجود کسی بھی منہس کہ بھی نظر آتے ہیں اور صرف
 یہ نہیں بلکہ صوبہ پر بھی کسی کوئی فقرہ کس وسیع ہیں، کسی کسی اور انداز سے لے کر پھیلنے ہیں
 غرض اسے دل کی ہر اس نکالنے کا کوئی نہ کوئی موقع حال ہی لیے ہیں، فرماتے ہیں،
 دوست چپ بیٹھا ہے آخر شکوہ بجا کریں اس بنانے سے وہ گرم گفتگو ہو جائے گا

دیکھیں اب سن کر گیا ہیں کیوں کر درباں طرح سے خانہ پڑی ہے درد لہا کے پاس

اپنے مقصد کے لئے تو بھی مگر لائے رجوع کاش مہذب کہیں سب ترے دیوانے کو

مختلف کیا ہے مگر صورت میں ہر دم سے بہتر ہو طریق ظلم میں بھی دو قدم گروں سے بڑھ کر ہو

رہا ناہم کوئی دن اور زندہ ترے ناوک نے سناہوں خطا کی

ناہم کہی نہ کوچے میں تیرے قدم رکھے بیچارہ کیا کرے کہ یہی رہ گزار ہے

کیوں چھپا تھے حال رنجش غیسر ہم نے بھی سن لیا کسی سے ہے

دیکھو تو کہ وہ غصہ میں کیا کرتے ہیں تاہم کیوں ان سے کہی شکوہ بے جا نہیں کرتے
 شوخی | شہر کا ایک اہم موضوع رندی و سرستی، شوخی و ہنسی اور واعظ و ناصح کے ساتھ
 جنگ و جدل ہے۔ بلاشبہ ہر شاعر نے بقدر زور طبیعت و اعظ و ناصح کی پگڑی اچھالی ہے،
 آواز کے ہیں اور ان بے جاوں کو ہر طرح آماجگاہ زور طبع بنایا ہے۔ تاہم بھی کسی سے

بچے نہیں ہیں، دو بھی اپنی دہی دہستی کی کھاتیں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں "انہیں بھی
 جب دماغ یا ناس سے ہلا پڑتا ہے تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے وہ قبرے کتے ہیں کہ شاید ناس صاحب
 یا دماغ صاحب بھی جیسے بغیر نہ رہتے ہوں۔ لیکن اس کا خیال رکھا ہے کہ ابتداں دسوقیت کی
 اپنے دہن کو ہوا کبھی نہیں لگنے دی، حالانکہ اس میدان میں "بڑے بڑے شعرا سے" بڑی بڑی
 لہر تھیں ہو چکی ہیں۔ درحقیقت یہ وادی بھی ہے بہت خارزار۔ ابتداں دشواری میں بہت کم فرق
 ہے، یوں تو دشواری نہایت پسندیدہ چیز ہے لیکن ذرا ابتداں کا رنگ آیا کہ شعرِ نضر سے گرا، بلکہ میں
 تو یہ کہتا ہوں کہ شاعرِ نضر سے گرا۔

لیکن ناظم نے سنجیدگی اور عزت کو ساتھ ساتھ نبھانے کی کوشش کی۔
 ہے کہ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے، مثلاً
 دماغ و شیخ سبھی خوب ہیں کیا تبتلاؤں میں نے ہے :

لی عتب نے گھر کی تلاشی تو کیا ہوا	نکلا سبوتے کتنے میں سرکہ صبر ہوا
عزم مجاز حضرت ناظم سے تھا بے حد	سنتا ہوں راہ میں سے پھر آئے جلا ہوا

زاہد کو کیوں شراب کا یارب مزا پڑا	رسوائے شہر و کوچہ و بازار ہو گیا
سکین کا لین دین نہ تھاے فروش سے	آخو گدائے خانہ خمار ہو گیا

معتقد ہوں کعبہ کا ناظم گہرواں جا کر مجھے	عبرت آتی ہے کہ کیا تجمانہ دیراں ہو گیا
------------------------------------------	----------------------------------------

درمت سے میں سنا کیجئے دماغ کا بیاں	بحث نادان سے کیوں کیجئے دانا ہو کر
------------------------------------	------------------------------------

سمنوں سی وہد کاسید گرے شیخ اچانیں با ایں ہستہ تکین و عیار قہیں

معرفت عالم و عابد کو کہاں ہے ناظم بس یہ اتنے ہیں کہ اور ادوسائل جانیں

اس بت کا کوچہ سجد جامع نہیں ہے شیخ اٹھے اور اپنا یاں سے مصللاً اٹھائے

پڑھتا ہے شراب پی کے لاجول ناظم رندوں میں پارسا ہے

مردم کیوں رہیں گے شراب طہور سے آخر خدا کے ہندے ہیں ہم بادہ خوار بھی

آج ساقی یار کے گھر دعوت اغیار ہے کیا مزا جو گر غم سے میں نمک داں چھوڑے
حائق | ناظم مرث ایک عاشق ناکام ہی نہیں ہیں کہ جن کا صحیفہ زندگی عشق و محبت کی داستانوں
ہوا وہوس کی حکایتوں اور زندگی و مرستی کے ولوں سے لبریز ہو، بلکہ وہ صبح سمنوں میں
ایک "شاعر" ہیں۔ ان کی نظر فطرت کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے اور وہ وہ سب کچھ دیکھتے ہیں
جو ایک مفکر دیکھ سکتا ہے۔ جب وہ حقائق و معارف، اسرار و نکات، اور حکمت و موفقت پر کچھ
کتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ایک نکتہ رس اور دقیقہ سنخ فلسفی ہے جو رموز فطرت کی گرہ کشائی کر رہا
ہے۔ اس موضوع پر جب وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی حیثیت بالکل بدل جاتی ہے۔
مثلاً منصور و نعرہ منصور پر تقریباً ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے اور جس کی رسائی فکر
جاں تک ہو سکتی تھی وہاں تک اس نے اپنے خیالات اپنے اسلوب میں ظاہر کئے ہیں، لیکن ناظم
نے اس مسئلہ پر جو بات کہی ہے وہ نہ مرث اپنے انداز بیان اور اسلوب اداس کے اعتبار سے بہت
خوب ہے بلکہ نفس مسئلہ پر انھوں نے اپنی جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی ان کی دقت نظر پر شاہد

ہے۔ کہتے ہیں،
 اے نواسنج انا الحق ترا دعوے سچ ہے ایک دستور نہیں قطرہ کو دریا کسنا
 اس موقع پر مجھے اکبر الہ آبادی کا بھی ایک شعر یاد آگیا۔ انہوں نے بھی بہت مقبول
 بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں،
 حضرت منصور ”انا“ بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ
 دار تک تکلیف ذما نہیں : ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اکبر صاحب کہتے ہیں کہ منصور ”حق“ کے ساتھ
 میں اتنا ہوش ہے کہ ”انانیت“ اب تک باقی ہے تو وہ
 جس کے ہوش و حواس گم ہو چکے ہوں اور اتنا داصل بالحق :
 حقیقت سے مل گیا لیکن جو شخص اس منزل پر پہنچ جائے گا وہ من و توڑے امیر سے بہتر
 ہو جائے گا اور آپ جب ابھی اس منزل میں ہیں کہ آپ کو ”انا“ کا احساس ہے تو آپ دور
 تک تکلیف کیجئے۔

تا غم کہتے ہیں ”انا الحق“ کا دعوے صحیح ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ قطرہ کو دریا کسنا کب مناسب
 ہے۔ تمہاری حیثیت تو ایک قطرے کی ہے اور وہ ”حقیقت“ ایک بحر ہے کراں، تو ایک قطرے
 کو یہ کب زیب دیتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرنے لگے کہ دریا میں ہوں۔ معلوم ہوتا ہے تم اپنی حقیقت
 ہی نہیں سمجھتے۔

اکبر و ناظم کی فکر کا یہ طبع فرق ارباب نظر کے لئے یقیناً باعث لطف ہو گا۔ دوسری
 حقیقت ملاحظہ ہو،

یوں تو ہو جاتا ہے ہر اک مین و عشرت کا شریک دوست کہتے ہیں اسے جو مصیبت کا شریک

کون ہو گا کہ نہ ہو معتقد فصل ہزار موسم اچھا ہے پہ کئے کہ یوم کب تک

خود کو بے پروا نہ بنے اچھا کہیں گے وہ آئینہ کو منہ رخ نہیں زنگبار میں

تم اپنی جالی سے بدنام ہو گئے ہنس یہ اہل صومعہ چپ چپ کے کیا نہیں کہتے

ہم تو پروانے کے قائل ہیں کہ چکا چل جائے بے لعل نغمہ سرا عاشق غوغائی ہے
عیش و مستی اور کھا چکا ہے کہ ناظم کی زندگی کا ماحول عیش و عشرت تھا، چنگ و رباب تھا،
ساغر و مینا تھا لیکن اپنے اس ماحول سے بناوٹ کر کے انہوں نے اپنی زندگی کے لئے ایک
نئی شاہراہ نکالی تھی جو وادی نجد میں جا کر ختم ہوتی تھی، لیکن پھر بھی وہ زندگی جس میں ان کی
پرورش ہوئی تھی کبھی کبھی ان کے سامنے "خوش باش دے کہ زندگانی ایت" کی دعوت بھی
دیدیتی ہے اور وہ بعض بعض مواقع پر ان جذبات عیش و مستی کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے، "نونا"
شراب و شاہد و مطرب سے کام رکھنا ناظم کے خیال سے کہ انتخاب کام کیا ہوگا

مجلس اہل ورع نور کا دریا ہی سہی دل لگی صحبت رنداں سے آشام میں ہر

تبلیغ و درد دلی و مصیلت نہیں پسند چنگ و رباب و ساغر و مینا پسند ہے
قدرتِ تشبیہ تشبیہ و استعارے کو صحیح طور سے استعمال کرنا بھی ایک کمال ہے، بڑے بڑے شعرا
نے اس میدان میں ٹھوکریں کھائی ہیں مثلاً آپ نے یہ زبان زود خاص و عام مصرعہ ضرور سنا ہوگا،
جوبات کی خدا کی قسم لا جواب کی

لیکن اس کا پہلا مصرعہ سنئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تشبیہ و استعارے کو "استادوں" نے کس کس
طرح استعمال کیا ہے،

باپوش میں لٹائی کرن آفتاب کی جوبات کی..... الخ

لیکن تاہم اہل تشبیہ میں بھی ایک خاص بات پیدا کر دیئے ہیں
 لے وہ ایسا ہی سہی پر ہے تنزل و پریش بدشگونی ہے جو تجھ کو مرہ کال سمجھیں
 تو ارد [تاہم] کے کلام کا تمام و کمال معاملہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دیوان میں ایسے
 اشعار بھی ہیں جو غالب سے بالبعض اور شعرا کے اشعار سے ٹکراتے ہیں۔ اب یہ آپ کی خوش فہمی
 پر منحصر ہے خواہ آپ اسے سرود سمجھیں، تو ارد سمجھیں، سینہ زوری سمجھیں، جو چاہیں سمجھیں لیکن یہ واقعہ
 ہے کہ ان کے بعض اشعار دوسرے شعرا کے اشعار سے ٹکراتے ضرور ہیں۔

تاہم کا شعر ہے

پڑھ کے خط نام غیر سے ان کو مال اپنا

اسی مفہوم کا ایک مشور شعر یہ بھی ہے

سناتے ہیں انھیں افسانہ قیس بنانے ہیں

تاہم :- الفت بری بلا ہے کہ تاہم بایں تیسر + کرنی پڑی رقیب کی جی اسیا ہے
 مومن :- اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا دلیل + میں کو چہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا
 تاہم :- لگاؤٹ غیر سے اس کی جلا کر خاک کر دیتی + سمجھتے گرنہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کس کا ہے
 غالب :- اشک کتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حین + عقل کستی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
 تاہم :- کب میں نے کسی بات پہ ٹکرا رہا نکالی + دیکھا مجھے اور آپ نے تلوار نکالی
 غالب :- ہر ایک بات پر کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے + تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
 تاہم :- بار محفل میں نہ تھا کسی دن اور اب + روز دو چار گھنٹی رہتی ہے خلوت مجھ سے
 مستی :- کئی بار آنا دوسرے لطف سے + عطا پر عطا ہے کرم پر کرم
 تاہم :- ملے گی محشر میں داد ہم کو بندھا ہے یہ اعتقاد کہو + ملی نہ والی بھی مراد ہم کو تو پھر بتاؤ کہ کیا کرینگے
 غالب :- ولے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو + اب ملک تو یہ توقع تھی کہ وہاں ہو جائیگا
 تاہم :- عاشق ہوا اس آفت جاں پر مرانہم + جب خوب میرا محرم اسرار ہو چکا

مگر اس پہلی دق کا اود پھر یہاں اپنا ہو گیا رقیب آخر تھا جو راز دہاں اپنا
 ایسا ہی کیا مگر کوئی رعایت شعری کا اگر موقع سے استعمال کیا جائے تو طعنت کلام دو بالا
 ہو جاتا ہے لیکن آپ قدیم شعرا کے دو ادین اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ تقریباً ہر شاعر
 نے اس صنعت طبع سے اپنے کلام کو زینت دینا چاہی ہے۔ لیکن جب اس قسم کے اشعار
 کا انتہائی کچھ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ۱۵ فی صدی اشعار نہایت محل طور سے خراب ہو کے رو گئے
 ہیں۔ ایک زمانے میں تو شاعری 'رعایت لفظی' ضلع بگت اور بھکڑ بازی میں منحصر ہو کے رہ گئی تھی
 لیکن اس دور ناموسود سے پیشتر اور بعد بھی جب شعرا نے اس پر طبع آزمائی کی تو بلا تامل یہ کسا
 جاسکتا ہے کہ ان میں سے اکثر بالکل ناکام رہے اور جو محدود و چند کامیاب ہوئے وہ بھی صرف
 کسی حد تک 'ورنہ ۱۵ فی صدی ان کے اشعار بھی

اس وقت بے معنی غرق ہوئے ناب اولیٰ

کے مصداق ہو کر رہ گئے ہیں۔

لیکن ناظم اس معاملے میں غور فرمائیے۔ میں نے ان کے پورے کلام کا مطالعہ کیا ہے
 اور اس موضوع پر ان کے جو اشعار میں نے جمع کئے ان میں عیب تلاش کئے لیکن اس کا اعتراف
 ہے کہ کم از کم میری نظر میں کوئی شعر نہیں کھٹکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ
 رعایت لفظی جیسی صنعت میں کسی شاعر نے سیکڑوں اشعار رکھے ہوں اور ایک بھی ایسا نہ ملے جو
 محل کما جائے یا جس سے طعنت زبان میں ذرا بھی رکاوٹ نہ پیدا ہوتی ہو۔ نمونہ چند اشعار
 آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ وہ الفاظ خط کشیدہ ہیں جن سے اس صنعت کو ظاہر کیا گیا ہے:-
 کیوں آئے ہو تربت پہ مری ساتھ عدد کے میں مردہ ہوں مردہ کو جلانا نہیں اچھا

ناظم نہ رکھ اس آہوئے وحشی سے چشم طعنت میں میں نہیں ہے التس وہ انسان ہی نہیں

نئی تہذیبِ چٹم وہ طالع کو مل گئی ہے دغل کس کو بخشش پر ہزدگاریں

تم بھی بن جاؤ گے یلیٰ کی نظیر نہ کہو قیس کا ہر مجھ کو

رخصت عرض مال کیا مانگوں کہ نہ بیٹھیں کہیں کہ رخصت ہو

بیو خانی کا داغ کیسا ہے ہم نے

منہ ترا دیکھنا نصیب نہ ہو منہ سے نہی

وہ اُٹے محفل سے ناظم مجھ کو آتا دیکھ کر ادیں سمجھا کہ اُٹتے ہیں مری تعظیم کو

تھک کیا ہر صورت میں مردِ مہر سے بہتر ہو طریقِ ظلم میں بھی دو قدم گردوں سے بڑھ کر ہو

بھوٹی دیکھی جو صراحی سے کی میں نے جانا مری قسمت ہو گی

اس کو یوں خاک پر لے متسبِ شرع نہ چپک حرمتِ بادہ بہت مشربِ اسلام میں ہے

بہت کہنے سے آجاتی ہے خدا انسان کو ناظم نہ کر تکرار ان سے گویا تکرار میں آئے

مردہ زندوں کو تری آن سے ہم دیکھتے ہیں زندہ مردوں کو تری تان سے ہم دیکھتے ہیں

خدا مراد کے تئیں رحم تو آیا لیکن یہ بھی قیمت کا لکھا تھا کہ پڑھا میرے بعد
 جتنی اشعار ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر شعر کے اند کوئی نہ کوئی
 خوبی ضرور موجود ہے، لیکن چونکہ منتخب اشعار کی تعداد کم ہے اس لئے کسی مخصوص عنوان کے ساتھ
 دو ایک شعر کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ بہر حال وہ اشعار یہ ہیں :-
 تم کرد ترک جفا کیا اسکاں ہم کریں ترک وفا کیا باعث؟

کیا اس نے قتل اور میں نے صاف عبث اہل شہر اس کا چرچا کریں

خدا کو دینی جو جان ہوم نہیں ہے مرنے کا مجھ کو کچھ غم
 یہی ہے رونا کہ میں نہ ہوں گا تو پھر وہ کس پر جفا کریں گے؟

ڈرتے ہیں منتخب سے بھلا آئے تو سہی ابھی کسی کہ ساعشرہ دینا اٹھائے

کرتے ہیں عبث غور کیا آپ؟ ہیں کوئی جناب کبر یا آپ؟

کل جو کچھ دل کی بیتیاری کا ' تذکرہ ان سے ایک بار ہوا
 ہنس کے کہنے لگے کہ کیوں صبا دل کہاں تھا کہ بقیہ دار ہوا
 اس میں وہ کیا کرشمہ ہے قائم جس سے پھر تو امیدوار ہوا

وہ نے ترے زلیست کی تو قیر بڑھائی مرتے ہیں پر مرنے کی تمنا نہیں کرتے

شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلم پر کوئی نہ جانے ہیں ایسے بھی نہیں ہم

شہرے کہتے ہیں کیا کناہِ ناظمِ دواہ وا اس غزل کو سن کے میں قائل تمہارا ہو گیا

خضر ہے وادیِ محبت کا کیوں نہ ناظم کے ہم قدم چو میں

چند اور اشعار | ناظم کی وہ مشہور نظم جو ”میں نے کہا کہ دعویٰ الفت“
اور وہ غزل جس کا آغاز ”وہ حسن نہیں نام خدا اور ہی کچھ ہے“
سے قصداً نظر انداز کر دیں اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں بہت مشہور
تھی کہ ان کا مشہور کلام پیش کیا جائے۔ اس محبت کا مقصد تو صرف غیر معروف اشعار
تھی اور بس۔

ختم کلام | کلام ناظم پر غور و فکر کے بعد جو رائے قائم کی گئی تھی اور کلام ناظم کا انتخاب کیا گیا تھا
وہ آپ کے سامنے پیش ہے۔

آخر میں جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں یہ اور عرض کروں گا کہ ناظم کے کلام
اور غالب کے دیوان کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ناظم
نے اگرچہ غالب سے استفادہ کیا لیکن ان کا رنگ طبعیت، رنگ شاعری اور طرز اسلوب
غالب سے بالکل جدا ہے اور یہ فرق صرف زبان و بیان ہی میں نمایاں نہیں ہے بلکہ فکر و خیال
میں بھی ایسا ہی اہم فرق نظر آتا ہے جیسا زبان و بیان میں دونوں کا رنگ ایک مستقل چیز ہے۔
غالب ایک فلسفی ہے، ایک خوددار عاشق ہے، ایک گدے ٹکڑے ہے، فارسی ترکیبیں
اطلاق و پیچیدگی کے ساتھ اس کے کلام کا اہم جزو ہیں۔ اس کی رسائی نگر و ہاں تک ہے
جہاں تک ہر کہ وہ پہنچ نہیں سکتا۔

پس اس کے ماتم ایک شاعر ہے، ایک سپر انگلند عاشق ہے، ایک دل زدہ مظلوم ہے،
 ایک پیکرِ کرم، ایک مجنہٴ حسرت ہے۔ اس کے ہاں نیا نش و نشاندگی ہے، جاں نثاری، جاں بازی
 ہے، اور کبھی کبھی نغمہ شادی ہے جو دیکھتے دیکھتے نغمہ غم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
 بس ان دونوں کا فرق صرف اسی قدر ہے کہ غالب اپنی قریرِ خار کو "نولہ سروش"
 سمجھتا ہے اور یہ بے چارہ "رخصتِ عرضِ مال" ہی کرتا رہ جاتا ہے۔

غزل

از حضرت امجد گوٹھی

کوئی محلِ نشیں کیوں شادیاں شاد ہوتا ہے
 قفس کیا؟ حلقہ لے دام کیا؟ دنجِ اسیری کیا؟
 ہمار سبزہ و گل ہے، کرم ہوتا ہے ساقی کا
 یہ سب نا آشنائے لذت پرواز ہیں شاید
 بارِ انجامِ سمجھوں؟ اس چمن کا یا نزاں سمجھوں؟
 بنالیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
 سائے جار ہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ دلیر
 قفس کی تیلیوں پر شاخِ گل کا رنگ ہر اتیک
 دمانہ ہے کہ خوگر سہرا ہے شور و شیون کا
 مگر کوتاہیِ ذوقِ گل ہے خود گرفتاری

یہاں مستوں کے سر الزام سہی ہی نہیں صفر

اب اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

بدچلن بیوی

ہم چائے خانے میں بیٹھے ہوئے اور حرادہ کی باتیں کر رہے تھے۔ بات میں بات نخل آتی ہو کسی نے ان جھلکڑوں کا تذکرہ چھیڑ دیا جو اور باتیں تو ایک طرف خود اپنے ذاتی معاملات کو خواہ وہ کیسے ہی اہم کیوں نہ ہوں اس طرح بھول بیٹھے ہیں کہ سن کر نہ صرف تعجب معلوم ہوتا ہے بلکہ بالکل یقین نہیں آتا۔ پھر کیا تھا ہر ایک نے اپنا اپنا تجربہ بیان کیا۔ سنی ہوئی مرنے دار کہانیاں دہرائیں دیکھے ہوئے تھے سنائے۔

ان قصوں اور کہانیوں کی ایک عام خصوصیت یہ تھی کہ ان کے پروفیسر مشہور فلسفی اور سائنس دان ہی تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ فکر کرنے کی عادت انہیں اپنے ماحول سے بالکل بے خبر کر دیتی ہے۔

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ہماری نظریں بے اختیار پروفیسر عبدالکریم کی طرف پئیں۔ یہ سب وہ جانتے تھے کہ وہ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ہیں لہذا اس میں امید تھی کہ اس خصوص میں جناب کے واقعات نہایت ہی دلچسپ ہوں گے۔

لیکن امین بیگ جو اتفاق سے ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا تھا بڑا مسخرو تھا۔ اس نے پروفیسر صاحب پر دیدے لگادے اور لگا انہیں سر سے پیر تک گھورنے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی عجیب الخلقیت مخلوق کا نہایت ہی غور و خوض اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہا ہے۔

پروفیسر صاحب ان تسخر آمیز نظروں سے بہت گھبرائے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا امین بیگ سے پوچھا ”کیوں سبھی کیا بات ہے جو اس طرح گھور رہے ہو؟ مجھے دنیا کی کوئی نئی مخلوق تو نہیں سمجھ رہا ہے جو اس طرح سر سے پیر تک کا جائزہ لیتے ہو؟ میرے سر پر دو سینگ تو نہیں ہیں؟“ امین نے جھٹ سے جواب دیا ”نہیں جناب مجھے یہ گستاخی نہیں ہو سکتی۔ میں تو دیکھ

ہاتھ لگائیں آپ اپنی نکتائی کالز ہٹا دیں اور کوئی چیز تو نہیں بھول گئے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے سٹیس کی قسم کی کمی نہیں۔ لہذا مجھے آپ کے تجربہ عملی پر شک ہوتا ہے کیونکہ اگر آپ ایسے ہی نجی علامہ ہوتے جیسا کہ عام طور پر سمجھے جاتے ہیں تو آپ کی بھول کا کچھ نہ کچھ ثبوت ضرور ملتا۔

یہ سن کر پروفیسر صاحب مسکرائے اور فرمایا: ”اور تو تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ مجھے بھولنے کی عادت نہیں ہے؟“ پھر اپنا قصہ یوں بیان کرنے لگے۔

انسان پر بعض ایسے کڑے دن آتے ہیں کہ کسی طرح نہیں بھولتے۔ مجھ پر بھی یہی واردات گزری۔ ایک دن میں سویرے اٹھا۔ اس وقت مجھے کسی قسم کا رنج و ملال نہیں تھا، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اس دن کے ختم ہونے سے پہلے مجھ پر ایسا صدمہ پڑے گا جس سے میرے دماغ کی چولیس ڈیگری ہو جائیں گی۔

میں نے ناشتہ کیا اور صبح کی ڈاک دیکھنے بیٹھا۔ اس میں مجھے ایک خط ملا جس کے بھیجنے والے کو میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے لفافے پر بہت غور کیا لیکن پھر بھی مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ لکھنے والا کون ہے۔ ڈاک تو مقامی ہی تھی لیکن خط اتنا برا تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔

پھر میں نے اس کو کھولا اور کھول کر پڑھا ہی تھا کہ دم سم رو گیا۔ میرے حواس بگڑ گئے، دم چڑھنے لگا اور عقل غائب غلبہ ہو گئی۔ غصہ کے مارے تھرائے لگا۔

خط کا مضمون یہ تھا:

”پیارے استاد“

مجھے یہ کتنے ہوئے سخت صدمہ ہوتا ہے کہ آپ کی بیوی آپ سے یوں فانی کئی ہے اور

ایک شخص سے جس کا نام حسین بیگ ہے ناجائز تعلقات رکھتی ہے۔ شاید وہ آپ کا لافانی بھی ہے۔

ان دونوں کے تعلقات قدیم ہیں اور گہرے ہیں۔ ان کی لافانیوں بلاناغہ ہمیشہ ہوتی ہی رہتی ہیں آپ

کو کیا خبر کہ لوگ آپ پر ہنستے اور آپ پر ہنسا ڈالتے ہیں۔ آپ تو ہمیشہ اپنے نظریات اور مباحث میں

شغول رہتے ہیں اور آپ کی عزت و آبرو ہے کہ بچے بچے کی زبان پر غمزہ بنی ہوئی ہے۔ اگر آپ کو

میری کائناتیں تیں ہمتا ہے کہ آج دن کے گیارہ بجے "دلفریز" جانے اور ماشق و
مشوق کو اپنی ہرماہ خلعت سے مہماں نمازہ اٹھاتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھئے:

‘میری بھئی اور وطن‘

اس کے دوسرے شخص سے ناجائز تعلقات ہیں۔ یہ دونوں ہیشہ ملتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت
لوگوں کو معلوم ہے اور مجھے نہیں۔ ہاں یہ قسمی داتے یہ بھیبی !
اس دل دلاوینے والے لفظ میں میرے سامنے خون کی ندیاں بنے نکلیں قتل خونریزی
دار دیگر اور کشت و خون کا سماں بندہ گیا۔ ہر دم کی سزا کا خیال جوا۔
آیا اور میں غصے سے نمرانے لگا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس عزت ریزی کا مجھے ضرور ہی
اور بے وفا عورت کو ضرور ہی قتل کرنا چاہئے۔ اس کے ساتھ اس کے بد ماس ماس بن۔
کے گھاٹ اتارنا چاہئے چاہے اس میں مجھے پھانسی پر ہی لٹکنا کیوں نہ پڑے۔
اتنے میں گھڑی نے دس بجائے اور اب ان بد ماس عاشق و معشوق کی ردیل حرکات
کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے مجھے ایک ہی گھنٹہ رہ گیا تھا۔

فران میں اپنے کتبخانہ والے کمرے میں گیا۔ اپنا پیچہ نکالا اور اس میں گولیاں بھر لیں۔
دنیا میری آنکھوں میں اندھیری ہو گئی۔ اب مجھے انسان کا خون بنانا بالکل آسان سی شے
نظر آنے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ایک مذہب اور شریعت انسان کس طرح خون کرنے پر آمادہ ہوتا ہے
اور تمام مظاہر انسانیت سے عاری ہو کر ایک خونخوار درندے کی طرح کیوں کر انسانی خون سے اپنی
پیاس بجھاتا ہے۔

لیکن اسی وقت مجھے ایک اور خیال پیدا ہوا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ خط بھی اسی سکارہ نے
لکھا ہوگا کہ اس بہانے سے مجھے گھر سے چلا کے اپنے عاشق کو بلائے اور مزے اڑائے۔
‘ہاں ہاں یہی ہے جیک یہی ہے‘

پنچائی کا میرا ہوا ہے کہ میں ”دلفروز باغ“ جا کے حیران و سرگرداں پھرتا رہوں اور وہ اپنے ماضی کے ساتھ خالی گھر میں گھبرے اڑائے۔

لیکن وہ ایسا کیوں سمجھنے لگی کہ میں اس پر شک یا گمان کر رہا ہوں۔ کیوں وہ چپ رہ کر بیٹھتا ہے آپ کو میرے شک و شبہ کا نشانہ بناتی؟

نہیں یہ ظالم میرے کسی غلط دوست ہی نے لکھا ہے تاکہ میری آنکھیں کھلیں اور میں اپنی عزت دینی کا دھڑلے لوں۔

آخر میں نے جانے کا حکم ارادہ کر لیا اور کپڑے پہن لئے۔ لیکن غصہ و غضب سے میں کانپ رہا تھا۔ خوف یہ تھا کہ میں اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکوں گا۔

میں نے کپڑے پہن لئے۔ سر پر ٹوپی رکھی اور نکلنے کا ارادہ کیا اور اس وقت اور صرف اس وقت جبکہ میں کامل ایک گھنٹہ غم دالم یاں و ناامیدی اور غصہ و غضب کے دیا میں غوطے لگا چکا۔

اس وقت مجھے یاد آیا اور تب تک میں بھولا ہوا تھا کہ ”ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔“



تنقید و تبصرہ

کتاب

تجلیاتِ فرخ: مثنوی حسنِ فطرت۔ روحِ ظرافت۔ حفظِ العلوم۔ میکہ۔
 احتقاقِ حق۔ التماہُ انوری۔ معقناتِ المعروف۔ رخصت۔
 اسلامی نظامِ تعلیم۔ فضائلِ رضد

تجلیاتِ فرخ | مبلوہ سرفراز قومی پریس کھنٹو۔ تجلیاتِ فرخ کے نام سے

ہے قطعِ رسمی۔ کاغذ سفید سمولی ہے۔ ملاوہ نظموں۔ غزلوں اور رباعیات کے ایک سہریہ اور زیبِ عددہ بی
 شامل ہے۔ تبصرہ مولانا رفی احمد صاحب رتقی دہلوی اور مقدمہ جناب ضیاء احمد صاحب ایم اے پروفیسر
 علی گڑھ نے لکھا ہے تبصرہ میں شاعرانہ نظرسے اور مقدمہ میں ناقدانہ حیثیت سے جناب فرخ کے کلام پر اظہار
 خیال کیا گیا ہے اور اس کی خوبیوں کو مثالیں دیکر پیش کیا ہے

جناب فرخ کے کلام میں ملاوہ غزلیات کے نظموں اور رباعیوں کی مقبول تعداد ہے اور ایک قصیدہ
 تقریب ولادتِ حضرت علی علیہ السلام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے

پروفیسر ضیاء احمد صاحب کا مقدمہ زبانِ اردو کی تاریخ اور اس کے دور ارتقائی سے بھی بحث کرتا ہے
 اور اس موقع پر وہ فرماتے ہیں کہ ”یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ موجودہ تنزل پہلے کی نسبت واقعیت و
 انبیکے زیادہ قریب آگیا ہے“ اسی بات کو دوسری جگہ ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے کہ ”یہ دور حقیقت۔
 تخلیقی پرستی کا دور ہے“ اور مزید تفصیل کے لئے فرماتے ہیں کہ ”دورِ حال کے متغزلین کے خیالات دورِ مندول
 اور دفاہرستِ لوح کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ اندول می نیزد بر
 دل می نیزد“.....“

زبان و شعریں جس قدر انقلاب گذشتہ پچاس سال میں ہوئے وہ اہل ذوق کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔
 لیکن زمانہ حال کے غزل گو شعرا کو۔ ان صفات سے یکسر بیگانہ قرار دینا جو قدما کی خصوصیات بھی جاتی

کتاب میں درج ہے اور گو یہ بحث اگلا ہے کہ وہ صفات کیا گئے خود بھی نہیں دیکھی ادب و
 فن کے لیے کچھ ذریت و زید تھا۔ یا ایک بڑا دانا لیکن محض جو وہ تھا کہ پورے شعراء عالی
 قدر و مستارہ زبان و بیان میں ایسے اہموں کے پانہ میں بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ بعد
 میں ان کا لقب کار و ناپا ہوا ہر کیا عام ہے وہ غالباً سالفہ شاہانہ کے عہد میں داخل ہے
 بابا فرخ کے کام میں لطف زبان بھی ہے اور لطف بیان بھی، مضامین میں بہت سی وقامت پسندی
 نہیں نقل کی ہے اور بالعموم غزل بھی ہے بعض اشعار نہایت عمدہ ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ نقل کئے جاتے
 ہیں ان سے کتاب منظر نہیں ہے

فرخ اہل نے نکول دئے عقد ہائے زینت
 قاتل کثافت ماصل اخفائے راز کا

ہم گئی چاک گر یا لہ کی نگاہوں میں بہار
 جلوہ گل کس قدر فرخ جنوں انگیز تھا

بقدر ذوق بود آستان ہنس عطا
 زمیں سے توڑے آسمان ہنس ملتا

جس کی آتی ہے کانوں میں دور سے آواز
 تلاش میں ہوں مگر کارواں نہیں ملتا

کتاب بحیثیت مجموعی دیکھی ہے چرخ کے قابل ہے قیمت معمر اور علی پادوی صاحب فرزند مصنف
 علامہ انوار اناؤ سے مل سکتی ہے۔

شیخوئی حسن فطرت | مصنفہ جناب منشی گورکھ پرشاد صاحبہ حیرت مرحوم گوردکھ پوری بطور دیوانہ شاعرت

کتاب

کے زوہان اہل علم جناب مجنوں گورکھپوری کی ادبی خدمات کے سلسلے میں ہیں ثنوی حسن فطرت
مائل ہوتی ہے جو کئی جہتوں سے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ پچھلے روز دیر سفید کاغذ پر۔ جیسی قطع اور
عمدہ کتابت و طبع کے ساتھ شائع ہوئی ہے جناب مجنوں کا مقدمہ ثنوی کی خصوصیات پر ایک جامع
مضمون ہے۔ منشی گورکھ پرشاد صاحب گورکھپور کے ممتاز وکیل۔ بے۔ ادب و زبان کا ذوق رکھتے تھے اور
شعر سے خاص مناسبت تھی ان کا زمانہ مآلی و آزاد کا زمانہ تھا تعلیم نے اس اثر کو ا۔ بھلا دیا خدا بخیر
ثنوی کی تو قدیم طرز کو مجوز کر غالب صورت اختیار کی اور حسن۔

اور انہیں کو قصہ کے افراد قرار دے کر ایک فسانہ بنا دیا

ثنوی کی بحر بھی جدا گانہ ہے زبان نہایت صاف اور محاورا۔

ہر ایک فقرہ کو دم سے کے وہ سلاتا ہے

وہ اپنی گوں پہ ہر اک شخص کو لگاتا ہے

...

سری نگاہوں میں تاریک سب خدا ہی ہے

مگر کی چٹ ہے فسر زند کی جدائی ہے

لیکن اس جدت طرازی سے قصہ کا لطف نہایت کم ہو گیا۔ بے عذرانہ حیثیت سے اس امر پر تنقید کرنا
دشوا ہے اس لئے اس جدت طرازی نے اس کو قدیم طرز کی ثنویوں سے بالکل جدا گانہ حیثیت دیدی
ہے کتاب کی طبعیت نہایت دیدہ زیب اور کاغذ قیمتی اور خوبصورت ہے ۱۲ قیمت پر ایوان احسان
گورکھپور سے حاصل ہو سکتی ہے

روحِ ظرافت | منو اعظم بیگ چغتائی ایم اے ایل ایل بی وکیل جو وہ پور اپنی ظرافت نگاری اور رسائل
نوازی کے باعث مشہور اہل قلم ہیں۔ آپ کی ظرافت کا حلقہ بیت وسیع ہے اور وہ ہر قصہ اور ہر
بات میں اس طرح چمک اٹھتی ہے کہ کثیر التعداد اردو قصے پڑھنے والے اس سے لطف اٹھاتے ہیں

کے اندر جو اس طبقہ کے مذاق کی خصوصیت سے رعایت رکھتے ہیں۔ کتاب شروع سے آخر تک
مطبوعہ اور بیان کا لطف کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا البتہ قصہ کی سلیبت سے نیز
ذاتی اور نظریاتی طرز کے اعتبار سے ان افسانوں میں ترقی کی بہت گنجائش ہے

تیسرا حصہ | یہ کتاب اردو افسانوں کو پہلی بار جو پانچ پانچ سو صفحات کی ڈھائی سو جلدوں پر مشتمل
ہوگی۔ اس کو میاں حفص الرحمن صاحب براہ زادہ حاجی مولوی محبوب حسن الم ایڈیٹر میاں اخبار نے
نہایت کوشش اور صرف سے مرتب کرایا ہے اس کے اکثر حصے تیار ہو چکے ہیں اور علامہ غایت اللہ صاحب
مثنوی کی تحریک خاکساران کو دیدے گئے ہیں علامہ موصوف ان جلدوں کو شائع کرنا چاہتے ہیں ان
کی خواہش یہ ہے کہ اس کی پہلی جلد شائع ہو جائے جس کے لئے باتو علم دوست حضرات بطور قرضہ کے قرضہ
مقرر دی رقم دیدیں جو بعد فروخت کے واپس کر دی جائیگی یا پہلی خریداری کی قیمت ادا کر دیں جس سے
کتاب شائع کی جاسکے۔ پہلی جلد شائع ہو جانے کے بعد ملک اس کی ضرورت معلوم کرے گا اور پھر
انہوں نے چاہا تو بقیہ جلدیں تجارتی طریقہ سے شائع ہوتی رہیں گی۔

آج دنیا کی تمدن اقوام کا ذکر چھوڑیے۔ خود اسی ہندوستان میں بنگالی۔ گجراتی۔ مرہٹی ہندی
اور تامل زبانوں میں انسائیکلو پیڈیا موجود ہیں مگر نہیں ہیں تو اس زبان میں جو ہندوستان کی زبان
عام ہوئے گا دعویٰ رکھتی ہے۔ جہاں تک قلم کا فریضہ تھا اس نے ادا کر دیا اور مسموٹ انسائیکلو پیڈیا
تیار ہو چکی اب دولت کا فریضہ ہے کہ اس کو شائع کرے
ہم نے خود ابھی تک اس کی کوئی جلد نہیں دیکھی ہے کہ اپنی رائے دے سکیں مگر اہل علم کی ان باتوں
کا ضرور مطالعہ کیا ہے جو انہوں نے اس کے اوپر لکھی ہیں اور اس کی طباعت کے لئے ہر ذرہ سفارش کی ہے۔

میسرہ | حکیم تیر صاحب دہلی کی چند نظمیں کا مجموعہ۔ لکھائی۔ چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قلعہ خور و جلد
نور و صورت حجم ۸۸ صفحے قیمت جلد ۱۲ ار غیر جلد ۸ روپے کا پتہ: سید صفات احمد خیر الدین دو خانہ چوک چوڑے
منڈی لاہور
حکیم صاحب نے اس مجموعہ میں چند قومی نظمیں صریح کی ہیں اور چند ادبی بھر چھ نظمیں ہیں

اس کے بعد ہی طبعی نظمیں ہیں پھر چند اشعار متفرق کلام میں جو ذرت اندیش حقیقی ہے وہ نہایت ترین کے قابل ہے۔ زبان میں معانی اور جدت دونوں کا لحاظ ہے ہم کو یہ نظمیں بہت پسند آئیں۔ نہ صرف بیان کے لحاظ سے بلکہ قبولیت کے لحاظ سے بھی

احقاقِ قی مصنف مولوی محمد ادریس خالفا صاحب نجیب آبادی حجم ۱۰ صفحات کتابت و طباعت معمولی۔
سازمبی جیت ۵، رانہ ملے کا پتہ مکتبہ عبرت نجیب آباد
اس رسالہ میں ہمارا گاندھی کے غریبی و اخلاقی خیالات و عقائد پر بحث و تنقید کی گئی ہے جناب مصنف کو ہمارا حامی کی غیر معمولی قبولیت و شہرت کی بنا پر یہ خطرہ پیدا ہوا کہ
یعنی تلاش حق کی اشاعت سے ایک جدید مذہب کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔
نے اس تصنیف کی زحمت گوارا فرمائی ہے جناب مصنف کی اس تنقید
گنجائش ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن یہ بات ہر آئینہ لائق ستائش ہے۔
نہایت متین و سنجیدہ ہے اور مجز دو چار لفظوں مثلاً ہمارا تائی ایچ۔ پیغرا نہ ایچ۔ صدی پرنٹرز
کے جناب مصنف نے غلط و مدار کا سرشار نہ سے نہیں چھوڑا ہے بحیثیت مجموعی کتاب مطالعہ کے
لائق ہے۔

انجائزوری مصنف نواب زادہ محمد مسیح اللہ ایس جنگ الودی حجم ۱۱ صفحہ جیبی تقطیع کتابت و
طباعت معمولی قیمت ۱۰ جناب مصنف سے الہ آباد کے پتہ پر مل سکتی ہے
ایک مسلسل نظم ہے جو مسلمانوں کی موجودہ پستی اور ادبار سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے

مقتلات المعروف بہ خزانہ صنعت۔ مرتبہ جناب بلقیس جاں نیگم تقطیع کلاں حجم ۱۰ صفحہ کتابت
و طباعت متوسط قیمت ۱۲، غالباً خود جناب مصنف سے آگرہ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔
دستکاری پر اردو میں بہت سی کتابیں نکل چکی ہیں لیکن اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ
اس میں ہندوستانی گھروں کی مردہ صنعتوں اور دستکاروں میں از سر نو جان ڈالنے کی کوشش

کتاب کا معنیہ کا خیال ہے کہ برلنی دستکار یوں میں جہت پیدا کی جائے تو اسلامی کی کوئی
 کتابیں ماسی سلسلہ میں انہوں نے کوششیں ہی کی ہیں اور بڑی حد تک انہیں کامیابی ہوئی
 ہے۔ اسی کامیابی سے متاثر ہو کر انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں جایا فتدائ نوئے
 دئے گئے ہیں اور ان کی تشریح کی گئی ہے کتاب پر حثیت سے کامیاب ہے جس امید ہے کہ طبقہ
 نسوں میں اس کی بیش لائش قدر دانی کی جائے گی تاکہ اس کا بغیر حصہ بھی شائع ہو سکے

اسلامی نظام تعلیم | ترجمہ خباب فضل کرم خاں درانی بی بی قطع متوسط حجم ۶۰ صفحے کتابت و طباعت

اور کاغذ اچھا قیمت ۶ روپے کا پتہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور
 یہ رسالہ دراصل ایک جرم مشرق ڈاکٹر دانیال ہائی بیرک کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جو ہمدرد
 میں شائع ہوا تھا۔ فاضل مشرق نے نہایت جامعیت اور ایمان نظر کے ساتھ قدیم اسلامی نظام تعلیم
 اہل اسلامی مدارس کے طریقہ تعلیم پر بحث کی ہے اس موضوع پر اس سے پہلے بھی بعض حضرات نے لکھنے
 کی کوشش کی ہے لیکن شاید مواد فراہم نہ ہونے کی وجہ سے انہیں پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی
 یہ رسالہ بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن نہایت تلاش و تحقیق کے بعد لکھا گیا ہے بڑی خوبی یہ ہے کہ مسلمانوں
 کے قدیم نظام اور طرز تعلیم کا پورا خاکہ ذہن میں کھینچ جاتا ہے جو حضرات اس موضوع پر آئندہ کچھ
 لکھنا چاہیں گے۔ ان کے لئے یہ رسالہ اساس کا کام دے گا خباب بی بی نے اس مفید علمی رسالے کا
 ترجمہ کر کے ایک قابل قدر خدمت انجام دی ہے ترجمہ نہایت صاف و شستہ ہے البتہ میں خباب
 ترجمہ سے شکایت ہے کہ امام ابو یوسف کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا انہوں نے بھجپ
 ترجمہ کر دیا۔ اور اس پر فٹ نوٹ بھی نہیں لکھا ہندوستان میں مسلمانوں کا بڑا طبقہ امام ابو حنیفہ
 اہل ان کے شاگردوں امام ابو یوسف وغیرہ کو بہت احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اس لئے عام طور
 پر امام صاحب کے متعلق مسلمانوں کو یہ الفاظ گراں گزریں گے

فضائل رضوان | مصنفہ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب فتح الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور
 ضخامت ۶ صفحات کتابت و طباعت معمولی قیمت ۵ روپے کا پتہ ہمدرد اشام الحسن کتب خانہ

مفتی محمدی حضرت نظام الدین اولیاء دہلی۔

مولانا نے اس رسالہ میں رمضان لیلتہ القدر اور اعکاف کے متعلق محکم حدیثیں جمع فرمائیں ہیں ساتھ ہی دل نشیں انداز میں ان کی تشریح بھی کی ہے جس سے رمضان کے زمانہ میں عبادت و ریاضت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے یہ رسالہ عام مسلمانوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ خدا حضرت مصنف کو بڑے خیر سے

رسائل و اخبارات

سالنامہ اردو گزٹ۔ کارز:

سالنامہ اردو گزٹ ۱۹۳۳ء حجم ۶ م صفحہ قیمت ۴م مقام اشاعت۔

جامعہ کے کسی پچھلے پرچہ میں اس اخبار پر تبصرہ ہو چکا ہے ایڈیٹر صاحب سالانہ نمبر پائے پاس اظہار رائے کے لئے بھجا ہے بڑی خوشی کی بات ہے کہ رنگون میں اردو کی ہر دلعزیزی ترقی پر ہے اور فوجوانوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو اس زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے سرگرمی سے کوشش کر رہا ہے اور دو چار سال سے کئی اخبار بھی روزانہ اور ہفتہ وار نکل رہے ہیں ان میں اردو گزٹ کو خاص اقبال حاصل ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب سر واری لال کھنہ پرچہ کو کامیاب بنانے کے لئے بہت کوشاں ہیں

زیر نظر سالہ مضامین، تصاویر، کتابت و طباعت پر اعتبار سے کامیاب ہے۔ مضمون نگاران کی فہرست میں حضرت عسرت گھنوی، مولانا عیش امروہی، مقیم رنگون، حضرت برقی دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جناب محمود حسین صاحب امر رنگونی خاص رنگون کے رہنے والے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ان کی نظم کشف الطون بہت کامیاب ہے اسی طرح جناب صبا کا مضمون ”مانڈیلے کے شاہی مملات، تاریخی حیثیت سے بہت قیمتی ہے امید ہے کہ جناب صبا بڑا کے دیگر قدیم تاریخی آثار پر بھی خامہ فرسائی فرمائیں گے۔

کار و سہارا ملے۔ ورنہ اخبار ماڈل ٹاؤن لاہور سے پنجاب کے جوں عمر اور جوں کا منہو حضرت
جو لاخر حیفہ جالندہری کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ دیکھپ۔ دیکھش اور
سرا سر حرکت مل۔ امید ہے کہ یہ اخبار پنجاب کے نوجوانوں میں دلور کار اور جذبہ عمل پیدا
کرے گا اور ان کو محکم راستہ پر چلائے گا۔

اس میں سب سے زیادہ دیکھپ جو چیز ہوتی ہے وہ خود حضرت حیفہ کی نظمیں ہیں۔ لکھائی
چھپائی عمدہ۔ فلیکپ سائز ۱۲ صفحے۔ قیمت سالانہ تیس روپے

سالہ تسنیم آگرہ

سال ہی بھر کی مدت میں تمام ملک ہند اور بیرون ہند میں اس قدر شہرت اور مقبولیت
مایل کر چکا ہے۔ کہ اب الحمد للہ مزید تعارف کا محتاج نہیں تمام اہل الرائے متفق ہیں
کہ تسنیم نے جو بلند پایہ علمی۔ ادبی۔ اور اخلاقی مضامین اور پاکیزہ کلام نظم اب تک
میں کئے۔ وہ ہندوستان کے اکثر گراں قدر اور ممتاز رسائل کے مقابلہ میں اس کا
طرح امتیاز ہیں۔ اور یہی تسنیم کی شہرت اور مقبولیت کا راز ہے۔
قیمت سالانہ صرف پانچ روپیہ۔ قیمت فی پرچہ آٹھ آنے طلبہ کے لئے
چار روپے سالانہ بنونہ صرف دو آنے کے ٹکٹ موصول ہونے پر ارسال ہوگا۔

المشہر منجر رسالہ "تسنیم" آگرہ (دیوبندی)

دنیا کی رفتار

الف، عالم اسلامی

۱۔ افغانستان کی رفتار ترقی۔ | ہر ہائیں احمد شاہ خاں وزیر دار افغانستان نے ایک طاقت کے وہ ان میں ذیل کا بیان دیا ہے۔ ہر ہائیں اعلیٰ حضرت شہر یار غازی کے چچا زاد بھائی ہیں اور مہلات الملک سلطان ابن سعود سے ایک دوستانہ معاہدہ قائم کرنے کے لئے جانا تشریف لے گئے۔ جنہوں نے حال غازی کی طرف سے فریضہ حج بھی ادا کریں گے۔ حکومت افغانستان کی طرف سے مکہ معظمہ میں ایک دارالحج تعمیر کیا۔ حج میں سہولت ہو۔

ہر ہائیں نے فرمایا کہ افغانستان نے اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی سے یہ سہولتیں یہاں دیکھ کر ترقی کی ہے جس قلیل عرصہ میں اعلیٰ حضرت نے ملک کو فتنہ و فساد سے پاک کر کے از سر نو شاہراہ کاروانی پر ڈال دیا ہے وہ بلاشبہ حیرت انگیز ہے گذشتہ خانہ جنگی کے زمانہ میں عمارتوں اور سڑکوں کو جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی کر دی گئی ہے۔ اور خیال ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں جدید ذرائع آمد و رفت ملک کے ہر حصے میں پھیلانے جائیں گے۔ ان طریقوں سے جو افغانستان کے تو قائم کردہ مدارس میں تعلیم پڑھ رہے ہیں۔ اکثر طلباء کو صنعت و حرفت سکھانے کے خیال سے یورپ اور امریکہ بھیجا گیا ہے تجارت کا حال نہایت اچھا ہے اور اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ کل محصولات کی آمدنی گذشتہ سال سے گنی ہو گئی ہے حکومت کے زیر غور اب یہ امر ہے کہ ملک کی عظیم الشان معدنی دولت سے کیونکر فائدہ اٹھایا جائے۔

خارجی تعلقات کے متعلق ہر ہائیں نے کہا کہ افغانستان کے تعلقات سب ممالک سے مساویانہ ہیں اور اس کے نزدیک کسی قوم کو دوسری قوم پر ترجیح حاصل نہیں نہ کسی قوم کو کوئی خاص مراعات دی گئی ہیں نہ اجارات۔

ممالک میں بنیاتی ملازمت قائم ہے جس شورائے دیار والوں پر مشتمل ہے اعلیٰ حضرت
 کے فیصلوں کی تصدیق کر دیتے ہیں لیکن اگر ایوانات کے درمیان کوئی مسئلہ فتنہ
 ہو تو دوسری فیصلہ شاہ غازی کے ہاتھ میں ہوتا ہے اگرچہ اس کی اب تک نوبت نہیں
 آئی۔

۴۔ صلاتی پاشا ظلیں میں | پچھلے مہینہ اسماعیل صدیقی پاشا شام و فلسطین تشریف لے گئے اور اندامی
 حکومتوں سے آپ کا پر جوش مقدم کیا اس سفر کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ حکومت مصر نے
 شام اور فلسطین کی مصنوعات پر وصول میں حال ہی میں بہت کافی اضافہ کر دیا تھا لہذا ان
 مالک کی یہ خواہش تھی کہ حکومت مصر اپنے اس فیصلہ پر نظر ثانی کرے لیکن اسماعیل صدیقی پاشا
 کے سفر فلسطین کے متعلق ایک دوسری رائے قائم کی گئی ہے۔ خیال یہ ہے کہ حکومت مصر نے مفتی ظلیں
 کی سرگرمیوں کو کچھ اسی نظر سے نہیں دیکھا اور موثر انعقاد سے بھی کوئی خوشگوار نتائج مرتب
 نہیں ہوئے اب جو صدیقی پاشا فلسطین آئے ہیں تو اس سے مقصود یہ ہے تھا کہ دونوں حکومتوں کے
 درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو دور کر دیا جائے۔ پچھلی مرتبہ جب ہائی کمشنر بلعین
 قاہرہ گئے ہیں تو وہ خود ہی صدیقی پاشا اور وزیر رسل و رسائل کو قدس آنے کی دعوت
 دے گئے تھے یہ گویا سرکاری تعبیر ہے مصر و فلسطین کے باہمی تعلقات کی ورنہ ظاہر ہے کہ مصر
 یا فلسطین کے کسی مسلمان کو مفتی ظلیں یا موثر اسلامی کی سرگرمیوں پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔
 بہر حال ان سیاسی خیال آرائیوں کے علاوہ فلسطین میں اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ریلوے
 کی تعمیر کا ہے۔ اس وقت جو لوگ مصر سے آتے ہیں ان کو قطرہ سے کشتی میں سفر کرنا پڑتا ہے جس سے
 اکثر تکالیف کا سامنا ہوتا ہے حکومت فلسطین کی یہ خواہش ہے کہ ریل کے انتظامات میں جو
 خرابیاں ہیں ان کو جلد سے جلد دور کر دیا جائے

۵۔ اور قاہرہ میں غریب عربی انجمن موسیقی کا اجلاس ہونے والا ہے جس کا مقصد فنی اور
 نظری دونوں شعبوں سے موسیقی کی اصلاح کرنا ہے اسکے پیش نظر اس کے علاوہ اور بھی
 بہت سے امور ہیں جن کی تفصیل آئندہ اشاعت میں عرض کی جائے گی۔

مجلس عراق | سیاست عراق میں اس وقت بہت سے اہم مسائل پیش ہیں ایک مسئلہ خارجہ تعلقات

کا ہے۔ وہ عراقی سرحد کے تغیر کا ہے اس کے علاوہ حکومت نے حال ہی میں فیصلہ کیا ہے کہ پہلے
نکول کی بجائے عراق کے مسکوکہ کرائے جائیں لیکن اس وقت دو باتیں خاص طور سے توجہ کا مرکز
بن رہی ہیں۔ اول شاہ عراق کا سفر پھران اور ثانیاً نوری پاشا کی مراجعت جنہوں نے مجلس مندوبین
میں عراق کے سیاسی اور اقتصادی معاملات کے متعلق نہایت اہم بیانات دئے

نوری پاشا نے اس سر پر اظہارِ عقیدت کیا ہے کہ عراق کو محقریب مجلس اقوام کی رکنیت حاصل
ہو جائے گی گو یا ختمِ مستذاب کا معاملہ اب قطعی طور سے فیصل شدہ ہے۔ نوری پاشا نے کہا کہ عراق اہد
ترکی کے اقتت دوستانہ معاہدہ قائم ہو گیا ہے جس کا اثر ضلوع موصل برآمد

سب بیانات میں سے حیرت انگیز اطلاع یہ تھی کہ پڑ کی قیمت گر جانے لے

کہ عراق پٹرولیم کمپنی کو جو رقم ہر سال ادا کرنی پڑتی ہے اس کا تعین
سے کیا جائے اس کا مطلب یہ تھا کہ کمپنی ایک لاکھ پونڈ کی زائد رقم ادا کرے۔

کے درمیان ایہ الزام تھا لیکن اب جو نوری پاشا لندن گئے ہیں ادا کیٹی کو جو مراعات اور شرائط حکومت
کی طرف سے حاصل ہیں ان کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ حکومت عراق کا مطالبہ جائز ہے۔ نہایت زیادہ
حکومت میں محقریب اس گراں بہار رقم کا اضافہ ہو جائیگا۔

نوری پاشا نے یہ بھی کہا کہ وہ تیل کی ایک دوسری کمپنی سے بھی گفت و شنید کر آئے ہیں گو انہوں نے
اس کمپنی کا نام نہیں لیا۔ لیکن خیال ہے کہ ان کا اشارہ برٹش آئل کمپنی کی طرف ہوسکتا ہے کہ اس کے دو ڈاکٹر
حال ہی میں سفر بغداد سے واپس آئے تھے۔ نوری پاشا کا خیال یہ ہے کہ حکومت کو اس کمپنی سے تیل کے
ہر ٹن پر چار شلنگ اور حاصل شدہ تیل کا بیسواں حصہ ملے گا۔

امیر فیصل کا سفر پھران | امیر فیصل نے ارادہ کیا ہے کہ اپریل کے مہینہ میں پھران کا سفر کریں قیاس

یہ ہے کہ اس سفر کا مقصد ان خطہ فہمیوں کو رفع کرنا ہے جو حکومت ایران و عراق کے درمیان پیدا
ہوئی ہیں بالخصوص اس لئے کہ حکومت عراق نے حنفی سلطان سردار باغیان کرد کے خلاف جو طرز عمل اختیار
کیا ہے اس کو پھران میں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

حنفی سلطان جس کردی قبیلہ کا سردار ہے وہ سرحد عراق و ایران کے دونوں طرف آباد ہے تمام

موجودہ حال کی طرح یہ لوگ بھی کسی حکومت کا اقتدار تسلیم نہیں کرتے اور حتیٰ الوسع آزادی کی سرگرمی میں سیلاب کے سرا میں حکومت ایران نے ان کی سرکشی کا فائدہ کرنے کے لئے فوج کشی کی تو شروع شروع میں جعفر سلطان نہایت کامیابی کے ساتھ لڑتا رہا لیکن بالآخر اسے عراق میں ہلاک کر دیا۔ جعفر سلطان نے سلیمان کے مقام پر اپنے آپ کو حکومت کے حوالہ کر دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک سردار مذکور حکومت عراق کے زیرِ مراست برسرِ عمل ہیں ہی نظر بند ہے یاں ہمہ ایرانی حکومت حکام عراق کے اس طرزِ عمل سے خوش نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اب عراق درپردہ کا باغیوں کے طرقدار ہیں۔ یہی غلط فہمی ہے جس کو دودھ کرنے کے خیال سے شاہ عراق طہران جا رہے ہیں۔ اودامیہ کی جاتی ہے کہ اس کا اثر دونوں مہایہ حکومتوں کے باہمی تعلقات پر نہایت اچھا پڑے گا۔

سلطان بغدادیہ



ادھر کالفتہ جرمن اور سینٹ مشن کے ماہوار رسالہ مشرقِ قعادر میں شائع ہوا ہے۔ اسی ایم جیپ جو صوفیا در سلطنتِ بغدادیہ میں رہتے ہیں اور جنہوں نے یہ نقشہ مرتب کیا ہے ان کا۔

بھارت کی کل تعداد لاکھ ہے قارئین جاسے نقشہ سے اندازہ کر سکیں گے
 بھارت کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے

(ب) ہندوستان

سرکار کی مالی حالت

مرکزی حکومت انارٹین کو یا دھوگا کہ حکومت ہند کا اصل میزانیہ
 اس پر نقد کرنے کے لئے ایک خاص اجلاس بماء نومبر دہلی میں منعقد
 کو منظور کر دیا تھا لیکن دائر اس نے اپنے اختیارات خصوصی سے
 دمبر ۱۹۳۳ء سے نافذ کر دیا تھا۔ اب ۲۸ فروری ۱۹۳۴ء کو وزیر مال نے ممبران
 پیش کیا ہے اور اپنے بیان میں نہایت تفصیل سے حکومت ہند کی مالی حالت کے ایک ایک پہلو پر
 بحث کی ہے وزیر مال کا یہ بیان مبنی مول اس قدر طویل ہوا ہے کہ ہر شخص اس کو دیکھنے سے بڑھ کر سچہ
 سکتا ہے

اپریل ۱۹۳۳ء میں سال رواں ۱۹۳۳ء کیلئے حسب ذیل تخمینہ کیا گیا تھا

آمدنی ایک ارب ۳۴ کروڑ ۸۷ لاکھ

خرچ ایک ارب ۳۴ کروڑ ۸۶ لاکھ

لیکن دوران سال میں سیاسی اور معاشی حالات کی وجہ سے تجارت درآمد اور برآمدات
 نصف رہ گئی ہے اس لئے تخمینہ کے خلاف محصول کرد گیری غیر دیگر مدات میں آمدنی بہت زیادہ گھٹ
 گئی اور تخمینہ کیا گیا کہ اتمام سال تک ۱۹ کروڑ روپے کا خسارہ ۱۹۳۳ء کے میزانیہ میں ہوگا اور اگر ضابط
 دمبر ۱۹۳۳ء کی گئیں تو ۱۹۳۳ء میں بھی تقریباً ۱۹ کروڑ کا خسارہ ہوگا۔ چنانچہ وزیر مال نے اس شکل
 کو عمل کرنے کے لئے عام معارف میں تخفیف اور محصولات میں اضافہ تجویز کیا ہے جس پر اب عمل درآمد

پچھلے سال کا تخمینہ گذشتہ برس یہ تھا کہ مجوزہ تخمینہ معارف اور اعداد محصولات کے بعد سالانہ
 بجٹ ۱۹ کروڑ کی بجائے صرف دس کروڑ سترہ لاکھ کا خسارہ رہے گا۔ اگرچہ
 کے اہتمام پر بجائے کسی خسارہ کے ۵ کروڑ ۲۳ لاکھ کی بچت ہوگی۔ لیکن بیان سے معلوم ہوتا ہے
 کہ وزیر مال کا یہ تخمینہ ضرورت سے زیادہ گیم تھا۔ اس لئے کہ بجائے دس کروڑ ۷۱ لاکھ کے ۳۳۳۳
 کے وزیر کے تیرہ کروڑ ۶۶ لاکھ کا خسارہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۳۳۳۳ کے اہتمام پر
 جو بچت ۵ کروڑ ۲۳ لاکھ کی بننے والی تھی اس میں سے ۳۳ کروڑ روپیہ چارہ بیہینہ کے اندر نکل گئے
 اس میں بارہ بیہینہ باقی ہیں اور کل دو کروڑ پندرہ لاکھ کا فرق اب رہ گیا ہے اگر لباس اور ماسشی
 حالات تک کے یہ ہی رہے جو اس وقت ہیں تو کوئی تعجب نہ ہوگا اگرچہ ۳۳۳۳ کے وزیرانہ میں بجائے کسی
 بچت کے چھ سات کروڑ کا خسارہ ہوگا۔

مرکزی حکومت ہند کے خاص خاص ذرائع آمدنی محصول کر دگیری، انکم ٹیکس اور محصول نمک ہیں
 خراج کی حالت میں فوجی معارف، قرضہ جات کا سود، اور مختلف دفاتر کے معارف ہیں جس کا
 صحیح اندازہ ذیل کے نقشے کیا جاسکتا ہے۔

تخمینہ آمدنی بابت ۳۳۳۳

تخمینہ آمدنی بابت ۳۳۳۳

۱۔ کر دگیری کا محصول	۵۲,۳۱,۲۷,۰۰۰	۱۔ فوجی معارف	۲۷,۹۱,۹۶,۰۰۰
۲۔ انکم ٹیکس	۱۸,۷۳,۳۸,۰۰۰	۲۔ سود	۱۹,۹۲,۳۵,۰۰۰
۳۔ نمک محصول	۹,۴۳,۴۰,۰۰۰	۳۔ دیوانی	۹,۶۲,۹۳,۰۰۰
۴۔ مہگال	۳,۳۱,۷۵,۰۰۰	۴۔ ریل متفرق خرچ	۵۱,۳۲,۲۱,۰۰۰
۵۔ ریل و متفرق آمدنی	۴۹,۱۷,۰۳,۰۰۰	کل خرچ	۱,۲۷,۸۱,۴۵,۰۰۰
کل آمد	۱,۲۹,۹۶,۲۹,۰۰۰	بچت	۲۱,۳۸,۲۰,۰۰۰
			۱,۲۹,۹۶,۲۹,۰۰۰

آمدنی کی حالت میں سب سے زیادہ اہم محصول کر دگیری ہے ۳۳۳۳ میں اس سے ۶ کروڑ۔

۱۹ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں ۲۵ کروڑ کا تخمینہ تھا لیکن کل ۲۴ کروڑ روپے حاصل
 سے آمدنی ہوئی حالانکہ آخری چار ماہ میں محصول کرورگیری میں کافی اضافہ کر دیا گیا تھا سال ۱۹۳۵ء
 کے لئے ۲۵ کروڑ ۱۳ لاکھ روپے کا تخمینہ کیا گیا ہے لیکن اول تہائی میں محصول دوسرے ملک میں
 سودیشی ٹریڈ کے قوی اثرات اور غیر قوم کی قوت خرید کم ہو جانے کی وجہ سے اندیشہ ہے
 کہ تخمینہ صحیح ثابت ہو گا۔

کرورگیری کا دار و مدار تجارت درآمد اور برآمد پر ہے درآمد میں سب سے زیادہ آمدنی
 شکر اور سوئی کپڑے سے ہوتی ہے لیکن شکر کی درآمد نصف سے زیادہ کم ہو گئی اور تین کروڑ ۵۶ لاکھ
 روپے اس محصول میں نقصان ہوا ہے۔ سوئی کپڑے کی درآمد کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہو سکتا

جنگ عظیم سے قبل اوسطاً ہر سال ۱۲ ارب ۲۰ کروڑ گز:

جنگ عظیم کے بعد ۱۹۳۵ء تک
 ۱۰۰ ۸۰ ۹۰
 ۹۰ کروڑ گز پکڑا آتا ہے
 اب صرف

۱۹۳۵ء تک سوئی کپڑے پر ۲۴ کروڑ روپے محصول کرورگیری وصول ہوتا تھا۔ لیکن اب اضافہ
 محصول سابقہ ہونے چار کروڑ روپیہ سے زیادہ اس میں وصول نہیں ہوتا۔ لیکن دونوں مدوں
 سے جو نقصان ساری آمدنی کو ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ فائدہ دیسی مصنوعات کو پہنچ رہا ہے
 شکر سازی اور سوئی کپڑے کی سبب سے بیرونی مقابل میں بالکل تباہ ہو گئی تھیں ان کو زندہ کرنے
 کے لئے تائیدی محصول لگانے کی شدید ضرورت تھی اب بھی ان دونوں صنعتوں کی حالت بہت
 زیادہ قابل اطمینان نہیں ہے بیرونی مال کی درآمد میں تائیدی محصول کی وجہ سے اتنی زیادہ کمی نہیں
 ہوتی ہے جتنی کہ عام کساد بازاری ملک کی سیاسی حالت اور قوم کی قوت خرید کم ہو جانے کی وجہ سے
 اس کی اصل حالت قائم ہو جائے گی اور مزید تائیدی کی ضرورت ہوگی

مٹی کے تیل پر اضافہ محصول کی وجہ سے سال رواں میں زائد آمدنی کی توقع کی جاتی ہے اور
 یہی حال نمک کے محصول کا بھی ہے کہ باوجود ۲۵ فی صدی اضافہ محصول کے نمک کی مانگ پر اس کا

کئی شخصیں ڈرا اود ایک کروڑ روپہ لکھ لکھ کی خرید آمدنی اس سے حاصل ہوگی چنانچہ وزیر مال اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آئندہ اگر آمدنی میں اضافہ کرنے کی ضرورت پڑے تو ایسی ہی چیزیں پر اضافہ کیا جائے جو عام الناس استعمال کرتے ہیں صاحب موصوف کی اس رائے سے شاید کئی شخص متعلق نہ کرے۔ نیک ناگزیر ضروریات زندگی سے ہے اور اس پر محصول کا اضافہ یا تخفیف کا کوئی خاص نہیں پڑتا۔ اگر نیک ستا ہو جائے گا۔ تو لوگ اس کو بھانکتا نہ شروع کر دیں گے اود اگر بہت زیادہ گواں ہوگا تو روکھی روٹی اود بے نیک کی وال نہ کھائیں گے۔ وزیر مال کا خیال صحیح ہے کہ تھوڑے آدمیوں پر زیادہ محصول لگانے کی اب انتہا ہو چکی ہے اور اس سے زیادہ ان سے وصول نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن عوام الناس پر جو بار ان کی آمدنی کے لحاظ سے اس وقت پڑ رہا ہے یہ بھی ناقابل برداشت ہے۔ اس پر اگر اود اضافہ کیا گیا تو ناگزیر ضروریات زندگی سے گویا کوئی چیز ان سے چھین لی جائے گی۔ وزیر مال کو ایک نہ ایک آنہ فی کس عولم ہاں سے وصول کرنا زیادہ آسان نظر آتا ہے لیکن ہر ایک کی قدر ان غریبوں کے دل سے کوئی بچھے جو اس ایک آنہ سے ایک وقت اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ گذشتہ میزانیہ میں ایک ہزار کی آمدنی پر بھی اکھم گیس لگایا گیا تھا لیکن وزیر مال نے اس اضافہ کے متعلق کوئی اعداد و شمار پیش نہیں کئے جس سے معلوم ہوتا کہ مجموعی آمدنی میں اس جدید محصول سے کتنا اضافہ ہوا۔

میزانیہ میں توازن پیدا کرنے کی وزیر مال نے دو صورتیں تجویز کی ہیں کہ محصولات میں اضافہ کیا جائے اور معارف میں تخفیف کی جائے چنانچہ محصولات میں اضافہ پونے دس کروڑ کے قریب کیا گیا ہے لیکن معارف میں تخفیف توقعات سے بہت کم ہوئی۔ تخفیف معارف کی کئی کئی کھدھر عبد الرحیم کا تو یہ خیال تھا کہ میزانیہ کا خسارہ صرف معارف میں تخفیف کے ذریعہ پورا کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہی خیال تقریباً تمام منتخب اراکین اسمبلی کا بھی تھا، لیکن حکومت اس حد تک تخفیف معارف کے لئے کسی طرح تیار نہ تھی پھر بھی خیال تھا کہ محصولات میں جس قدر اضافہ ہوگا کم از کم اسی قدر تم تخفیف معارف سے حاصل ہوگی لیکن وزیر مال کے بیان سے معلوم

جو پہلے کل ۱۲ کروڑ روپے کی تخمینہ معارف میں لگی گئی ہے جس میں سے ہر کروڑ فوجی مصروف
 میں ۱۰۰ روپے ملے دیوانی میں اس میں ہی بیشتر حصہ بالکل غرضی ہے اور کمانڈر انچیف صاحب نے یہ
 بتا دیا ہے کہ ۸ کروڑ روپے کم میں فوجی معارف نکلنا نہیں چل سکتے سالہ رواں کے لئے۔
 کمانڈر انچیف نے ازراہ غایت ۱۲ کروڑ قبول قبول کر لیا ہے یہ مطالبہ قوی نقطہ نظر سے اس قدر
 زیادہ ہے کہ اس پر کسی رائے ذاتی کی ضرورت نہیں ہر ملک اپنی آمدنی اور حیثیت کے مطابق اپنی
 طاقت کا انتظام کرتا ہے جس ملک میں ۹۲ فی صدی آبادی بڑھا کھانا جانتی ہو اور جہاں
 بالغ لاکھوں جانیں ہیضہ طاعون چمک اور بگاڑ کے نظر ہو جاتی ہوں جھنڈا اور لٹکا لٹکا رہا ہے۔
 لا سھول انتظام نہیں۔ ایسا ملک اپنی آمدنی کا تقریباً نصف حصہ فوج کے
 کھلانے پر لے کر کسی طرح صرف کر سکتا ہے۔ دنیا کے دوسرے ملک
 کرتے ہیں وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۸ء
 تیار کیا گیا ہے لیکن اتنے تحلیل عرصہ میں بہت زائد فرق نہیں واقع ہو سکتا ہے

۱۔ ہندوستان	کل آمدنی کا تقریباً ۵۲ فی صدی	فوج پر صرف کرتا ہے
۲۔ جاپان	۲۶۵	" "
۳۔ اٹلی	۲۳۲۴۶	" "
۴۔ فرانس	۱۹۷۵	" "
۵۔ امریکہ	۱۶۰۰۹	" "
۶۔ برطانیہ	۱۲۷۵	" "
۷۔ آئرلینڈ	۷۱۶۹	" "
۸۔ چین	۷۱۶	" "
۹۔ آسٹریلیا	۶۱۵۲	" "
۱۰۔ نیوزی لینڈ	۲۱۵۱	" "
۱۱۔ جنوبی افریقہ	۲۱۶	" "

اس طول طویل فہرست میں سب سے اول نمبر ہندوستان ہی کو حاصل ہے اور سب سے

ہندوستان اگر اپنی اس بے بسی پر نہایت
گہرا غم کیا جائے گا

حکمریل کا میزانیہ | حکمریل میں بیٹی حکومت کو تقریباً ۹ کروڑ روپے کا نقصان سال رواں میں
ہوا ہے۔ ابتدائی ریلوں کا حساب کتاب مرکزی حکومت کے میزانیہ میں شامل تھا لیکن ۱۹۳۷ء میں ریلوں
کے انتظام کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے ایک ریلوے کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ
تفصیل کمپنیوں کا معاہدہ ختم ہو جانے کے بعد ریلوں کا انتظام براہ راست حکومت کے ماتحت کر دیا
جائے اور ریلوں کا حساب کتاب مرکزی حکومت کے میزانیہ سے علیحدہ کر دیا جائے نیز چونکہ حکومت
نے تقریباً سات ارب ۶۵ کروڑ روپیہ کا سرمایہ اب تک ریلوں پر لگا دیا ہے اس لئے اس سرمایہ
پر کچھ منافع بھی حکومت کو ملنا چاہیے۔ سنہ تک ریلوں سے کوئی منافع نہیں ہوا تھا لیکن اس کے بعد
سال بہ سال متحول آمدنی ہو رہی ہے۔ ہن کا کچھ اندازہ گذشتہ چند سال کے اعداد و شمار سے
جو مندرجہ ذیل ہے۔

۲۶-۲۷	۱۸ ۱/۲	۲۶-۲۷	۱۸ ۱/۲
۲۷-۲۸	۱۸ ۱/۲	۲۷-۲۸	۱۸ ۱/۲
۲۸-۲۹	۱۸ ۱/۲	۲۸-۲۹	۱۸ ۱/۲
۲۹-۳۰	۱۸ ۱/۲	۲۹-۳۰	۱۸ ۱/۲
۳۰-۳۱	۱۸ ۱/۲	۳۰-۳۱	۱۸ ۱/۲

۱۹۳۳ء میں حکومت ہند نے ایک ریلوے کمیٹی کی سفارشات کو منظور کیا اور ایک قرارداد
کے ذریعے طے پایا کہ ۱۔ ریلوں کا حساب کتاب علیحدہ کر دیا جائے۔ ۲۔ حکومت کے کل
سرمایہ پر ایک فی صدی کا ۱۱ حصہ سالانہ حکمریل سے حکومت ہند کو ادا کیا کرے۔ ۳۔ اس کے
بعد اگر کچھ فاضل رقم بچے تو اس کا بھی ۱۱ حصہ مرکزی حکومت کو دیا جائے اور باقی رقم سرمایہ محفوظ
اور سرمایہ فرسودگی میں جمع کر دی جائے تاکہ اگر کبھی خسارہ ہو تو سرمایہ محفوظ میں سے قرض لے کر
حکومت ہند کا مطالبہ ادا کر دیا جائے اس فیصلہ کے مطابق پانچ اور چھ کروڑ کے درمیان رقم حکومت
ہند کو سال بہ سال حکمریل سے ملنا چاہیے۔

۱۹۳۲ء تک ریلوں سے اتنا فائدہ ہوتا تھا کہ حکومت ہند کا مستقل مطالبہ ادا کرنے کے بعد ایک کافی رقم سرمایہ محفوظ میں جمع کر دی جاتی تھی لیکن ۱۹۳۳ء سے ریلوں کی آمدنی میں خسارہ شروع ہوا ہے۔ پہلے سال بھی ۱۹۳۳ء میں دو کروڑ روپیہ سرمایہ محفوظ سے قرض لے کر حکومت ہند کا مطالبہ ادا کیا گیا۔ دوسرے سال ۱۶ کروڑ ۱۲ لاکھ خسارہ ہوا۔ چنانچہ یہ رقم اور حکومت ہند کا مطالبہ ادا کرنے کیلئے کل گیارہ کروڑ روپیہ سرمایہ محفوظ سے قرض لیا گیا۔ اب اس سال ۱۶ کروڑ روپیہ کا نقصان ریلوں میں ہوا ہے۔ سرمایہ محفوظ میں کل ۵ کروڑ روپیہ رہ گیا تھا۔ اس لئے یہ کم کروڑ کی رقم سرمایہ قرضہ دہی سے قرض لے کر یہ خسارہ پورا کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں حکومت ہند کا مستقل مطالبہ ادا نہ ہو سکتا ہے اور کیا جا سکتا ہے سرجائج نکلنے (جو اس ٹکڑے کے ذمہ دار ہیں) تحفہ کیا۔

کا خسارہ ہوگا۔

...

...

عالمگیر کا دبا زاری کا زمانہ ہے۔ ریلوں کے ٹکڑے میں بہ نقصان بہت زیادہ عوام کو پہنچا ہے۔ لیکن ریلوں کا کاروبار چونکہ تجارتی اصول پر ہے۔ اور کوئی کاروبار ایک عرصہ تک مسلسل نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسی صورتیں نکالی جائیں کہ اگر فائدہ نہ ہو تو نقصان بھی نہ ہو۔ یہ اس طرح ممکن ہے کہ کرایہ اور محصول میں اضافہ کیا جائے۔ اور اضافی معارف میں زیادہ سے زیادہ تخفیف کی جائے۔ چونکہ ریلوں کے کاروبار میں اجارہ داری ہے اور اس کا انتظام بھی حکومت کے ہاتھ میں ہے اس لئے اندیشہ تھا کہ یہ نقصان صرف کرایہ دہی اور محصول میں اضافہ سے پورا کیا جائے گا۔ اور معارف میں صرف برائے نام تخفیف ہوگی۔ لیکن سرجائج ریٹی (ریلوے نمبر) نے تسلیم کیا ہے کہ کرایہ دہی اور محصول کے اضافہ سے ریلوں کی آمدنی بجائے بڑھنے کے گھٹ جائیگی۔ اس لئے اب یہ خسارہ صرف تخفیف معارف سے پورا ہو سکتا ہے اس وقت تک ریلوے بورڈ نے جو کوششیں تخفیف معارف کیلئے کی ہیں۔ وہ ہر طرح قابل اطمینان ہیں۔ بشرطیکہ یہ کوششیں آئندہ بھی جاری رہیں۔ یہ بھی تجویز ہے کہ ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو ریلوں کے انتظام کے متعلق از سر نو تحقیقات کرے۔ اس کمیٹی میں جنس اور فرانس کے واقف کار ماہرین کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش ہے تاکہ وہ اپنے ملک کے ماہر سال کے تجربات کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے متعلق مفید مشورہ دیں۔

ریلوں کے ذریعہ کا کام بھی مالی شکست کی وجہ سے بہت روکا جا رہا ہے لیکن اس میں بھی الامس۔
 کامیاب ہو چکا ہے۔ ملک کی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کا دار و مدار ذرائع نقل و حمل
 پر منحصر ہے۔ ہندوستان کے اشارہ دکھ سربیل رقبہ میں کل ام ہزار میل ریل
 اب تک تیار ہوئی ہے۔ اس کے بالکمال پورے ۱۷ لاکھ ۷۰ ہزار میل ریل اور اس کا تکمیل کر کے رقبہ میں
 دو لاکھ میل ریل موجود ہے۔ ذیل کے نقشہ مختلف ملک میں ریلوں کی ترقی کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

ملک	ریلوں کی ہزار مربع میل	۳۹۶ میل ریل
ہنگری	۱۹۵	۱۹۵
امریکہ	۷۰	۷۰
جاپان	۳۲	۳۲
ہندوستان	۲۰	۲۰

موجودہ کساد بازاری۔ بظاہر کوئی مستقل صورت نہیں اختیار کر سکتی اس لئے ریلوں
 کی توسیع کے پروگرام میں جہاں تک ممکن ہو کوئی کمی نہ ہونا چاہیے۔ ورنہ بالآخر اس سے ملک کی
 ترقی کی راہ میں سے زیادہ رکاوٹیں پیدا ہوں گی جتنی کہ اس وقت موجود ہیں۔

مالک غیر

چین و جاپان [آخری خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپان نے تینگھائی کے علاقہ میں فوجی کارروائیاں
 بند کر دی ہیں اور انہیں اقوام کی مداخلت اور تحقیقات ہی کو منظور کر لیا ہے۔ ایک گزشتہ شاعت
 میں یہ بتایا گیا تھا کہ جاپان کو مختلف عہد ناموں کی وجہ سے جو اس نے براہ راست چین
 سے کئے یا جو اسے روس سے اپنی عہد آفرینی فتح کے بعد درجائے۔ پنچوریا میں صرف تک
 کے لئے بہت اہم حقوق حاصل ہیں۔ ان حقوق کی بنا پر پنچوریا میں فوجی کارروائی کرتے
 وقت جاپان کو بین الاقوامی مداخلت کا زیادہ اندیشہ تھا۔ لیکن جس حد تک پنچوریا میں
 پیش قدمی کرنے کا قصد جاپانی وزارت نے کیا تھا وہاں اس سے زیادہ پیش قدمی ہو گئی اس لئے

کہ جاپانی فوج کا اتنا دریاست پرغالب تھا اور پنچو ریا جاپانی فوج کے لئے ارض مقدس ہے۔ اس زیادتی نے اصل یورپ کے کان کھڑے کئے، ”ادھر امریکہ (جو جاپان کے مقابلہ میں ہمیشہ چین کی منڈی کو اپنے لئے محفوظ کرنے کی غرض سے اس کی حفاظت کرتا ہے) نے سخت احتجاج کیا۔ لیکن جاپان نے ایک کی یہ سنی اور جس کی لامنی اس کی یمنس کے اصول کی وہ تفسیر اپنے حل سے پیش کی جس کے سامنے تمام احتجاجات اور انہیں اقوام کی تمام قراردادیں بے اثر ثابت ہوئیں۔

جنوریہ کے بعد فوجی کارروائیاں شنگھائی کے علاقہ میں نہایت شدت کے ساتھ شروع ہوئیں اور بلا اعلان جنگ کے گذشتہ جنگ عظیم کے ہیبت ناک مناظر دینا شروع ہوئے۔ ”شہر طے“ پر امن شہری قتل ہوئے، لاکھوں آدمی بے گناہ ضابطہ اعلان بھی نہیں ہوا! اب خدا خدا کر کے یہ بے ضابطہ جہاز فوجی کارروائیوں کے آغاز اور اس وقت ان کے بند ہونے کے منتظر ہیں۔

شنگھائی میں فوجی کارروائی کا ہونا جاپان کے لئے اس واسطے ضروری تھا کہ پنچو ریا کی فوجی کامیابیاں شنگھائی کے تجارتی میدان میں شکست سے بدل ہو رہی تھیں۔ جب چین پنچو ریا کو نہ بچا سکا تو اس نے جاپانی مال کا بائیکاٹ کیا اور اس بائیکاٹ کا مرکز شنگھائی تھا۔ چین کی تجارت ”ساہو کارہ“ جاپانی اور ”چیم“ کا کاروبار اگر شنگھائی میں جمع ہو گیا ہے۔ کچھ عرصہ سے سیاست کے اعتبار سے اسے کینٹن پر فضیلت حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ میں جاپانی مال اور جاپانیوں کے بائیکاٹ کی تحریک نے زور پکڑا۔ جاپان جو پنچو ریا کو اس لئے اپنے تسلط میں لانا چاہتا تھا کہ اس کی تجارت کے لئے اجناس غلام وہاں سے آسانی حاصل ہو سکیں گی اسے کیسے گوارا کرتا کہ اس خام مال کو مصنوعات میں تبدیل کرنے کے بعد کوئی انہیں ہاتھ بھی نہ لگائے! چنانچہ شنگھائی میں فوجیں اتار دی گئیں اور تجارتی مال کو بیچنے کے لئے خریدنے والوں کے جان و مال کو برباد کر دیا گیا!

یہ کارروائی بلا نظیر نہ تھی۔ اس لئے کہ سترہویں صدی میں جاپانی انقلاب کے موقع پر اپنے اغراض کی حفاظت کے لئے برطانیہ نے بھی شنگھائی میں فوج بھیجی تھی۔ لیکن انگریزی فوج اپنی وزارت کے قبضہ میں تھی اس لئے سیاست کی مصلحت آمیزیوں پر کسی نے کان نہ دھرا اور پنچو ریا کی طرح شنگھائی میں بھی سپہ سالاران جاپانی نے اپنے دل کا حوصلہ نکالا۔

غریب انجمن اقوام جس کے تمام با اثر دکن خود دل میں معاملات کو طے کرنے کے اسی جا بانی ملک کے خالی ہیں وقتاً فوقتاً قرار دادیں منظور کرتی رہی اور جا پان ان کی طرف سے بے اعتنائی برتاوا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ ان احتجاج کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنے مال کو بکوانے کے لئے وہی سب کر سکتا ہے جو وہ خود کر رہا ہے۔ انجمن اقوام کی حقیقت سے اس کے شرکار سے زیادہ کون واقف ہو سکتا ہے کہ بد تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند لیکن پھر بھی ضمیر انسانیت ان ظالمانہ حرکتوں پر مشتعل ہو رہا ہے اور کوئی ظالم اس کی طرف سے کال بے اعتنائی نہیں برت سکتا، ہمیشہ ظالموں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس ضمیر کو اپنے کسی خواب آدھ عمل سے سلا دیں۔ چنانچہ ہی اب جا پان کرنا چاہتا ہے اس نے انجمن اقوام کی تمام تجاویز کو اچھی طرح ٹھکرایا اور اب پنچو ریا پر اچھی طرح تسلط قائم کر کے وہاں ایک نام نہا جمہوریت قائم کر کے اور تنگنائی میں جان و مال کی تباہی کے علاوہ چینی دلوں میں ہمت پیدا کر کے وہ ضمیر انسانیت کا خیال بھی کر سکتا ہے اور ”بھلے بھگت“ بن سکتا ہے!

چنانچہ انجمن اقوام کا وفد تحقیقاتی جائے گا۔ تنگنائی سے تو جا پانی قومیں ہٹ جائیں گی مگر پنچو ریا پر تسلط قائم رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ امریکہ اور ایک دو مغربی دول کو بھی کچھ حقوق مل جائیں گے!

برطانیہ | درآمد اشیا پر ایک عام محصول لگا کر برطانیہ بھی اصولاً مائینی تجارت کے حامیوں کی صف میں آتا ہے۔ جو لوگ آزاد اور مامون تجارت پر انگریزی ادب سیاسی و معاشی میں مفصل بحثیں پڑھنے کے عادی ہیں اور انگلستان کو آزاد تجارت کا سب سے بڑا حامی جانتے ہیں انہیں شاید یہ تبدیلی عجیب معلوم ہو۔ لیکن عرصہ سے اس کے لئے میدان تیار ہو رہا تھا۔ اصول اگرچہ آزاد تجارت ہی کا مقبول عام تھا لیکن مخصوص صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے مائینی محاصل کی تدبیر نے جو سب اوقات اختیار کی جا چکی تھی مائین کو بالکل نالغوس چیز نہ رکھا تھا۔ اُدھر جنگ عظیم کے بعد سے دوسری قوموں کی شدید مائینی تدابیر نے انگلستان میں بھی اس کے لئے خاصی آمادگی پیدا کر دی تھی۔ پھر خود اپنی نوآبادیوں سے تجارت کو ترجیح دینے کا خیال بہت ہر دہلنیز تھا، حال میں مزدوروں کے سیاسی اثر کی ترقی نے اجرتوں کو گھٹنے سے روکا، کام کا وقت کم کیا، اوریوں معارف پیدا نش میں اضافہ ہوا۔ دوسرے ملک جنہوں نے اپنے کو مائینی دیواروں میں محصور کر لیا تھا اپنی سستی اجرت اور طویل اوقات کار کے سبب انڈس

نیز یہ بتانا کہ غلہ کے مقابلہ کا حوصلہ کیا اور انگریزی صنعت سے یہ ہے کہ بڑے خطرہ میں پڑ گئی۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے پہلے تو انگلستان نے اپنے سکے کا تعلق سونے سے منقطع کیا اور اس طرح ملک کے اندر اپنے مال کی قیمت بڑھائی اور پڑوسیوں کے لئے اسے ارزاں کیا۔ لیکن یہ تدبیر کافی نہ تھی۔ اس لئے تائین کی تدبیر اختیار کی گئی اور اب چند چیزوں کو مستثنیٰ کر کے سب درآمد پر قیمت کا ۱۰ فی صدی محصول عائد کر دیا گیا۔ مستثنیٰ چیزوں میں سے خاص خاص ہیں، گیہوں، گوشت، چارہ، رب، چرٹ اور کپڑے کی صنعت کے لئے اجناس عام۔ چمہ بیسنے کے بعد اس فہرست پر نظر ثانی کی جائے گی اور اس میں ترمیم یا توسیع حکومت وقت کے اقتدار میں ہوگی۔ اس باب میں حکومت کو مشورہ دینے کے لئے ایک شاہد رتی یعنی ستر گزری ہوئی ہے جو تائین حاصل کے اثرات کا بغور مطالعہ کرتی رہے گی۔

خود برطانوی سلطنت کے مختلف اراکین کے باہمی معاشی تعلق۔

نئے اُشار کھا گیا ہے جو مغرب منصف ہونے والی ہے۔

آئرستان | آئرستان کے انتخابات میں مہملی حکومت کو شکست ہو گئی اور ڈی دلیہ ای کی بی بی۔

آگئی۔ گزشتہ سال ہی یہ بات بہت واضح ہو گئی تھی کہ آئرستان کے شہریوں میں سیاسی اختلافات نہایت گہرے ہو گئے ہیں اور اس حد سے کہیں آگے بڑھ چکے ہیں جہاں تک جے ہوئے پارلیمنٹی نظام کی صورت میں اکثر ہوتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جمہوری جماعت کی طرف سے ملک میں ایک نئی انقلابی تحریک شمع ہونے والی ہے۔ چنانچہ گزشتہ حکومت نے دستور اساسی میں ترمیم کی نہایت غیر معمولی کھردرائی تک سے اعتراف کیا اور گزشتہ اکتوبر میں دستور کے ان دفعات میں جن سے شخصی آزادی، اظہار خیال کی آزادی اور باضابطہ عدالتی تحقیقات کا حق ہر شہری کو ملا تھا، ترمیم کر دی گئی۔ اور سیاسی جموں کی تحقیقات کے لئے ایک فوجی عدالت قائم کی گئی جسے سزائے موت تک کا اختیار تھا۔ لیکن بظاہر یہ فوجی عدالت اور جمہوری جماعت کو دبانے کی کوشش ناکام رہی اور بلاخون کا ایک نظریہ بہلے یہ جماعت انتخابات میں برسرِ اقتدار آگئی۔ ڈی دلیہ ارجو جنگ آزادی کے زمانے میں بھی وطن خواہ جماعت کا سردار تھا آج پھر حکومت آئرستان کا صدر ہے، عمدہ صدارت پر شکن ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے تو ان سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جو مذکورہ بالا قانون کے ماتحت پابجولاں تھے۔ پھر یہ اعلان کیا

کشمکش پاکستان کی وفاداری کی قسم لیے کافرستان کی پارلیمنٹ کے اراکین پر عائد کیا جائیگا۔
 میں سائل یہ جانتا ہوں کہ پاکستان اور آئرستان میں تعلقات دو غائبوں کے اگرچہ رفتار سیاست کا
 خیال کہ یہ کہنا دشوار نہیں ہے کہ پاکستان اس سلسلہ میں بہت سے صحیح گھونٹ پینا گوارا کرے گا!

جوینی | صدر جمہوریہ کا انتخاب فیصلہ کن ثابت نہ ہوا۔ جرمن دستور کے مطابق پہلے انتخاب میں وہ شخص صدر
 منتخب ہو سکتا ہے جو امیدواروں سے پہلی مجموعی زیادہ رائیں حاصل کرے۔ اگر کوئی امیدوار ہی ایسا
 نہ کر سکے تو پھر دوبارہ انتخاب ہوتا ہے جس میں محض اکثریت آرا انتخاب کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے۔
 اس انتخاب نے جوینی کے موجودہ صدر اور قیصری زمانہ کے مشہور عالم سپہ سالار فان ہنڈنبرگ کو سب سے
 زیادہ رائیں ملیں لیکن دوسرے امیدواروں کی مجموعی رایوں سے کم۔ اس لئے اب انتخاب دوبارہ
 ۱۰ مارچ کو ہو گا جس میں فان ہنڈنبرگ کا مقب ہونا تقریباً یقینی ہے۔

جوینی کی موجودہ سیاسی اور معاشی حالت کا خیال کر کے وزیر اعظم نے پہلے تو یہ کوشش کی تھی
 کہ سب سیاسی جماعتیں مل کر دستور اساسی میں ترمیم کر دیں اور ہنڈنبرگ کا زمانہ صدارت اور بڑھا دیا جائے۔
 لیکن قدامت پسند اور قومی اشتراکی جماعتوں کے قائد ہوگن برگ اور ہٹلر اس پر راضی نہ ہوئے۔
 سیاست بھی عجیب و غریب چھاؤں ہے جن لوگوں نے گذشتہ انتخاب میں ہنڈنبرگ کو صدر بنوایا
 وہ آج اس کے مخالف ہیں اور ہنڈنبرگ کو قبضی رائیں ملیں اکثر ان جماعتوں سے جو پہلی بار اس کے
 خلاف تھیں۔ آج یہ مخالفت دیکھتے ہیں کہ ملک کو شاہ پسندی اور اشتراک کے خطرناک تجربوں
 سے اگر کوئی محض بچا سکتا ہے تو ہنڈنبرگ۔ خانہ جنگی کو ٹال سکتا ہے تو یہ بوڈھا سپہ سالار جمہوریت
 اور دستور کو قائم رکھ سکتا ہے تو قیصر کا یہ آزمودہ کار جنرل!

لیکن ہر چند ہنڈنبرگ کا انتخاب اس مرتبہ یقینی سا ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس سے
 جوینی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس سے صرف تغیر سیاسی و معاشی کی رفتار دہرا ہوا ہو جائے گی
 اور بس۔ زندگی کے شعبہ میں نہایت تیزی سے تغیر ہو رہا ہے۔ سیاسی اور معاشی انتشار ناقابل برداشت
 ہوتا جاتا ہے۔ ہٹلر کی جماعت بس یہی کہتی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ناقابل برداشت ہے۔ ہمیں
 برسرِ اقتدار کر دو تو سب ٹھیک ہو جائے۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ کیسے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، لیکن

اشرار میں لوگوں کو پھاس کرنے کی نصرت بھی نہیں ہے۔ اُدھر اتنا پسند اشرار کی کہتے ہیں کہ یہ پڑیاں عالی کسی شخص کا قصود نہیں، یہ نظام سرمایہ داری کا لازمہ ہے اور اس کی ماہیت کا تقاضا ہے اس نظام کو انقلاب اشرار کی سے ختم کرو سب کچھ درست ہو جائے گا۔ اور جرمنی کے نوجوان، دیوالیے، دلوں میں تلخی رکھنے والے، ملحد و سخی کے سب وہ لوگ جن کی ساری دولت جنگ کے بعد جرمن سک کی خرابی کی وجہ سے دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے نکل گئی، یہ سب یا تو ہٹلر کی طرف جاتے ہیں یا اشرار کیوں کی طرف۔ اُدھر ان سب کے معنی میں جرمن قوم کا بہت بڑا حصہ۔ اگر رفتار یہی رہی تو قیاس ہے کہ پہلے ہٹلر کو کامیابی ہوگی۔ جب وہ اپنے وعدے وفائے کر سکے گا اور ظاہر ہے کہ نہ کر سکے گا۔ تو اشرار کوں کا موقع آئے گا اور انقلابی تحریک بہت قوی ہو جائے گی۔

اشرار کی روس کا مشورہ سالار تراسکی جو اس وقت جلا:

ایک جگہ جرمنی کے متعلق لکھتا ہے:-

”جرمن معاملات کی رفتار پر صرف جرمنی کی قیمت کا انحصار نہیں ہے بلکہ عرصہ تک کے لئے دنیا کی قیمت کا دار و مدار ہے۔ روس کی اشرار کی تفسیر ہسپانی انقلاب کی رفتار، انگلستان میں انقلاب سے پہلے کی سی حالت کا پیدا ہونا، اور فرانسیسی سامراجیت کا آنے والا حشر، یہ سب کچھ اگر ایک نقطہ پر جمع ہو گیا ہے۔ یعنی اس سوال کے جواب پر کہ اگلے چند مہینوں میں جرمنی میں کون جیتتا ہے اشرار کی یا ہاشستی (ہٹلر)؟ کسی جزوہ کے سرے پر ایک گیند رکھ دو تو ذرا سے دھکے سے وہ سیدھی طرف لڑک سکتی ہے یا الٹی طرف۔ یہی حال اس وقت جرمنی کا ہے، اور لڑکنے کا وقت ساعت بہ ساعت قریب آتا جاتا ہے۔ بعض قوتیں چاہتی ہیں کہ گیند سیدھی طرف لڑکے (قدامت پسندی کی طرف) اور مزدور جماعت کی کمر اس سے ٹوٹ جائے۔ بعض چاہتے ہیں کہ گیند وہیں سرے پر رکھی نہ ہے۔ یہ لوگ ناممکن بات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ گیند وہاں نہیں رہ سکتی۔ اشرار کی چاہتے ہیں کہ گیند الٹی جانب (انقلاب کی طرف) لڑکے اور

سرمایہ داری کی کمر توڑ دے۔ لیکن آرزوئیں کافی نہیں تھیں۔ عمل کی قوت
درکار ہے۔

لیکن عجب بات ہے کہ باقی دنیا کا بڑا حصہ یہی چاہتا ہے کہ گیند اوپر سرے ہی پر
رکھی رہے !



شذرات

اردو اکادمی کا جلسہ جو ۱۹ مارچ کو ہونے والا تھا متوی کرنا پڑا۔ شہر میں دفعہ ۴۴ کا نفاذ ہو گیا جس کی رو سے ہر مام جلسہ کرنے کے لئے خاص طور پر اجازت لینے کی ضرورت تھی۔ یہ اطلاع اتنی دیر میں ملی کہ اگر اجازت کا انتظار کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ جلسہ کا وقت کہیں اور اس وقت تک اجازت کی اطلاع نہ آئی ہو۔ اس لئے مناسب یہ ہی معلوم ہوا کہ جلسہ ملتوی کر دیا جائے۔ اس سٹوڈنٹس وٹن میں لوگوں کو بہ خلعت التوا کی اطلاع دیدی گئی۔ اب انشاء اللہ جلسہ ۹ اپریل کو ہو گا۔ انصار اول کے اور دعوت ناموں کے ذریعہ سے دو تین دن پہلے سب حضرات کو نہ

فروری کے جامعہ میں جو افسانہ شائع ہوا۔ اس کا صاحب نے کیا ہے۔ غلطی سے ان کا نام شائع نہ ہو سکا۔ ہم ان مہینہ جو افسانہ شائع ہو رہا ہے اس میں کسی کا نام نہیں اور اس کے ساتھ کوئی خط بھی نہیں آیا یا آیا ہو تو ہمارے پاس نہیں پہنچا۔ ہمیں امید ہے کہ جن صاحب نے یہ احسان بھیجا ہے وہ اپنے نام نامی سے مطلع فرمائیں گے۔ انامی مقابلہ کی جو تاریخ مقرر تھی اس کے گزر جانے کے بعد یہ افسانہ موصول ہوا ورنہ یقیناً یہ انعام کا مستحق قرار پاتا۔

دہلی یونیورسٹی کا جلسہ تقسیم اسناد ۱۹ مارچ کو منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک کے بجائے تین خطبے دئے جاتے ہیں۔ ایک صبح کا جو اس سال مقرر ہوا ہو۔ دوسرا وائس چانسلر کا اور تیسرا پروفیسر یعنی وائس چانسلر کے کونسل کے ممبر تعلیمات کا۔ اس تثلیث کی مصلحت سمجھیں نہیں آتی مگر کچھ ہوگی ضرور۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جلسہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ وائس چانسلر صاحب یونیورسٹی کی مختصر رپورٹ سنائیں اور پروفیسر صاحب اس کا جواب دیں مگر چونکہ اس قسم کے جلسوں میں باہر کے کسی شخص سے خطبہ صدارت پڑھوانے کی رسم ہے اس لئے یہ بھی

انہوں نے کہ سرسہی بی راماسوامی اہم کا خطبہ صدارت اس موقع کو پورا نہیں کرتا جو ان کے علم و فضل اور علمی کارناموں کی بناء پر ملتی کہ وہ علم و تعلیم پر وسیع و برآئے لفظ ڈالیں گے۔ یونیورسٹی کے جیسے تعلیم کے خطبہ پڑھا جائے اس میں یہ تین باتیں ہوں یا کم سے کم ان میں سے ایک بات جتنی چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم کے نصب العین کے متعلق کوئی فکر یہ جو خطبہ پڑھنے والے ذاتی طور اور مشاہدے سے قائم کیا ہو یا کم سے کم گہری تنقید کے بعد تسلیم کیا ہو اور اس کے ماتحت جو وہ یونیورسٹی کی حالت پر تبصرہ ۲۔ اس خاص یونیورسٹی کے علمی مسائل کی بحث اور ان کے حل کرنے کے لئے مفید مشورہ ۳۔ فائنل تحصیل طلباء کو علمی زندگی کے متعلق جس سے انہیں سابقہ پڑنے والے ایسی باتیں جس سے انہیں بصیرت اور فیضان حاصل ہو۔ یوں تو فاضل مقرر کے خطبہ میں یہ تینوں چیزیں موجود ہیں مگر کوئی اس میں پوری نہیں اترتی جو ایسی دقیق علمی صحبت کی تقریریں کا ہے یا ہونا چاہئے۔

تعلیم کے نصب العین کی بحث میں موصوف نے کئی اہم مسئلے چیلے ہیں۔ لیکن اتنے اعتبار سے کام لیا کہ نہ اپنا مطلب اچھی طرح واضح کر پائے اور نہ خیالات میں منطقی تسلسل اور ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ چند متفرق نکتے بیان کر دینے سے علمی تحقیق یا علمی رہنمائی کا فرض پورا نہیں ہوتا۔ پہلے فاضل مقرر نے یہ بحث اٹھائی کہ یونیورسٹی کی تعلیم میں عام تمدن تربیت اور کسی خاص فن کا مطالعہ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر اتنا زور نہیں دینا چاہئے کہ دوسرے کو نقصان پہونچے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ موصوف کے انداز بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک تعلیم کے ان دونوں طریقوں میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ طبیعتوں کے لئے مناسب ہے۔ بعض کو ایک طرح کی تعلیم ملنی چاہئے بعض کو دوسری طرح کی جیسا کہ یونیورسٹی کی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ علم کو مرکز بنا کر ہر فرد جو ان تمدنی زندگی کے ہر شعبے سے متوڑی بہت واقفیت پیدا کرے تاکہ تمدن کا ایک مجموعی تصور اس کے ذہن میں قائم ہو سکے مگر اس کے ساتھ کسی ایک چیز کا گہرا مطالعہ کرے تاکہ اس کے ذریعے سے وہ کسی

جیت سے معاشرت کی عملی خدمت کر کے اور اس کی بقا اور ترقی میں معاون ہو سکے۔
 اس کے بعد موصوف نے اور اہم مقاصد کی طرف اشارہ کیا مگر صرف اشارہ ہی
 کر کے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اعلیٰ تعلیم میں اصل چیز یہ نہیں کہ بعض معلومات اور مشاہدات
 حاصل کر لئے جائیں بلکہ یہ ہے کہ تقریباً پیدا کی جانے والے انسان اپنے طبعی اور ذہنی ماحول
 کے تغیرات کو سمجھتا رہے اور ان سے مطابقت پیدا کر کے ہم آہنگ زندگی بسر کرے اس کے
 علاوہ یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کی عملی خصوصیات و محاشی ضروریات
 کو پیش نظر رکھے اور نوجوانوں کو ہر قسم کے منفید پیشے اختیار کرنے کا شائق اور اس کے
 لائق بنائے۔ مگر سب سے بڑا کام یونیورسٹی کا طالب علموں کے لئے (جو کہ ماضی میں)
 خدمت کا ذوق و وسعت نظر اور قوتِ ارادی پیدا کرنا ہے۔

دہلی یونیورسٹی کی عملی ضروریات کے سلسلے میں جو
 جو یونیورسٹی اور کالجوں کی تعلیم اور ان کے فرائض کی تقسیم و حسن انتظام ہے
 آپ نے یہ بتایا کہ تعلیم کالجوں میں ہو۔ یونیورسٹی صرف اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ اور مصل فراہم کرے
 مگر یہ بھی مالی دقتوں کے سبب سے فی الحال ناممکن ہے۔
 مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ دہلی یونیورسٹی اس وقت تک مختلف کالجوں کا نام ہے جو
 ایک انتظامی سلسلہ میں مربوط کر دئے گئے ہیں۔ اب ان کو ملا کر وہ اتحاد اور ہم آہنگی پیدا
 کرنا جو یونیورسٹی میں ہونا چاہیے کیونکہ ممکن ہے جو عملی فاضل مقرر نے بتایا ہے اس سے
 نہ تو پوری نظری تشفی ہوتی ہے اور نہ زیادہ عملی مدد ملتی ہے۔

آئندہ فاضل مقرر نے طلبہ کو نصیحت بھی کی مگر یہ نصیحت رواج کے مطابق
 بس یہیں تک محدود ہے کہ انہیں سیاست میں شرکت نہیں کرنا چاہیئے ماس نصیحت کی جو
 دلیلیں ممدوح نے پیش کی ہیں۔ وہ ان دلائل سے کہیں زیادہ منقول ہیں جو عموماً ایسے مقول
 پر پیش کی جاتی ہیں۔ موصوف نے فرمایا کہ سیاست ہمیشہ فرقہ بندی اور فتنہ پیداکرتی ہے

علم کے طالب علموں کی حاجت کو ایک مستقل برادری بن کر رہنا چاہیے جس کا مشورہ
 قصور وہ ذہنی اور اخلاقی قوت پیدا کرنا ہو جو کشمکش حیات میں عملی حصہ لینے کے لئے ضروری
 ہے مگر داخل مدرسے ان نوجوانوں کی مشکلات پر غور نہیں فرمایا۔ ذہنی اور اخلاقی قوت پیدا
 کرنے کے لئے جن نوخرات کی ضرورت ہے ان میں حب وطن۔ دردمت۔ قوم کے سیاسی
 رہنماؤں کا احترام بھی شامل ہے۔ مگر یونیورسٹیاں حکومت کے دباؤ سے طلبہ پر اسے
 قیود عائد کرتی ہیں کہ یہ جذبات بے تکلفی سے ظاہر نہیں ہونے پاتے بلکہ اپنے اظہار کی
 غیر معمولی راہیں ڈھونڈتے ہیں جن سے نقصان بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ پیش پا افتادہ
 بات ہے جسے نوجوانوں کا ہر معلم جانتا ہے بلکہ غالباً یونیورسٹیوں کے ارباب عمل و عقد اور
 حامی حکومت یا مست داں بھی سمجھتے ہیں مگر حکومت کی مردت انہیں مجبور کرتی ہے کہ
 جب یہ قیود طالب علموں پر نمودار ہوں گے لہذا ان کا اہتمام لگا دیں۔

بہم ارشاد الحسن العزیم

ج

زیر ادا رت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید بدین ای
جلد ۱ بابۃ ماہ اپریل ۱۹۳۲ء

فہرست مضامین

۲۹۴	مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری	۱۔ مسکنی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر
۳۱۰	عبد الجلیل صاحب ندوی تعلیم جامعہ	۲۔ عربی سیادت کے خلاف علمی تحریکیں
۳۲۱	عبدالواحد صاحب سندھی تعلیم جامعہ	۳۔ انجمنوں کا سیاسی عروج و زوال
۳۲۲	محبت اللہ صاحب ندوی	۴۔ خلافت کی سحر کاریاں (ترجمہ)
۳۵۳	خواجہ غلام حسین صاحب علم یونیورسٹی علی گڑھ	۵۔ غربت و فساد
۳۶۵	ایڈیٹر	۶۔ تنقید و تبصرہ
۳۶۳	ش۔ ق۔	۷۔ دینی کی رفتار۔ ہندوستان
۳۶۸	ن۔ ن	اسلامی ممالک
۳۸۴	ز۔ ح	ممالک غیر
۳۸۹	ایڈیٹر	۸۔ شذذات

محمد عیوب بی۔ لے (دکسن) پرنٹر و پبلشر نے وقرر سالہ جامعہ قرو باغ، دہلی سے شائع کیا۔

مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر

مصر میں سلطان سلیمان نے میں داخل ہوتے جبکہ حضرت عمر فاروق کے عہد میں عربین مصر میں سکونت کو فتح کیا۔ اس زمانے میں مصر کی جو حالت تھی اس کو دکھانے کے لئے ضرورت ہو کہ اقصا کے ساتھ وہاں کی قدیمی تاریخ بیان کر دی جائے۔

آج کل جو حصہ زمین مصر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کا مجموعی رقبہ تین لاکھ تری ہزار میل مربع ہے جو بیس ضلعوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن اس رقبے میں سے فرو و حصہ ۸۳ ہزار میل مربع سے زائد نہیں۔ یہ آبادی اور زراعت تمام تر ان قطعات میں ہے جن میں سے دریائے نیل گزرتا ہے۔ بقیہ حصہ بنجر۔ ریگستان اور بے آب و گیاہ ہے۔ درحقیقت مصر کی ساری دولت ثروت آبادانی اور زراعت کا ذریعہ یہی مبارک دریا ہے جس کا نام نیل ہے اور آج سے نہیں بلکہ قدیم زمانے سے

مورخین کا بیان ہے کہ قدیم اہل مصر حام بن نوح کے بیٹے مصر اہم کی اولاد تھے جو شام کے ملک سے اگر وادی نیل میں جا بجا قبیلے قبیلے آباد ہو گئے۔ اسی وجہ سے یہ ملک مصر کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ لوگ پانچ طبقوں میں منقسم تھے۔ پہلا طبقہ کاہنوں کا تھا جو دینی پیشوا تھے۔ ان کی کسی بات کی خلاف ورزی عبود کے حکم سے سرتابی کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ دوسرا طبقہ جنگی جماعت کا تھا جو دشمنوں کی مدافعت کرتا تھا۔ باقی تین طبقے تاجر۔ کاشتکاروں اور گدہ بانوں کے تھے۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق یوز کاہنوں اور جنگ آوروں کے کوئی دوسرا زمین کی ملکیت کا حق نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اراضی کا بڑا حصہ کاہنوں کے قبضے میں تھا اور کچھ جنگ آوروں کے قبضے میں تھا۔ زمینیں ان سے ٹھیکے یا کرائے پر لے کر کاشتکاری کرتے تھے۔

زمانہ دراز کے بعد جب ان قبائل کی تعداد زیادہ ہو گئی اور انتظامی ضرورت نے

میسر کے انھیں میں سے ایک شخص متانامی جو بنگلی جلتے کا سر خنہ تھا بادشاہ بن گیا اور اس نے مصر میں اپنی سلطنت قائم کی جو ایک زمانے تک اس کی اولاد میں رہی۔ پھر دوسرا خاندان نکلا آگیا۔ اسی طرح سلسلہ پہلے ۳۱ خاندان حکمران ہوئے۔

ان کہتیں خاندانوں کا زمانہ پانچزار سال قبل میلاد مسیح سے شروع ہو کر ۳۳۲ ق م میں ختم ہو جاتا ہے جبکہ سکندر اعظم نے اگر مصر کو فتح کر لیا اور وہاں یونانی حکومت قائم کر دی۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس قدیم تاریخ کے معتبر مصادر موجود نہیں ہیں کیونکہ سلاطین مسیح سے پانچ سو سال قبل کی کوئی تصنیف نہیں ملی ہے سب سے پہلے مصر کا کچھ جانا جس نے لکھ لکھ دہ شہور یونانی سیاح ہیرودوٹس ہے جو ابوالفتح لکھا جاتا ہے۔ مسیح سے پچتر سو اہل نیل سے گزرا تھا۔ اس کے دو سو سال کے مصر کی تاریخ لکھی جو اگرچہ مفقود ہو گئی مگر اس کے جو حصے دوسرے

دہ باقی ہیں۔ انھیں سے قدیم حکمران خاندانوں کے بادشاہوں کی فہرستیں ترتیب کی گئی ہیں۔ گذشتہ صدی میں نو سال کی لگاتار کوشش کے بعد فرانس کے مشہور راوی محقق شمبولن نے مسئلہ میں سر و غلیفی کتاب یکجہ حل کر لیا۔ جس کی وجہ سے آثار قدیمہ کے کتبے پڑے جانے لگے اور پرانے ہیکلوں، معبدوں اور ان کے ستونوں اور دیواروں کے نقوش سے بعض بعض قدیم واقعات اور بادشاہوں کے کارنامے منکشف ہوئے۔ ادھر تقریباً نصف صدی سے مصر کے پرانے کھنڈر اور قبرستان کھودے جا رہے ہیں اور قدیمی عمارتوں سے آثار کی جستجو ہو رہی ہے جس سے کچھ کچھ تاریخی اکتشافات ہوتے جاتے ہیں۔

قدیم اہل مصر جیسا کہ ان کے کتبوں سے ثابت ہوتا ہے متعدد دیوتاؤں اور دہبیوں کو پوجتے تھے۔ لیکن ان کے بڑے معبود وہی تھے۔ ایک فاتح یعنی خالق اکبر جس کا بت منفی تھا جو قدیمی ہائے تحت تھا۔ دوسرا مع یعنی سورج جس کی صورت القصر میں جو آج کل القصر کے نام سے مشہور ہے بنائی گئی تھی۔ لیکن سورج کو وہ مستقل خدا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ خالق اکبر کی ایک

مصر کا حال کی بہت سی باتیں اس کے بعد جن بت تواریخ میں ملتی ہیں ان کے بعد دونوں کے نوع میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

بادشاہ بسامتیک اول (خاندان ۲۶) کے زمانہ میں جب یونانی مصر میں گئے اور وہاں رہے تو انہوں نے علوم مصریہ یعنی ریاضی ہیماۃ اور نجوم وغیرہ کے ساتھ وہاں کے علم الاصابہ کو بھی سیکھا اور مصری بتوں کو مع ان کے ناموں کے یونان میں لگائے۔ قدامصر کا یہ خیال تھا کہ دیوتا بعض بعض حیوانات کی شکل میں جسم اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گائے۔ مگر۔ شہباز وغیرہ کو بھی پوجتے تھے۔

انکا ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ موت کے بعد روح جسم کے ساتھ تعلق قائم رکھتی ہے۔ اسی بنا پر وہ مردوں کی ممی بناتے تھے انہوں نے ایسی دوائیں معلوم کر لی تھیں جن کی بدولت جسم غیر محدود زمانہ تک سترنے سے محفوظ رہ سکے۔ انکا خیال تھا کہ جسم اگر ضائع ہو گیا تو روح بھٹکتی پھریگی اور اسکا کوئی ٹھکانا نہیں رہیگا۔ اس لئے امیر و غریب ہر ایک اپنے مردوں کی ممی بنواتے تھے اور اسکو محفوظ تابوت اور صندوق میں بند کر کے تہہ خانوں میں رکھتے تھے۔ امرا اور سلاطین ان پر تختہ عمارتیں بنوا دیتے تھے۔ چنانچہ مؤرخین کا خیال ہے کہ مصر کے اہرام وہاں کے بادشاہوں کے مقبرے ہیں۔

ان میں ایک خاص رسم یہ بھی تھی کہ ممی تیار ہو جانے کے بعد پہلے اسکو ایک چوڑے پر لاکر رکھتے تھے جہاں مذہبی حکام۔ کاہن اور عوام الناس آکر جمع ہوتے اور اعلان کیا جاتا کہ اگر کسی کو اس میت پر کوئی دعویٰ ہو تو پیش کرے۔ اگر وہ بیگناہ نہ تھا تو اسکو قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت ملتی۔ اسکے اقرباء اسی وقت اپنا ماتمی لباس اتار دیتے اور اس کی برأت پر خوشی مناتے۔ اور اگر وہ گنہگار ٹھہرتا تو دفن سے منع قرار پاتا۔ مجبوراً اسکے ورثہ اسکے تابوت کو لاکر اپنے گھر میں رکھتے جب اس قسم کے متعدد مردے کسی گھر میں جمع ہو جاتے تو کاہن زندہ دن کی خاطر سے ان کو دفن

کسی بہانت دینے مگر قبرستان سے ملے۔ اس آخری احتساب میں کسی قسم کی حمایت نہیں برتی جاتی تھی چنانچہ خوفناک و خبیث بادشاہوں کو بھی کابھوں نے دفن چھتے سے روک دیا تھا۔

اس دستور کی وجہ سے ان کے اخلاق اچھے تھے۔ کیونکہ آخری فضیلت اور برائی کے خوف سے وہ معاملات کو صاف رکھتے اور سب کے ساتھ نیک سلوک کرتے تھے۔
قدیم اہل مصر طبیب بھی واقف تھے اور اکثر بیماریوں کی شناخت اور انکی دوائیں بتاتے تھے۔ ریاضی اور میماۃ سے بھی انکو ذوق تھا۔ جہانک معلوم ہو سکا ہے دنیا میں قطبی ہی سب سے پہلی قوم ہیں جنہوں نے شمسی سال ۳۶۵ دن اور قمری ۳۵۴ دن کا دریا بتایا۔
فن تعمیر میں تو اہرام اور عجیب غریب معبد اور میل انکی ایسی دنیا حیرت کے ساتھ دیکھتی ہے۔

مصر کی اس قدیم تاریخ کو مؤرخین نے مختلف ادوار میں تفصیل مقصود نہیں ہے بلکہ ان ۳ خاندانوں کی خاص خاص تاریکی باون اور یاد ۵ روپر ایک سرسری نظر ڈالنی ہے۔

مصر کا سب سے پہلا ہرم جو آج ہرم کوکمہ کے نام سے مشہور ہے۔ خاندان اول کے ایک بادشاہ نفیس کا تعمیر کردہ ہے۔ دوسرے خاندان میں بادشاہ مینو تریس بہت نامور گذرا ہے جس نے یہ قانون بنایا تھا کہ خاندان میں اولاد ذکر نہونے کی صورت میں عورتوں کو تخت سلطنت پر بیٹھنے کا حق ہوگا۔ اسی نے دعویٰ کیا تھا کہ میں خدا کا رشتہ دار ہوں اسکے زمانہ سے یہ عقیدہ برابر یونانیوں کے عہد تک ملوک مصر میں چلا آیا۔

تیسرے خاندان کے عہد میں فن کتابت اور سنگ تراشی میں ترقی ہوئی۔ ابولہول کا عظیم الشان بت جسکا طول ۶۰ گز سے بھی زیادہ ہے اور جو اہرام جزیرہ کے پاس آج بھی قائم ہے اسی زمانہ میں بنایا تھا۔ اسکا جسم شیر کا ہے اور سر انسان کا جس سے قوت اور عقل

مصر کے اجتماع کی طرف اشارہ ہے۔

چوتھے خاندان میں سے غولبادشاہ نے مصر کا سب سے بڑا ہرم تعمیر کرایا جو جزیرہ صغیر
اسکا ہر ضلع ساڑھے سات سو فٹ ہوا اور بلندی ساڑھے چار سو۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس
میں ایک لاکھ آدمی روزانہ کام کرتے تھے اور پورے تیس سال میں تیار ہوا پہاڑ سے بھی باؤ
مظہین ہے۔ خلیفہ مامون عباسی جب شکستہ مصر میں گیا اور لوگوں سے سنا کہ ان
عمارتوں میں ملوک مصر کے خزانے میں تو اسی ہرم کو تڑوانا شروع کیا۔ ہزار دقت صرف ایک
حصہ ٹوٹ سکا اور صرف بہت بڑا گیا اسلئے چھوڑ دیا۔

اسی ہرم کے سامنے دوسرا ہرم جو کسی قدر اس سے چھوٹا ہے اسی خاندان کے ایک
دوسرے بادشاہ فرعون کا بنایا ہوا ہے۔ تیسرا ہرم بھی جس کی بلندی ۲۰۳ فٹ ہے۔ اسی خاندان
کے ایک بادشاہ منکورع نے بنایا تھا۔ اس منکورع کی نقش سنگین تابوت میں برآمد ہوئی تھی
انگریز اسکو انگلستان لے جایا ہے تھے۔ راہ میں پرتگال کے ساحل پر جہاز ڈوب گیا۔ لیکن جتنہ
اور اسکا چوبیس غلاف جو انسان کی شکل کا تھا برآمد ہو گیا جو لندن کے میوزیم میں موجود ہے۔
چھٹے خاندان نے اپنی قوت بڑھا کر ایک طرف نوبیا اور دوسری طرف شام پر قبضہ
کر لیا۔ جنگی کشتیاں بھی تیار کرائیں اور فیروزہ۔ توتیا اور تانبے کی کانیں نکالیں۔ نیز کوہ طور سے
نسل در نسل ہر برآمد کئے۔

گیارہویں خاندان نے اپنے عہد میں تجارتی غرض کے لئے مصر اور عرب کے راستہ
کو ٹھیک کر لیا۔ اسپین، جارجیا، مصر، لبنان اور کوئٹہ کھدوائے۔ یہی راستہ اسلام کے
زمانہ تک رہا۔

بارہویں خاندان کے اوسترس نامی بادشاہ نے طیبہ کا میل تعمیر کرایا۔ اسی کا بنوایا ہوا
ایک ستون مطروہ میں موجود ہے جس پر ہیروگلیف میں یہ کتبہ ہے
”بادشاہ منصور، ہر موجود کی حیات، بالائی اور نیچی مصر کے فرمانروا، دونوں

مجاہدوں کے مالک، خورشید کے فرزند، دوسرے، مطر کے معبودوں کے
 معبود، جو ہمیشہ زندہ رہے، اس نشان کو رسمی تیوہار کے آغاز میں اپنے
 نام سے اس جشن کی یادگاریں نصب فرمایا۔

چودھویں خاندان کے خاتمہ پر شام اور عرب کے قبائل نے مڈمی دل کی طرح صبر
 پڑھائی کی جس قبیلہ نے ان کی قیادت کی وہ توریت میں حشین اور عربی تواریخ میں عاملق کہا
 گیا ہے۔ ان لوگوں نے مصر کے بڑے بڑے ہیکلوں کو ڈھادیا۔ شہروں کو آگ لگا دی۔
 باشندوں کو تہ تیغ کر ڈالا اور اپنی حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے زمانہ میں حضرت ابراہیم
 علیہ السلام جو ان کے ہم قبیلہ تھے مصر میں تشریف لے گئے تھے اور علیہ السلام نے حضرت
 ہاجرہ کو ان کی خدمت کے لئے دیا تھا۔

مصر میں عمالقہ کے تین مختلف خاندانوں نے حکم
 بادشاہ ابوقیس کے عہد میں حضرت یوسف علیہ السلام کو:

اور اسکے وزیر دوفرنامی کے ہاتھ بیچا تھا۔ اسی خاندان کے آخر میں مصر میں چہرہ پر سر
 قائم کر لی اور انیس بادشاہ نے عمالقہ کو پورے چھ سو سال کے بعد مصر سے نکال کر اپنا تسلط
 جمایا جبل قرنہ پر ویرجری سے اسکی مٹی نکلی ہے جو چیزہ کے اقیقہ خانہ خدیوی میں موجود ہے۔
 اسی خاندان کا ایک بادشاہ تھونس ثالث تھا جس نے ایک طرف عرب۔ شام عراق
 ایشیائے کوچک اور کردستان وغیرہ کو فتح کیا اور دوسری طرف بحری بیڑہ سے قبرس
 کرٹ۔ یونان اور اطالیہ کے جنوبی حصہ پر قابض ہو گیا۔ اسکے بنائے ہوئے دو ستون مصر
 میں تھے جو ملکہ قلیوپٹرا کے عہد میں اسکندریہ میں لا کر رکھے گئے تھے۔ اب انہیں سے ایک
 انگلستان میں ہے اور ایک امریکہ میں۔ اسی خاندان کا بادشاہ توت انخ عمون تھا جس کی نقش
 مع اسکی ملکہ کی نقش کے بے شمار خزانہ اور طلائی تخت وغیرہ کے ساتھ آٹھ سال کا عرصہ ہوا
 القصر سے نکلی ہے۔

انیسویں خاندان میں مصر کا سب سے بڑا بادشاہ رمیس اکبر تھا جس کی محبت اور عظمت مصریوں کے دلوں میں عبادت تک پہنچ گئی تھی اس نے کنخانیوں پر دو لاکھ فوج کے ساتھ حملہ کیا اور ۱۴ سال تک لڑا رہا۔ بالآخر مصاحت ہوئی۔ چاندی کے پیروں پر صلح نامہ لکھا گیا جو آج لندن کے میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ اس رمیس کا بیٹا مفتاح تھا یعنی وہ فرعون جو حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے سمندر میں غرق ہوا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کی نقش برآمد ہو گئی ہے۔ جیزہ کے عجائب خانہ میں رکھی ہوئی ہے اور دیکھنے والوں کے لئے عبرت کا سامان ہے۔ کہ یہ مشیت خاک اور خدائی کا دعویٰ!!

بیسویں خاندان میں ایک بادشاہ رمیس ثالث تھا جسکی می پیرس کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

اکیسویں خاندان کے آخری بادشاہ کے زمانہ میں اشور کے بادشاہ نمرود نے چڑچڑائی کر کے مصر پر حکومت قائم کر لی جو ۱۰۰ سال تک اسکے خاندان میں رہی۔ اسی زمانہ میں بابلی اور اشوری تہذیب مصر میں پہنچی۔

نمرود کے بیٹے ششقی کی صورت کرناک کے ہیکل کی چار دیواری پر موجود ہے سر پر شاہی تاج۔ ہاتھ میں مصری تلوار اور سلسلے حضرت سلیمان کے بیٹے رحجام کی تصویر جکی گردن میں رسی پڑی ہوئی ہے۔

پچیسویں خاندان کے بادشاہ بسامتیک نے یونانیوں کی مدد سے تخت تاج حاصل کیا تھا۔ اسلئے اسکے عہد میں انکو عروج ملا۔ اور بڑی بڑی جاگیریں اور مارتیں دی گئیں۔

ان یونانیوں نے مصر میں مدارس قائم کئے جن میں ان کے ملک کے بہت سے طلباء تحصیل علم کے لئے آنے لگے۔ فیثاغورث۔ بقراط۔ جالینوس۔ افلاطون۔ اور ارسطو وغیرہ اکثر حکمائے یونان نے اپنے اپنے زمانوں میں ان میں علوم حاصل کئے۔

اسی خاندان کے آخر میں کے بہمن پیرسندبار نے مصر کو جا کر سخر کر لیا۔ ایک عرصہ تک

اہل فارس وہاں حکومت کرتے رہے۔ آخر میں ایک مصری رئیس نامی نے ان کو مصر سے نکالا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ مگر کچھ ایسے انقلابات پیش آئے کہ ۶۰ سال کے عرصے میں تین مختلف مصری خاندانوں میں حکومت تبدیل ہوتی گئی آخر میں پھرایانیوں نے اگر قبضہ کر لیا۔ انھیں کی حکومت میں دار الحکومت کا حکمران ق م میں سکندر نے مقدونیہ سے نکل کر مصر سے طرابلس تک فتح کر لیا۔ اپنے ہم سے اسکندریہ آباد کر کے وہاں ایک نائب چھوڑا اور ایران کو فتح کر تا ہوا ہندوستان تک پہنچا۔ اہی میں بابل میں انتقال کر گیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس کا بیٹا اسکندریہ میں لاکر دفن کیا گیا۔ اسکندر کی فتح سے مصر میں یونانی حکومت قائم ہو گئی جو چند سال تک اس کے خاندان

میں رہی۔ پھر پطیموس نے جو بابل میں اس کا نائب تھا مصر پر خود اسی خاندان کی آخری تاجدار ملکہ قلیوپطرا تھی جس نے جاہ میں اس کی حکومت قیصر کسٹس کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس وقت

صوبہ ہو گیا۔

۳۹۵ء میں رومی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ مغربی حصہ کا پایہ تخت رومنہ اٹلی کے

رہا۔ اور مشرقی حصہ کا قسطنطنیہ قرار پایا۔ مصر اسی حصہ کا ماتحت رہا۔

آغاز عہد اسلام میں قسطنطنیہ کے تحت پر قیصر ہرقل تھا۔ اس نے ایک قبطی امیر متوقس کو مصر کا والی مقرر کیا تھا۔ اسی کے عہد میں ۶۴۰ء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک عظیم القبط کے امام ماطب بن بقرہ رضی اللہ عنہ کے گئے تھے۔ متوقس اسلام تو نہیں لایا مگر ایک خچر جس کا نام وکئل تھا اور اور دو لونڈیاں مع دیگر ہدیوں کے اس نے رسول اللہ کی خدمت میں بھیج دیں۔ انھیں میں سے ایک حضرت ماریہ قبطیہ تھیں جن کے بطن سے حضور اکرم کے بیٹے ابراہیم پیدا ہوئے تھے۔

اس طرح پر حضرت ہاجرہ کے قدیمی رشتے کے بعد اہل مصر کا ایک جدید رشتہ بھی رسول عربی کے ساتھ قائم ہو گیا۔

فتح اسلامی ۶۴۰ء مطابق ۶۴۰ء میں طاعون عمو اس کے بعد حضرت عمر حبیب فوج کے انتظام

کے لئے مدینہ سے شام میں تشریف لے گئے تو عمرو بن ماصؓ نے تنہائی میں ان سے عرض کیا کہ مجھے مصر بڑھانے کی اجازت دیجئے۔ کیونکہ اس کے فتح کر لینے سے رومیوں کی قوت ٹوٹ جائے گی اور اسلام کی شوکت بڑھے گی۔ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی کلفت اور مشقت کے خیال سے اس دور دراز جہم میں پس پیش کیا لیکن عمرو بن ماصؓ نے اپنے عزم راسخ سے کامیابی کی ایسی قوی امید دلائی کہ آخر کار راضی ہو گئے اور چار ہزار سوار جو سب کے سب یمن کے قیدی مکعب کے تھے۔ ان کے ساتھ کر دیئے۔ وہ اس وقت اسی فوج کو لے کر روانہ ہو گئے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ جس طرح شام میں دور خلافت سے ہم کو مسلسل کمک آتی رہی ہے اسی طرح مصر میں بھی آئے گی۔

ان کے روانہ ہو جانے کے بعد امراء اسلامی نے تعجب ظاہر کیا کہ ایسے ملک میں جہاں کم از کم ۱۰۰ ہزار فوج حفاظت کے لئے موجود ہے۔ عمرو بن ماصؓ ان مٹھی بھر آدمیوں سے لیکر یمن گئے۔ حضرت عثمانؓ نے خود خلیفہ سے جا کر کہا کہ ابن ماص امارت کا سخت حریف اور پیش قدمی اور عمل میں نہایت بے باک ہوا لہذا نہ ہو کہ اس جماعت کو درطہ ہلاکت میں ڈال دے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ عمرو بن ماصؓ بیابان سینا سے گزر کر مقام عریش میں پہنچے اور اس کو فتح کر لیا۔ یہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ تھی۔ وہاں قربانی کی اور فوج کو دعوت کھلائی۔

عریش سے نکل کر فلیک طرف بڑے ایک بڑے شہر تھا جس کے گرد و فیل تھی اور ملک کا دروازہ سمجھا جاتا تھا جس وقت حفاظت کے لئے رومی نژاد فوجیں بھیجی جاتی تھیں۔ عمرو بن ماصؓ نے محاصرہ کیا اور ایک مہینہ کے بعد محرم کو اس کے اندر داخل ہو گئے۔ اب رومی فوجیں مقام میں خمس جمع ہوئیں اور پوری طاقت سے مقابلہ کی تیاری کئے نکلیں۔ عمرو بن ماصؓ نے دربار خلافت سے امداد طلب کی۔ وہاں سے دس ہزار فوج آئی جس میں شامیہ صحابہ میں سے حضرت نیر بن عوامؓ مقدار بن اسودؓ عبادہ بن صامتؓ مسلمہ بن مخلدؓ ابوالدرداءؓ اور شریح بن حسنہ وغیرہ تھے۔

رومی سپہ سالار تھیوڈورس شکر کے کر بڑھا۔ کھلے میدان میں مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں نے ایسی شکست دی کہ اس کی بیس ہزار فوج میں سے صرف تین سو آدمی انچٹائیوں کے چپے جو قصر شمع کی طرف بھاگے تھے باقی سب کے سب مارے گئے۔

حضرت ایک خوفناک شخص میں والی مصر مقوقس خود موجود تھا۔ اب مسلمانوں نے بڑھکرا اس کا
 حاصرہ کیا۔ مقوقس نے چند روز کے بعد عمرو بن عاص کے پاس دو آدمی بھیجے اور لکھا کہ
 تم لوگ ہمارے ملک میں گھس آئے اور جنگ کرنے لگے۔ اب ایک رومی لشکر آ رہا ہے
 جو ہر طرح کے ساز و سامان سے مسلح ہے وہ یقیناً تم کو فنا کر دے گا۔ لہذا تمہارے
 حق میں بہتر یہ ہے کہ صلح کر کے چلے جاؤ ورنہ اس کے آجانے کے بعد کوئی نفع نہ ہوگا
 حضرت عمرو بن عاص نے جواب دیا کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لو۔ اولاً
 اجزیہ یا جنگ۔

مقوقس عین شمس کی ہولناک جنگ سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ ا
 کہا کہ مسلمان اس قلعہ کو بھی یقیناً شمس کر لیں گے۔ لہذا ان کے ساتھ صلح
 شروع سے اس نے عمرو بن عاص کو بچ لکھا کہ آپ اپنا قائم مقام بھیج
 نکل آئے۔ انھوں نے عبادہ بن عاصتؓ کو دس آدمیوں کے ہمراہ بھیجا اور حکم دیا کہ ہمیں مدد دے
 اور پھر ان تینوں باتوں کے جو میں نے لکھی ہیں اور کوئی بات قبول نہ کرنا۔
 حضرت عبادہ کا طول قامت دس اشت تھا اور رنگ سیاہ۔ مقوقس ان کو دیکھ کر گھبرا
 اور کہا کہ تم میں سے کوئی دوسرا شخص میرے ساتھ گفتگو کرے۔ مسلمان بوسے کر وہ عقل و راستے
 میں ہم سے بہتر اور درجے اور رتبے میں افضل ہیں اور ہمارے امیر نے انہیں کو اپنا نامزدہ
 مقرر فرمایا ہے۔ مجبوراً مقوقس نے ان کو کلام کی اجازت دی۔ انہوں نے کہا کہ

ہماری لڑائی کسی دنیاوی غرض سے نہیں بلکہ محض اعلیٰ رکعت حق کے لئے ہے
 نہ ہم دنیاوی آسائش کے جو یا ہیں۔ راحت کی جگہ تو آخرت ہے۔ ہمارے اللہ
 اور رسول نے ہی ہم کو بتلایا ہے اور اس بات کا عہد لیا ہے کہ ہم اپنی ساری
 توجہ رضائے الہی کی طرف رکھیں اور دنیا کی نعمتوں سے صرف ضروری غذا و لباس
 پر قناعت کریں۔

موقوف نے پسندیدگی سے سر ہلایا۔ پھر نصیحت کے قالب میں دھلی ہوئی دھکی دینی شروع کی اور

کہا کہ

”بے شک تمہاری یہی حالت ہو لیکن اب تمہارے مقابلے کے لئے ایک رومی لشکر
آ رہا ہے جن کی شجاعت مسلم ہے اور جو اس کی پروا نہیں کرتے کہ کس سے لڑتے ہیں
اور ان کا مد مقابل کون ہے۔ تم یہاں پڑے ہوئے مصیبتیں اٹھا رہے ہو۔ اس لئے
میں تمہاری حالت پر ترس کھا کر مشورہ دیتا ہوں کہ صلح کر لو۔ تم میں سے ہر ایک کو
دو دو دینار امیر کو ایک سوا در خلیفہ کو ایک ہزار ویدوں کا۔ اس کو لے کر اپنے ملک
کو واپس چلے جاؤ۔ قبل اس کے کہ وہ لشکر آ جائے جس کے مقابلے کی طاقت تم
نہیں رکھتے۔“

حضرت عبادہ نے فرمایا۔

”تم جو رومیوں کی قوت اور ان کی کثرت سے ہم کو ڈراتے ہو تو اس دعوے کے میں
نہ رہو کہ اس سے ہمارے ارادوں میں کچھ بھی قور پڑ سکے گا۔ کیونکہ ہم سب اگر قتل
بھی ہو گئے تو یہ ہمارے رب کی رضامندی اور حصول جنت کا ذریعہ ہو گا جس سے
بڑھ کر کوئی شے ہم کو محبوب نہیں۔ ہم میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ ہو گا جو یہاں سے
لوٹ کر اپنے اہل و عیال کے پاس جانے کا خواہشمند ہو بلکہ ہر ایک صبح اور شام یہی
دعا کرتا ہے کہ اللہ اس کو شہادت سے سرفرو فرمائے۔ اس لئے تم ہمارا خیال چھوڑو
اور اپنی مصلحت دیکھ کر ان تینوں صورتوں میں سے جو بیش کی گئی ہیں کوئی صورت
منتیار کر لو۔“

موقوف نے کہا کہ کیا ان کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی؟ انھوں نے جواب دیا
کہ نہیں۔ اس گفتگو کے بعد حضرت ہو کر واپس چلے آئے۔ موقوف نے اپنے اصحاب کو سمجھایا کہ
اسلام یا جزیہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی پسند کر لو کیونکہ تم ان کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے

لیکن انھوں نے اس کی بات نہ اُنی اور جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ مگر چند ہی روز کے بعد مسلمانوں کے سخت حملوں کی تاب نہ لا کر آخر مصالحت پر مجبور ہوئے۔ مسلمان بلائے گئے اور یہ عہد نامہ لکھا گیا۔

عمر بن عاص اور مقوقس باہم اس بات پر صلح کرتے ہیں کہ اہل اسلام تمام ملک میں ہر ایک قبیلے سے جو بالغ ہے خواہ اونٹنی ہو یا اٹلی دو دینار جزیرہ سالانہ لیں گے۔ بڑے بچے۔ عوریں اور معذور اشخاص اس سے بری ہیں۔ اہل مصر کے ارضی و اموال انھیں کے ہاتھ میں رہیں گے۔ اور ان کے مذہبی رسوم میں کسی کا دخل نہیں دیا جائے گا۔

یہ عہد مقوقس نے اپنے کل تہم قوموں یعنی اقباط مصر کی طرف سے لے لیا کہ اگر تم چاہو تو ان شرائط پر صلح کر کے مصر میں رہو نہیں تو جب یہ عہد نامہ منظور کی گئی تو اس کے پاس بھیجا گیا۔

اور لکھا کہ عرب کی حقیر قوت کے مقابلے میں تم نے کیوں دیکر صلح کر لی اور سارے

میں اس عہد نامے کو جائز نہیں قرار دیتا۔ رومی امیروں کو حکم بھیجا کہ تم جنگ جاری رکھو۔ مقوقس اپنی جماعت کو لے کر قلعے سے باہر نکلا اور نیل کے اُس پار مقام جزیرہ میں اپنے قصر میں جا کر بیٹھا۔ گزیر ہو گیا۔ وہاں سے عمرو بن عاص کے پاس کہلا بھیجا کہ میں نے جو عہد نامہ لکھا ہے اس پر قائم ہوں۔ میری قوم ان شرائط کو پورا کرے گی لہذا اس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

حضرت عمرو بن عاص نے لکھا کہ ہم بھی عہد نامے کی پابندی کریں گے لیکن قبیلوں کو چاہئے کہ ہمارے راستے میں فلاں فلاں دو مقامات پر پل بنائیں اور جہاں جہاں ہماری فوج خیمہ زن ہو وہاں بازار لگائیں اور سامان رسد پہنچائیں۔ قبیلے اس پر رضامند ہو گئے۔

بعض مورخین نے مقوقس کے اس فعل کو خیانت اور غداری قرار دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر یہ بات روشن ہو چکی تھی کہ رومی فوج کسی طرح عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خود قصر ہرقل اپنی پوری قوت کے ساتھ ان کے مقابلے میں شکست پر شکست کھا کر شام کا ملک چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ اس

کے علاوہ اس کی قوم رومیوں کے ظلم و ستم سے جاں بلب تھی۔ اور عربوں کی حکومت میں اس کو دینی آزادی اور دنیاوی آسائش نظر آئی۔ ایسی صورت میں اس کے لئے سوائے مصاحمت کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اسی وجہ سے اس نے نہ صرف مفتوحہ علاقہ بلکہ کل ملک مصر کی طرف سے عہد نامہ لکھ دیا۔

قیصر نے اس کو قسطنطنیہ طلب کیا اور باز پرس کی۔

رومیوں نے مقابلہ شروع کیا لیکن اسی درمیان میں قیصر انتقال کر گیا جس کی وجہ سے ان کا نظام اتر ہو گیا۔ مسلمانوں نے ان کو شکست دیتے ہوئے بہت تھوڑے عرصے میں پہنچ کر اسکندریہ کا بھی جوان کا مرکز تھا محاصرہ کر لیا۔ وہاں رومیوں کے ساتھ ۲۰ اکتوبر ۶۴۲ء میں معاہدہ لکھا گیا عجیب بات یہ ہے کہ اس معاہدے میں رومیوں کا نام مذہب بھی حقوق ہی تھا جو قیصر کے انتقال کے بعد اسکندریہ میں واپس آ گیا تھا۔ معاہدہ کی دفعات یہ تھیں۔

(۱) یہ مارضی صلح صرف گیارہ مہینے کے لئے ہے۔ ۲۸ ستمبر ۶۴۲ء کو اس کی مدت ختم ہو جائیگی۔
(۲) اس اثنا میں عرب رومیوں کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں کریں گے بشرطیکہ وہ کوئی مخالفانہ رویہ نہ اختیار کریں۔

(۳) کسی رومی فوج کو مصر کی سر زمین میں داخل ہونے کا حق نہیں ہے۔

(۴) مسلمان کتبوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے نہ کسی دینی معاملے میں مداخلت کریں گے۔

(۵) یہود کو شہر اسکندریہ میں سکونت کا حق حاصل رہے گا۔

(۶) اسکندریہ کی محافظ رومی فوج اپنا سامان لے کر بھری راستے سے جاسکتی ہے۔ مگر جو لوگ خشکی سے جانچا ہیں گے ان کو جزیرہ دنیا ہوگا۔

(۷) شرائط معاہدے کی ضمانت کے لئے رومی فوج کے ۵۰ اسر دار مسلمانوں کے پاس بطور رہن رہیں گے۔

اس معاہدے کے بعد جنگ ختم ہو گئی اور بہت تھوڑے عرصے میں رومی فوج نے تمام مصر کو خالی کر دیا اور بالائی اور نشیبی کل علاقوں پر مسلمان قابض ہو گئے۔

اسکندریہ کے اطراف کے باشندوں نے دوران جنگ میں درویشوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو نقصانات پہنچائے تھے اس لئے عمرو بن عاص نے ان سب کو مع اہل و عیال کے گرفتار کر کے عجمیت کے ساتھ دربار خلافت میں بھیج دیا۔ مگر حضرت عمرؓ نے ان کے جرائم معاف کر کے زمینوں میں شامل کر دیا۔ اور پھر ان کو مصر میں واپس بھیج دیا کہ اپنے گھروں میں رہیں اور اپنی ملکیتوں پر قبضہ رکھیں۔

اسلامی فوج کا خیال تھا کہ مصر کو ہم نے جنگ سے فتح کیا ہے اس لیے اس کو سپاہیوں میں تقسیم کر دینا چاہئے۔ مگر عمرو بن عاص اور خلیفہ وقت نے یہ نہ کیا۔ اور اس کے باشندوں کو غلام بنا کر فوج میں تقسیم کر دیں۔
زمین کوخراجی قرار دیا۔

عمرو بن عاص نے کل ملک مصر کو دو سال کے عرصے میں طرابلس غرب کو بھی قبضہ میں لائے۔ تونس کا بھی ارادہ رکھتے تھے مگر حضرت عمرؓ نے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اور حکم بھیجا کہ جس قدر علاقہ قبضہ میں آچکا ہے اسی کا انتظام مکمل کر دو۔
اس وقت سوائے ملک مصر مسلمانوں کے زیر حکومت نہ تھے۔ یہ اسلامی عہد بارہ تاریخی دور میں تقسیم ہوا ہے۔

(۱) خلافت راشدہ	۶۳۹ء سے ۶۶۱ء تک
(۲) بنی امیہ	۶۶۱ء " ۷۵۰ء
(۳) عباسیہ اول	۷۵۰ء " ۸۰۰ء
(۴) طولونی	۸۰۰ء " ۹۰۵ء
(۵) عباسی بارہوم	۹۰۵ء " ۹۳۴ء
(۶) اخیدی	۹۳۴ء " ۹۶۹ء
(۷) فاطمی	۹۶۹ء " ۱۱۴۱ء
(۸) ایوبی	۱۱۴۱ء " ۱۲۵۰ء

۱۲۵۰ء سے ۱۳۸۲ء تک

(۹) مالک بھری

" ۱۵۱۶ " ۱۳۸۲

(۱۰) مالک چرکس

" ۱۸۰۱ " ۱۵۱۶

(۱۱) عثمانیہ

۱۸۰۱ء سے آج تک

(۱۲) خدیوی

اب میں اختصار کے ساتھ الگ الگ عنوانات میں اس اسلامی اثر کو بیان کروں گا جو مصر

اہل مصر پر پڑا اور جو میرے اس مقالے کا موضوع ہے۔

قدیم زمانے میں فرعون مصر کا دار السلطنت پہلے طیبہ تھا پھر منف جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ سکندر نے جب قبضہ کیا تو اپنے نام پر اسکندریہ کو آباد کرایا۔ اس وقت سے ہی مرکز قرار پایا اور ساحل بحر پر واقع ہونے کی وجہ سے ایک عظیم الشان بندرگاہ اور شہر ہو گیا۔ رومیوں نے بھی اپنے عہد میں اسی کو مستقر رکھا۔

عروب بن مامس نے جب اسکندریہ فتح کیا تو وہاں کی جلد شاہی عمارتیں ان کو خالی ملیں بچاتے تھے کہ اسی گھنڈو مقام رکھیں لیکن حضرت عمرو بن لادن نے اس کو خالی کر دیا۔ اس کا حال ہونا پسند نہیں کرتے تھے راضی نہ ہوئے۔ اس لئے دریائے نیل کے اسی پار قصر شمع کے متصل جو زمین ہے اس کو منتخب کیا۔ یہ جگہ عرب اور مصر کے قریب ترین نقطہ اتصال پر ہے اور یہاں سے مصر کے دونوں اطراف شمالی اور جنوبی کی نگہداشت ہو سکتی ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی صحت بخش ہے۔ ایک طرف دریائے نیل ہے اور دوسری طرف کوہ قلعہ اور سارا قطعہ سرسبز و شاداب ہے۔

مورخین کہتے ہیں کہ پہلے اسی مقام پر عربی فوج نے ڈیرے ڈالے تھے جب اسکندریہ کو روانہ ہونے لگے اس وقت عمرو بن مامس کے خیمے میں ایک کبوتر نے گھونسلہ بنا کر اڑے دے دئے تھے انھوں نے اس پرند کی خاطر سے اس کو اسی طرح چھوڑ دینے کا حکم دیا اور کہا کہ مت اکھاڑو ورنہ ہمارے اس جہان کو تکلیف ہوگی۔ جب اسکندریہ کی ہم سے واپس آئے تو اسی میں اترے اور اسی

جگہ شہر تعمیر کرایا۔ ڈیرہ کو عربی میں فسطاط کہتے ہیں اس وجہ سے اس شہر کا نام فسطاط رکھ دیا گیا۔
اس کے مددگار و خلیل بنو انی اور وسط میں ایک عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کرائی جس کی سمت قبلہ کی
تعمین میں ۷۰ صحابہ کرام شریک تھے۔

عرب کے بعض قبائل مثلاً تمیمیر۔ ازود اور ہمدان وغیرہ کے لوگوں نے چہار دیواری کے اندر
سکونت رکھنے کو شہادت کے متافی سمجھا۔ اس لئے باجارت خلیفہ ان کو ایک دوسرے قطعے میں
آباد کر دیا جس کا نام جنیزہ رکھا اور جو آج تک آباد ہے۔

فسطاط مدت تک مصر کا صدر مقام اور دہاں کی تہذیب اور تجارت کا مرکز رہا جس جس
محلے میں چار چار گھر آباد ہوتے تھے۔ ان میں چار چار سو آدمیوں کی ایک گزشتہ آبادی
کے زمانے میں چالیس ہزار فوج یہاں رہتی تھی۔ ابن طولون
قدر بڑھ گئی کہ اس کو اس کے متصل ایک دوسرا شہر قنطاریہ
کنا پڑا۔ چوتھی صدی ہجری کا مشہور سیاح بشاری لکھتا ہے کہ

تجارت کا مرکز اور مسلمانوں کا مایہ نگر ہے۔ دنیا سے اسلام میں یہاں کی جات مسجد سے زیادہ آہستہ
علی مجالس نہیں ہوتیں یہاں کی بندرگاہ سے زیادہ کہیں کشتیاں نگر اندازہ ہوتی ہیں۔
۷۵۰ھ میں جب خلفاء فاطمیہ کا مصر پر قبضہ ہوا اور شہر قاہرہ تعمیر کر کے مرکز بنایا گیا اس وقت
سے فسطاط کی رونق کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ صلیبی جنگیاموں کے دوران میں وہ بالکل ویران
ہو گیا۔ مگر اب تک جامع عمرو بن ماس اپنے جگہ پر موجود ہے۔

عربی سیادت کے خلاف عجمی تحریکیں

پہلی صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے عرب دنیا کے طول و عرض میں چھائے گئے۔ کم ایسے خطے تھے جہاں کے وہ حکمران نہیں چکے ہوں یا کم از کم اپنے اثرات ہی سے دنیا کو متاثر نہ کیا ہو۔ اکثر و بیشتر مقامات پر انہیں کی تہذیب تھی اور انہیں کا تمدن، اس لئے بعض قوموں کے بعض ان افراد نے جن کا قومی، وطنی اور مذہبی جذبہ قوی نہ تھا اس محکومیت کو قومی ذلت اور اپنی شاندار روتا کے بالکل منافی سمجھا اور اس نئی اسلامی تہذیب کو شقیہ نظروں سے عبی دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ اختلاط ایک نہ ایک دن ان کی قومیت ان کے مذہب اور لسانی امتیاز کو بالکل جڑ سے اکھاڑ کر پھوگا۔ رسوائی کا یہ احساس اور اپنی ہستی کے فنا ہونے کا یہ خطرہ ایک سے زیادہ قوموں کے زیادہ افراد کو تھا لیکن بالخصوص ایرانیوں کو زیادہ تھا۔

ان الفہم کا نوا من سعة الملك وعلو الید
علی جمیع الامم و جلالة الخطیوفی نفسہم حتی
انہم کانوا یسئلون نفسہم لاجلاد والابناء وکانوا
یعدون مسائل الناس عبدیہم فلما استغنوا بزوال
الدولة عنہم علی ایدي العرب وکان العرب اقل الامم
عند الفہم فظنوا انہم الامم وضاغت لہم السیاسة

ایرانی اپنی وسیع سلطنت اور علوم تربت کے اعتبار سے تمام قوموں پر غالب تھے اس لئے اپنے آپ کو آزاد اور دوسروں کو غلام سمجھتے تھے لیکن جب ان کی حکومت عربوں کے ہاتھ میں چلی گئی جس کو کہ یہ اپنے سے فرد تر سمجھتے تھے تو یہ ان کو بہت شاق گذرا

انہیں خطرات اور اپنے ان احساسات کی ناپرا ایک ایسی چال چلنے پر مجبور ہوئے جو ایک عرصہ بعد مسلمانوں کے انتشار اور ان کی سلطنت کی کمزوری کا سبب بنی۔ وہ چال یہ تھی کہ انبیا پر مسلمان ہونے کا اظہار کیا جائے لیکن باطن میں خفیہ طور پر ان کے مٹانے کی فکر ہو۔ یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا کہ

(۱) اہل وائل بن حزم صفحہ ۱۱۵

مسلمانوں کی اس وقت کی قوت کے آگے کوئی دوسرا طریقہ مقابلہ کا شک تھا چنانچہ حلقہ اسلام میں داخل ہو کر سب سے پہلے شرعی احکامات میں تاویل اور تنقید کا رواج عام دیا۔

جمعہ عند فحکة الاسلام تاویل الشارح علی | اسلام کی بڑھتی ہوئی شوکت سے خائف ہو کر ان لوگوں نے
وجہ تعدد الی قواعد اسلام فہم وذلک انہم | ارادہ کیا کہ شریعت کی تاویل اس طریقے پر کی جائے جو
اجتمعوا فلما اکروا ما کان علیہم من | ان کے اسلاف کے طریقوں کی طرف ان کو لے جائے اس
الملک وقالوا لا سبیل لنا الی وقع المسلمین | لئے وہ جمع ہوئے اور اپنے بزرگوں کے بلند مرتبہ کو یاد
بالسیف فلبیہم استلایہم علی المملک و لکننا | کیا اور چونکہ کوئی دوسرا طریقہ مسلمانوں کی قوت و راز
تعال بناویل شاریعہ الی ما یجوز علی قواعدنا | کے اختیار کی وجہ سے
ونستدحرجہ بالضعفاء ومنہم فان ذلک | کے کہ یہی ان میں
یوجب اختلا فہم واضطرب ملکہم۔ | کا باعث ہو سکتا تھا

دوسرا سوئرا اور کارگر آئہ جو اختیار کیا گیا وہ میلان شیعیت کا تھا حالانکہ عیسائی بزرگ
جماعت تھی کہ جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور زہد ان کی اولاد سے کوئی محبت تھی، ان کے نزدیک
آل علیؑ اور دیگر عرب یکساں تھے صرف اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے یہ ایک بہتر صورت تھی و
خوب سمجھتے تھے کہ عام مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے جتنا شنف ہر کسی سے نہیں
ہو سکتا۔

”از ابتدائے اسلام مخصوص از روئے کہ ایران بدست سعد بن وقاص از طرف خلیفہ دوم

(۱) شرح مواقف

(۲) یہ اور اس کے بعد تین چار مقامات پر جو اقتباسات دئے گئے ہیں ”تجلیات روح ایرانی در ادوار
تاریخی“ ایک فارسی رسالے کے ہیں۔ یہ رسالہ ایران کے ایک مشہور قوم پرست حسین کاظم زادہ کا ہے
اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ روح خاص جو زمانہ قدیم سے ایرانیوں میں چلی آتی ہے اب
تک باقی اور زندہ ہے اور اس روح سے ان کی مراد جذبہ قوم پرستی، وطن پرستی اور مذہب پرستی ہے۔ وہ

شیخ استیلا، گویہ ایرانیوں نے جس انتقام و ردِ دل خود می پروردند و ایمان میں دیکھنا انتقام و ردِ دل خود نمائی می کرد و از پروردہ بیرون می افتاد، انیکہ با آئین فرقہ تشیع کلی ظاہر گشت، بہ محبت مخصوص از ابتدا سے اسلام ایرانیوں نسبت بخاندان رسول و مسلم حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) و اولاد او ہم رسانیدہ خیل از اسباب معلومہ یک ملت سیاسی نیز خواست۔ و گرد ہمد قبائل عرب و پیشوایان اسلام برائے ایرانیوں یکے بود و یا پیچ کہ امام خویشی و روابط مخصوص پیش از وقت نہ داشتند۔

صحیح طور پر یہ بتا کر کس وقت دور کس کے عہد حکومت میں انھوں نے تشیع کا اظہار کیا، ذرا مشکل ہے۔ البتہ یہ آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ بنو امیہ کے زمانے میں انھوں نے بھی اپنے منبر، داعی، قاصد اور نقیب سلطنت امیہ کے چپہ چپہ پر پھیلا دئے تھے، اور یہ وہ موقع تھا جب دو دو جماعتیں ملو یہ اور عباسیہ متحدہ سازشی قوت کے ساتھ بنو امیہ کی حکومت کو مٹانے کے ور پے تھیں جو ایک خالص عربی حکومت تھی، ظاہر ہے کہ اس سے بہتر موقع عربوں کے خلاف ان کو اور کب مل سکتا تھا، چنانچہ ان کے منبروں اور داعیوں نے وہ کرد و کھایا جو ایک بڑی سے بڑی اور طاقتور حکومت بھی اپنے مخالف کے مقابلے میں مشکل کر سکتی، بالآخر انھیں کے ایک شخص ابو سلم جو خالص ایرانی اور مجوسی النسل تھا بنو امیہ کی حکومت کو برباد کرنے اور ان کی جگہ عباسی حکمران کو متعین کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بنو عباسیہ کی حکومت کی جو خود ان کی کوششوں سے قائم ہوئی تھی اس کا اثر کا اثر تھا کہ جس نے ایرانیوں کو مختلف مذاہب اور قوموں کے مقابل سینہ سپر کیا اور پھر اسلام کے خلاف بھی انھوں نے اپنے اس جذبہ کائنات دیا۔

ایرانیوں کے متعلق جن خیالات کا اظہار حسین کاظم، ابن خرم اور ان کے علاوہ اور بہت سے دوسرے مؤرخین نے کیا ہے اس سے یہ عطا بھی نہ ہونی چاہئے کہ اس جذبے میں ہر ایرانی مسلمان شریک تھا اس لئے کہ ایران کی سر زمین نے جہاں اس قسم کے لوگوں کو پیدا کیا وہاں بہت سے سچے مسلمان بھی ہوئے تھے جن کی شہادت و تاریخ، علم و اخلاق، تصوف و غیرہ کی کتابوں کے صفحات سے رہے ہیں۔

ابو مسلم کی کیا عظمت کی فزیب کاری کا ثمرہ تھی۔ یہ لوگ اپنی خاص اور ایرانی حکومت تصور کرتے تو
 ”اگرچہ خلفائے عباسی از اولاد حضرت علی ابن ابی طالب کہ ایرانیان می خواستند بنویز
 دے باز بہتر از بنو امیہ بودند چوں بدستاری ایرانیان و سپاہ مروی ابو مسلم خراسانی بمقام خلافت
 رسیدند سلطنت ہاں یک سلطنت ایرانی شمرده می شود“

ان کا شاید یہ گمان تھا کہ رفتہ رفتہ اثر و اقتدار بڑھا کر اس کی حکومت کو خالص ایرانی حکومت
 بنالیں گے۔ لیکن خلیفہ ابو منصور کی بروقت بیداری اور اس سلسلے میں ابو مسلم خراسانی کے قتل
 ایرانیوں کو چوکنہ کر دیا۔ ان کو دھندلا سا نظر آیا کہ شاید ان کی آرزو پوری ہوئی نظر نہیں آتی۔
 ”وے ایں انقلاب ہنوز برائے اعادۂ استقلال سیاسی“

دستورائے عباسیان بہند خلافت رفع عطش از تشنگان زلال
 کہ ایرانیان بدان خاندان بشرب بودند بطور دلخواہ حاصل نہ شد“

اس نے اب یہ پہلا موقعہ تھا کہ عباسیوں کے خلاف بھی ان کی پہلی جیسی
 لیکن سازشی تدبیروں کے علاوہ ابو مسلم کے ہمراہیوں میں سے فیروز نامی مجوسی نے جو ستاد کے
 نام سے مشہور ہے باغی ہوا اور ابو مسلم کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے سے اس سلطنت کے شیرازہ
 کو کھینچنے کی تدبیر کی۔

”ستباد مجوسی کہ دوست و طرفدار بود، ہوا خواہان زیادہ زوری دور خود جمع کردہ اہل
 شہر قوش درے را کہ ابو مسلم خزائن زیادہ دریں شہر آخری گذاشتہ بود و صرف نمود و آن خزائن را
 برداشت و اعلان کرد کہ خیال دارد کہ بر حجاز حملہ یزد و کعبہ را خراب بکند“

رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی کارروائی جاری رکھی، یہاں تک کہ خلیفہ ہارون الرشید کا زنا
 آگیا۔ اس زمانے میں خاندان براکھ نے جو اثر و اقتدار اپنا حاصل کر لیا تھا اس سے ان کی توقع
 بیجا نہ تھی کہ اب حکومت آسانی کے ساتھ ایرانی حکومت میں تبدیل ہو سکتی ہو، مگر یکایک ہارون
 چڑھکا اور خاندان براکھ کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا۔ براکھ کی تباہی جن اسباب کے تحت

ہوئی۔ اور اس ہی سبب تھا، چنانچہ اکثر اہل مغرب آبادی کہتے ہیں کہ
 ”خالد بن برمک ابومسلم خراسانی کا خاص مستعد تھا۔ یہ لوگ ایرانی سلطنت قائم کرنے کے بعد
 آئندہ مند تھے، خالد بن برمک نے ابومسلم کے قتل کے بعد کسی اپنے طرز عمل سے اپنی ناراضگی کا اظہار
 ہونے نہ دیا، تیاری ہو چکی تھی اور سلطنت عباسیہ کا تختہ الٹ جانے کی سازش مکمل کر چکے تھے۔
 اس سازش میں علوی ان کے شریک تھے۔ برآمدہ کی یہ تیاریاں ابومسلم کے خون کا بدلہ لینے اور
 ایرانی سلطنت قائم کرنے کے لئے تھیں۔ انھوں نے ایک طرف علویوں اور خراجیوں کو اپنے ساتھ
 شامل کر لیا تھا اور دوسری طرف علماء و فقہاء اور صوفیاء کو بھی زر پاشی سے اپنا ہوا خواہ بنالیا تھا۔
 اس واقعے سے ایرانیوں کی آنکھیں کھل گئیں اور یہاں پہنچ کر ان کو صاف صاف معلوم
 ہو گیا کہ کچھ بھی ہو آخر تو خلفاء مسلمان ہیں اور ان پر عربوں کا کافی اثر ہے لیکن اس کے باوجود ان کی
 ہمتیں پست نہیں ہوئی تھیں وہ برابر اس دامن میں لگے رہے، خلیفہ امون کی ماں ایرانی تھی،
 سلطنت بھی ایک ایرانی وزیر فضل نامی جس کا باپ مجوسی تھا کی کوششوں سے حاصل ہوئی تھی
 اس لئے قدرتاں امون ایرانیوں کا ہوا خواہ تھا۔ اسی وجہ سے پھر وہ ایرانی اقتدار جس کو ہارون
 نے ختم کر دیا تھا اس دور میں حاصل ہو گیا، اس کے علاوہ خیالات اور عقائد میں جو آزادی اس
 زمانے میں لوگوں کو حاصل تھی کسی زمانے میں بھی ایسی بے راہ روی نہ تھی، فارسی، یونانی اور
 سریانی وغیرہ زبانوں کی بہت سے فلسفیانہ کتابوں کے ترجمے نے اس بے راہ روی میں اور
 اضافہ کر دیا تھا، ایرانیوں نے اس موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ جھٹ ایک بڑے گروہ
 نے اسماعیل اور ان کی اولاد کا ہوا خواہ بن کر ان کے لئے دعوت خلافت شروع کر دی۔ پھر
 سلطان بک محمد کے وہ خطبات جو وقتاً فوقتاً جامعہ مصریہ کے طلبہ کے سامنے صاحب موصوف
 نے دئے ہیں ”الفلسفۃ العربیہ والاخلاق“ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں، اس میں
 ایک چھوٹا سا خطبہ اس جماعت پر بھی موجود ہے، چنانچہ وہ یہ کہنے کے بعد کہ فارسیوں کا یہ تھا

قول حق صنف، ہ

جذبہ تھا جو اسلامی سلطنت کے خلاف کوشش کر رہے تھے، کہتے ہیں کہ
 مامونؑ کا میلان شیعیت کی طرف زیادہ تھا، اس کے زمانے میں فارسی
 بزبان اور سریانی زبانوں کی فلسفیانہ کتابیں عربی زبان میں بہت سی نقل ہوئیں، لوگوں نے
 کثرت سے اس کی طرف مہمپی کا اظہار کیا، پھر بعض کو مذہب وغیرہ کے متعلق خیالات کے چلار
 میں عام آزادی مل گئی، فارسیوں کو یہ موقعہ قیمت معلوم ہوا، اس لئے وہ اسماعیلیت کی طرف
 جیسے اور یہ اس وجہ سے کہ لوگوں کا رجحان آل علی کی طرف زیادہ تھا۔

اس قدر لکھنے کے بعد یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس
 جس میں یہ لوگ اگر شریک ہوئے، اسماعیلیہ پہلے ایک سیاسی
 تھی، جو جو عباس کے دور حکومت میں پیدا ہوئی اور وہ اس میں پہلے
 سے عقائد و خیالات کے مختلف فرقوں اور جماعتوں میں منقسم ہو گئے، سیاسی حیثیت سے بھی
 دو بڑی شاخوں میں بٹ گئے، ان میں سے ایک گروہ اہل سنت والجماعت کا ہے اور دوسرا
 شیعہ، اہل سنت والجماعت سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جن کا اعتقاد اس مسئلہ خاص یعنی خلافت
 و امامت میں یہ ہے کہ خلفاء اربعہ جس ترتیب سے خلیفہ ہوئے ٹھیک اسی ترتیب سے ان کو حق خلافت
 حاصل تھا۔ لیکن شیعہ جن کا عقیدہ بالکل اس کے عکس یہ ہے کہ خلافت کے اصل حقدار حضرت علی
 رضی اللہ عنہ تھے۔ عام مسلمانوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا کر ان کے حق میں دست اندازی
 کی۔ شروع شروع میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جمہور اہل اسلام کا ابو بکرؓ کی بیعت
 پر متفق ہو جانے کے بعد کسی کی بہت یہ نہ تھی کہ ان کی خلافت اور اسی طرح حضرت عمرؓ کی خلافت سو
 اٹھا کر کرتے لیکن حضرت عثمان کی خلافت کے ساتویں سال سنہ ۳۵ میں خلیفہ موصوف کی زمرہ کبا
 سے یہ تحریک عملاً شروع ہوئی کہ علیؓ اور ان کے خاندان میں خلافت محدود ہو، چنانچہ اسی تحریک

کا یہ بھی تھا کہ حضرت عثمان رضی کی شہادت ہوئی اور بالآخر حضرت علی رضی خلیفہ منتخب ہو گئے گو اس جماعت کا مقصد حاصل ہو گیا تھا مگر اس کو کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ حضرت علی رضی کو بصرہ ہنزہ اور صفین کی لڑائیاں لڑنی پڑیں اور آخر کار ایک خارجی نے شہید کر دیا اور معاویہ ابن ابی سفیان کے ہاتھ پر شام، حجاز، یمن اور مصر کے لوگوں نے بیعت کر لی، صرف ایک کوفہ رہ گیا تھا جس نے ان کی بیعت نہیں کی تھی، ان لوگوں نے حضرت علی رضی کی شہادت کے بعد امام حسن رضی حضرت علی کو صاحبزادے کو خلیفہ بنایا۔ امیر معاویہ نے عراق پر حملہ کیا اور چند دن کے بعد آخر کار امام حسین خلافت سے دست بردار ہو گئے امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی خلافت اپنی ہی زندگی میں تسلیم کرانی چاہی، کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی، چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں اپنی خلافت لوگوں سے منوانی چاہی اور کوفہ والوں نے امام حسین کو خلیفہ بنانا چاہا اور مکہ کے علاقے میں ان کی شہادت کا دردناک واقعہ پیش آیا، یزید کے انتقال کے بعد عبداللہ بن زبیر کا علاقہ اطاعت بہت وسیع ہو چکا تھا اور دوسری طرف بنو امیہ کی اولاد تھی، ان دونوں گروہوں میں خوب خوب جنگ ہوئی اور آخر میں امیہ کا خاندان غالب آ گیا اور ایک عرصے تک ان کی خلافت اور حکومت رہی، ظاہر ہے کہ جو لوگ حضرت ابوبکر رضی اور حضرت عمر رضی جیسے جلیل القدر مستدین صحابہ کو ماصب خلافت ٹھہرا سکتے تھے، بنو امیہ کا خاندان ان بزرگوں کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا تھا، اور پھر اس وقت جب یحییٰ بن عبد کے حکومت کا دور دورہ ہو۔

لیکن اس دور حکومت میں یہی شیعہ دو بڑی شاخوں میں منقسم ہو گئے ایک یزید اور دوسرے کسانہ۔ اول الذکر خلافت و امامت کو اس جماعت میں دیکھنا چاہتی تھی جو حضرت فاطمہ کی اولاد سے ہوں، اور موخر الذکر نے محمد بن حنفیہ (حضرت علی رضی کے بڑے بیٹے) کے سلسلہ کو اپنا پیشوا اور مقتدا بنایا تھا۔ زیدیوں کے موجودہ امام زید بن علی بن حسین تھے اور کسانہ کے ابو ہاشم عبداللہ بن محمد بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب تھے۔ ان دونوں جماعتوں نے عباسی داعیوں کے ساتھ مل کر کام شروع کیا، جو راہ عمل اختیار کی تھی وہ یہ تھی کہ بظاہر امویوں کی خلافت تسلیم

کرتے اور خفیہ طور پر جس کو اپنا اہلحد و سبختے بیعت لیتے، اور راز کے پوشیدہ رکھنے کی تاکید فرماتے۔ اس کے علاوہ آپس کے تصادم سے بچنے کے لئے بہتر طریقہ یہ اختیار کر رکھا تھا کہ بجائے امام زین العابدین، محمد بن حنفیہ یا حضرت عباس کے نام پر بیعت لینے کے صرف اہل بیت کا لفظ استعمال کرتے، عباسی داعیوں کی یہ ایک چال تھی کہ اپنے کو ہمیشہ خود خلافت کی آرزو سے الگ اور ان کا محض معاون ہی ثابت کرتے رہے۔ لیکن جب کاسیانی کا موقعہ ابوسلم کی کوششوں نے پیدا کر دیا۔ تو قدیم معاہدے کے خلاف اپنی حکومت قائم کر لی جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ علویہ کی وہ جہالتیں جس طرح بنو امیہ کے مٹانے کے ورپے تھیں عباسیہ کی نگہ میں، انہیں چنانچہ پھر وہ اگلی سی کوششیں ان کے خلاف جاری تھیں۔ اسماعیلیہ بن سے ان ایرانیوں کا تعلق۔

میں شیعوں کی ایک تیسری جماعت امامیہ کی ایک مشہور شاخ کے عقیدہ یہ ہے کہ خلافت کے مستحق دراصل حضرت علی، پھر حسن پھر حسین۔

اور پھر ان کے بیٹے جعفر صادق ہیں، جعفر صادق کے بعد دو جماعتیں پیدا ہوئیں۔ ایک کو موسیٰ کاظم کی نسل سے بتایا اور دوسری نے اسماعیل کی اور اسماعیلیہ کہلائے جس طرح شیعوں کی اور دوسری جماعتیں خلافت کے لئے کوشاں تھیں اسماعیلی اس معاملے میں سرگرم رکن نہ تھے۔ صرف اپنے عقیدے کے مطابق امام کی موجودگی کا یقین رکھتے تھے اور ان کے لئے بیعت لینے پھر رہے تھے، چنانچہ مبارک نجم محمد بن اسماعیل بن امام جعفر صادق کا غلام تھا۔ محمد بن اسماعیل کی وفات کے بعد کوفے میں جا کر کوفے کے شیعوں کو مذہب اسماعیلی اختیار کرنے کی ترغیب دی اور اسی طرح بعض اسماعیلیوں کا خفیہ طور پر شمالی افریقہ کے علاقوں میں اسی زمانے میں دعوت امت کا پتہ چلتا ہے، اگرچہ شیعوں کے عام عقیدے کے مطابق امام وقت اللہ کی طرف سے مخلوق پر حجت ہوتا ہو اور اس کا وجود تبلیغ شریعت کے لئے ضروری ہو۔ کسی ایسے امام کا ظہور اسماعیل کی اطاعت میں نہیں ہوا مگر انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ امام کا ظہور ضروری نہیں بلکہ کبھی کبھی وہ مستور ہوا کرتا ہے اور لوگوں کو ان کے حال سے آگاہ ہی نہیں ہوتی ہے مگر ایسی حالت میں یہ لازم ہے کہ ان کا نائب

ظاہر ہو جو خلق اللہ پر محبت ہو اور دعوت تبلیغ کے منصب پر قائم ہو۔

ایرانیوں کا اس تعلق کی خاطر جانوں نے اسماعیلیوں سے قائم کیا تھا ان کا تذکرہ کرنا ضروری تھا، اس لئے کہ یہ تعلق نہ صرف ابتدائی زمانے ہی میں ظاہر کیا گیا بلکہ تا انقراض دولت عباسیہ سیشہ کیساں طور پر باقی رکھا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ ساری وہ کامیابیاں جن کا ذکر آگے آئے تھے اسی بنا پر ان کو حاصل ہوئیں، اس لئے قصداً ان واقعات کے بتانے میں ذرا تفصیل سے کام لیا گیا تاکہ جہاں یہ معلوم ہو سکے کہ یہ اسماعیلی کون تھے اور ان کا ظہور کن مہاجرات کے ماتحت ہوا، اس بات کے اندازہ کرنے میں بھی سہولت ہو کہ اس جماعت کے ساتھ شامل ہونے سے ان کا کیا فائدہ تصور ہو سکتا تھا۔ حالات اور واقعات کی بنا پر یہ نتیجہ نہایت آسانی سے اخذ کیا جاتا ہے کہ اس اسماعیلی جماعت کی طرف اپنے کو منسوب کرنے میں ان کا بظاہر منشا یہی تھا کہ جس طرح دوسری شیعہ جماعتیں زید یہ اور کیسانہ دولت عباسیہ کے خلاف اپنی خلافت قائم کرنے اور عباسی حکومت کو مٹانے کے درپے تھیں، اسماعیلیوں کا بھی دراصل وہی منشا تھا اور اس پر دوسے کی آڑ میں کچھ اور بھی مقصود تھا کہ ان کے مقابل لاکر کھڑا کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اخوان الصفا

اس وقت کے بہت سے علما نے جن کی ذہنیت کو یونانی فلسفہ اور منطق نے مسخ کر دیا تھا ایسے رسائل کیے جن کا مقصود اگرچہ یہ نہ تھا کہ اس قسم کے لوگوں کی تائید کی جائے مگر باعتبار نتائج ایسا ضرور ہوا کہ انھوں نے اپنے ان خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا جو حصول مقصد میں معین ہو سکے تھے۔ یہ رسائل اخوان الصفا کے نام سے مشہور ہیں اور یہ چار جلدوں میں ہیں۔ یہاں ایک آدھ مقام سے اس کا اقباس پیش کیا جاتا ہے، تاکہ یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ ان رسائل سے ان کی تائید کیے ہوئے تھے۔ ان اسماعیلیوں کی سب سے پہلی اور بنیادی چیز یہ تھی جیسا کہ آئندہ بتایا جائے گا، کہ لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ قرآن اور جملہ احکام الہی اپنے ظاہری اور باطنی معنی کے اعتبار سے دو الگ الگ چیزیں ہیں، لوگوں نے ظاہری احکام پر عمل کر کے سخت غلطی کی ہے، اسی خیال کو اخوان الصفا

کی چوتھی جلد چھ رسالے میں ناسوس الہی کی اہمیت اور نبوت کے شرائط کے تحت لکھا گیا ہے
 ”تمام سائنسی کتابیں اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے نو معنی میں ایک تو وہ معنی میں جو
 اس کے ظاہری الفاظ دلاتے ہیں، دوسرے وہ حقیقی معنی جو کہ لفظ کی تہہ میں پوشیدہ ہیں۔
 اس بنا پر ہر شرعی احکام کے دو پہلو ہیں ایک اس کا ظاہر اور دوسرا اس کا باطن جو لوگ ظاہری
 احکام کے پابند ہوتے ہیں وہ دنیاوی حیثیت سے شک کا مایاب ہیں لیکن اہل اہل اور آخری کا بنیاد
 ان لوگوں کے صفحے میں ہر جو اس کے خفی معنی سے واقف اور اس کو اپنا عملی شعبہ بناتے ہیں.....
 خدائی قانون کی غرض اہل ہی ہے کہ لوگ اسرار سے واقف

لوگ ان اسرار سے واقف ہونے کے باوجود کوئی جدوجہد
 حشر مرنے کے بعد یہ ہو گا کہ عام بہانہ اور ان کے رتبے میں کوئی
 رالابث میں عام مسلمانوں کے اس اعتقاد سے کہ
 دوبارہ اٹھیں گے انکار کیا ہے جس کو اسماعیلیوں نے نفی قیامت کا پہلا زنیہ قرار دیا ہے۔
 یہ اسماعیلی دولت عباسیہ کے خلاف پروپیگنڈا کرتے پھرتے تھے اور یقین عوام کو دلا رہے
 تھے کہ اب خدا کا وعدہ پورا ہونے والا ہے، حکومت اور خلافت ہمارے خاندان میں بہت جلد
 منتقل ہوگی۔ اس چیز کی تائید ایک دوسرے رسالے الدعوۃ الی اللہ سے ہوتی ہے۔

”ملک اور دولت ہر زمانے اور ہر دور میں ایک خاندان سے دوسرے خاندان
 ایک قوم سے دوسری قوم، ایک ملک والوں سے دوسرے ملک والوں میں تبدیل ہوتی رہتی
 ہے، اس لئے اب یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اچھی حکومت اور دولت جو اب شروع ہونے والی
 ہے اور جس حکومت کے کل و پرزے اچھی قوم کے اچھے افراد ہوں گے، اس کو شش کے لئے یہ

کھپا ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ کسی مخصوص مقام پر جمع ہوں ایک رائے اور طریقے پر متفق ہونے کے بعد یہ عہد کریں کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہوں گے، ان کے تمام افراد کی مجموعی حیثیت تمام امور میں صرف شخص واحد کی اور تمام تدابیر میں صرف ایک نفس منفرد کی ہوگی بعد یہ معاملہ دین کی مدد اور آخرت کی طلب کا ہو۔ اس لئے صرف دعا کی رحمت کے طلبکار ہوں گے۔

بھائیو! اس اچھی خبر سے خوش ہو، اللہ کی مدد پر اعتماد کرو جس نے ہر کوشش کرنے والے کو اس کی کوشش کا پل دینے کا وعدہ کیا ہے۔ والذین جادو منہا لنہدیہم سلبا ویضرن اللہ من ینصرہ، وان حزب اللہ ہم الغالبون۔

بہت سے عقائد اور خیالات جو ان اسماعیلیوں کے تھے باطل ملتے جلتے ہوئے اکثر زمانہ میں موجود ہیں جو یہاں صرف مضمون کے زیادہ بڑھ جانے کے خوف سے چھوڑے جاتے ہیں۔

الٹائیٹھو پیڈ یا آن اسلام میں اخوان الصفا کے متعلق یہ لکھا ہے کہ
 سچو تھی صدی ہجری کے آخر نصف میں ایک شیعہ مذہبی اور سیاسی جماعت تھی جس کے عقائد اور خیالات اسماعیلی فرقے سے ملتے جلتے تھے۔ اس کا مرکز بصرہ تھا اس کے اراکین اپنے آپ کو صافی اور مومن کہتے اس لئے کہ اس کا مقصد اپنی روح کی نجات باہمی اعانت اور مدد سے حاصل کرنا تھا، اس جماعت کا نام اخوان الصفا رکھا۔ ان کے سیاسی کارناموں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، سوائے ان کے رسائل کے جو بہت مبہم زبان میں ہوتے تھے۔

افغانوں کا سیاسی عروج و زوال

افغانوں کا نسب | تاریخ اسلام میں افغان ایک عجیب و غریب قوم ہے جس کے سلسلہ نسب کے متعلق شرقی اور مغربی مورخین میں سخت اختلاف ہے، افغانوں کی نسبی تحقیق و تدقیق کے متعلق محققین نے کوئی بقیہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ لیکن جب اس کی تحقیقات پر غور کیا جاتا ہے تو ان

بعض مغربی مورخین کا خیال ہے کہ بعض قبائل افغان اُن

مکندہ عظیم کے ساتھ آئے تھے اور فتح کے بعد افغانستان کے پہاڑوں

دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ افغان قوم اُن نوآبادیوں کی نسل سے ہے۔

کے عہد میں یونان سے ہجرت کر کے افغانستان میں آکر آباد ہو گئے تھے۔

شرقی مورخین کا ایک بڑا گروہ اس بات پر متفق ہے کہ افغان قوم کا سلسلہ نسب بنی اسرائیل

سے ملتا ہے یعنی افغان سامی نسل ہیں۔

”دی افغانز“ کتاب کے مصنف کا خیال ہے کہ افغان قوم کا سلسلہ نسب البانیوں سے ملتا

ہے اور یہ لوگ البانی نسل ہیں۔ مصنف موصوف نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی ہے

کہ وہ البانی قبائل جو سواہل بحر اسود اور بحر متوسط پر سکونت پذیر تھے اور جو آئے دن شاہان ایران کو

پریشان کرتے رہتے تھے وہ ”غوان یا افغان“ کے نام سے مشہور تھے۔ شاہان ایران ان لوگوں کو وقتاً فوقتاً

بحر اسود اور بحر متوسط کے سواہل سے جلا وطن کر کے افغانستان میں لاکر بیٹاتے تھے۔ چنانچہ اس

موضوع کے خیال کے مطابق افغانی البانی نسل ہیں۔

خود افغان مورخین اپنے آپ کو یہودی نسل کہتے ہیں اور اپنے آباؤ اجداد کے وسط ایشیا

میں آنے کا حال اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ افغانہ جس کے نام سے افغانوں کو منسوب کیا جاتا ہے

حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے ایک شخص تھا۔ بخت نصر نے یہودیوں کو قید کر کے کوہستان غور میں

ان کی نسل پہلی چولی اور بڑھی۔ اگرچہ یہ لوگ ارض مقدس سے دور بلاد وطن کو کے
 پہنچے دس گئے تھے تاہم ان لوگوں کا مذہب ظہور اسلام تک یہودی مذہب تھا اور اس وقت تک یہ
 اپنے مذہب پر قائم تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بعض لوگ ارض مقدس میں آکر اپنے مذہبی
 جذبات تازہ کر کے واپس جاتے اور اپنے ہوطنوں کو یہودیت پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے
 ان لوگوں کے اسلام لانے کے متعلق یوں مشہور ہے کہ ایک یہودی خالد نامی آنحضرت کی خدمت میں
 آکر مشرف باسلام ہوا اور افغانستان میں اپنے بھائی بندوں کو اسلام کا پیغام پہنچایا۔ رفتہ رفتہ جب تمام
 افغانوں نے اسلام قبول کر لیا تو خالد نے چند افغانی سرداروں کو خدمت نبوی میں حاضر کیا۔ ان
 لوگوں نے خدمت نبوی میں اپنا سلسلہ نسب بیان کیا اور کہا کہ ہم لوگ حضرت ابراہیم کی نسل
 سے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے ان لوگوں کے ساتھ بہت مہربانی کا سلوک فرمایا۔ انھیں افغانی سرداروں
 میں سے ایک سردار قیس نامی تھا آنحضرت نے اس کا نام عبدالرشید رکھا۔ افغانی مورخین میں
 سے ایک اگر وہ کا خیال ہے کہ یہ افغانی سردار خدمت نبوی میں رہ کر بعض غزوات میں ہر کا بی
 کے شرف سے بھی مشرف ہوئے تھے لیکن یہ واقعہ بعید از قیاس ہے کیونکہ سیرت کی کتابوں میں اس
 واقعہ کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ افغانوں کے اسلام لانے کے متعلق ایک دوسری روایت
 قیاس معلوم ہوتی ہے جو ایک افغانی مورخ اس طریقے پر بیان کرتا ہے کہ لفظ افغان عربی لفظ ہے جو
 اہل میں عبرانی سے مشتق ہے ملک طاہرات جو یہودیوں کا سردار تھا اس کے ایک لڑکے کا نام افغان تھا
 جس کے ام سے اس کی نسل افغان مشہور ہوئی۔ یہودیوں میں آپس میں ایک عرصہ دراز تک خانجگی
 ہوئی اور نبخت نصر کے حملہ بیت المقدس تک جاری رہی۔ نبخت نصر نے ستر ہزار سے زیادہ یہودیوں
 کو نہ تیج کر دیا تھا۔ ان میں سے جو لوگ باقی رہ گئے تھے وہ بیت المقدس سے بھاگ کر ایک عرصہ
 تک عرب میں سکونت پذیر رہے لیکن معاش کی قلت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ایشیا کے کسی سرسبز حصے
 میں جا کر آباد ہوں۔ چنانچہ انھوں نے کوہستان سلیمان کو پسند کر کے وہیں سکونت اختیار کی۔ باقی ماندہ
 افغان حلیفہ اول کے عہد میں مشرف باسلام ہوئے اور ایران میں جا کر آباد ہو گئے۔ یہ لوگ چنگیزی

ملک ایران میں رہے اس کے بعد چنگیزی ظالم کی تاب نہ لاکر کوہ سلیمان میں ہجرت کر کے اپنے قبیلے
بندوں کے ساتھ اقامت پذیر ہو گئے۔

افغان قوم مختلف قبائل اور جڑگوں میں منقسم ہے۔ تمام افغانی قبیلوں کا دعویٰ ہے کہ
یہ لوگ ملک طالت کی نسل سے ہیں۔ افغانوں کی قومی خصوصیت آزادی۔ یہاں نوازی۔ اور
شجاعت ہے۔ افغان سنی المذہب ہیں اور بعض شیعہ مذہب بھی رکھتے ہیں۔ لیکن کثرت سنیوں
کی ہے۔ افغانوں کی قومی زبان پشتو ہے جو افغانستان کے مختلف حصوں میں مختلف لہجے
لہجہ کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ قندھار کی پشتو ایران کے
اس کے مشرقی افغانستان کی پشتو سخت لہجہ رکھتی ہے
بھی جاتی ہے۔ سرکاری دفاتر تمام کے تمام فارسی زبان
سرکاری زبان فارسی ہے۔

افغانستان | افغانستان فارسی کا ایک مرکب لفظ ہے جس نے "افغان" اور
"ستان" سے ترکیب پائی ہے۔ جس کے معنی ہوئے افغانوں کا ملک یا افغان قوم کا مسکن۔
افغان اپنے ملک کو قلا جیت اور کابلستان بھی کہتے ہیں۔ افغانستان کے حدود اور بوجہ ہیں
شمال میں ترکستان۔ مشرق میں پنجاب۔ جنوب میں بلوچستان اور مغرب میں خراسان۔
افغانستان کا رقبہ دو لاکھ پندرہ ہزار مربع میل سے بھی زیادہ ہے۔ باشندوں کی تعداد
دس ملین کے لگ بھگ ہے۔ افغانستان کے مشہور شہر یہ ہیں۔ کابل۔ غزنی۔ قندھار۔ ہرات
اور جلال آباد۔ ہرات اپنے موقع و محل کی وجہ سے مغربی ایشیا اور وسطی ایشیا کا تجارتی مرکز ہے
جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک روس اور برطانیہ کی استعماریت کا مرکز توجہ بنا رہا۔

افغانستان، ایران کی سطح مرتفع کا سب سے بلند حصہ ہے جس کی بلندی چار ہزار
فٹ سے لیکر سات ہزار فٹ تک ہے۔ افغانستان کا شمالی پہاڑ یعنی کوہستان ہندوکش
میں ہزار فٹ بلند ہے۔ اور مشرق میں کوہ سلیمان ہے جس کی چوٹیاں سات ہزار فٹ سے

کے گزیرے ہزار فیٹ تک بلند ہیں۔ کوہستان ہندوکش کی مغربی شاخیں یہ ہیں۔ کوہ بابا
کوہ سفید۔ اور کوہ سیاہ۔ ان سلسلوں کے شمال میں افغانی ترکستان واقع ہے۔ افغانی
اصدوسی ترکستان کے درمیان حد فاصل دریائے جھوں قائم کرتا ہے۔

افغانستان نامہوار سطح کا ملک ہے۔ بلند پہاڑیوں۔ بعض عمیق میدانوں اور ندیوں
کی خشک گھاٹیوں اور دروں سے ترکیب پاتا ہے۔ افغانستان کے میدانوں میں کثرت سے
باعث ہیں جن میں انگور، سیب، شتالو، امرود، بھی، انار۔ بادام اور پستہ بکثرت پیدا ہوتا
ہے۔ جو افغانی باشندوں کی ضروریات کو پورا کر کے ہندوستان کے بازاروں میں بھی خشک
و تر بکثرت آتا ہے۔ افغانستان کے اونچے اونچے پہاڑوں میں جو گنے جگلات سے ڈھکے ہوئے
ہیں۔ کفتار۔ لومڑی اور بعض حصوں میں شیر اور چیتا بھی پایا جاتا ہے۔ پالتو جانوروں
میں ایک قسم کی ایرانی بکری ہوتی ہے۔ جو اپنے لمبے بالوں کی وجہ سے کافی شہرت رکھتی ہے
گائے، بھیس، گھوڑا، گدھا، خچر بکثرت پائے جاتے ہیں۔ افغانستان میں وہ تمام پرندے
ملتے ہیں جو ایشیا کے دوسرے حصوں میں ہیں۔ قدرت نے افغانستان کو بکثرت معدنیات عطا
کی ہیں۔ لیکن ابھی تک صرف چند معدنیات نکالی گئی ہیں مثلاً شورہ، گندہک، نمک، رانگا اور لوہا۔
افغانستان کا لوہا اپنی خصوصیات میں دنیا کے کسی حصہ کے لوہے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

افغانستان میں دریا بہت کم ہیں۔ سب سے بڑے دریا صرف وہ ہیں رود ہلند اور دریائے
کابل۔ یہ دونوں دریا کوہ ہندوکش سے نکلنے ہیں۔ چند چھوٹی چھوٹی ندیاں بھی ہیں جن کا تذکرہ
باعث طوالت ہو گا۔

افغانی حکمران خاندان | عہد نبوآئیمہ اور نبو عباس میں افغانستان اموی اور عباسی گورنروں کے
ماتحت رہا۔ عباسی خلافت کے زوال کے بعد جب طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا تو افغانستان
پرخراسان کے گورنر اسماعیل سامانی نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد الپتگیں حاکم افغانستان ہوا

اس کے بعد سیکٹیں اس کے بعد محمود کا دور شروع ہوتا ہے۔ جس کی تلوار ایک طرف تو وسط ایشیا میں چلی اور دوسری طرف ہندوستان میں بے نیام ہوئی۔ دولت غزنویہ کے عہد حکومت میں افغانستان اپنی قومی حکومت قائم نہیں کر سکے۔

غوری خاندان | دولت غزنویہ کی تباہی کے بعد کوہستان غوز میں غوزیوں نے ایک حکومت قائم کی جس کو مورخ پہلی افغانی حکومت کہتے ہیں۔ یہ دولت غوز یہ وہ ہی ہے جس کے حکمرانوں میں شہاب الدین غوری بھی تھا جو ہندوستان کا مشہور فاتح اور سرزمین ہند میں اسلامی حکومت کا بانی ہے۔ یہ خاندان چنگیزی حملہ تک افغانستان میں نہایت شاندار طریقہ پر حکومت کرتا رہا۔ چنگیزی حملہ کے بعد افغانی قوم اپنے وطن میں ایک عرصہ دھارمک کوئی حکومت قائم نہ کر سکی۔

نے ایشیا کی سیاست میں ایک طوفان فہیم پیدا کر دیا تھا۔

دوہمی خاندان | ہندوستان میں تعلق خاندان کی تباہی

دور ہو گیا۔ جس سے فائدہ اٹھا کر بھلول نامی ایک لودھی سرور۔ لیکن طوائف الملوکی کی گرم بازاری اس کے زمانہ میں بھی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغانی حکومت صرف دہلی ہی تک محدود رہی۔ البتہ سکندر لودھی کے زمانہ میں سلطنت لودھی نے کافی وسعت حاصل کر لی تھی۔ سکندر بڑا عالم اور انصاف پسند حکمران تھا۔ ہمیشہ عیاد کی پیروی کیلئے کوشاں رہتا تھا۔

سکندر لودھی کے بعد اس کے جانشینوں میں وہ قابلیت نہ تھی جو ہندوستان کے ایک حکمران میں ہونی چاہیے۔ خود لودھی سرداروں میں بھوٹ بڑھ چکی تھی۔ دولت خاں۔ لودھی پنجاب کا گورنر تھا۔ اس نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور بابر نے اس کی دعوت پر ہندوستان پر حملہ کیا۔ بابر اور ابراہیم لودھی کی فوجوں کا پانی پت کے شہر میدان میں مقابلہ ہوا۔ ابراہیم لودھی کو شکست فاش ہوئی اور وہ مارا گیا۔ یہ واقعہ ۱۵۲۶ء کا ہے۔

سید خاندان [تیرہ چودہ سال تک افغان اپنی کوئی سلطنت قائم نہیں کر سکے اس کی وجہ یہ تھی کہ باہر کی فوجی طاقت بہت زیادہ تھی اور افغان اس کے مقابلہ میں کمزور تھے۔ باہر نے ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کو توسیع دینے کی سر توڑ کوشش کی جس سے ہندوستان کے مختلف صوبے مرکز یعنی حکومت آگرہ سے ملحق ہو گئے۔ باہر کے انتقال کے بعد ہمایوں نے بھی سلطنت کی توسیع و ترقی کی بے حد کوشش کی گجرات و مالوہ فتح کر کے مرکز کے تحت لایا۔ اور اس کے بعد چاہتا تھا کہ بنگال اور بہار کو بھی اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کرے۔ چنانچہ گجرات سے واپسی کے بعد اس نے بنگال و بہار کا رخ کیا۔ بہار میں اس زمانے میں افغانی حکومت تھی جس کا بادشاہ ایک نابالغ شہزادہ جلال خان نامی تھا۔ حکومت کا نظم و نسق اس کی ماں اپنے ہاتھ میں رکھتی تھی۔

اس زمانہ میں ایک نوجوان افغان جو اپنی شجاعت اور علمی تبحر کی وجہ سے شہرت تمام رکھتا تھا۔ میدان سیاست میں نمودار ہوا۔ یہ نوجوان ایک نووارد افغانی سردار کا بیٹا تھا جس کی جاگیر سہرام میں تھی۔ عنفوان شباب میں اپنے باپ سے خفا ہو کر جوہنور چلا گیا۔ جہاں اس نے فارسی ادب اور تاریخ کا بہت محنت سے مطالعہ کیا اس نے مذکورہ بالا دونوں فنوں میں زبردست قابلیت حاصل کر لی تھی۔ تاریخ ہند اس نوجوان کو شیر خان کے نام سے یاد کرتی ہے۔ شیر خان مختلف اوقات میں مختلف بادشاہوں کی خدمت میں ادا کرتا رہا۔ کبھی لودھی حکومت میں فوجی خدمت ادا کی کبھی ہمایوں کے دربار میں رہا اور ستارہ اقبال چکا تو بہار کی افغانی حکومت میں سپاہ و سفید کالک ہو گیا۔ شیر خان جلال خان نابالغ بادشاہ بہار کی ماں پر اس قدر اثر رکھتا تھا کہ وہ اپنے مرتے وقت حکومت بہار کا تمام نظم و نسق شیر خان کے سپرد کر گئی۔ چنانچہ اب شیر خان اور جلال خان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ جلال خان نے اپنی امداد کے لئے عالم بنگالہ کو مدد مانگی۔ اس نے شیر خان پر حملہ کر دیا جس زمانے میں شیر خان اور عالم بنگالہ کی فوجیں برسرِ پیکار تھیں ہمایوں کی فوجوں نے بہار کے قلعوں پر قبضہ کر کے بنگالہ کے قدیم دار الحکومت گور کو محاصرہ کر لیا۔

موسم ہمارے کی وجہ سے دو تین ماہ تک ہایوں سے اپنی فوج کے گور میں رہا۔ اس اثنا میں شیرخان بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ گزین ہوا۔ لیکن بعد میں میدانی علاقوں میں ٹھکڑ بنا دیں اور جو پور پر قابض ہو گیا۔ اس طریقہ پر شیرخان نے ہایوں کا راستہ روک لیا اب ہایوں کے لئے اگر وہ سے ملک بھی نہیں آ سکتی تھی۔ ہایوں نے مجبوراً برسات کی وجہ سے اگر وہ واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ ہایوں جب پٹنہ پہنچا تو اس کو یہ معلوم ہوا کہ شیرخان کی فوجیں راستہ روک کے کھڑی ہیں۔ ہایوں نے گنگا پار کرنے کے لئے کشتیوں کے پل تیار کرنے کا حکم دیا تاکہ دوسری طرف خیمہ زن ہو کر دشمن کا مقابلہ کر سکے اسی اثنا میں شیرخان کی طرف سے صلح کے لئے سلسلہ جنجانی ہوئی۔ شیرخان نے اپنے کوچ کو ملتوی رکھا۔ لیکن حقیقت یہ صلح ایک دھوکہ ہے۔ ہایوں پر شب خون مارا۔

رات کے وقت شیرخان فوجوں نے ہایوں کی فوجوں پر جس کی وجہ سے ہایوں کو سخت شکست اٹھانی پڑی اور اس نے جان بچانے کے عرصے میں اپنے ہمراہیوں کے دریا پار ہو کر بھاگنا چاہا لیکن اس کے بہت سے ساتھی غرق ہو گئے اور وہ خود بھی ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ اس جنگ کو تاریخ ہند میں جنگ بکسر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور یہ ۱۳۱۷ء کا واقعہ ہے۔

دوسرے سال ہایوں نے شیرخان جس نے اب شیرشاہ کا لقب اختیار کر لیا تھا کی سرکوبی کے لئے از سر نو فوج تیار کی اور کوچ کیا۔ اس دفعہ شیرشاہی اور ہایوں کی فوجوں کا مقابلہ دریائے گنگا پر فوج کے قریب ہوا۔ ہایوں کی فوج کے لئے بارش نے لشکر گاہ میں رہنا مشکل کر دیا۔ اور بعض سرداروں نے عین وقت پر ہایوں کو دغا دی۔ اس حالت میں شیرشاہی فوجیں ہایوں کی فوجوں پر شدت سے حملہ آور ہوئیں۔ ہایوں کو پھر شکست ہوئی۔ اتمان و خیران اگر وہ پہونچا شیرشاہی فوجیں برابر تعاقب کر رہی تھیں۔ مزید برآں اگر وہ

ہمایوں کے بھائیوں کی نگاہری مخالفت بھی ہمایوں کیلئے دشمنی کا باعث ہوئی۔

اس سبب کی بنا پر ہمایوں نے بادل ناخواستہ ہندوستان کو خیر باد کہا۔

ہمایوں، پنجاب اور سندھ ہوتا ہوا ایران پہنچا۔ شاہ ایران نے اس کی بڑی خاطر وادعات کی اور اپنا خاص مہانچ کرکھایہ واقعات ۱۵۴۵ء کے ہیں۔ ہمایوں کے جانے کے بعد تقریباً تمام شمالی ہند شیرشاہ کے قبضہ میں آگیا۔ شیرشاہ نے مالوہ اور رازدار فتح کر کے اپنی حکومت کی توسیع کی پانچ سال تک حکومت کرنے کے بعد راہی ملک عدم ہوا۔

شیرشاہ کا سب سے بڑا کلامہ ملکی زراعتی انتظامات ہیں جن کی وجہ سے اس کا نام تاریخ ہند میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اور اسی چیز نے مومنین کے اس نظریہ کو باطل کر دیا کہ افغان حکومت کرنا نہیں جانتے۔ لیکن ایک فاتح یا بہترین سپاہی بن سکتے ہیں۔ شیرشاہ کے رفقاء عام کی چیزوں میں سے آج بھی ہم کو ایک یادگار ملتی ہے۔ اور وہ مشہور شرک اعظم ہے جو کلکتہ سے پشاور تک اب بھی رہرو دن کی رہبری کرتی ہے۔

شیرشاہ کے بعد اس کا بیٹا سلیم شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے نو سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کی اور اپنے باپ کے نامک کاموں کی تکمیل کی۔ اس کے بعد سوری حکومت نالائق حکمرانوں کے ہاتھ میں آئی جنہوں نے اپنی ناقابلیت کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں میں حکومت کھو دیا۔ سلطنت کھونے کی سب سے بڑی وجہ سوری سرداروں کا باہمی اتفاق تھا۔ سوری سرداروں کی باہمی کشمکش کے دوران میں ہمایوں نے مناسب موقع پا کر ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ سوری اور ہمایوںی فوجوں میں پانی پت کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ میدان ہمایوں کے ہاتھ رہا۔ سوری فوجیں بھاگ نکلیں۔ ہمایوں کامیاب دھارانی کے ساتھ دہلی اور آگرہ پر سمر قابض ہوا ۱۵۵۶ء میں فغانی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور سلطنت مغلیہ کی از سر نو بنیاد پڑی۔

سُلّی خاندان | مسئلہ ۲ تک جب تک سلطنت مغلیہ میں انحطاط و تنزل نہ ظاہر ہوا تھا اس وقت تک مغلوں نے افغانوں کو باگل دبائے رکھا تھا۔ اگر افغان سردار کسی علاقہ میں سرٹھاتے تھے تو نہایت سختی سے ان کی سرکوبی کی جاتی تھی۔ افغانوں کا اصل وطن، افغانستان بھی ہمیشہ مغلوں کے گورنروں کے ماتحت رہا یہ حالت تقریباً دو سو برس تک رہی اس عرصہ میں افغانی کوئی اپنی قومی حکومت قائم نہ کر سکے۔

قدرت نے ایک دفعہ پھر سلطنت مغلیہ کے انحطاط کے بعد افغانوں کو اپنے وطن افغانستان میں حکومت کرنے کا موقع دیا۔ اس اجمال کی ابتدا میں ایرانی حکومت نہایت تنزل و انحطاط کو پانچویں صدی میں سپاہیانہ جذبہ ایک تہہ اور ابھرا۔ چنانچہ انھوں کو پیچھے در پیچھے حملوں سے پریشان کر دیا۔ اور دوسری طرف ترکوں سے یہیں سے بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

اس زمانہ میں قدرت نے ایران کی حفاظت کے لئے نادر شاہ افشار کو پیدا کیا۔ جس نے ایک طرف تو افغانوں کو شکست دے کر ان کے وطن افغانستان پر قبضہ کیا اور دوسری طرف ترکوں کو سخت شکستیں دیکر ایرانی علاقے خالی کر آئے۔ ۱۷۰۷ء میں جب نادر شاہ افشار قتل ہوا تو ہر افغانی سردار کی تمنا تھی کہ افغانستان کی عنان حکومت اس کے ہاتھ میں آئے۔ چنانچہ تمام افغانی سرداروں کا جرگہ منعقد ہوا جس میں اتفاق رائے سے یہ طے ہوا کہ احمد شاہ ابدالی شاہ افغانستان ہو۔ اور جمال خان بابرک زئی اس کا وزیر اعلیٰ مشیر ہو۔ احمد شاہ ابدالی "نادر شاہ افشار کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدہ پر تھا اور نادر شاہ افشار کا مختلف محروکوں میں بھر کا رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے اس نے افغانستان کے کشر قبائل کو رام کیا اس کے بعد اپنی حکومت کیلئے کوشاں ہوا۔ کشمیر، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سیستان کو اپنی حکومت سے ملحق کر لیا۔ اور آخر میں پانی پت کے میدان

محمود شاہ کی طاقت کو پاش پاش کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد مرہٹہ طاقت پھر منہل نہ سکی۔
 محمود شاہ نے پچیس سال تک حکومت کی۔ اس کا دور نہایت کامیاب رہا۔ اس زمانے
 میں حکومت افغانستان کی حد ایک طرف مشہد تک پہنچتی تھی۔ دوسری طرف دہلی تک
 اس کے مرنے کے بعد اس بیٹا تیمور وارث تخت ہوا۔ اس کے زمانہ میں بھی حکومت کا
 وہی عالم تھا جو احمد شاہ کے زمانہ میں تھا۔ لیکن بعد اس کے جب زماں شاہ تخت افغانستان
 پر آیا تو ایک طرف تو سلطنت میں تنزل شروع ہوا۔ اور دوسری طرف ابدالی شہزادے
 غمان حکومت کے لئے برسہا برس کا نظر آنے لگے۔ چنانچہ ایک قلیل عرصہ میں افغانستان کی
 وہ وسیع سلطنت جو احمد شاہ ابدالی نے قائم کی تھی، اکوہ سلیمان کی گھاٹیوں ہی میں
 محدود ہو گئی۔

۱۸۰۱ء میں زماں شاہ کے بھائی شجاع نے جو پشاور میں مقیم تھا۔ اپنی بادشاہت
 کا اعلان کر کے کابل پر حملہ کر دیا۔ لیکن محمود شاہ کی فوجوں سے شکست کھا کر درہ خیبر میں پنا
 گزین ہوا۔ لیکن ۱۸۰۲ء میں وہ تخت کابل لینے میں کامیاب گیا۔ اور محمود شاہ کو تخت و
 تاج کراٹے قید کر دیا، اور خود رونق افروز تخت کابل ہو گیا۔

اس کے بعد سات سال تک شجاع نے افغانستان پر حکومت کی۔ مگر آٹھ دن بناؤ تو
 اور شورشوں سے پریشان رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ شجاع نہ تو جنگ و جدل کا مرد میدان
 تھا۔ اور نہ بد رویا ست کی چالیں جانتا تھا۔ مزید برآں بڑھاپے نے اس کے قوی کواؤ
 بھی شل کر دیا تھا اس لئے ہر افغان شاہ شجاع سے نفرت کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس نفرت نے
 افغانستان میں ایک عالمگیر بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ ۱۸۰۹ء میں وزیر خان نے
 شاہ شجاع کو شکست فاش دے کر تخت کابل چھین لیا اور شجاع افغانستان کو چھوڑ کر ہندوستان
 میں اول اول رنجیت سنگھ کے ہاں پناہ گزین ہوا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے بجائے غلطو
 مدارات کے شاہ شجاع کے ساتھ نہایت بڑا سلوک کیا۔ شاہ شجاع کے پاس جتنے جواہر

تھے اس نے وہ سب اس سے غضب کر لئے۔

اب بحالت مجبوری شاہ شجاع نے انگریزوں کے ہاں ہجرت نہاہ لی۔ انگریزوں کے لئے ایک وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن ابھی تک شاہ شجاع تخت کابل کا جواب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ ایک بار اور تخت کابل کے لئے قسمت آزمائی کی۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شاہ شجاع نے سکھوں اور انگریزوں سے ایک میا ہد دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ طاقتیں افغانستان کا تخت اس کے اصلی اور حقیقی وارث شاہ شجاع کو دلائیں گی۔ چنانچہ افغانستان کی پہلی جنگ کے اسباب میں سے

براہ دروہ بولان افغانستان میں داخل ہوئیں۔ قندھار،

شجاع کو تخت کابل پر بٹھایا۔ دوست محمد خان جاگزیلی

قابض ہوا تھا بھاگ کر امیر بخارا کے ہاں پناہ گزین ہوا لیکن جب

اس کو قید کر لیا۔ اتفاقی طور پر دوست محمد خان نے رہائی پا کر اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے

کر دیا۔ انگریزوں نے اس کو ملکیت میں نظر بند رکھا۔ اور دو لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ افغانی قبائل شاہ شجاع کی حکومت سے ناراض تھے۔ اب اس

ناراضگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ اس نے کفار و نصاریٰ کو کابل میں بلایا تھا نیز اس نے

ہمیشہ قوم کے ساتھ منافقانہ برتاؤ کیا۔ افغانستان کی پہلی جنگ کے بعد جرمنوں نے انہیں

شاہ شجاع کی حفاظت کے لئے کابل میں مقیم تھیں۔ افغان چاہتے تھے کہ ان کا کئی استیصال کر کے

برطانوی قدموں سے افغانستان کی زمین کو پاک کر دیں۔ اس زمانہ میں شاہ شجاع بظاہر تو

قوم سے ملا ہوا تھا۔ مگر خفیہ طور پر برطانوی نمائندوں سے ساز باز کرتا تھا۔ اس چیز نے افغانوں

کو مشتعل کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے شاہ شجاع کو قتل کر ڈالا۔ الغرض ۱۸۴۳ء میں ابدلی

خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور بارک زئی خاندان نے اس کی جگہ لی۔

بارک زئی خاندان | اس زمانہ میں تمام افغانستان میں انگریزوں کے خلاف ایک عام نفرت کو

جہاں تک پہلے گئے جنہوں نے ترقی پا کر بغاوت کی شکل اختیار کر لی جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس زمانہ میں دوست محمد خان انگریزوں کی پناہ میں کلکتہ میں مقیم تھا۔ دوست محمد خان کا چٹا اکبر خان جو شجاعت میں اپنے باپ سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس نے افغانوں کی رہنمائی کی۔ آخر الامرا انگریزوں اور اکبر خان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی شرائط و فہات یہ تھیں کہ دوست محمد خان کو افغانستان کا بادشاہ بنایا جائے۔ اور انگریزوں کی فوجیں جلد سے جلد افغانستان کے تمام شہروں کو خالی کر دیں۔ چنانچہ معاہدہ کی رو سے انگریزی فوجیں واپس آرہی تھیں کہ برف باری اور افغانی قبائل دونوں نے مل کر تمام انگریزی فوج کا خاتمہ کر دیا۔ ایک ڈاکٹر بشکل جلال آباد سے پشاور تک پہنچا جس کی رہائی یہ سرگزشت دوسروں کے کانوں تک پہنچی۔ اس کے بعد انگریزوں نے دوسری مہم محض اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے افغانستان روانہ کی جس نے کابل کے سب سے خوبصورت بازار کو جو ایشا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اگر کریمنڈ خاک کر دیا۔ اور جن جن کر افغانوں کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد انگریزی فوجیں واپس ہوئیں اس وقت انگریزوں نے افغانی قیدیوں کو رہا کیا۔

اب دوست محمد خان کو افغانستان کا امیر تسلیم کیا گیا۔ اس نے ایک عرصہ تک افغانستان پر حکومت کرنے کے بعد ۱۸۶۳ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد شیر علی خان اور افضل خان افغانستان کے دعویدار ہوئے۔ شیر علی خان نے انگریزوں سے امداد کی درخواست کی جس کو انگریزوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہم نہیں چاہتے کہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کریں۔ اس خشک جواب کے بعد شیر علی خان تنہا اپنی قوت بازو سے تمام افغانستان پر قابض ہو گیا۔

اس باہمی نزاع کے دوران میں انگریزوں نے موقعہ پا کر خان قلات سے ایک خفیہ معاہدہ کیا اور کوٹہ لے لیا۔ اس چیز نے شیر علی خان کو انگریزوں سے متنفر کر دیا۔ وہ

روس کی حکومت سے اپنے تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ انگریزوں نے اب تیسرا حملہ افغانستان پر کیا۔ شیر علی خان بھاگ کر روسی سرحد میں پناہ گزین ہوا۔ جہاں موت نے ہمیشہ کے لئے اس کو شمش زنگی سے نجات دے دی۔

اب انگریزوں نے ایک معاہدہ کی رو سے امیر یعقوب علی خاں کو تخت کا مالک بنایا۔ لیکن یعقوب علی خاں سے افغان خوش نہ تھے۔ کیونکہ انہی شاہ شجاع کی طرح اپنی حکومت انگریزی تلواروں کے زیر سایہ قائم کی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے میں بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی افغانوں نے انگریزی ریزیڈنسی کو جلا دیا۔ یعقوب آپ کو انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ انگریزوں نے اسے ہندو مقرر کر دیا۔

یعقوب علی خاں کے بعد افغانوں کی حکومت کا خاتمہ جنرل رابرٹس جاری کرتا تھا۔ شیر علی خان کے دوسرے بیٹے ایوب خان نے ہرات سے میوند پر حملہ کر کے انگریزوں کو شکست دی۔ اب انگریزوں نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ افغانوں پر بزور شمشیر حکومت قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ انگریزی مدبرین نے یہ مناسب سمجھا کہ کسی افغان شہزادے کو تخت افغان دے کر انگریزی فوجیں ہندوستان کو واپس ہوں۔ انگریز مدبرین کی نظر میں عبدالرحمان خاں پر پڑیں جو ایک عرصہ سے روس میں پناہ گزین تھا۔ اور اب روس چھوڑ کر حدود افغانستان میں اپنی قوت جمع کر رہا تھا۔ اور موقع کا منتظر تھا کہ اتنے میں انگریزی قاصد پیغام لے کر پہنچا۔ عبدالرحمن خاں نے انگریزوں کی دعوت قبول کر کے تخت کابل کو سنبھالا اور انگریزی فوجیں ہندوستان واپس چلی آئیں۔

عبدالرحمان خاں اپنے زمانہ کا ایک بڑا مدبر شخص تھا۔ انقلاب زمانہ نے اس کے ذہن کو اور جلا دیدی تھی۔ اس نے اپنے طویل عہد حکومت میں ملکی اور فوجی محکموں کی اصلاح

کے اس سے پہلے افغانستان میں مائندہ ملک میں شمار کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کی بنیاد و زندگی محض شوق نے افغانستان کو تہذیب حاضر سے آشنا کر دیا۔ عبدالرحمان خان نے اس بات کی بہت کوشش کی کہ افغانستان انگریزی اور روسی اقتدار سے ہمیشہ آزاد رہے۔ چنانچہ امیر موصوف نے اپنے سب سے چہیتے بیٹے نصر اللہ خان کو انگلستان اس مقصد کے لئے بھیجا کہ شاہ انگلستان سے اس بات کی اجازت حاصل کر لے کہ افغانی اور برطانوی معاملات حکومت انگلستان سے براہ راست طے ہوا کریں۔ نہ کہ حکومت ہند کے توسط سے۔

لیکن شاہ انگلستان نے اس درخواست کو منظور نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے عبدالرحمان خان کو انگریزوں سے بددلی پیدا ہو گئی۔ انگریزوں نے اس کی تلافی اس طریقہ پر کرنی چاہی کہ ولایت میں ایک دربار منعقد کر کے عبدالرحمان خان کو بلایا۔ جس میں ویسیرائے ہند اور امیر موصوف کی ملاقات ہوئی۔ حکومت برطانیہ نے شاہ افغانستان کے سالانہ وظیفہ میں اضافہ کر کے بارہ لاکھ کے بجائے اٹھارہ لاکھ کر دیے۔ امیر موصوف نے اس اضافہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور برطانوی مدیرین کو یقین دلایا کہ افغان ہمیشہ حکومت برطانیہ کے سچے دوست رہیں گے اور وہ بوقت ضرورت حکومت برطانیہ کی مدد کرنے کو ہر طرح تیار ہیں۔

سن ۱۲۹۱ھ میں جب امیر عبدالرحمان خان نے رحلت کی تو ان کے بیٹے حبیب اللہ خان افغانستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ امیر حبیب اللہ خان نے اپنے پہلے دربار میں تمام سرداران قبائل کے سامنے اس امر کا اعلان کیا تھا کہ ان کی حکومت کی پالیسی وہی رہے گی جو ان کے والد امیر مرحوم کی تھی۔ حقیقت یہ ہے حبیب اللہ خان کو عبدالرحمان نے اپنی زندگی میں اچھی طرح ملکی معاملات کا عملی تجربہ سکھایا تھا۔ لیکن حبیب اللہ خان نے کوئی خاص جوہر نہیں دکھایا جو اس کے باپ امیر عبدالرحمان خان میں تھا۔ امیر حبیب اللہ خان کو افغانستان کی عنان سلطنت اس وقت ملی جب تمام ملک منظم تھا۔ تمام افغانستان میں امن و امان کا دورہ دورہ تھا۔ عبدالرحمان خان کے انتقال کے بعد تخت کے لئے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ ان حالات

میں حبیب اللہ خان کا فرض تھا کہ ملک کو یک قدم اور آگے بڑھاتے۔ لیکن حبیب اللہ خان میں باپ کے افعال کے بعد وہ دلولہ نہیں رہا تھا جو وقتاً فوقتاً باپ کی زندگی میں ظاہر ہوتا رہا۔ غرضیکہ ۱۸۹۱ء میں جب یورپ کی جنگ عظیم چھڑی تو اس زمانہ میں ایک جرمن و ترکی وفد افغانستان پہنچا اور حبیب اللہ خان سے اسد علی کہ افغانستان کی فوجیں ہندوستان پر حملہ کر کے اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کریں۔ حبیب اللہ خان نے اس مشورہ کو ٹھکرا دیا۔ جرمن و ترکی وفد بے نیل و مرام واپس گیا۔

اس واقعہ نے نوجوان افغانوں کے دلوں میں حبیب اللہ خان کے نام کی ایک

بذات پیدا کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۹۱ء میں حبیب اللہ خان
شکار گاہ میں ایک نوجوان افغان کے ہاتھ گولی کا نشانہ
ہو گیا۔

حبیب اللہ خان کے بعد تخت افغانستان پر وہ شخصیت جلوہ آ رہی جس کو دنیا۔
امان اللہ خان کے ہر دل عزیز نام سے جانتی ہے۔ امان اللہ خان بھی بلا کسی مخالفت کے شاہ
افغانستان ہوا۔ ۱۸۹۹ء میں جب انگریزی قوت باوجود فتح یابی کے جو رچور ہو گئی تھی۔ اسی وقت
امان اللہ خان نے زرین موقع دیکھ کر انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ چنانچہ افغان
فوجیں نادر خان موجودہ شاہ افغانستان کی قیادت میں انگریزی سرحد پر حملہ کر کے انگریزوں کو
اس سرحد کو لے کر پہنچا کہ حکومت برطانیہ افغانستان کے استقلال کو تسلیم کرے۔ کیونکہ افغان
اب انگریزی اقتدار کو کسی حالت میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ افغانی اور انگریز
نمائندوں نے راولپنڈی اور دہرہ دون میں معاہدہ تیار کیا۔ اس میں افغانستان کو دولت مستقلہ
کیا گیا۔ اور انگریزوں نے وظیفہ کی وہ رقم جو شاہان افغانستان کو سالانہ دیتے تھے بند کر دی۔
اب افغانستان کی سلطنت دو دولت خداداد مستقلہ افغانستان، کے نام سے مشہور ہوئی۔
اور تمام مشرقی اور مغربی طاقتوں نے افغانستان کے استقلال کو تسلیم کیا۔ مختلف ممالک

افغانی سفر اور مقرر ہو کر رہنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ کارکنان قضا و قدر نے امان اللہ خان کو وہ ذہن رسا عطا کیا تھا کہ جس کی قدر و قیمت افغانوں جیسے قدامت پسند لوگ نہیں کر سکتے تھے۔ امان اللہ خان اپنے دادا کی طرح جانتا تھا کہ افغان قوم اقوام عالم کے ساتھ ترقی کی دوڑ میں دوش بدوش چل سکے۔ لیکن افغانوں جیسی قدامت پسند قوم نے امان اللہ خان کی شخصیت کو نہیں سمجھا۔ ایسے افراد کسی قوم میں ہر روز نہیں پیدا ہوا کرتے۔ بلکہ قدرت اپنی نعمت ایک عرصہ دراز کے بعد دیتی ہے۔

ہزاروں سال زرخیز اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی شکل سے ہوتا ہے جن میں دیدہ ور پیدا (اقبال)

۱۹۲۸ء میں امان اللہ خان نے اپنے ملک کی اصلاح و ترقی کیلئے ضروری سمجھا کہ بذات خود یورپ کے مختلف ممالک کی سیاحت کر کے وہاں کے تعلیمی، صنعتی اور تجارتی اداروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اپنے ملک، افغانستان میں ان طریقوں کو رائج کریں۔ چنانچہ امان اللہ خان نے یورپ کے مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ خصوصاً جب وہ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس میں گئے تو ان کی حکومتوں نے امان اللہ خان کا شاہانہ استقبال کیا۔ یورپ اور ایشیا کے جرائد و اخبار نے امان اللہ خان اور افغانستان پر مفصل مضامین شائع کئے۔

افغانستان کی شہرت دنیا کے دور و دراز گوشوں تک پہنچی۔ امان اللہ خان یہ سفر تقریباً سات آٹھ ماہ میں ختم کر کے بحریہ اپنے وطن کو واپس ہوئے۔ امان اللہ خان کے دل میں اپنے وطن کی محبت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے افغانستان ترقی کر کے دنیا کے متمدن ممالک میں شمار ہونے لگے۔ آتے ہی امان اللہ خان نے ملک میں اصلاحات جدیدہ جاری کر دیں۔ اس فوری اقدام نے افغانی قوم کو ناراض کر دیا۔ اور قوم کی ناراضگی نے بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ انگریز امان اللہ خان نے کابل کو خیر باد کہہ کر

قندھار میں پناہ لی۔ باغیوں کے سرغنہ پچھتہ نے تخت کابل پر قبضہ کر لیا۔ اور امیر حبیب اللہ کے عقب سے تخت نشین ہو گیا۔

امان اللہ خان نے قندھار میں فوجی قوت درست کی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ باغیوں سے مقابلہ کیا۔ لیکن اس مقابلہ میں ان کو معلوم ہو گیا کہ ان کا افغانستان میں رہنا محال اور بے فائدہ ہے۔ چنانچہ امان اللہ خان ہندوستان کی راہ یورپ چلے گئے۔ اور روم میں سکونت پذیر ہو گئے۔ امان اللہ خان کے جانے کے بعد تمام افغانستان پر پچھتہ کا قبضہ ہو گیا۔ ستوی مظالم نے افغانوں کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ اور ان کو فرانس میں اور نجات کے لئے ایک مریض سردار کو جو فرانس میں

کے نام سے جانتی ہے لاکر کھڑا کر دیا۔ بیماری کی حالت میں نے مجبور کیا کہ فرانس جیسے ملک کی پر لطف زندگی کو ترک

ستوی مظالم کی وجہ سے کڑوا آتش بنا ہوا تھا آئے اور ملک کو ڈاکوؤں سے ہاتھ دھو کر یہ منظم حکومت قائم کرے۔ چنانچہ نادر خان نے مع اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے ۱۹۲۹ء میں افغانستان پہنچ کر ملک کو ڈاکوؤں سے صاف کر کے افغانستان کے تاج کو قومی جرگہ کے سامنے رکھا۔ کہ قومی جرگہ اس تاج کے قابل جس کو سمجھے اس کے سر پر رکھ دے۔ چنانچہ تمام افغانستان کے سرداروں نے یہی فیصلہ کیا کہ موجودہ ابتری کی حالت میں افغانی تاج کا سزاوار صرف نادر خان کا سر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نادر خان ہی تھا کہ جس نے ۱۹۱۹ء میں ملک کو استقلال کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا اور پھر اب مصیبت کے وقت ملک کو اسی نے نجات دلائی۔

اس لئے افغانی تاج نادر خان کے سامنے پیش کیا گیا۔ جسکو انھوں نے بڑے اصرار کے بعد زینت سر کیا۔ اس کے بعد سے اپنے وطن عزیز افغانستان کی ترقی اور بہبودی کے لئے برابر کوشاں ہیں۔ اور تدریجی طریقہ سے ملک کو اسی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں

جس کی طرف امان اللہ خان نہایت تیزی سے لہجنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ امان اللہ خان اور نادر خان دو قابل محرفرزند ہیں۔ دونوں کے دل افغان قوم کی ترقی کے لئے بے قرار ہیں۔ دونوں چاہتے ہیں کہ افغان نشان تمام دنیا میں عزت و وقار حاصل کرے۔ اگر فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ امان اللہ خان بہت تیزی سے ملک کو تہذیب جدید سے آشنا کرنا چاہتے تھے اور نادر خان تدبیر کی طریقے پر ملک کو ترقی کی طرف لہجرا ہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانوں جیسی قدامت پسند قوم کو یہ ہرگز گوارا نہ ہوگا کہ بیک وقت تہذیب حاضرہ سے ہمکنار ہو جائیں۔ ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کو تدبیر کی طریقے سے ترقی کی طرف لہجرا جائے۔

امیر عبدالرحمان خان افغانی زندگی کا سب سے بڑا ابتلا ص تھا۔ بالفاظ دیگر جس نے افغانی فطرت کا نہایت عمیق مطالعہ کیا تھا اس نے اپنے جانشینوں کو اپنی خود نوشتہ سولہ جیات میں چند نصیحتیں کی ہیں اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ کہ

”میرے جانشینو! یہ فرض ہے کہ جو اصلاحی تحریک ملک میں جاری کرنا چاہیں وہ سوچ سمجھ کر جاری کریں۔ ایسا نہ ہو کہ افغان قوم کے جذبات کو ٹھیس لگے معزنی تعلیم کے دارالعلوم اور جمہوری طرز حکومت کے قوانین بدرجہ جاری کریں“

امیر فطرت افغانی، امیر عبدالرحمن خاں کی یہ نصیحت کس قدر تجربہ اور حقیقت پر مبنی ہے امان اللہ خان اس نصیحت کو ترک کر کے سرعت کے ساتھ اپنی قوم کو اصلاحات کی طرف لہجنا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اس لئے افغانستان کے ہر حکمران کے لئے ضروری ہے کہ وہ افغانستان کے سامنے اصلاحی پروگرام تدبیر کی طور پر پیش کرے۔

نادر خان نے اس قلیل عرصہ میں افغانستان کو جس طرح منظم کیا ہے۔ اس کی مثال۔ افغانی تاریخ میں شکل سے لیگی۔ اس وقت افغانستان خدا کے فضل سے تدبیر کی رفتار سے ترقی

کی طرف توجہ رہا ہے۔ آج افغانستان کی فوجیں منظم ہیں ملک کی سیاسی، تعلیمی، تجارتی، مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لئے موجود ہر ساز و ابھ طرح سے کوشاں ہے۔ مذہبی اصلاح کیلئے اس نے ایک طاعت جمعیتہ علمائے افغانستان قائم کی ہے۔ سیاسی ترقی کے لئے اسی سال افغانی پارلیمنٹ اٹھ افغانی ڈالار کا افتتاح ہو چکا ہے۔ ان اداروں کا افتتاح کرتے ہوئے نادر خان نے جو تقریریں کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فرمانروا کا دل اپنی قوم اور مذہب سے کس قدر مسموم ہے اور وہ اسلامی اصولوں کے احترام و وقار کے لئے اپنی سرچیز قربان کر چکے ہیں۔

خاتمہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ افغان بجائے خا ہے۔ لیکن اگر تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ افغانی جس طرح میدان جنگ میں سپاہیانہ جوہر دکھلائے۔

پرانظام مملکت بھی کر سکتا ہے۔

دولت غوریہ سے لے کر موجودہ زمانہ تک اگر افغانوں کی سیاسی تاریخ دیکھی جائے تو افغانوں میں سینکڑوں افراد ایسے ملیں گے جنہوں نے اس امر کا کافی ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ افغان قوم اصول چہان بینی میں کسی قوم سے کم نہیں قدرت نے افغانوں کو جہاں سپاہیانہ جوہر مرحمت فرمایا ہے وہاں حکمرانی کا سلیقہ بھی عنایت کیا ہے۔ یہ سلیقہ حکمرانی افغانوں میں اگر کسی قوم سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ سکندر لدھی کا عدل و انصاف۔ شیر شاہ کا انتظام مملکت احمد شاہ ابدالی کی فوجی قابلیت۔ امیر عبدالرحمن خان کے سیاسی تجربات اور امان اللہ خان کی سب الوطنی اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ افغانوں کو قدرت نے جہاں سپاہیانہ مادہ عنایت کیا ہے وہاں ملکہ فرماندگی میں بھی بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ یہ دونوں خاصیتیں کسی قوم میں بیک وقت کم پائی جاتی ہیں۔

افغانی حکمران خاندان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ افغانی حکومتیں رعایا پروری، عدل و انصاف میں دوسرے حکمران خاندانوں سے اگر آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں ہیں۔

برطانیہ عام اور ملک کی اندرونی امن و امان ان کی حکومتوں کا مقصد اولین تھا۔ غوریوں کی حکومت میں تمام افغانستان میں امن و امان تھا۔ لودھیوں نے طوائف الملوک کے زمانہ میں سلطنت ہندوستان کو جس طرح لامرکزیت سے نکال کر مرکزیت میں کر دیا۔ کیا یہ واقعہ ان کے ملکہ جہانپانی کے نبوت کے لئے کافی نہیں؟ شیر شاہی عہد اپنی برکات کی وجہ سے تانچہ ہند میں ایک نمایاں امتیاز رکھتا ہے۔ ابدالی فتوحات افغانی تانچہ میں ایک زریں صفحہ ہے۔ بارک زئی خاندان کی بنیاد کے کارنامے ہر افغان بچے اور بوڑھے کی زبان پر جاری ہیں۔ اسی خاندان نے اپنی شجاعت اور تدبیر سے روس اور برطانیہ جیسی استعماریت پرست طاقتوں کو متعدد بار نیچا دیکھایا۔ دونوں طاقتوں کو معلوم ہو گیا کہ افغانی قوم کوئی ترلحمہ نہیں جس کو آسانی کے ساتھ ہضم کیا جاسکے۔ برطانوی مدیرین اپنی انتہائی سیاسی چال بازیوں اور فوجی طاقت کے مظاہروں کے باوجود افغانوں کو اپنے قبضہ میں نہ لاسکے۔ انگریزوں کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ افغانوں جیسی حریت پسند قوم پر حکومت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مورخ افغانی اور برطانوی جنگوں پر تنقید کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے کہ ”میں کروڑوں مصارف کثیرہ اور ہزار ہا جانیں ضائع ہو چکیں باوجود ہم کو افغانوں کی عداوت کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا“

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ افغان قوم باوجود ان مندرجہ بالا حضرات کے ایک خرابی رکھتی ہے جو ان کی تمام خوبیوں پر پردہ ڈالے ہوئے ہے اور وہ نفاق ہے۔ افغانی تاریخ بتاتی ہے کہ متعدد شخصیتوں نے افغانوں کو اتحاد کی تلقین کی۔ ان شخصیتوں میں نمایاں شخصیت شیر شاہ کی ہے۔ شیر شاہ نے افغانوں کے اتحاد کے لئے بے انتہا کوشش کی۔ لیکن شیر شاہ کے مرنے کے بعد افغان سرداروں میں وہی نا اتفاقی عود کر آئی جس نے شیر شاہ کی قائم کی ہوئی وسیع سلطنت کو تباہ و برباد کر کے چوڑا شیر شاہ کے بعد دوسری شخصیت عبدالرحمان خان کی ہے جس نے افغان قوم کو متنبہ کیا کہ ”تمہاری نا اتفاقی تمہاری تباہی و بربادی کا سبب بنی ہوئی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ افغانستان کی حکومت مضبوط ہو تو تمہارا

سب سے مقدم فرض ہے کہ قوم کے منتشر افراد کو رشتہ اخوت میں منسلک کروڑ
عبدالرحمان خان کے بعد اس کے پوتے امان اللہ خان نے بھی قوم کے سامنے
اپنے دادا کے پیغام کو دہرایا اور کہا کہ ”افغانوں کی ترقی کا راز اتحاد و یکپہلو
میں مضمر ہے۔“

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج تک افغان قوم نے اپنی جہالت کی وجہ سے اتنی دلی برکت
کو نہیں سمجھا۔ مگر گردشِ زمانہ افغانوں کو ایک نہ ایک روز رشتہ اتنا جس منسلک کرے
چھوڑے گی۔ اس وقت یہ ملت آوارہ کوہِ دو من میدان
حاصل کرے گی۔

حوالے

- | | | |
|---------------------|-------------------------------------|---------|
| زاعلب حسن حسرت | (۱) نیزنگ افغانستان | } اردو |
| دارالترجمہ حیدرآباد | (۲) تاریخ فرشتہ | |
| ازھاشمی | (۳) تاریخ ہند | |
| | (۱) تاریخ سراج الاخبار | } فارسی |
| | (۲) تزک عبدالرحمانی | |
| | (۳) فارسی جرائد (افغانستان - اصلاح) | |

(۱) The History of Kabul vol: I by Elphinstone.

خطابت کی سحر کاریاں

ٹیکسیر کا ایک مشہور ڈرامہ (جو لیس قیصر) ہے یہ افسانہ عقول عوام کی ایک دردناک داستان اور خطباء کی ہوس رانیوں اور قریب کاریوں کی ایک مکمل تصویر ہے۔ انہیں اس قصہ میں نظر آئیگا کہ جس طرح کھلاڑی فٹ بال کو اپنے حسبِ منشا اور پھینکتے پیچے گراتے اور ٹھوکریں دیتے ہیں ٹیکسیر اسی طرح عوام کے لیڈر بڑے بڑے خطباء اور اچھے سے اچھے مقررین ان کے جذبات ان کے خیالات اور ان کے احساسات سے کھیلے ہیں۔ کبھی اپنے قطرہائے اشک کے سیلاب میں نہیں ڈکیا کرتے ہیں تو کبھی اپنے برقِ صفت تبسم سے ان کے خرم سکون و راحت کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں۔ کبھی اپنی پرچوش تقریروں سے قلب کو گرما اور روح کو تڑپا دیتے ہیں۔ تو کبھی اپنی جادو بیانیوں سے ساری قوم کو اپنی ہواؤں میں اور ذاتی اغراض و مقاصد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

بروٹس ایک ہمدرد قوم و ملک اور شریف و معزز آدمی تھا اس نے شدت کیساتھ یہ محسوس کیا کہ جو قیصر نے پوری رومی قوم کو غلام بنا رکھا ہے۔ انکی شرافت نفسِ فنا کے گھاٹ اتر چکی ہے۔ ابدی نلت نے ان کے حب و شہور پر پورا قابو پا لیا ہے۔ انہیں اپنی زندگی کی تلخی کا احساس نہیں۔ چندے یہی لیل و نہار رہا تو بحیثیت ایک معزز و خوددار قوم کے ان کا نام و نشان صفرِ ہستی سے مٹ جائیگا۔ کافی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس ہلکے مرض کا واحد علاج قیصر کا قتل ہے۔

قیصر بروٹس کا نہایت ہی محبوب دوست تھا لیکن قوم و ملک کی خاطر اس نے اپنی محبوب متاع کو اپنا ہی تلوار سے موت کے خوفناک گڑھے میں ڈھکیل دیا۔

رومی قوم قیصر کے قاتل سے انتقام لینے کیلئے تیاب ہو گئی۔ لوگوں کا ایک سیلاب اُمتڈ آیا اور بروٹس کو گھیر لیا۔

بروٹس اس غضبناک جمع کے سامنے تقریر کر سیکے لئے کھڑا ہوا۔ یہ نہایت ہی نازک موقع تھا

سفر بازی و سر ہندی کا تاج یا ذلت و رسوائی کا قہر بے پناہ۔ بہادروں اور جان نثاروں کا درخشاں تہنہ یا خائن و خدا گروہ کا سآثر یک انجام۔ یہ ظاہر ہے کہ تقریر کی تاثیر و عدم تاثیر پر موقوف تھا۔ مجمع غصے میں بھولتا تھا۔ کسی طرح تقریر سننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ زبان پر انتقام انتقام کی رٹا تھی۔ بالے بغض و عداوت کی کوششوں و سکون کی فضا پیدا ہوئی اور بروٹس نے تقریر شروع کی۔

بروٹس کی تقریر

بزرگان قوم! کیا میں امید کروں کہ آپ حضرات میری بھلی یا بری کردہی یا مینٹھی کو بوس تھیں گی دیر کیلئے عدل و انصاف کی خاطر صبر و سکون کے ساتھ سنیں گے۔ ہا تھا اور نہ آپ کے جذبات احساسات کی توہین کرنا اور آپ کے ہوں بلکہ آپ لوگوں سے میری پرزور درخواست ہے کہ واقعہ مطالعہ فرمائیے میں آپ لوگوں کو کامل صداقت و خلوص سے دعوت دیتا ہوں۔ سنات و سنجیدگی اور سکون قلب و اطمینان خاطر کیساتھ عدل و انصاف کی روشنی میں کیجئے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میرا اقدام مبنی برحق ہے اس کے دامن پر کوئی ایسا داغ نہیں جسے میں آپ لوگوں کی نظروں سے بچانے کی کوشش کروں۔

برادران وطن! اگر آپ میں کوئی قیصر کا دوست پہلے موجود ہوا اور وہ اسکے قتل پر اپنے جگر کے ٹکڑے کر رہا ہو تو مجھے صاف کرے اگر میں اس سے یہ کہوں کہ اے میرے معزز دوست! قیصر کے قاتل بروٹس کو قیصر تم سے زیادہ محبوب تھا۔ قیصر کی وقعت تمہارے دل میں اتنی نہیں جتنی اسکے دل میں تھی۔ اکابر ملت! میں تمام دنیا کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہوں لیکن آپ لوگوں کے سامنے کوئی جھوٹ و عداوت نہیں کر سکتا۔ آپ لوگوں کو اجماعی طرح معلوم ہے کہ میں نے اپنے محبوب و دوست قیصر کو کسی ذاتی بغض و عداوت کی شخصی عداوت و دشمنی کی بنا پر قتل نہیں کیا ہے بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے قتل کیا ہے کہ وہ مجھ کو اس سے کہیں زیادہ محبوب تھا۔

قیصر ایک بڑی شخصیت کا مالک تھا اس لئے مجھے وہ محبوب تھا وہ شجاع اور بہادر تھا اسلئے میں اس کا احترام کرتا تھا لیکن وہ طمع و حرص تھا اس لئے میں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ پس ایک ہی وقت میں میں نے اسپر آنسو بھی بہائے اور ہنجر بھی چلایا۔

مجھے یقین نہیں کہ آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جسے قیصر کی موت پر حقیقی اور واقعی پنج و غم اور افسوس و حسرت ہو آپ دیہین اور دیہی کسی ذلت کیساتھ زندہ رہنا پسند نہیں کرتا۔ آپ لوگوں میں وہ کون ایسا شخص ہے جو روی کھلایا جانا پسند نہیں کرتا۔ وہ کون ہے جو آزاد رہنا عیب سمجھتا ہے۔ وہ کون ہے جو اپنے نفس و ضمیر کی توہین گوارا کرتا ہے۔ وہ کون ہے جو اپنے وطن عزیز کی ذلت و حقارت کی اپنے اندر تاب رکھتا ہے۔ اگر آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہو تو جواب لے دی اس بات کا حقدار ہے کہ مجھ سے قیصر کے خون کا مطالبہ کرے کیونکہ میں نے اس شخص کے علاوہ کسی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا ہے۔

مجمع۔ نہیں ہم میں کوئی ایسا نہیں۔
برٹس۔ تو پھر میں نے کسی کو اذیت نہیں دی۔

برٹس نے مشکل ہی سے یہ جملہ ختم کیا تھا کہ قیصر کا دوست اور طالبان انتقام کا سرگروہ ٹونیو مع اپنے نقا کے قیصر کی لاش لئے ہوئے مجمع میں نوم و مرثیہ خوانی کے لئے پہنچا۔ برٹس نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

دیکھئے یہ قیصر کی لاش ہے اور یہ انٹونیو قیصر کا دوست ہے۔ یہاں پر قیصر کے فضائل و محاسن بیان کرنے آیا ہے۔ آپ لوگ غور سے سنئے مگر اس فرق کو ذہن میں محفوظ رکھئے کہ گنہگار قیصر اور ہے اور نیک و پرہیزگار قیصر اور ہے۔ گنہگار قیصر کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا اسے تو آپ سن چکے اب پرہیزگار قیصر کے متعلق جو کچھ کہا جائے اسے سنئے۔ آخر میں میں ایک جملہ پر اپنی نعت ختم کرتا ہوں۔

عظائے روم! جس تلوار سے میں نے روم کے لئے قیصر کو قتل کیا ہے وہ تلوار قیصر کی

ہر شخص کے لئے یہی سچا ہے کہ ہم اپنے پیشہ مندر ہے گی۔
تقریر کا اثر

مجمع - زندہ باد بروٹس

ایک - اس جاں نثار ملک و خدا کا رقوم کا ایک مجسمہ نصب کرنا چاہئے۔
دوسرا - اس لائق فردِ وطن کو قیصر کے تاج و تخت کا مالک بنادیا جائے۔
تیسرا - قیصر فضل و کمال اور شرافت نفس میں اس کے پائتک بھی نہیں تھا۔
چوتھا - قیصر ظالم و جفا کار تھا۔

پانچواں - اجمی وہ سرا پا جو رستم اور ظلم و جفا تھا
چھٹا - اب روم کو اس ظالم و سفاک سے نجات
ساتواں - کیا ہیں انٹونیو کے ساتھ قیصر کے مشیت
آٹھواں - ہاں ضرور کیونکہ بروٹس نے ہم کو حکم دیا ہے۔

بروٹس اٹیج سے اب اتر پڑا اور مجمع پروانہ وارا اس پر ٹوٹ پڑا۔ لوگوں کے دل اس
کے قدموں پر ٹوٹ رہے تھے اور آنکھیں اس کے لئے بھیجی جاتی تھیں۔ انٹونیو اسی عالم میں
کھڑا ہوا تھا۔ غضبناک اور خشم آلود آنکھوں نے اس کو گھورا۔ اگر بروٹس نہ روکتا تو مجمع اسے
چشمِ زدن میں فرشِ زمیں پر ڈھیر کر دیتا۔ انٹونیو نے اس غبار آلود فضا میں حسبِ ذیل
موکدہ الہی را تقریر شروع کی۔

انٹونیو کی تقریر

انٹونیو - اے رومیو!

ایک - خاموش، سنو، انٹونیو کیا کہتا ہے
دوسرا - نہیں، ہم نہیں سنیں گے، ہم اس کی بات نہیں سنیں گے۔
انٹونیو - پیارے بھائیو! سنو بروٹس کے حکم کی عزت کرو۔ بروٹس کی خاطر میری سنو۔

کئی ایک۔ دیکھو سنو تو سہی کہ بروٹس کے متعلق شخص کیا کہتا ہے۔

دوسرا۔ اماں، کچھ نہیں، ہم اس کی بکواس نہیں سنیں گے۔

تیسرا۔ نہیں ہم لوگوں کو سننا چاہئے، دیکھیں کہتا کیا ہے۔

انہی نو۔ دوستو! میں قیصر کا رشتہ بڑھتے نہیں بلکہ اس کی فحش کو دفن کرنے اور اس کے مروجہ مجسم کو سپرد خاک کرنے کے لئے آیا ہوں۔

ہر شخص اپنی زندگی میں اچھے اور برے کردار کا مالک ہوتا ہے، اس کے اعمال سنہ تو اس کی موت کے ساتھ مٹ جاتے ہیں لیکن اس کے اعمال یہ قیامت تک باقی رہتے ہیں قیصر بھی انسان تھا اس کے بھی حسنات و منیات کا یہی حشر ہونا تھا اور ہوا۔

برادران قوم! اگر بروٹس مجھے اسٹیج پر آنے اور کچھ عرض کرنے کا حکم نہ دیتا تو اس وقت میں ایک نطفہ بھی اپنے منہ سے نہ نکالتا، اس نے مجھ کو حکم دیا، میں نے اس کی اطاعت کی اور اس کے فرمان والا نشان کے سامنے تسلیم و اقیاد غم کر دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ ایک شریف و لائق عزت شخص ہے۔

برادران! معزز دوست بروٹس نے کہا کہ قیصر ایک طالع و حریص شخص تھا۔ میں اس کی مخالفت کی جرات نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ ایک سچا آدمی ہے، جھوٹ نہیں بولتا۔

میں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قیصر قناعت پسند اور بے طمع آدمی تھا کیونکہ محترم بروٹس نے اس کے خلاف اعلان کیا ہے۔ میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ یہی وہ لالچی قیصر تھا جس نے قیدی دشمنوں سے اتنا کثیر زرفدیہ وصول کیا کہ روم کا خزانہ گہر و جواہر سے لبریز ہو گیا اور ملک دولت و ثروت کی اس بارش سے سرسبز و شاداب ہو گیا۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میری مان آنکھوں نے قیصر کو غریب کے فقر و فاقے پر اکثر آنسو بہاتے، گریہ و بکا کرتے، اُمیں جھرتے اور مالہ و فحاش کرتے دیکھا ہے، کتنی ہی ایسی راتیں ہیں جنہیں قیصر نے تلخ و ستم کی اصلاح حال اور فراہمی معاش کی فکر میں آنکھوں میں کاٹ ڈالا ہے۔

میں نے خود کوئی دفعہ ”لو بیکال“ میں تاج و تخت قیصر کی خدمت میں پیش کیا ہے لیکن اس نے ہمیشہ اس سے اعراض و انکار کیا، اس کو تاج کا شوق نہیں تھا وہ تو خدمت وطن کا بھوکا تھا، اس کو عیش و آرام سے الفت نہیں تھی، اس کو تو قوم کی خوشحالی کی خاطر آلام و مصائب کے برداشت کرنے میں لطف آتا تھا۔

بروٹس ایک نہایت ہی سز و شخص ہے، میں کسی حال میں بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتا ورنہ میں تم سے دریافت کرتا کہ کیا حرص و آرزو کا سکون ایسا ہی قلب موہتا ہے، کیا ایسے اندازِ دل میں، کیا ایسے خدا ترس قلب میں طمع اور لالچ کے رویو! آج سے پہلے قیصر تھیں دنیا و مافیہا۔ اس کی خاطر اپنا خون بہانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ قطرہ بھی تمھاری آنکھوں سے نہیں گرتا۔

اگر تم اس عمدہ صفات، بہتر فضائل اور لائق تعریف شمائل پر نہیں روتے تو نہ روؤ لیکن کم از کم اس کے لئے تو روؤ کہ وہ تم کو محبوب تھا، تم کو پیارا تھا۔ دنیا جہان میں سب سے زیادہ تمھارا چہیتا تھا۔ تم اس لئے روؤ کہ کل یہی وہ شخص تھا جس کی ایک غیش لب پر بڑے بڑے بہادر و اور سو رماؤں کے دل دہل جاتے تھے جس طرح بجلی کی ایک کڑک سے اس سرے سے لے کر اس سرے تک زمین و آسمان کی ساری فضا لرز جاتی ہے، لیکن آج وہی شخص ہے جو ایک دیوار کے کنارے ذلیل و خوار بیچارہ و مددگار پڑا ہوا ہے۔ نہ اس کا کوئی نومہ خواں ہے نہ غمخوار۔ آہ آج اس پر کوئی رونے والا نہیں۔

لے عقل انسانی! آج یہ مجھ کو کیا ہو گیا ہے؟ تو کیوں انسانوں کے دلوں سے محل کر دیتی ہو؟ لوگوں میں سا گنتی ہے؟ تو نے اپنا راستہ کیوں کھو دیا؟ تو کیوں گم کردہ راہ ہو گئی؟ تو بہت ہمو کر رہ گئی ہے۔ تو نے خیر کو شر اور شر کو خیر قرار دے لیا ہے۔ کیا تجھ سے فرق میزہ چین لی گئی؟ کیا تجھ اب صواب و خطا کھوٹے کھرے میں تیز نہیں رہی؟ کیا جراثیم و محاسن کی پہچان

سید محمد رفیع

دوسرا میری زندیدہ بیانی و پیشانی گوئی سے اگر تم کو تکلیف ہوتی ہو تو معاف کرنا کہ اس
تاج پٹنی و عا و ذکری نے میرے دماغ کو منتشر اور قلب کو پرانگندہ کر دیا ہے۔

دوستو! میرے پہلو میں ایک ایسا دل ہے جو تمہاری محبت و الفت میں سشار تمہاری
غیر فطرتی و نیکو کوشی میں غرق، تمہاری فلاح و بہبود کے لئے بھین اور تمہاری آرام و آسائش کے کُر
پرتاب ہے۔ اگر مجھے ڈرنہ ہو کہ تمہارے سینے شدت رنج و محن و کثرت و وزن و الم سے بھٹ
جائیں گے تو میں کہتا قیصر مظلوم ہے وہ بلا قصد قتل کر دیا گیا۔

بدش اور اس کے زقار کار غرق و اور ملک کے سزنا زفر زدن میں۔ ان کو مجرم و ظاک
کہنے سے پہلے میرے ضمیر کو، روم کو، اور خود قیصر کی پاک و ج کو بڑا دکھ ہو رہا ہے۔
اتنا کہہ کر اتنوینہ خاموش ہو گیا اور اس کی چمپا ہے پر ہم سے آنسوؤں کا سیلاب ابل پڑا۔

انقلاب

ایک۔ (اپنے ہم نشین کی طرف مخاطب ہو کر) مجھے تو ایسا معلوم ہوا ہے کہ یہ شخص نہایت
ہی متعلی بات کہہ رہا ہے۔

دوسرا۔ یقیناً، اگر تم ذرا غور کرو تو تم پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ قیصر کا قتل سفاحی
بے رحمی کا بدترین نمونہ اور اتہائی بزدلانہ جرم ہے۔

قیصر۔ قیصر کے تاج و تخت پر استغفار نے تو میرے دل کو اپنا لیا۔ اس کا فیصل کتنا
منعم اور کس قدر مبارک ہے

چوتھا۔ وہ کیا نرم دل، رقیق القلب اور رحم صفت تھا کہ مصیبت و فتن اور فاقہ کشوں
کی حالت ڈار پر رنج و غم کے آنسو بہا تا اور جگر کے ٹکڑے کرنا تھا۔

پانچواں۔ نقیض اور آفت میڈوں کا ایسا نمونہ غمخوار ایسا ہمدرد و ہنگامہ دار غلام نہیں ہو سکتا۔
چھٹا۔ اب تو جناب قیصر کی خوریزی نے بڑی اہم نازک صورت حال اختیار کر لی۔

ساتھوں۔ قاتل سے ضرور انتقام لینا چاہئے۔
 آٹھواں۔ اپنے ہم طلب کی طرف مخاطب ہو کر دیکھو انٹونیو کس طرح چوٹ چوٹ کر رہا تھا اور زخم کتنا
 نواں۔ روم میں انٹونیو سے بڑھ کر ملک کا کوئی سچا بہی خواہ نہیں۔
 انٹونیو۔ کیا آپ لوگ مجھے اس بات کی اجازت دیں گے کہ تھوڑی دیر کے ٹو میں یہاں سر ہٹ
 جاؤں اور اس یکس و مظلوم بہتہ پر نذر عینیت کے چند پھول چڑھا آؤں۔
 مجمع۔ ضرور۔ ضرور۔

انٹونیو اسٹیج سے اتر آیا اور آہستہ آہستہ قیصر کی لاش
 میں لپٹی پڑی ہوئی تھی جس میں کہ وہ قتل کی نئی تھی اور خنجر
 تھے۔ انٹونیو نے مجمع کو پکار کر کہا۔

انٹونیو۔ لوگو! یہی وہ قیصر ہے جس کے ابرکرم کی بارش سے مہارہا سیراب ہو چکے ہیں۔ اس
 کی لاش زخمِ دھون میں شراور ہو رہی۔ آؤ اور اپنے آنٹوں کی جھڑی سے اس کو غسل دو۔ قیصر کی لاش
 کا رواں رواں نہایت بے کسی و عاجزی کے ساتھ تم سے اس کا مطالبہ کر رہا ہے۔
 تم سب لوگ اس لباس کو دیکھتے ہو مگر شاید اس کی تاریخ و اہمیت سزاوارتہ نہیں ہو۔ مجھ کو خوب
 اچھی طرح یاد ہے کہ یخون میں اترا ہوا لباس قیصر نے اس شام کو زیب تن کیا تھا جس شام کو قیصر نے وہ
 شاندار نتیجہ جانی حاصل کی تھی جس پر روم قیامت تک فخر کرے گا۔

(اس موقع پر انٹونیو نے قیصر کی عبا کے ایک شگاف کو نمایاں کیا اور کہا۔)

اسی بڑے سورخ سے اس فاتحِ عظم کے جسم کو چھلنی کیا گیا۔ اسی سورخ سے ہو کر بروٹس کا
 منہ قیصر کے سینے میں پوستان ہو گیا۔ اسی سورخ سے قیصر کا بے گناہ خون بہا گیا۔

زخموں نے خنجر کے اس بنا سے ہوئے جھروکے سے اپنے قاتل کی خوفناک صورت کو رحم طلب
 بھگاہوں سے دیکھا بلکہ میرا تو خیال ہے کہ قیصر نے بروٹس سے طلبِ رحم کرنے سے پہلے روم کے ہر ہر
 فرد کو دادرسی کے لئے آواز دی مگر افسوس صد افسوس کہ کسی نے بھی اس کی دادرسی نہیں کی

میں اس عورت کی موت نہیں۔ مرنے سے جگر پاش ہو گا اور وہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ سننے میں نہیں آسکتا۔

ایک شخص۔ کیا ہی قیامت آفریں نظر ہے۔

دوسرا۔ اسے لوگوں کی قیصر پر رحم اور اس کے ساتھ انصاف کرو۔

قیصر۔ قیصر کا یہ دم قتل نہایت ہی شرافت منیزین قیصر کی ہتھیاروں سے روکا گیا تھا اور روایتوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

چوتھا۔ یہ دنات اور غلبہ پن روم کے۔

پانچواں۔ اس خیانت اور زرداری نے روم

چٹا۔ انتقام، انتقام۔

مجموعہ (سخت اشتعال میں) قاتلوں کو جلا ڈالو، ان کے جسم کے ٹکڑے فضا آسانی میں بھیر دو، کسی ایک پر بھی ترس نہ کھاؤ۔ یہ رحم کے قابل نہیں۔

انٹوینو۔ ٹھرو، ٹھرو۔ میں تمہارے اشتعال سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ملک میں فتنہ و فساد

برپا کرنا نہیں چاہتا کہ قاتلوں سے خون کا مطالبہ کر کے وطن کی فضا کو تیرہ و تار یک بنا دوں میرا

بیمشہ سے یقین رہا ہے کہ یہ قوم کے ہی خواہ ملک کے ہمدرد اور ملک کے مغز خوار ہیں۔ ہو سکتا ہے

کہ قیصر کے قتل کے ان کے نزدیک وہ مقول وجوہ موجود ہوں جن کو ہم نہ جانتے ہوں۔ میرا مطلب

ہو اس وقت صرف یہ ہے کہ قیصر تم کو دل جہان سے پیار کرتا تھا، اس لئے وہ اس بات کا مستحق ہے

کہ تم اس کا رشتہ بیان کرو۔ مجلس خراجہ اور اس پر دھڑکنا اگر مجھ کو تمہارے ہاتھ سے عنان

صبر کے چھوٹ جانے، تمہارے بے قابو ہو جانے کا خوف نہ ہوتا اور اگر مجھ کو ڈرنے ہوتا کہ تمہارے

قلوب غم و الم میں اور رنج و محن میں ڈوب جائیں گے تو میں تمہیں اس فقید عصر کی وصیت ملتا

پھر تمہیں معلوم ہو جائے کہ قیصر کو تم کتنے زیادہ محبوب تھے، وہ تمہارا کتنا جاں نثار و خدا کا سر دار تھا

اور وہ ہرگز اس لائق نہ تھا کہ وہ تمہارے سامنے اس بیدردی سے قتل کر دیا جائے۔ درنہا لیکہ تمہاری

میں نے اپنی ہڈی اور جھاری ہڈی میں خون کی گردش و عبادت ہو۔

مجمع - وصیت ضرور سنائے۔

اٹھو جو۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہارے بیٹے اس شہیدِ عظیم کے قتل پر شدتِ خون و الم کو شش و پنج

مجمع - نہیں ہم وصیت ضرور سنیں گے۔

اٹھو جو۔ قیصر نے وصیت کی ہے کہ رومی قوم کے ہر ہر فرد کو میرے خزانہِ خاص سے ۵۰

روپے دیے جائیں اور تمام رومی قوم کے لئے میرے تمام باغات اور تفریح گاہیں وقف فرمیں۔

ایک شخص - قیصر کیا ہی فیاضِ طبع و غریب پرور آدمی تھا۔

دوسرا - کیا ہی شریف و کریم تھا۔

تیسرا - قاتلِ تباہ و برباد ہیں۔

چوتھا - انتقام انتقام !!

پانچواں - ہم بردش کا گھر جلا کر دیں گے۔

اس کے بعد طوفانی مجمع سڑکوں پر لہریں مارتا ہوا نظر آنے لگا۔ ٹھیک اس طرح جس طرح

غبارِ سند میں موجیں بل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

اٹھو جو تنہا اپنی جگہ پر اسے تاریک شہر! اے بھیا نک فتنہ! میں نے ہی تجھ کو تیری

خوابگاہ سے اٹھایا ہے۔ بس تو جا اور اپنا کام کر۔ تو مشتعل ہو جا اور عطفِ آسان اور فرشِ زمین کو

جلا کر خاکِ سیاہ کر دے۔

دیکھو یہ کس قدر عبرت ناک نظریہ کہ رومی قوم نے ابھی قیصر کی غلامی سے پورے طور پر

نجات بھی نہیں پائی تھی کہ اٹھو جو نے اپنے دامِ عبودیت میں ان کو جکڑ دیا۔ جاہل و غلام ملک

کی یہی حالت ہوتی ہے یا تو وہ صاحبِ تاج و تخت کے زیرِ نگیں ہوتا ہے یا کسی جاہل و بیاں خلیب کے

(ترجمہ)

دامنِ سحر کا شکار۔

غربت

پڑھا میں وہ لال بھکڑا ایک نوجوان تاتاری جس کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا۔ دریا کے کنارے
الاکے گرد بیٹھے تھے۔ باقی تین قلعہ جو نیڑی کے اندر تھے۔ بیسوں کوئی ساٹھ سال کا ڈبلا پتلا، پو پلا آدمی
تھا۔ اُس کے شانے چوڑے پھلے تھے۔ اور چہرے سے ابلی صحت کے آثار نکلتے تھے۔ اس وقت وہ نشتے کی رنگ
میں تھا۔ اُس کی جیب میں شراب کی بوتل تھی۔ اور جال میں یہ

سے جتن نہ مانگ بیٹھیں۔ یہ نہ ہوتا تو وہ کبھی کا سو جاتا۔ تاتار
سے پیٹے، موہے، مہر سک کی مرے دار زندگی اور اپنی بیوی۔

کر رہا تھا۔ اس کی زیادہ سے زیادہ عمر پچیس سال ہوگی۔ مگر الاؤ کی روسی میں اس نے زرد بونا اور
مغموم چہرے کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ ابھی لڑکا سا ہے۔

لال بھکڑا بولا: "بھئی یہ جگہ کچھ جنت تو ہے نہیں۔ تم خود ہی دیکھتے ہو۔ کہ سوائے پانی اور دریا کے پیش
کناروں، اور پسندارشی کے کچھ بھی نہیں۔ جاڑا ہو چکے کو آیا۔ دریا میں برف بہ کر آ رہی ہے۔ آج
سویرے بھی تھی۔"

تاتاری نے کہا، مصیبت ہے مصیبت! اور گھبرا کر چاروں طرف نظر ڈالی۔

دش قدم کے فاصلے پر ٹنڈا برف کا سیاہ دریا بہ رہا تھا جھلاتا تھا، کھونکے ریتیلے ساحل سے ٹکراتا تھا
اور کہیں دور سمندر کی طرف تیزی سے بہتا چلا جا رہا تھا، کنارے سے ملی ہوئی ایک بڑی ناؤ کی سیاہ
پرچائیں نظر آتی تھی۔ بہت دور دریا کے اُس پار، روشنیاں کبھی دھندلی ہو جاتی تھیں۔ کبھی جھلکانے
گھتی تھیں۔ اور چھوٹے چھوٹے سانپوں کی طرح بل کھاتی تھیں، یہ پچھلے سال کی گھاس تھی جو جلاتی جا رہی تھی
ان سپوٹیوں کے پیچھے پھر اندھیرا تھا۔ جو اطرب اور سرد تھی۔

تاتاری نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ اُس کے دامن میں بھی اتنے ہی تارے تھے، چاروں

تاری قدر اندھیرا تھا۔ لیکن یہاں کسی بات کی کمی محسوس ہوتی تھی، صوبہ سمبرک میں تارے یہاں
کے بالکل مختلف تھے۔ اور آسمان بھی دوسرا تھا۔

تاری نے پھر کہا: ”معصیت ہے معصیت“

سیوں ہنسا، رفتہ رفتہ طبیعت مانوس ہو جائیگی، ابھی کچھ ہو..... منہ سے ابھی دودھ
ڈالتی ہے۔ اپنی نادانی سے سمجھتے ہو کہ مجھ سے زیادہ برا حال کسی کا نہیں۔ کوئی دن جاتا ہے۔ اپنے دل
میں کہو گے، خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے! مجھے دیکھو۔ ہفتہ بھر میں پانی اتر جائیگا۔ ڈونگی چلنے
لگیں گے۔ تم سب سائے بیریا کار استہ لوگے، میں یہاں پڑا اس کنارے سے اُس کنارے، اُس
کنارے سے اِس کنارے کشتی کھینتا رہ جاؤں گا۔ بائیس سال سے میرا دن رات یہی کام ہے۔ پانی
مے تلے چھلپا ہوا پانی کے اوپر میں، پھر طبعی شکر ہے کہ مجھے کسی بات کی شکایت نہیں۔ خدا سب کو
ایسی زندگی نصیب کرے!

تاری نے آگ میں کچھ خشک ٹہنیاں جھونکیں اور شعلوں کے قریب سُکڑ کر بیٹھ گیا اور ہولامیرے
والد ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ میری ماں اور بیوی وعدہ کر چکی ہیں، کہ اُن کے مرنے کے بعد یہاں
آجائیں گی۔

ہال بھکرانے پوچھا: ماں اور بیوی کو لے کر کیا کر دے گا؟ ارے میاں اس حماقت میں نہ
پڑو۔ شیطان ملعون تم کو بہکا رہا ہے۔ اُس مردود کی ایک نہ سنو! اُس کے دم میں ہرگز نہ آؤ۔ اگر
وہ عورتوں کا ذکر چھیڑ کے در غلائے۔ تو اُسے جلانے کے لئے کہ دو، مجھے اُن کی کوئی ضرورت
نہیں۔ آزادی کے بہانے اُس نے تو اُس کا مردوں کی طرح مقابلہ کر دیا۔ اور کہ دو مجھے نہیں
چاہئے۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بیوی، نہ آزادی، نہ ڈاک، نہ کھیت
کھیاں، خدا ان سب کا ستیاناس کرے مجھے ان میں سے کچھ نہیں چاہئے۔

ہال بھکرانے اپنی بوتل میں سے ایک گھونٹ لیا۔ اور پھر بوننا شروع کیا۔ ”میں معمولی
کسان“ مزدوری پیشہ لوگوں میں سے نہیں۔ ایک پادری کا لڑکا ہوں، جب آزاد تھا۔ تو

پتیرہگ یا اسکو کی مزاج دار قانون۔۔۔ یہاں اُن کے لئے کھیاں مارنے کے علاوہ کیا دھرا تھا، اس پر مردہ کہ خاندان کی حیثیت میں پہلے سے گر گئی تھی، ایک بیچارے بھلا وطن کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔

اس کے تین سال بعد کا ذکر ہے، مجھے خوب یاد ہے۔ کہ لیننہ القدر کی شام کو پرے کنارے سے کسی نے زور سے بکا، میں ناؤ اُدھر لے کر پہنچا۔ دیکھا میرا ہوں کہ۔۔۔ بسنگم عراجہ کا ناؤ، ایک اوڑھن لپٹے کھڑی ہیں، اور پہلو میں ایک نوجوان اس میں نے انہیں پار اتار دیا، وہ گاڑی میں بیٹھ کر یہ بار۔ گھوڑا اڑاتے وسیلہ سے سرگے پوچ صاحب گھاٹ پر۔

بیوی تو کسی غینک دالے آدمی کے ساتھ پار نہیں گئی، میں نے جواب دیا، جی ہاں، اب میدانوں میں جا کر ہوا پھیل مارینے! اس نے ان کے پیچھے بھٹ گھوڑا ڈال دیا، دن رات پانچ روز تک اُن کا تعاقب جاری رکھا۔ واپسی پر جب میں اسے پار اتار رہا تھا۔ تو وہ بے دم ہو کر میری کشتی میں ڈھیر ہو گیا۔ اور اپنا سر تختوں پر پٹختا اور چنچن مار مار کے روتا رہا۔ میں نے کہا تو یہ معاملہ ہے ہنس کر اسے یاد دلایا کہ لوگ سائے بیریا میں لمبی لطف سے زندگی بسر کر سکتے ہیں! وہ اپنا سر اور زور سے پٹنے لگا۔

اس کے بعد آزادی کی ہوس اُس کے دل میں چکیاں لینے لگی۔ اُس کی بیوی فرار ہو کر روس پہنچ چکی تھی، اُس کے دل میں ہوک اٹھی کہ جا کر اُسے عاشق کے پنجے سے چھڑاؤں! یہاں! اُس دن سے وہ مارا مارا صبح شام گھوڑا دوڑانے پھرنے لگا، کبھی ڈاک خانہ ہے، تو کبھی کیدان کا دفتر، عرضیوں کا تانتا باندھ دیا۔ کہ میرے حال پر رحم کیا جائے۔ اور روس واپس جانے کی اجازت دیدی جائے۔ زمین بیخ ڈالی مکان یہودیوں کے ہاتھ رہن کر دیا۔ بال سفید ہو گئے، کمر جھک گئی۔ چہرہ دق کے ماروں کی طرح زرد پڑ گیا۔ بھلا چنگا ایک ایک کی

کچھ گھنٹوں میں آنسو بھر لاتا۔ اس طرح آٹھ سال تک وضو کا تار باندھ کر رہا۔ ہر دھوئیں کی جان میں جان آگئی ہے۔ کیوں نہ ہو خیر سے بڑی کے سیانے ہونے سے کچھ نہ بچتا تھا۔ اتنا لگ گیا ہے۔ وہ اسے ٹیٹھی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اور آنکھ کی پٹی کی طرح دکھتا ہے۔ یہ ضرور ہے۔ کہ لڑکی میں کسی قسم کا عیب نہیں، اچھی شکل، کالی کالی بھوئیں، منہ میں خوشی، ہر اتوار کو اسے ساتھ لے کر گرجا جاتا تھا۔ دونوں کشتی میں ہاس ہاس کھڑے ہو جاتے، لڑکی مسکراتی، اور باپ کی نظریں بیٹی کے کھڑے سے چل بھر کو اٹھنے کا نام نہ لیتیں۔

کہنا، 'ہاں' 'سیوں'، سائے بیریاں میں بھی زندگی لطف سے بسر ہو سکتی ہے، سائے بیریاں میں بھی انسان خوش رہ سکتا ہے۔ میری بیٹی کو دیکھو، ماشاء اللہ کتنی پیاری ہے! میں شرط لگاتا ہوں کہ اتنی پیاری لڑکی تم چراغ لے کر ڈھونڈو تب بھی نہیں پاسکتے، میں جواب دیتا ہوں شک تم ٹھیک کہتے ہو، تھلادی لڑکی میں کوئی خرابی نہیں، اور اپنے دل میں کہتا ہوں ذرا صبر کرو۔۔۔۔۔ اس کی اٹھتی جلدی ہے۔ خون میں اُبال ہے، جی میں مرادیں ہیں، یہاں ہلار اگ رنگ کہاں؟ اور یہاں لڑکی پر سچ کھلنے لگی، سوکھتی گئی، سوکھتی گئی، اور ایڑیاں رگڑ رگڑ رنگ رہی ہے،

وقت۔۔۔۔۔

دیکھ لی آپ نے سائے بیریاں کی خوشی، لعنت ہو کم بخت پر، یہاں زندگی اس طور سے بسر ہوتی ہے۔۔۔۔۔ خیر تو اب ڈاکٹروں کی ڈھونڈ بھی، ایک کو چھوڑا، دوسرے کو پھڑا۔ آج ابھی دکھا، کل اُسے، جہاں کسی ڈاکٹر یا جادوگر کا پتہ چلا اور اسے لینے پہنچا، ڈاکٹروں کے پیچھے ہزاروں دھوپیر بوا کر دیا۔ میرے نزدیک تو بہتر ہوتا، کہ یہ روپیہ شراب میں اڑا دیتا، لڑکی تو حرکت کرے گی، اب کسی کے بچائے نہیں بچتی، پھر اس کی مکر ٹوٹ جائیگی، اور اس کا یقین رکھو کہ یا تو صدمے سے خود کشی کرے گا۔ یا دوسن بھاگ جائے گا، فرار ہوگا، پکڑا جائے گا، تھوڑے چلے گا، سزا ہوگی،

تو باہر سے جو سردی میں مسکڑا تھا، بڑبڑا کر کہا، اچھا ہے، اچھا ہے، اچھا ہے، اچھا ہے، اچھا ہے، اچھا ہے،

اُس کی بیوی، اُس کی بیٹی... اس کے مقابلہ میں قید کی، سدرے کی کیا حقیقت ہے !
ابھی بیوی اپنی بیٹی کی فصل تو دیکھنے کو مل گئی۔... تم کہتے ہو، کچھ نہ مانگو، یہ نہوت بُری، اُس کی بیوی
تین سال تک اُس کے ساتھ رہی، یہ پروردگار کی دین تھی، نہوت بُری، تین سال اچھے، کچھ بکے
ہی !

سردی سے اُٹک اُٹک کے اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے روسی لفظ سوچ سوچ کر اُسے بھرتی
گنتی کے روسی لفظ آتے تھے، تاتاری نے کہنا شروع کیا، کہ خدا... گھڑی نہ لائے، کہ کوئی چار
پڑے اور پردیس میں جان دے، اور ٹھنڈی، کالی زمین
دن بھر نہ سہی، گھنٹہ بھر کو آجائے، تو اس نعمت کے
خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا، خوشی کا ایک دن نہوت۔

وہ پھر اپنی حسین و زیبین بیوی کی حکایت لے بیٹھا، پھر اُس نے اپنا سہا سوسائیں پر یہ
اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، سمیوں کو اس نے یقین دلایا کہ میں بے گناہ ہوں، اور
مفت میں مصیبت ٹھکت رہا ہوں، میرے دو بھائیوں اور چچا نے بل کر اُس کسان کے گھوڑے پہا
حاف کیا تھا، اور انہی نے گھوڑے دالے کو مار مار کے ادھ موایا تھا، پنچائت نے انصاف سے
کام نہیں لیا، بلکہ کچھ ایسی کاری گری کی، کہ ہم بھائیوں کو کالا پانی ہو گیا، اور ہمارا پیسے والا
چچا صاف چُٹ گیا۔

سمیوں نے تھکے ہوئے پیچے میں کہا، کچھ دنوں میں خود بخود جی لگ جائے گا،
تاتاری دم بخود بیٹھا اپنی اٹک آلود آنکھوں سے اُگ کی طرف دیکھتا رہا۔ چہرے سے حیرانی
اور تردد پڑا اُٹکتا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیوں گھر سے اتنی دور اس تاریکی اور غمی میں
انجان لوگوں کی صحبت میں پڑا شہر رہا ہوں،

لال بیکر اُگ کے قریب بیٹے بیٹے کسی بات کا دھیان کر کے آپ ہی آپ ہنسا، اور دھیمی
لے سے ایک دُمن گنگنا نے لگا۔

میں نے دیکھا تھا، لڑکی کے لئے باپ کی صحبت میں کیا لطف؟ یہ مزہ ہے کہ وہ اسے
 دیکھ کر ہنس پڑتا ہے۔ مگر جانی، اس کے سامنے انسان کو اپنے شمس قیامیوں کا
 ہونا ہے۔ بڑا مزاج کا سخت اور چڑا ہے۔ جو ان لڑکیوں کو بھلا سختی سے کیا سرد کار؟ انہیں تو
 پادشہ کی چائیں اور ہا ہا! ہو ہو ہو! عطر چاہئے۔ اور غازہ چاہئے۔ جی ہاں۔ آہ زندگی
 دھڑکی۔ سیوں نے دقت کے ساتھ اٹھتے ہوئے ایک آہ کھینچی۔ شراب ختم۔ معلوم ہوتا ہے۔ سوت
 کا وقت آچہنچا۔ میاں، میاں تو چلا۔۔۔۔۔

تاتاری اکیلا رہ گیا، تو اس نے الاؤ میں کچھ اور ہنسیاں ڈالیں۔ لیٹ رہا۔ اور فعلوں پر
 ہنگامی بندھ کر اپنی بیوی کے تصور میں ڈوب گیا۔ ہینہ بھر، دن بھر کو وہ میرے پاس آجاتے۔
 خواہ جی چاہے تو پھر چلی جاتے۔ ایک ہینہ یا ایک دن سدا کی محرومی سے بہتر ہے۔ اچھا، فرض کرو،
 میں نے اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ اور وہ ابھی گئی۔ آخر کھا بیگی تو کیا کھا بیگی؟ رہیگی تو کہاں رہیگی؟
 سوچتے سوچتے اس کی زبان سے نکلا، کھانے کو کچھ ہوا، تو رہیگی کیونکر؟

دن رات چوچلانے پر بھی کٹھن دس کوپک اس کے پلے پڑتے تھے، یہ سچ ہے کہ سواریاں
 شراب یا چائے کے لئے کچھ بخش دے دیتی تھیں۔ وہ دوسرے ملاح آپس میں بانٹ لیتے تھے،
 ادھر صرف بیکارے تاتاری کو سوکھاڑتے تھے، بلکہ اس کا انا مذاق اڑاتے تھے، تو چرچ کی
 ہنگامی کی وجہ سے وہ بھوک، سردی اور دہشت کا شکار تھا۔۔۔

اب کہ وہ سردی کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا، اور اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹا جاتا تھا۔ چاہئے تھا
 کہ وہ جھونپڑی میں جا کر پڑھتا، اور سو جاتا، مگر وہاں اس کے پاس اوڑھنے کو کوئی چیز نہ تھی، اور
 اندر سردی باہر سے بھی زیادہ تھی، ساجل پر بھی اگرچہ اوڑھنے کو کچھ نہ تھا، مگر کم از کم آگ تو دہکا
 سکتا تھا۔

ہینہ بھر میں پانی اتر جائیگا۔ اور چھوٹے ڈونگے چلے گئیں گے۔ اور سوائے سیوں کے کسی
 طرح کی ضرورت نہیں رہیگی، تب تاتاری گاؤں گاؤں روزگار ڈھونڈتا اور بھیک مانگتا پھرے گا۔

اس کی بھوی صرف سترہ سال کی تھی، خوب صورت، نازک مزاج، شیریلی، کیا وہ بھی شرم دیا
چوڑ، نقاب اُلت اور بد رجھولی لئے پھرے گی؟ نہیں اس کے خیال ہی سے اُس کے بدن
کے رونگھے کھڑے ہو جاتے تھے۔۔۔

پو پٹ رہی تھی، کشتی، پانی میں بید معنوں کی جھاڑیاں، دریا کی لہریں صاف چمکنے لگی تھیں
پلٹ کر دیکھنے سے ترچھی ریتلی ڈھال نظر آتی تھی، اس کے دامن میں چھپر کی جھونپڑی تھی، ذرا
اوپر گاؤں کی جھونپڑیاں پاس پاس پڑی تھیں، گاؤں میں مرغ بانگ دینے لگے تھے۔
تاتاری سوچنے لگا، کہ یہ سرخ ریتلی ڈھال، کشتی، دریا، حائلہ، رہا، صبح

پایا، بیماری، شاید یہ سب مایا ہو، بلکہ بعید نہیں کہ بہ

معلوم ہوا، کہ میں سو رہا ہوں، اور اپنے خاٹوں کی آ،

دمن سمبر سک میں ہے، اُس نے اپنی بیوی کو نام لیکر پکارا

میں اس کی ماں ہو۔ لوگ کیسے کیسے در و ناک خواب دیکھتے ہیں، خواب آخر اتنے کیوں ہیں؟

تاتاری نے مسکرا کر آنکھیں کھولیں۔ یہ کون سا دریا ہو؟ دالگا؟

برف پڑ رہی تھی

’کشتی‘، دریا کے دوسرے کنارے پر کوئی شخص چیخ رہا تھا، کشتی!

تاتاری چونک کر اٹھ بیٹھا اور دوسری طرف جانے کے لئے اپنی ساتھیوں کو جگانے لگا،

روا روی میں پھٹی پرانی بیٹری کی کھالیں پہن، اپنی بجاری ایند بھری آواز میں گایاں دیتے

سرودی سے ٹھٹھرتے ملاح گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ کچی نیند سے اٹھ کر دریا کی تیز ہوا اُن کے

بدن کے پار ہوتی جاتی تھی، آہستہ آہستہ سب اچھل کر کشتی میں سوار ہوئے،... تاتاری اور

قیقہ اور ملاحوں نے بڑے بڑے، چوڑے پھل کے تپوار سنبھالے جو اندھیرے میں لیکڑوں کے

پنچے معلوم ہوتے تھے، سمیوں پیٹ کے بل تپوار کے پیرم کے سہارے لیٹ گیا، دوسرے کنارے

سے چیخنے کی آواز بدستور آرہی تھی، دو مرتبہ منچہ شاید اس خیال سے چلایا گیا۔ کہ ٹکلی ہے ملاح

سچے یوں، یا گھڑی کے شراب خانے میں گئے ہوتے ہوں،

میں یا آخر ایسی کیا گھبراہٹ ہو؟ لال بھکڑے بے سے پکتا تھا، کہ اس میں جلدی کرنا
مطلوب ہو، بلکہ از کم جلدی کا کوئی نتیجہ نہیں۔

میں چوڑی، بھڑی ناؤ کنارے سے روانہ ہوئی، اور بید مجنوں کی جھاڑیوں میں سے جو کچلنے
لگی، اور سخت چلتے نظر آتے تھے۔ اور صرف اسی بات سے اندازہ ہوتا تھا، کہ کشتی ساکن نہیں، بلکہ
حرکت میں ہو، طاح بچے تھے ہاتھوں سے چوچلا رہے تھے، لال بھکڑے پیٹ کے بل کمان کی شکل
لیٹا تھا، کبھی اس طرف کو لٹک جاتا کبھی اس طرف کو، اندھیرے میں یہ معلوم ہوتا تھا، کہ طاح
کسی باد آدم کے وقت کے لیے بے پنجوں والے وقیانوسی جانور کی پشت پر بیٹھے ایک برفانی
نقہ ووق ملک میں سے چلے جا رہے ہیں، ایک ایسے ملک میں جو کبھی کبھی ڈراؤنے خواب میں
دکھائی دیتا ہے، ناؤ بید مجنوں کی جھاڑیوں سے نکل کر کھلے دریا پر پہنچے گی، چوہوں کے برابر
چلنے کی آواز دریا کے دوسرے کنارے پر سنائی دیتی تھی، کوئی شخص چلائے جاتا تھا۔
جلدی کرو! جلدی کرو!

دس منٹ کے بعد ناؤ زور سے گھاٹ سے جا کر نکل رانی،

سیموں اپنے منہ سے برف پونچتے ہوئے بڑبڑایا۔ برف کی دو چاڑ ہے کہ ختم ہونے کو نہیں

آتی، خدا جانے اتنی برف کہاں سے نازل ہوتی ہے،

کنارے پر ایک میاں قد و قامت کا حقیر سا آدمی ٹوٹری کی کھال کا چھوٹا کوٹ پہنے

سینڈ بیٹر کی کھال کی ٹوپی اوڑھے بے حس و حرکت اپنے گھوڑے سے الگ ہٹ کر کھڑا تھا۔

عمداندہ اور از خود رنگی اُس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ گویا کوئی بھولی بھری بات یاد کرنے

کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اپنے ناقص حافظہ پر دانت پس رہا ہے، سیموں اس کے قریب

پہنچا اور مسکرا کر ٹوپی اتاری، اُس نے کہا مجھے انتہا سائیفسکا جانے کی جلدی ہے۔ میری

ڑکی کی حالت پھر خراب ہو گئی، سنا ہے کہ وہاں کوئی نیا ڈاکٹر آیا ہے۔

گڈھی گاڑیں دیکھ لی گئی، اور ملاحوں نے اسے بہاؤ کے فلاف کینا شروع کیا۔ وٹھس
جسے سمیوں نے دیسلانی سرگے یوچ کے نام سے پکارا تھا باکل ساکت کھڑا اپنے موٹے موٹے ہونٹ
دبانے تاک لی سیدھ میں دیکھتا رہا۔ کوچوان نے اُس سے سگریٹ پینے کی اجازت مانگی
تو اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ سمیوں نے اُس کی طرف طنز کی نظر بے دیکھا۔
اور کہا جی ہاں، ساتے بیریا میں بھی لوگ لطف سے زندگی بسر کر سکتے ہیں، لطف سوا! ناں بھیکو کے
چہرے پر فاتحانہ رنگ جھلک رہا تھا، جیسے اس نے کوئی بات ثابت کر لی، اور اسے خوشی ہے کہ
میری پیشین گوئی پوری ہو کے رہی، صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت
بہت لطف اٹھا رہا ہے،

جب گھوڑے سائل پر پہنچ کر جوتے جانے لگے۔

اس موسم میں آپ کو بہت کچھ پڑے گی، آپ کو چاہئے تھا، کہ جی۔ بی۔
سرے سے سفر کا خیال ہی دلوں سے نکال دیتے، سفر سے کچھ حاصل ہو، تب بھی ایک بات ہے۔
مگر آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ سالہا سال سے دن رات ادھر سے ادھر حیران و پریشان مارے
مارے پھرتے ہیں، ایمان کی بات تو یہ ہے، کہ اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ خاک نہیں نکلتا۔
دیسلانی سرگے یوچ چپ چاپ اسے انعام دیکر گاڑی میں بیٹھا، اور روانہ ہو گیا،
سمیوں نے سردی سے سکر کر کہا، پھر وہی ڈاکٹر کی تلاش، گو یا مقول ڈاکٹر کا ملنا اتنا
ہی آسان ہے، بقنا میدان کی ہوا کا، یا شیطان ملعون کی دم کا ہاتھ آنا، عجب آدمی جو، خدا یا،
مجھ گناہ نگار کو معاف کر!

تاتاری، لال بھیکو کے قریب پہنچا، اور تھوڑی دیر تک اُسے نفرت اور بیزاری کی نظروں
سے دیکھتا رہا۔ پھر سردی سے غمر غمراتے ہوئے اپنی ٹوٹی پھوٹی روسی میں تاتاری الفاظ گڈڈ
کر کے اُس نے کہنا شروع کیا، وہ نیک ہیں، نیک، اور تم بُرے ہو، تم بُرے ہو! ان کی بچ
پاک ہو اور تم حیوان ہو، پلید! وہ زندہ ہیں اور تم ایک مُردہ لاش ہو۔ خدا نے انسان کو

اس لئے بنایا جو کہ دکھ سکھ ہے، تمہارے دل میں کوئی خواہش نہیں تم بے جان ہو۔ تم پتھر ہو،
مٹی کا ڈھیر ہو!

اللہ میاں تمہیں نہیں چاہتا، انہیں چاہتا ہے!
طرح ہنسنے لگے، تاتاری کی پیشانی پر حقارت سے بل اُگیا۔ ہاتھ کے ایک جھٹلے سے
اُس نے اپنے پٹھے پر اُسے پیٹھڑے بدن سے لپیٹ لئے، اور الاؤ کے قریب چلا گیا، سیوے
اور دوسرے طرح ٹہلتے ہوئے جھونپڑی کی طرف چلے گئے۔

ایک طرح خشک گھاس پر لیٹے ہوئے بھاری آواز میں بولا، سردی ہے!
دوسرے نے اتفاق کیا وہاں، گرمی نہیں ہے، زندگی کیا ہے خیال ہے۔ . . .
سب لیٹ گئے دروازہ ہوا کے جھونکے سے کھل گیا، اوپر برف کی پوچھاڑ اندر آنے
لگی، کسی میں مارے سردی اور کاہلی کے اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اُٹھ کر دروازہ بند کر دیتا۔
سیوے غنودگی کا جھونکا آتے وقت بولا، میں تو مزے میں ہوں، خدا سب کو ایسی
زندگی نصیب کرے!

تمہاری دلاوری کا لوہا ہم سب مانتے ہیں، شیاطین بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگائیں گے!
باہر سے ایسی جھین آئیں جیسے کوئی کتا بھوں بھوں کر رہا ہے،
کیا ہے؟ کون ہے؟
تاتاری باہر بیٹھا سو رہا ہے،
عجب دیوانہ ہے!

سیوے نے کہا، رفتہ رفتہ عادی ہو جائیگا، اور فوراً اُس کی آنکھ لگ گئی،
باقی لوگ بھی تھوڑی دیر میں سو گئے۔ دروازہ کھلا پڑا،

بہ ہون،

تنقید و تبصرہ

کتب

المیخ الدجال ویا جوج ویا جوج - شنیوی یاد اسلام -
پانصد درناور - جواہرات اسلام - تناسخ -

پیام عمل - ۱

المیخ الدجال ویا جوج ویا جوج | مصنفہ مولوی محمد

چھپائی اور کاغذ معمولی - تقطیع ۲۷ ۱/۲ - صفحات ۲۸

لئے کاغذ : احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور -

اس رسالہ میں مولوی محمد علی صاحب نے بعض ملامت قیامت کی تشریح کی ہے مثلاً
یا جوج ویا جوج - میخ دجال - دابة الارض اور مغرب سے طلوع شمس - یا جوج ویا جوج جن کا ذکر
قرآن مجید میں ہے ان کے متعلق کوئی تفصیلی بحث مولوی صاحب نے نہیں کی نہ ان کے تاریخی حالات
پڑھنے کی رحمت گوارا کی نہ ان کتابوں کا مطالعہ کیا جو خود علما مغرب یا بائبل کے شارحین نے اس
موضوع پر لکھی ہیں - صرف ترقیل نبی کی کتاب کے حوالے سے اقوام مغرب کو یا جوج ویا جوج قرار دیا -
زیادہ توجہ انھوں نے میخ دجال پر صرف کی ہے بلکہ یہ سارا رسالہ اسی کے متعلق ہے - مگر
اس بحث میں تاویلیں اس قدر کمزور ہیں جن کے لکھنے کی جرات صرف انھیں کو ہو سکتی ہے مثلاً دعویٰ
یہ ہے کہ یا جوج ویا جوج اور دجال دونوں ایک ہی ہیں - دلیل یہ ہے کہ

”صحیح حدیث نے سورہ کعبہ کو فقہ دجال کا علاج بتایا ہے“ اور سورہ کعبہ

بالخصوص عیسائیت کے فقہ پر ہے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم

نے غلبہ عیسائیت ہی کو فقہ دجال قرار دیا ہے - صفحہ ۱۲ -

اگر مولوی صاحب اس دلیل کو ترتیب دیکر اپنے سامنے رکھ لیتے تو ان کو خود معلوم ہو جاتا کہ

اس کے کچھ خصات ممنوع ہیں۔

دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ دجال ایک فرد کا نام نہیں ہے بلکہ ایک قوم کا نام ہے۔ دلیل یہ ملتی ہے کہ
 ”یہ مشین گولیاں نبی کریم علیہ السلام کے کشوف (؟) ہیں اور کشف بارویا
 میں جب ایک قوم دکھائی جائے گی تو ایک فرد واحد ہی کے طور پر دکھائی جائیگی۔“
 صفحہ ۱۰۱۔

سوال یہ ہے کہ ”ایک فرد واحد“ کس طور پر دکھایا جائے گا؟ مولوی صاحب نے خود بنیاد
 کے ذکر میں نقل کیا ہے کہ حضرت جابر صحابی نے قسم کھا کر کہا کہ وہ دجال ہے۔ نیز خود آنحضرتؐ بھی جیسا کہ
 روایات سے معلوم ہوتا ہے اس کے دجال ہونے کا گمان رکھتے تھے۔ کیا وہ ”ایک فرد واحد“ تھا
 یا ایک قوم؟

اس کے علاوہ یہ بھی حدیث میں ہے کہ ”میری امت میں تین دجال نکلیں گے۔ کیا وہ ”ایک
 فرد واحد“ ہوں گے یا ایک ایک قوم؟
 حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں لکھتے ہیں:-

”حضرت عیسیٰؑ کا کام صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صلیب کو توڑیگا اور خنزیر کو
 قتل کرے گا۔ یہاں قتل دجال کا نام تک نہیں؟“ صفحہ ۱۰۲۔
 پھر آگے لکھتے ہیں:-

”آنے والے مسیح کے کارناموں میں قتل دجال کا نام تک نہ لینا اس بات
 کی قطعی اور کلی شہادت ہے کہ فقہ دجال اور غلبہ صلیب ایک ہی حقیقت کے دو
 نام ہیں۔“ صفحہ ۱۰۴۔

دعویٰ دلیل اور نتیجہ کی مطابقت کی منطقی بحث کو جانے دیجئے، کیونکہ مولوی صاحب اس سے
 کبھی سروکار نہیں رکھتے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جن حدیثوں میں کس صلیب اور قتل خنزیر کا ذکر ہے ان میں
 پہلے تصریح کے ساتھ قتل دجال کا بھی ذکر ہے جس کا اس شہود سے مولوی صاحب نے بار بار انکار
 کیا ہے۔ مجھے ان احادیث کے نقل کرنے کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ انہیں خود مولوی صاحب مصروف
 ہی کے قلم سے یہ پردہ اس طرح فاش ہوتا ہے:-

”بعض قلوب میں یہ غیبہ پیدا ہوتا ہے کہ مسیح موعود وہی شخص ہو سکتا ہے جو
دجال کو قتل کرے اور حضرت مرزا صاحب نے دجال کو قتل نہیں کیا۔ اس میں
شک نہیں کہ احادیث میں مسیح موعود کے دجال کو قتل کرنے کا ذکر آتا ہے مگر سوال
یہ ہے کہ قتل دجال سے مراد کیا ہے؟“ صفحہ ۵۱۔

قتل دجال کی اگر پہلے ہی تاویل کر دیتے اور یہ نہ لکھتے کہ ”آنے والے مسیح کے کارناموں میں
قتل دجال کا نام تک نہیں ہے“ تو کیا ہرج تھا۔

ذوالقرنین بعض لوگوں نے سکند کو کہا ہے۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ ان کے
نزدیک ذوالقرنین دارائے اول ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ”...“
کیونکہ دارا کا سد بنا کسی طرح ثابت نہیں۔ اس بار
جس نے ملکین کے ذوالقرنین کے سفرِ غرب و
دابة الارض جس کا ذکر قرآن کریم میں اس

”جب ان کے اوپر عذاب کا فیصلہ ہو چلے“ اس سے مراد کیا ہے۔ لکھتے ہیں
جاندار نکالیں گے جو لوگوں سے یہ کہے گا کہ وہ اللہ کی آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔“
(پ ۲۰ رکوع ۲)۔

مولوی صاحب نے اس سے عیسائی علماء کو مراد لیا ہے۔ لکھتے ہیں
”اقوام یورپ کے تین مختلف حصوں کا تین ناموں کے تحت میں ذکر کیا ہے۔
دجال ان کے پادری ہیں۔ یاجوج ماجوج انکا وہ گروہ ہے جس کے ہاتھ میں ملکی
طاقت ہے اور دابة الارض ان کے وہ علماء ہیں جو مادہ پرستی میں منہمک ہیں۔“
صفحہ ۶۴۔

لیکن مرزا صاحب نے دابة الارض خود علماء اسلام ہی کو قرار دیا ہے جو زمینی باتوں پر گرس
ہوئے ہیں۔ اس لئے مولوی صاحب کو اس تحقیق کے سامنے بھی سر جھکانا تھا۔ لکھتے ہیں:-
”کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ یہ آج ہمارے علماء کی ہو جو تصویر ہے۔ اگر
ایسے لوگوں کو دابة الارض کہہ دیا گیا ہو تو کیا بعید ہے؟“ صفحہ ۶۶۔

لیکن کیا علماء اسلام کی آج ہو بہو تصویر یہ ہے؟ میں تو یہی ان کی ذہنیت ایک ہزار سال سے
 دیکھنے کے لئے تیار ہوں لیکن اس کو چھوڑنے اور یہ دیکھنے کہ قرآن میں داتہ الارض کا خود ج
 مشروط ہے کہ اس وقت ہو گا جب عذاب دنیا قیامت کا فیصلہ ہو چکے گا۔ لیکن بقول مولوی محمد علی صاحب
 علم مغرب اور بقول مرزا صاحب علماء اسلام جو دوسرے انسانوں کی طرح مال کے شکم ہی سے پیدا
 ہوئے ہیں زمین سے نکلے جا چکے ہیں اور کتے پھرتے ہیں کہ لوگ آیات الہی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔
 دانت میں تنوین وحدت کی ہے جس کے سنی ہوئے ایک جاندار۔ مگر مولوی محمد علی صاحب
 کے لئے یہ آسان ہے کہ وہ "ایک فرد واحد" کو ایک قوم بنالیں۔

آخر میں مغرب سے طلوع شمس کی یہ تاویل کی ہے کہ جماعت احمدیہ نے ممالک مغربیہ میں
 تبلیغی مرکز قائم کر دیا ہے جہاں سے آفتاب اسلام "ضیاء باریاں" نکل رہا ہے۔ مگر اس صورت میں تو طلوع
 آفتاب مشرق یعنی پنجاب ہی سے ماننا پڑے گا جس کی ایک کرن مغرب میں پہنچ گئی ہے نہ کہ مغرب سے۔
 خاتمہ پر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ مشین گویاں جو روایات میں بیان کی گئی ہیں ان کی نسبت
 خود ائمہ حدیث نے اپنا اطمینان ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ ظالم میں ایک حدیث
 بھی صحیح نہیں۔ ایسی حالت میں ان کی اس قدر بے بنیاد تاویلوں میں پڑنا اہل علم و دین کے شایان
 شان نہیں۔ بے شک قرآن میں جو امور مذکور ہوئے ہیں ان پر مفید اور دلچسپ بحث ہو سکتی ہے۔ لیکن
 ایسی بحث جس کی بنیاد علم و عقل پر ہو نہ کہ فرقہ وارانہ خیالات پر۔

ثنوی یا د اسلام | مصنفہ شاہ ممتاز علی صاحب آہ ایٹھوی۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ تقطیع خود۔
 حجم پانچ جزو قیمت فی نسخہ ۱۰/-۔ لئے کا پتہ؛ مولوی محمد ساجد صاحب محلہ مغلیہ شہر فیض آباد۔
 شاہ صاحب موصوف نے اس ثنوی میں اللہ کے صفات۔ رسول اللہ کے حالات طیبہ اور
 ہرگز ان دین کے بعض تاریخی واقعات نہایت عقیدت کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ ٹھڈوں، دہریوں
 اور بے دینوں کے اعتراضات کے جوابات بھی دئے ہیں اور موجودہ مسلمانوں کی دین سے بیزاری اور
 افرنجیت کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔

وہ ایک نہ مثنیٰ شاعر اور حضرت منشی امیر احمد مرحوم مینائی کے اربشد تلامذہ میں سے ہیں اسلئے

میں کی شاعری نگہبانی ہے مگر غزل گوئی اور واقعات منظم کرنے میں بڑا فرق ہے چنانچہ اس غنوی میں ان کے شدید نظم نے وہ دلکش جولانیاں نہیں دکھائیں جو غزلوں میں ہیں مگر پھر بھی پختہ کلامی کا جو ہر پہلو عیاں ہو۔

یاقوت و زنادور | مصنف مولوی محمد عین خاں صاحب بی۔ اے (علیگ) سابق رئیس تدریسات افغانستان۔
لکھائی چھپائی اور کاغذ متوسط۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۰۰ صفحے۔ قیمت فی نسخہ ۸۔
لٹے کا پتہ، سید حمید خاں۔ لہتی نو جالندھر۔

اس کتاب میں قدیم اولیاء و کرام اور بزرگان اسلام کے اقوال سے پانچ سو تیس جو دہن و دنیا دونوں میں کار آمد ہو سکتی ہیں اور انسان کی عقل و معرفت کو بڑھانے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ غازی نادور خاں بادشاہ افغانستان کے لکھی گئی ہیں۔ انتخاب عقل و فہم کے ساتھ کیا گیا ہے اور بڑے اور جدید و قدیم تعلیم یافتہ سب کے لیے مفید۔

جواہرات اسلام | مصنف محبت رائے صاحب عین۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ تقطیع خورد حجم ۵۲ صفحے۔
قیمت فی نسخہ ۸۔ لٹے کا پتہ، میرالال پٹالال۔ دربار کلاں۔ دہلی۔
اس رسالہ کے مصنف مسٹر محبت رائے دہلی کے ایک معزز پیر سٹر ہیں۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کے حقائق کی زیادہ تر مولانا روم کی غنوی سے تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور بہت سے اہم مسائل کو بیان کیا ہے۔

تنازعہ کو بھی انہوں نے اسلامی تعلیمات میں سے سمجھا ہے اور اس کے اوپر غنوی کے بعض اشعار سے سند پیش کی ہے۔ لیکن دراصل یہ غلط فہمی ہے۔ اسلام نے تنازعہ ارواح یعنی آواگون کی تعلیم نہیں دی ہے۔ خود مولانا روم نے بھی تخلیق کے مدارج دکھائے ہیں نہ گناہوں یا نیکیوں کے حوض میں بابا پیدائش کے یعنی جو اشعار سند میں پیش کئے گئے ہیں ان میں ارتقاء تخلیق ہے نہ کہ سلسلہ تنازعہ اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے نہ کہ غنوی پر۔ کاش ایسی بے تعصب اور

سلامت ملتیں قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں تو اسلامی حقائق کو زیادہ صحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

تاسخ | مصنفہ ڈاکٹر بشارت احمد صاحبہ احمدی۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ حجم چار جزو قیمت فی نسخہ ۲۰۰ روپے۔ لکھنؤ، انجمن صاحب دارالکتب اسلامیہ، احمدیہ پبلشنگس لاہور۔

ڈاکٹر صاحبہ نے اس رسالہ میں ایک سوال کے جواب پر تاسخ کے متعلق تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ اعتقاد زمانہ لاطمی کا ایک غلط نظریہ ہے اس مسئلہ کی تردید میں اگرچہ پہلے بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر یہ رسالہ سب سے زیادہ واضح، مبین اور مدلل ہے۔ ان کے دلائل کا مطالعہ مین امور ہیں۔ اول یہ کہ ہر ایک آدمی جانتا ہے کہ میں اس سے قبل اس دنیا میں کبھی نہیں آیا۔ دوم یہ کہ مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعے سے انسان کو جو علم ملتا ہے یعنی سائنس اس نے ارتقا کو مان کر تاسخ کی جڑ کاٹ دی ہے۔ سوم یہ کہ خود خالق کائنات نے نبی نوع انسان کو آج تک جو علم انعام کے ذریعے سے دیا ان میں یہ بتا کر کہ مرنے کے بعد انسان اس دنیا میں واپس نہیں آتا تاسخ کی تردید کر دی۔

ساری کتاب ان تین اصولی دلائل کی تشریح اور توضیح ہے اور اس خوبی کے ساتھ ہے کہ علم اور عقل کی روشنی میں ان کا جواب ناممکن ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ نے اس رسالہ کو چار مختلف لکچروں میں تقسیم کیا ہے جس کی وجہ سے مضامین کا بابا بجا گوار ہو گیا ہے۔ اگر مسلسل ایک مضمون لکھتے تو یہ عیب نہ واقع ہوتا۔ مگر تاہم اپنے موضوع پر بے مثل رسالہ ہے۔

پیامِ عمل | جزیرہ سورشیش میں مولانا حکیم عبدالرشید نواب کی مدد سے ۱۹۲۹ء سے ایک مدرسہ قائم کیا گیا ہے جس میں مسلمان بچوں کو انگریزی نصاب کے ساتھ اردو اور دینیات کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس رسالہ میں اس مدرسہ کی ضروریات دکھا کر اس کی امداد کی تحریک کی گئی ہے۔ دستخط کنندگان میں کارکنان و ممبران مسلم ایجوکیشن سوسائٹی دیگر مسلمان سورشیش ہیں۔

اعوذ بنو یحلیب صاحب کہ مسجد اود خرافیت حیدر آباد و کن ارسال کی جا سکتی ہے۔

انارکلی | مصنفہ سید امتیاز علی تاج، دارالاشاعت پنجاب لاہور، تقطیع ۱۳۷۵ھ، محرم ۲۰۰۰ء صفحہ۔

اور وہ بڑے والوں میں شادی کوئی ایسا ہو گا جسے یہ ڈراما دیکھ کر خوشی نہ ہوئی ہو۔ موضوع "پس نظر" ڈراما کے مضامین اور صفات ہر اعتبار سے یہ تصنیف قابل قدر ہے اور ہمیں امید ہے سندھستانی ڈراما اور قیصر کے شائقین کی عام بدذاتی رفع کرنے میں یہ بہت مدد دے گا۔ اس میں حقیقت نگاری بھی ہے اور تصویق کی رنگینی بھی، جذبات کا عالم بھی اور ایک اچھی کمائی کی ترتیب بھی۔ مصنف نے منسل بادشاہوں کے حرم سرا کی فضا اور طرز معاشرت کا نقشہ بہت صحت اور کلمہ رسی کے ساتھ

لے اس سے زیادہ سوزوں پس نظر نہیں ہو سکتا تھا۔ ڈراما

موت میں نہیں معلوم ہوتے، بلکہ باغ اور چین، دریا کے کنار

جیسے کہ منسل واقعی تھے، ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ مجھوں میں۔

اپنی زندگی کو آراستہ کرنا جانتے ہیں اور وہ آرائش اور نفاست جو ہمارے تصور میں سیرامی ان بولیں بد مذمرہ زندگی کی ایک معمولی حقیقت ہے۔ منسل حرم سرا کے پرستان میں عشق کی داستانیں کوئی نرالی بات نہ ہوں گی، مگر انارکلی کا عشق کوئی معمولی جذبہ نہیں ہے۔ اس کا تیر تشدد اس طرح بھرپور اٹھتا ہے کہ محل اور باغ سب جگہ لگنے لگتے ہیں، اور کبھی کبھی اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ ہلکا کر چھوڑے گا، مگر شعلے کی چمک دم بھر کی ہے، وہ کچھ جلاتا نہیں، اپنی رونق دکھا کر کچھ جاتا ہے اور محل اور باغ شرمندہ ہو کر شام کے اندھیرے میں اپنا منہ چھپا لیتے ہیں۔

وہ جذبہ جس کا انارکلی ایک مجسمہ ہے ہر شاعر، داستان گو اور افسانہ نویس کا تہہ مشق رہا ہے اور نہ صرف ہمارے ادب میں بلکہ تمام دنیا میں عشق سے زیادہ فرسودہ کوئی مضمون نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جو رنگارنگی اس جذبے میں ہے، جو اثر اس کا ہر دل پر ہوتا ہے اور جو مختلف شکلیں یہ ہر طبیعت اور مذاق کے ساتھ اختیار کرتا ہے اس میں بہت صحت پیدا کر دیتی ہیں اور ہر عاشق کی طرح عشق کا ہر تصور بھی خود بخود ایک موجد ہو جاتا ہے۔ لیکن انارکلی کے عشق کی تصویر میں اصلیت کم اور رصیت زیادہ نظر آتی ہے جیسے ہمارے شاعر اپنے جذبہ عشق کی شدت ظاہر کرنے کے لئے بخود ہی اور محویت کی انتہا تک پہنچ جانے کا دعویٰ کرتے ہیں ویسے ہی انارکلی

حکایت ایسے رنگ میں دکھائی گئی ہے جو شاید ہی کسی انسان میں نظر آتا ہو۔ انسانی فطرت کے نزدیک حرکت ہوتی ہے اور عشق کے جذبے کی ایک حرکت کسی دوسری فطرت میں جو ہو جانے کی آئندہ بھی ہو جاتی ہے لیکن عشق کو محض جو ہو جانے کی خواہش ظاہر کرنا اور کسی انسان کو خالص عشق کا مجسمہ بنانا مبالغہ ہے۔ ممکن ہے یہ بعض لوگوں کو پسند آتا ہو، مگر جو لوگ انسانی سیرت کو اصلی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں انہیں یہ بے جا رنگ آمیزی معلوم ہوگی۔

اکبر کا طرز عمل بھی نفسیات کی رو سے ایک عمدہ سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ مصنف نے عورتوں سے ایسے سیاسی منصوبوں میں ڈوبا ہوا دکھایا ہے، اور جو ہمہ راہی رنگینی زندگی محض ایک دلچسپی ہے جس سے اس کے ٹھکانے دل سے کوئی قدر تفریح ہو جاتی ہے سلیم سے اس کو پوشکایت ہے وہ بجا ہے، لیکن وہ صرف عمل کی کمزوری اور ہمہ راہی دلچسپیوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اکبر کو شکایت سلیم کی فطرت سے ہونا چاہئے، اس کی استعداد کی کمی اور اس کے شوق کی گہرائی سے۔ محض انارکلی کی ایک گستاخی پر وہ اس قدر بگڑ جاتا ہے، حالانکہ ایسی حرکت ہمہ راہ میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی، جب مرد اور عورتیں سب شراب کے عادی تھے اور خود جہاں پناہ اپنے آباء و اجداد کی طرح خوار و غریبی کی داد دیا کرتے تھے سلیم کا انارکلی کو آزاد کرنے کی کوشش کرنا خصوصاً ایسے بھولے پن سے اسے بھی سزا کا سبب بننا خواہیے، مگر باب بیٹے میں ثابت ہوئی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ اکبر کا خصلہ انارکلی کو تباہ کر دیتا لیکن رقابت کا ڈیرا نہیں کٹی ہوئی نہیں ہے، اگر کہ مطلق معافی میں سست ہوتا اور اسے خواہ مخواہ اپنی طاقت استعمال کرنے کا شوق تائب بھی ہم سمجھ سکتے کہ اس نے انارکلی کو ایسی منگیوں میں کیونکہ طاقت کے ناجائز استعمال کی ہزاروں مثالیں تاریخ میں ادھارے دہانے میں ملتی ہیں لیکن اکبر کو انارکلی میں ایک نہایت روشن ضمیر مافیل دانا، مدبر کی صورت میں پس کیا گیا؟ اور وہ خبیانہ طرز عمل جو اس نے سلیم اور انارکلی کو جدا کرنے کے واسطے اختیار کیا اس کی سیرت کے باطل ظلمت ہوتا ہے۔ مصنف نے دیا ہے میں بیان کر دیا ہے کہ انارکلی کا قصبہ بنیاد ہے، مگر ڈرا میں حقیقت نگاری کا ایسا رنگ ہے کہ ڈراما کے پڑھنے والے کو تعین ہونے لگتا ہے کہ قصہ ضرور سچا ہو گا۔ ہم انشا پر از دل کوئی طرح پابند کرنا نہیں چاہتے، لیکن انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم جن لوگوں کی برائیاں بیان کر سکیں ان کی جعلی باتوں کو بھی یاد کرتے رہیں۔ ہماری موجودہ خلائی اور بے باکی جائے پیش عدول کی گہرائی اور ان کی سیرت کی خامیاں واضح کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ کچھ ان باتوں کی طرف بھی توجہ کرنا چاہئے جو ہمارے پیش روؤں کو اس وقت مصروف رکھتی تھیں جب شراب اور میث کی طلب ان کو دنیا سے غافل نہیں کر دیتی تھی۔

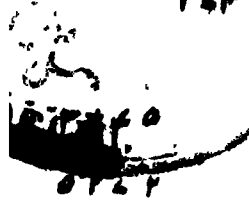
دنیا کی رفتار

ہندوستان

ہر دس برس میں ہندوستانیوں کا حال | یوں تو ہر ملک اور ہر دس برس کے لوگوں کو اپنے وطن اور اپنے گھر سے محبت
 ہوتی ہے لیکن ہندوستان کی قناعت پسند آبادی کو اپنے گھر اور
 محبت اور تعلق تھا کہ دس کو چھوڑ کر پردیس جانا برا اور
 رفتہ رفتہ ایسے سیاسی اور معاشی اسباب پیدا ہوتے گئے کہ انہی
 ملکوں کو آباد کرنے کے لئے ہندوستان میں بھرتی شروع کی
 سے معاہدے کے کاغذ پر انگوٹھا لگوا گیا اور سمجھا بھجا کر سمندر پار بھیج دیا گیا جہاں وہ سب رہا۔
 مختلف حصوں میں پر دسی ہندوستانیوں کی مردم شماری ۱۹۲۱ء لاکھ ہے جس میں سے تقریباً ۲۵
 لاکھ برطانوی نوآبادیات میں بس گئے اور باقی ایک لاکھ غیر برطانوی علاقوں میں بس گئے تفصیل حسب
 ذیل ہے۔

۱۔ جزیرہ سیلون (سنگا)	۹ لاکھ ۵۹ ہزار
۲۔ ملایا	۷ لاکھ
۳۔ ماریشس	۲ لاکھ ۸۱ ہزار
۴۔ جنوبی افریقہ	۱ لاکھ ۶۰ ہزار
۵۔ شرقی ڈاڈ	۱ لاکھ ۳۰ ہزار
۶۔ جزائر فیجی	۶۹ ہزار
۷۔ دیگر	۲۶ لاکھ
	۲۵ لاکھ ۲۵ ہزار

میزان



- ۱۔ بریتانیا متحدہ امریکہ
- ۲۔ بنگال
- ۳۔ جزائر شرق
- ۴۔ سرنگ

برطانوی طرز

۵۰ ہزار
۳۴ ہزار
تقریباً ایک لاکھ
میزان



ابتداء صرف مزدور پیشہ اور زراعت پیشہ طبقہ کے لوگ باہر گئے۔ لیکن اس کے بعد پھر گویا دروازہ کھل گیا اور تاجر، دستکار، منشی، وکیل، ڈاکٹر، غرض ہر پیشے کے لوگ بستر مواقع کی تلاش میں باہر جانے لگے، لیکن بد قسمتی سے اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگوں میں بیرون ملک جانے کا شوق اس زمانہ میں پیدا ہوا جب یورپ کے گورے آدمی ایشیا کے ”سیاہ فام انسانوں“ کو استعماری دولت اور محلات کی نظر سے دیکھتے تھے، چنانچہ جہاں جہاں ہندوستانیوں کا گزر ہوا ہر جگہ وہی آسمان وہی زمین، وہی پائندیاں، اقیانوسات اور نصیبات۔ قدرتنا شکایات پیدا ہوئیں اور اس لئے اور بھی زیادہ کہ ۲۶ لاکھ

یہ سب ۲۵ لاکھ ہندوستانی تھے جن میں ۱۰ لاکھ تھے جہاں آفتاب کبھی مغرب نہیں ہوتا ؟
 لیکن بدقسمتوں میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے ؟ حکومت ہند نے اپنی رعایا کی پردیس میں کوئی فکر کی اسلئے بھائی
 پلانٹ نے کبھی توجہ کی ۔ مقامی طور پر کچھ تو ہندوستانیوں کی اپنی سی وکوشش سے اور کچھ تنگ نظر فرنگیوں
 کے نقطہ نظر میں تبدیلی کی وجہ سے اکثر نوآبادیات میں حالات رو بہ اصلاح ہونے لگے اور اب کم از کم بھائی
 گوشتا ، ٹرینی واد ، جائیکا ، سیلون اور مارشس میں ہندوستانیوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا جاتا ہے ۔ لیکن
 بعض دیگر نوآبادیات میں ہندوستانیوں کی حالت بہت پریشان کن ہے اور ان کے ساتھ ہر طرح کی
 زیادتیاں کی جاتی ہیں تاکہ وہ کسی طرح اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں مثلاً ایک شہر اصوبے سے دوسرے
 شہر اصوبے میں سکونت نہیں تبدیل کر سکتے ، زمینات اور مکانات نہیں خرید سکتے ، کوئی کچی نسلوں سے
 وہاں آباد ہیں مگر حقوق شہریت نہیں ملتے ، حق تجارت بہت کم
 دوسری جگہ دوکان نہیں لگا سکتے ، مقررہ محلوں کے علاوہ
 میں صرف انھیں درجوں میں سفر کر سکتے ہیں جو ان کے لئے
 مزدوری وغیرہ کے لئے جو قوانین حکومت نے بنائے ہیں
 میں تعلیم نہیں حاصل کر سکتے وغیرہ وغیرہ ۔

جہاں تک ان شکایات کا تعلق ہے جنوبی افریقہ کی حکومت متحدہ کاروبہ ہندوستانیوں کے ساتھ
 سب سے زیادہ سزاوارتہ ہے ، جنگ سے قبل مائیکالانڈی نے کئی سال تک وہاں قیام کر کے ہندوستانیوں
 کی ان شکایات کو دور کرنے کی سعی وکوشش کی اور بالآخر مجبور ہو کر حکومت متحدہ کے خلاف متیہ گراہ کی
 جنگ شروع کی جس کا اہتمام ۱۹۱۲ء میں ”کانڈمی ایٹس“ مجبور ہو کر ۔ جنگ عظیم کے زمانے میں ۱۹۱۵ء
 اور ۱۹۱۸ء کی ”اسپرل وار کانفرنس“ میں یہ مسئلہ کئی مرتبہ زیر بحث آیا اور مناسب قراردادیں متحدہ کی
 مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا ۔ ۱۹۲۲ء میں حکومت متحدہ جنوبی افریقہ نے کئی مسودات قانون اپنی پارلیمنٹ
 میں پیش کئے جس کا مقصد سر ہندوستانیوں کی تجارت اور کاروبار کا تباہ کرنا تھا ۔ حالات بہت نازک
 ہوتے جا رہے تھے اس لئے مئی ۱۹۲۲ء میں حکومت ہند نے سر جانج پیڈمین کی سرکردگی میں ایک وفد
 حکومت متحدہ سے گفت و شنید کے لئے جنوبی افریقہ بھیجا اور یہ طے پایا کہ دسمبر ۱۹۲۲ء میں دونوں حکومتوں

کی ایک کانفرنس انگریزوں میں متحد ہو اور اس کانفرنس سے قبل جنوبی افریقہ کا ایک وفد ہندوستان آگریاں کے
 حالات کا پتہ خود معاملہ کرے۔ چنانچہ کانفرنس ہوئی اور گفت و شنید کے بعد ایک سمجھوتہ ہوا کہ حکومت جنوبی
 افریقہ منہجی و زندگی اختیار کرنے پر ہر بات پر طے سے اصرار کر سکتی ہے اور ہندوستانی ایسا کرنا چاہیں گے
 ان کی اس معاملہ میں امداد کو باہمی دونوں حکومتوں کا فرض ہے اور جو لوگ افریقہ چھوڑنا چاہیں گے ان کو
 دوسرے ملک میں آباد کرنے کے لئے ہر قسم کی امداد دونوں حکومتوں کی طرف سے دیکھائے گی۔ تین سال
 کی مسلسل غیر جانبداری کے بعد واپسی کا حق نہ ہو گا لیکن اگر اس سے قبل واپس آنا چاہیں تو جو رقم حکومت نے
 ان پر صرف کی ہے وہ ادا کرنا پڑے گی جو سودا پارلیمنٹ میں ہندوستانیوں کے متعلق پیش کئے گئے
 میں ان پر چھ بار بار واپسی نہ کی جائے گی حکومت ہند اپنا ایک ایجنٹ معاملات کی نگرانی اور دونوں حکومتوں
 کے درمیان تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے مقرر کرے گی۔

چونکہ میں سمجھوتے کے مطابق مشر شاستری حکومت ہند کی طرف سے افریقہ میں ایجنٹ
 مقرر کئے گئے اور ان کے بعد ان قیام میں حالات قابل اطمینان رہے لیکن موصوف کو قبل از وقت
 استعفیٰ دینا پڑا۔ ان کے بعد مشر رڈی ایجنٹ مقرر ہو گئے۔ مشر رڈی کو بھی حالات کی وجہ سے رخصت
 کر دیا۔ اس میں ہندوستان واپس آنا پڑا اور آپ کو اخیر موجودگی میں حکومت متحدہ نے فرنگیوں
 کی درخواست پر یہ فیصلہ کیا کہ ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کی جائیداد غیر منقولہ کی ملکیت اور قبضہ وغیرہ کے
 متعلق قواعد و ضوابط پر نظر ثانی کی جائے۔ اس فیصلے سے ہندوستانیوں کو قدرتنا اندیشہ پیدا ہوا حکومت ہند
 نے کوشش کی کہ یہ معاملہ کچھ عرصے کے لئے ملتوی ہو جائے مگر حکومت متحدہ نے کسی طرح منظور کیا۔
 مسئلہ حقیقتی کمیٹی سے گزر کر پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہو گیا لیکن بالآخر حکومت ہند کے اصرار سے
 پارلیمنٹ کے دوسرے اجلاس کے لئے ملتوی کر دیا گیا اور یہ مسئلہ پایاکہ مسئلہ کے سمجھوتے کے مطابق
 حکومت ہند اور حکومت متحدہ کے نمائندوں کی ایک کانفرنس پر منعقد ہوا اور سر فو تام مسائل پر غور کیا
 جائے چنانچہ اس سال جنوری اور فروری کے مہینے میں کانفرنس ہوئی۔ ہندوستان کی طرف سے
 مہر فیصل حسین مشر شاستری، مسر نیڈو اور مشر باجپی بیجے گئے۔ حسب ذیل مختلف فیہ مسائل تھے جن پر
 بالآخر سمجھوتہ ہو گیا۔

(۱۱) جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو بالخصوص ہندوستان واپس بھیجنے کے متعلق
 چوتھو سلسلے میں ہوا اتفاقہ قابل عمل ہے۔ اول تو۔ منی صدی ہندوستانی
 افریقی میں ہندوستان اب ان کے لئے ایک جی ملک ہے، وہاں کی آب و
 ہوا ان کے موافق نہیں اس لئے وہ ہندوستان واپس جانا نہیں چاہتے۔ اس کے
 علاوہ خود ہندوستان میں کثرت آبادی کی وجہ سے مزید دشواریاں ہیں، لہذا ایک
 کمیٹی مقرر کی جائے جو دنیا کے دوسرے غیر آباد علاقوں میں تحقیق حالات کرے اور
 اگر آب و ہوا مناسب ہو تو افریقی ہندوستانیوں کو وہاں آباد کرنے کی کوشش
 کی جائے۔ اس کمیٹی میں افریقہ انڈین کانگریس کا بھی ایک نمندہ ہوگا۔
 (۱۲) مغربی طرز زندگی کو اختیار کرانے کے لئے
 کا جو وعدہ حکومت متحدہ نے سلسلے کے عہدے کے عہدے

اور آل پر عمل بھی کرے۔

(۱۳) ٹرانسوال میں حقیقت اراضی کے متعلق جو سودہ قانون ایری پاس کیا گیا
 تھا اس پر بحث کرنے کے لئے جنوبی افریقہ کے نمائندے تیار نہ تھے وہاں کی فرنگی
 آبادی کو اس پر سخت اعتراض تھا کہ جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ کے معاملات میں
 حکومت ہند کو اس طرح دخل دیے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لئے یہ سٹے پیار
 افریقی نمائندے ڈاکٹر ملان ہندوستانی نمائندوں کے خیالات مجلس مقبہ کے سامنے
 پیش کر دیں اور کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ خود مجوزہ سودہ میں ضروری ترمیم
 کر دیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ کانفرنس کے سمجھوتے کا دار و مدار
 اسی پر ہے کہ اس خاص مسئلہ میں ہندوستانی نمائندوں کی تجاویز کو مسترد نہ کیا جائے
 اس مسئلہ پر سب سے زیادہ اختلافات تھے لیکن بالآخر اس پر بھی سمجھوتہ ہو گیا جو بحال
 موجودہ کافی سمجھا جاتا ہے۔

حکومت ہند کا ایک نمندہ آئندہ بھی بحیثیت ایجنٹ کے جنوبی افریقہ میں رہے گا۔ مشرقی کی
 میعاد ختم ہو گئی ہے، لیکن ان کے جانشین کا تقرار بھی تک عمل میں نہیں آیا ہے۔

اس کی وجہ سے اسے کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی ہے۔ لیکن غیر بنیاد پرستی کے ترجموں کی وجہ سے
 از پیشہ ہے کہ بچے گھروں کی طرح سے یکجہری رہیں۔ یہی رویہ کی بگڑی میں داخل دیا جائے گا۔ ہندوستان میں
 نئی ذہن اور سوچ ذات کے اختلافات پر ترجموں کو جی آتی ہے لیکن خود ان کی بدترین کیفیت ماہ
 نسل ارتکاب کے تعصب کا جو حال ہے وہ آج بھی جنوبی افریقہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ہندوستانیوں
 کو برطانوی پارلیمنٹ سے بجا طور پر شکایت ہے کہ ہندوستان میں خوب بات پر صوبے کے گورنر سے
 لیکر ملک منظم تک سب اپنے "تصدیق" اور تدریک کے اختیارات استعمال کرتے ہیں لیکن گو یہ سب امتیازات
 دیگر نوآبادیات کے متعلق بھی پارلیمنٹ اور ملک منظم کو حاصل ہیں لیکن آج تک کسی ان کا استعمال ہندوستان
 کے حقوق کے تحفظ کے لئے نہیں کیا گیا حالانکہ امپیرل کانفرنس کی قرارداد کے صریحاً خلاف ہندوستان
 کے ساتھ طرح طرح کی قانونی اور غیر قانونی زیادتیاں کی جاتی ہیں۔

اسلامی ممالک

حزب فلسطین | ۱۹۴۱ء کی روئید اور مردم شماری کی روئے فلسطین میں مسلم اور غیر مسلم آبادی کے شمارہ

اصداد ہیں۔

۷۵۹۹۵۲

مسلمان

۱۷۵۰۰۶

یہود

۹۰۶۰۷

عیسائی

۱۹۴۲ء کی نسبت یہود کی تعداد اب دگنی ہو گئی ہے (یعنی ۸۲۷۹۴ سے ۱۷۵۰۰۶)

لیکن یہودیوں کے لئے یہ امر کچھ بہت زیادہ قابل اطمینان نہیں اس لئے کہ گزشتہ ۹ سال میں مسلمانوں
 کی تعداد میں جو اضافہ ہوا ہے وہ یہود کی کل تعداد کے تقریباً برابر ہے (یہود کی کل تعداد ۱۷۵۰۰۶
 ہے۔ ۱۹۴۲ء میں مسلمانوں کی تعداد ۵۹۰۸۹۰ تھی اور اب ۷۵۹۹۵۲ ہے۔ گویا ان کی تعداد

میں ۱۶۹۰۶۲ کا اضافہ ہوا ہے)۔ لہذا محض آبادی کے مسئلے میں مسلمانوں کو یہود سے کوئی خطرہ نہیں

ہو سکتا۔ فلسطین کی کل آبادی ۱۰۳۵۱۵۲ ہے جس میں سے صرف بیت المقدس میں ۹۰۵۲۶

میں نے یہ سچا خیال رکھا کہ فلسطین کو یہود کا "قومی وطن بنانے میں
 کسی طرح کی بھی مدد نہیں دی جائے گی۔ فلسطین اپنے بہت و استقلال کی بدولت برطانوی شہنشاہیت
 کی تمام غصوبہ بازوں کا خاتمہ کر دیں گے۔

میں فلسطین میں ایک تازہ خبر آئی ہے کہ عرب رہنماؤں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ فلسطین کو
 دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان میں سے ایک میں مسلمانوں اور دوسرے میں یہود کو حق خود مختاری
 حاصل ہو۔ پھر ان دونوں حصوں کو مل کر ایک متحدہ ریاست قائم کی جائے۔ یہودیوں اس
 میں شامل ہوں اور اگر اس تجویز پر کامیابی کے ساتھ عمل ہو سکے
 سے جو عراق کو حاصل ہے انجمن اقوام میں شرکت حاصل کر
 کہ یہود کا ایک فرقہ اس تجویز کا سخت مخالف ہے۔ اس نے

کہا ہے کہ حکومت برطانیہ نے موجودہ شہنشاہی کے لئے یہودیوں
 کیوں یہودی ہے۔ ظاہر ہے کہ طرفداران صیونیت جو تمام فلسطین پر قبضہ حاصل کرنے کی آرزو سے
 ہیں اس طرح کو یہودی کہہ سکتے ہیں کہ ان کے خانہ ساز "وطن" کا ایک حصہ صیونی دہتر دس
 آزاد ہو جائے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ فلسطین برطانوی انتداب کی بجائے براہ راست انجمن اقوام کے زیر حکومت
 آجائے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں نو لاکھ آبادی میں سات لاکھ کے مقابلے پر یہودی ڈیڑھ لاکھ یہودی
 شعوس دے گئے ہوں مٹی بھر مینیوں کی خاطر ملک کے اصلی باشندوں کو حق ملکیت سے محروم کرنے
 کی تجویز پیش کرنا مغربی دستور و سیاست و فتنہ ہائے رعایات و حقوق کے ماتحت ہی ممکن
 ہے۔ البتہ یہ خیال کہ سیاستیں مصر و ہندوستان تجزیہ فلسطین کی حمایت کر رہے ہیں سر اسرئیل بن جوریون
 کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں لیکن مسلمانان ہندوستان جن کی ہر جماعت آزادی و مقامات
 مقدسہ کا حلف اٹھا چکی ہے کیوں کر گوارا کر سکتے ہیں کہ وہ کسی ایسی تجویز پر رضا و کریں فلسطین کے حقیقی
 استقلال اور حریت کے منافی ہو۔

ملک اسلامی کی مالی حالت | اس وقت دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جو مالی دشواریوں میں

موجودہ ترکیہ :- ہم نے جامعہ کے کسی گزشتہ پرچے میں عرض کیا تھا کہ حکومت انگریزوں کی تہاوت
 افسردہ کی صنعت کی دنیا کو روکنے کے لئے اس پر خاص پابندیاں عائد کر رہی ہے۔ حکومت ہر دو ماہ
 کے لئے درآمد کی مقدار مقرر کر دیتی ہے۔ اس تدبیر سے خاطر خواہ نتائج منتظر ہوئے ہیں۔ یہی صنومات
 کی آمد پہلے کی نسبت بہت کم ہو گئی ہے اور تین سو روپیہ افسر جو اپنے ہاں بچوں کی تربیت ترکہ میں مقیم تھے
 اب واپس جا رہے ہیں۔

ایران :- ایران اور روس کے تجارتی تعلقات کے متعلق ہم نے جامعہ کی کسی پہلی اشاعت میں
 ایک طویل تذکرہ سیر و قلم کیا تھا۔ اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ دولت ایران نے خارجی تجارت کے
 تباہ کن اثرات کو روکنے کے لئے یہ قانون بنا دیا ہے کہ ہر سفر کار
 مالی ایران میں نہیں آسکتا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ
 عمل نہیں کر سکی۔ امریکہ کو اس پابندی سے آزاد کر دیا گیا۔
 مقابلے میں۔ افسردہ کی کمی ہو گئی ہے لیکن اگر قیمت کاغذیں
 بچھ جاتا ہے۔

مصر :- مصر کی حالت ایران کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ سال نو کا مصری میزانیہ اگرچہ ۱۰ لکھ
 اٹھارہ کروڑ اسٹرنک پر قائم رہا ہے لیکن حکومت کے پاس ۵ کروڑ اسٹرنک بطور زر محفوظ موجود ہے۔
 روٹی کی برآمد کی مقدار بھی سال گزشتہ کی نسبت تیس فی صدی بڑھ گئی ہے۔

عراق :- ذوری پاشا وزیر اعظم کے اس اعلان کے مطابق جو عراق کے تیل کی برآمد کے متعلق تھا
 اور جس کا تذکرہ جامعہ کے پچھلے نمبر میں آچکا ہے حکومت عراق اور ایک انگریزی کمپنی کے درمیان ایک
 معاہدہ مرتب ہوا ہے اور اس کے ماتحت جو رعایت حکومت برطانیہ کو دی گئی ہے وہیں بین الاقوامی مفاد کا بھی
 خیال رکھا گیا ہے۔ کہنا جاتا ہے کہ جرمنی، اٹلی اور فرانس اس معاہدے سے بے تعلق نہیں ہوں گے کمپنی
 کو ۷ برس تک تیل کی برآمد کا اجارہ حاصل ہو گا اور اس کے لئے دریائے دجلہ کے مغربی کنارے دو سو
 مربع میل کا رقبہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔

عرب :- حکومت نجد و حجاز کے متعلق ایک سو سے پہنچے مشورتی کہ سلطان ابن سعود دولت
 برطانیہ سے کچھ روپیہ قرض لینا چاہتے ہیں جس کے عوض میں انگریزوں کو حجاز میں خاص مراعات حاصل

میں نے جو یہ دعویٰ کیا ہے اس کی گنجی سیاست کے موافق میں اس نے سلطان کو بلایا اور غیر سے
 صاحب سے شکایت ہے۔ حکومت نے اسے اس خبر کی تردید کر دی ہے لیکن جو سلطان سلطان ہیں اس
 میں ان کے خدشوں کی وجہ سے شک ہے اس کا آخری حصہ بلادی جو میں نہیں تیکھا ہوا ہے کہ
 حکومت نے یہ کہ کسی منہی قوم کے کسی رہنما مسلمان سے قرض لینے کی ذمہ داری ہے۔ اگر بلا ملک
 کی حکومت واقعی خیرگی کے ساتھ اس جو بزرگوار رہی ہے تو ہمیں غموس کے ساتھ کن پڑ گیا کہ بلا ملک
 اس کے ملک سے ہے سوائے دنیائے باہل مجھے میں اور یہ کوئی بہت اچھی بات نہیں اس لئے کہ اصل
 تو چندی رہنما میں ایسے مسلمانوں کا وجود عقائد جو کسی حکومت کو قرض دیکیں اور اگر وہ بھی تو اس کی
 یکساں علی بن الاقوامی خود داریوں سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اگر اس قسم کا کوئی مسلمان واقعی دنیا میں ہو جو
 تو اس کی کثافت کا سراہا نہ ہو جیسا عبدالعزیز ابن سعود سلطان نجد و ملحقہ کے سر ہو گا اور اس کے لئے مسلمان
 عالم جلالت کاب کو جس قدر بھی مبارک باد دیں کم ہے۔

خدمت مسافت افغانستان کی تعلیمی روئیداد | جدیدہ اصلاح کی تازہ اشاعتوں سے معلوم ہوا ہے کہ شروع
 میں پڑیس مدارس کابل کے تقسیم افغانیات کی رقم نہایت وجوم و حام سے منائی گئی۔ اس موقع پر خود اعلیٰ حضرت
 شہرہ نظامی تفسیر تفسیر تشریف رکھتے تھے اور مدوح کے علاوہ وزیر معارف اور دوسرے اعیان و مساند
 مملکت بھی موجود تھے۔ اول والی بال کا ایک ہوا دکتب المانی اور امانیہ کے درمیان) پھر تلاوت قرآن کے
 بعد آٹھ گھنٹہ کتب حیدریہ نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ایک سپانسا مہیش کیا جس کی ابتدا
 ان اشعار سے ہوتی ہے۔

ہزار شکر کہ از طالع تکون سرجام	مشرقیم بدر بارشاه با اکرام
شعہ کہ گشت ز تدبیر ناجی ملت	ز سبیل حادثہ انقلاب فتنہ خرام
ز سچی اوست کہ ایلائے ملک دولت شد	ز فرض اوست ہمیں استخوان مہوام
ہمیں زمین قدوم مبارکش از سر	گستہ رشتہ تا مین خلق یافت نظام
اگرچہ رہ ترقی از دست جملہ امور	نمودہ سوئے مصلحت سے قوتہ تمام
بجاست فرض کہ دانیم قدر ایں نعمت	ز روئے صدق تا نیم شکر ایں انعام

حکومت کی طرف سے کے بعد علی گڑھ نے انعامات تقسیم کئے اور موقعہ کی مناسبت کے لئے ایک تقریر فرمائی۔

وزیر معارف کی روئیداد کا مقصد یہ ہے کہ سب گزشتہ حکومت انڈیا نے تین لاکھ روپے اضافی تعلیم پر صرف کیا۔ دارالامان کی اراضی اور باغات سے جو آمدنی حاصل ہوئی ہے (اور بے تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے) اس کے علاوہ ہے۔ تعلیمی حالت با مقبار معلمین و معلمین دن بدن رو بہ اصلاح ہے۔ ہجرت کی تعداد بڑھ گئی ہے اور بہتر معلموں کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ انقلاب کے زمانے میں جو خدمات منہدم ہو گئی تھیں ان کی از سر نو مرمت کر لی گئی ہے۔ بعض مدارس میں اضافہ ہوا ہے اور حتی الوسع ان کی تزئین و آرائش کی کوشش کی گئی ہے۔ سامان تعمیر کے علاوہ نصاب میں شعبہ ہائے نجاری و معماری کو بڑھا دیا گیا ہے۔ مکتب زراعت اور مکتب فطرس، بدعشاں، ہرات، مزار شریف اور مکتب مشرقی میر سمیت مشرقی میں ایک اور مدرسہ نجم المدارس کے نام۔

بے معلموں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ بوائے اسکاؤٹس یعنی کشاں، ان سربین، سب سب، پوری ہے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے مدارس کے علاوہ تمام ساجدیں تعلیم کا انتظام ہے۔ وزارت معارف نے صیفہ، تالیف و اشاعت سے بھی غفلت نہیں برتی۔ صیفہ مذکور نے اس وقت تک ۲۴ کتابیں شائع کی ہیں۔ بیرونی مالک میں جو افغان طلباء مختلف مضامین مثلاً زراعت، ہندی، تعمیرات، ریڈیو، تاریخی، طب، ہونڈا سازی، آبرسانی، عسکریات وغیرہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کی تعداد ۴۴ ہے۔ علی گڑھ شہر بار غازی نے اس روئیداد پر اطمینان کا اظہار کیا لیکن وزارت معارف کو ہمت کی کہ ابھی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے اسے اپنی ساعی میں اور زیادہ اجتہاد اور سرگرمی سے کام لینا پڑیگا۔ جلالت آباد نے یہ بھی فرمایا کہ ان کا تعلیمی نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ افغان طلباء مذہب کے پابند اور خدمت ملک و ملت کی آواز دے سکیں۔

ممالک غیر

بھارت میں کو معلوم ہے کہ برطانیہ نے ستمبر گزشتہ میں پونڈ اور سونے کا تعلق توڑا، پھر دسمبر سے اکثر اشیاء کی درآمد پر پرمیٹیں وصول لگائیں۔ لیکن ان دونوں غیر معمولی معاشی کارروائیوں کے جو نتائج نظری اعتبار سے رہنا چاہئے تھے وہ ہنوز وضاحت کے ساتھ ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ ان دونوں باتوں کا نتیجہ مہیا کیا ہے تاکہ انگلستان میں درآمد اشیاء میں مستندہ کمی ہو، برآمد اشیاء خوب ہٹے اور ملک میں قیمتیں چڑھیں اور تجارت کی کساد بازاری دور ہو۔ لیکن واقعی صورت حال نے اس نظری نقشہ کا پورا پورا ساتھ نہیں دیا۔ شہر میں پونڈ کو سونے سے جدا کرنے کا نتیجہ یہ تو ہوا کہ پونڈ کی قدر میں با اعتبار از کوئی ایک تہائی کمی کی ہو گئی لیکن شوک فروشی کی قیمتیں ستمبر میں اگر ۹۹ تھیں تو ستمبر میں ۱۰۶ انگ بڑھیں اور دسمبر میں پھر کچھ گھٹ کر ۱۰۶ سے کم ہو گئیں۔ اجرتیں ۲۶ ۹۹ سے گھٹ کر ۲۶ ۹۹ رہ گئیں۔ قیمتوں میں بھی جتنی امید تھی اتنا اضافہ نہیں ہوا۔ تجارت پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ ۱۹۳۱ء کے پہلے نصف میں انگلستان کی اوسط ماہوار درآمد ۶۹ ملین پونڈ تھی، اور پونڈ کے سونے سے جدا ہونے کے بعد آخری تین مہینوں میں ۶۶ ملین پونڈ۔ البتہ جنوری میں پرمیٹیں وصول لگنے کے بعد یکایک درآمد میں کوئی ۱۱ ملین پونڈ کی کمی ہوئی۔ لیکن ایک تو جنوری ستمبر میں بھی کوئی ۵ ملین پونڈ کی کمی ہوئی تھی، دوسرے حاصل درآمد کی خبردار کوٹوں نے جلد بحال کر لیا تھا اس لئے جنوری ستمبر میں آنے والا مال دراصل نومبر اور دسمبر میں انگلستان پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ اعداد کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱ ملین میں سے صرف ۵ ملین کی کمی ان اشیاء کی درآمد میں ہوئی ہے جن پر پرمیٹیں وصول لگایا گیا ہے باقی کی دوسری چیزوں کی ہے۔ ستمبر کے بعد کی برآمد کے اعداد سے بھی متوقع نتائج کا انکار نہیں ہوتا۔ وہ اعداد یہ ہیں:-

سنہ	اکتوبر	نومبر	دسمبر	جنوری
برآمد ۱۹۳۰-۳۱ء (ملین پونڈ)	۵۴۱	۵۰۵	۴۳۶	۴۳۱
برآمد ۱۹۳۱-۳۲ء (ملین پونڈ)	۳۸۱	۳۶۵	۳۶۱	۳۶۲

ہم سچ کہہ رہے ہیں کہ انگلستان کی مالی حالت کے جلد درست ہو جانے کی توقع کچھ ایسے
کو کسی غرض کے لئے مستعدہ قومی حکومت قائم کی گئی تھی۔ اور جب پونڈ کو سونے سے جدا کر کے اور آزاد
تہذیب کی روایتی راہ کو چھوڑ کر بھی یہ اہم مقصد حاصل نہ ہوا تو غالباً اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ قومی حکومت
اپنی موجودہ شکل میں زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے چنانچہ حال ہی میں پارلیمنٹ کی ایک جگہ پر مزدور جماعت
کے ایک رکن کا انتخاب ہوا دیتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر بدلنے والا ہے۔

موجودہ وزارت قومی میں اشتراک عمل کے امکانات زیادہ دن تک چلتے نظر نہیں آتے۔ خود
وزیر اعظم مسٹر میکڈونلڈ کی حالت بہت قابل رحم ہے۔ یہ نام کو وزیر اعظم ہیں لیکن اپنے دس سے زائد وزیروں
جماعت ان کے ساتھ مخالفت کا برتاؤ کر رہی ہے مثلاً جنوری میں وزیر اعظم نے کہا کہ اس رفاقت میں لیبر پارٹی کو چھوڑا تھا۔ اٹارنی جنرل
کے اس رفاقت میں لیبر پارٹی کو چھوڑا تھا۔ اٹارنی جنرل
انہیں عام انتخاب میں شکست ہو گئی تھی۔ عام دستور کے تحت

ایسی جگہ خالی کر دینی چاہئے تھی جس پر ان کا انتخاب یقینی ہوتا۔
کنزرویٹو حامس انشپ کو اٹارنی جنرل بنایا گیا اور ان کی جگہ خالی ہونی اس پر بھی ایب سٹور۔ یہ
سرفریک مری مین بھیجے گئے۔ پھر اپنی محاصل کے قانون کے بارے میں بہت کچھ اختلافات رہے اور
وزارت برطانوی کی متحدہ ذمہ داری کا مسلک سپرد طاق نیاں کیا گیا۔ اور برطانوی وزارت نے برطانوی
وزارت کے پیش کردہ قانون کے خلاف پارلیمنٹ میں تقریریں کیں۔ ہندوستان اور آئرستان کے مسائل
کے متعلق بھی اس قدر مختلف خیالات جماعتوں کا باہمی تعاون زیادہ قریب تیار نہیں ہے۔

جب وزارت کے باہمی تعاون کا یہ حال ہو اور ان کی تدابیر قوم کی مالی حالت کو بہتر بنانے میں
داخل نتائج پیدا نہ کر سکیں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر آئندہ ۶ مہینے کے اندر اندر موجودہ وزارت
ٹوٹے اور حکومت کی تشکیل نو کے سلسلہ سے انگلستان کے مدبر دوچار ہوں۔

آئرستان | ڈی ولیر کے انتخاب پر پہلی اشاعت میں کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس انتخاب عام سے پہلے آئرستانی
ڈیل (آئرستانی پارلیمنٹ) میں نشستوں کی تقسیم یوں تھی کہ ۶۵ کاسگریو وزیر اعظم کی پارٹی کے اراکین تھے
۱۵۰ کی حمایت میں ۱۲ غیر جانبدار، ۶ کسان، اور ۲ غیر جانبدار مزدور جماعت کے اراکین تھے کل ۸۵۔

میں سے مل کر کہ پیش میں کے ہم خیال ہیں حکومت قائم کر سکیں۔ اگر انتہا پسند اشتراکیوں نے اپنے تمام عدس کے غلط احوال پسندوں کا ساتھ دیا تب تو بیکسپر تا میں موجودہ حکومت قائم رہ سکتی ہے ورنہ اور کوئی صورت نہیں۔

اگر اس وقت پر شا میں قومی اشتراکی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر پر شا اور مرکزی حکومت میں بے حد گیوں کا پیدا ہونا لازمی ہے اور کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر جرنی کے وزیر اعظم ہر پوینٹنگ کو مجبوراً مرکزی مجلس قانون ساز کے بھی نئے انتخابات کرانا پڑیں۔ نئے انتخابات کے جینی طور پر سنی ہوں گے قومی اشتراکیوں کی کامیابی۔ اور قومی اشتراکیوں کی کامیابی کے سنی ہوں گے ایک طرف فرانس اور دوسرے ممالک سے ناجاتی اور دوسری طرف اندرون ملک میں نظام جمہوری کی تخریب۔ مگر یہ صرف اس صورت میں ہے جب یہ جماعت اپنے ذمہ دار آج قومی اشتراکی کر رہے ہیں ان کا پورا کرنا قدرتی ناممکنات۔ جماعت کا اس کا سامنا ضروری ہے اور اس کی رسوائی کے۔ جرنی کی جو موجودہ حالت ہے اس میں قدرتی طور پر انتہا پسند اشتراکی یا پھر کیونٹ !

چین و جاپان | جیسا کہ پہلے مینہ لکھا جا چکا ہے جاپان نے تنگھائی کے علاقہ میں تو انجمن اقوام کی قرارداد کے مطابق جنگی کارروائیاں بند کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن منچو یا پر اپنے اثر میں ذرا سی کمی بھی اسے گوارا نہیں۔ جاپان نے ایک خود مختار منچوری حکومت کا اعلان کر دیا ہے اور منزول شاہ چین کو جس کی حیثیت شاہ شہر نچ سے زیادہ نہیں صدر جمہوریہ بنا کر خود اس ملک پر حکمران ہے۔

امریکہ اور دول یورپ اس صورت حال کو پسند نہیں کرتے مگر جاپان انہیں کی منت پر تو چل رہا ہے اس لئے تاپسندیدگی کے اظہار میں زور کہاں سے آئے؟ چین کی تقسیم کا منصوبہ جاپان سے پہلے دول یورپ نے بنایا تھا۔ کبھی مراعات معاشی کی شکل میں، کبھی دو فائدہ صوبوں مثلاً تبت اور منگولیا پر تنوق کی صورت میں، کہیں ٹھیکوں کے نام سے، کہیں حقانے اثر کے دھوپ میں۔ تعلق کی بات تھی کہ جاپان کو اس تقسیم میں روس کے وارث کی حیثیت سے حصہ ملا اور منچو یا کو جاپان کی

تاریخی بتانے کا منصوبہ دراصل جاپان کو اسی تقسیم کے پروگرام کے ایک حصہ کی تکمیل ہے۔
 مگر یہ اس کی سخت مخالفت کر رہا ہے اگرچہ سٹیشن ۱۹ میں کو لیبا سے ہٹا دینا کی نیت میں
 ریاستہائے متحدہ کا جو رویہ رہا تھا اسے جاپان بطور نظیر پیش کرتا ہے۔ انگریز اس نظیر کو ورنی بتاتے
 ہیں مگر سچ یہ ہے کہ نیت کے متعلق انگریزوں کے جو منصوبے ہیں وہ اس باب میں ان کے لئے نیا
 ورنی ہیں گے!

روس نے بھی پنجوبائی کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اگرچہ چینی مشرقی ریلوے کے چینی صدر
 تو کو جب جاپانیوں نے اس سے سوال دیا کہ اس نے نئی حکومت کے احکام نہ ماننے تو روس نے اسکی
 بغاوتی کو منظور کر لیا۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ فوجی نقل و حرکت کے سلسلہ میں روس کو احتجاج کا موقع
 ملا مگر وہ خاموش رہا۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ روس کو پنجوبائی میں جاپان کا اس درجہ تسلط نہیں بھاتا۔
 شروع امرج میں روسی حکومت کے سرکاری اخبار نے دو دستاویزیں شائع کیں جن کے متعلق خیال ہے
 کہ ممتاز جاپانی سپہ سالاروں نے تیار کی تھیں اور جن میں روسی علاقہ پر حملہ آور ہونے کے منصوبوں کی
 تفصیل ہے۔ اس اخبار نے پھر ایک اقتصادی لکھا کہ روس ہر جہد کہ غیر جانبدار رہتا چاہتا ہے لیکن اگر
 اس کے خلاف یہ منصوبے بنائے گئے تو لڑنے پر بھی آمادہ ہے۔ یہ مضمون تمام روس میں لاسکی کے ذریعہ
 پھیلا یا گیا اور تمام روسی اخباروں نے اسے شائع کیا۔ اس کے بعد سے پنجوبائی سرحد کے قریب روسی
 فوجیں جمع ہو رہی ہیں اور چونکہ "مشرق بعید کی ریلوے" کے سلسلہ میں روس کے اغراض جاپان سے
 ٹکراتے ہیں اور اورادھر جاپان کا فوجی وجود سے ولاڈی واسٹک پر دانت ہے اس لئے ممکن ہے کہ
 عرصہ بعد مخالفت کے یہ شراے جنگ کی شکل میں ظاہر ہوں۔

شذرات

اردو اکادمی کا جلسہ جو پچھلے مہینے منعقد ہوا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دو جلسے ہوسے پہلا بجے شام سے ۹ بجے تک دوسرا بجے سے ۱۱ بجے تک۔ حاضرین کی تعداد اس مرتبہ پچھلے دو جلسوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ باہر سے بھی پہلے سے زیادہ لوگ آئے تھے اور دہلی کے اہل ذوق بھی بہت کثرت سے موجود تھے۔

پہلے جلسے میں مولانا اسلم جیرا چوری نے ”منہ کرتا“ سے ایک دلچسپ مقالہ پڑھا جس کا نصف حصہ اس پرچے کے جلسے کی صدارت مولانا محمد سورتی صاحب کرنے والے تھے۔ لے جانا پڑا۔ جن اتفاق سے ان کے مایہ ناز شاگرد ڈاکٹر بہ علم اسلامی کی ڈگری لے کر آئے ہیں موجود تھے اور وہی جناب شیخ اباسملی جو یہ سب سب بنائے گئے۔ فاضل مقرر کی تقریر ختم ہونے کے بعد جناب صدر نے ایک مختصر تقریر میں موضوع کلام پر مزید روشنی ڈالی اور جلسہ دونوں حضرات کے شکریے پر ختم ہوا۔

پہلے جلسے کے بعد کسی قدر وقفے سے دوسرا جلسہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ ”ہندوستانی یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم اجتماعی اور انفرادی دونوں پہلوؤں سے صحیح نشوونما میں مدد دینے کے بجائے اس میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔“ اجتماعی حیثیت سے یونیورسٹی کا فرض یہ ہے کہ قومی تمدن اور قومی روایات کو محفوظ رکھے، ان میں زندہ رکھے اور ضرورت کے مطابق تجدید اور اصلاح کرے، تخلیقی قوت سے کام لے کر ان کی حدود کو وسعت دے اور یہ سارا خزانہ آئینہ نسلوں کے سپرد کر دے۔ مگر ہماری یونیورسٹیاں قومی تمدن اور قومی روایات کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتیں۔ اور اگر کرتی بھی ہیں تو اسے حفاظت کے لائق نہیں بلکہ مٹانے کے لائق سمجھتی ہیں۔

کے قابل تھی۔ انھوں نے مذہب کو جو قوم خصوصاً ہندوستانی قوم کی زندگی و تہذیب کا مرکز و محور ہے اسے مٹانے سے خارج کر دیا ہے۔ انھوں نے ملکی زبانوں اور ان کے ادب کو اپنی منزل میں بار نہیں دیا اور اگر دیا بھی تو اتنی ذلت و حقارت کے ساتھ کہ اپنی ذات والے اچھوتوں کی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ہندوؤں کے ملکی غرضوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ محض مغربی علوم کو پڑھنے اور پڑھانے کے قابل سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مغربی تعلیمی اور تعلیمی طور پر ملکی تعلیم و تہذیب کو ان سے اتنا بھی توڑ دیا کہ جدید علوم کو اپنے ملک کی زبانوں میں منتقل کر دیتے تاکہ لوگ عام طور پر ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ سیاسی آزادی اور معاشرتی اور معاشی اصلاح کی کوششوں میں رہنمائی کرنا ایک طرف انھوں نے ہمیشہ باب حکومت کے اشارے سے ان کوششوں کی مخالفت کی اور انھیں بے جا اور مضرت بت کرنے کے لئے منطقی کے گے پر چھری پھیری۔

مغربی ہندو سے دیکھ کر تو یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ نوجوانوں کے دل و ذہن کی تربیت کر کے خصوصاً ان میں تعمیری تنقید اور آزادی فکر کا مادہ پیدا کر سکے۔ ان کے ذوقِ جمال کی صحیح تربیت کر سکے اور ان کے اعلیٰ اخلاق کو علمی اہمیت سے چمکائے۔ ہندو یونیورسٹیوں کے اساتذہ عموماً ان صفات سے محروم ہی ہوتے ہیں تاہم دیگر اچھے و برے۔ تعمیری تنقید اور آزادی فکر کا یہ حال ہے کہ شاید ہی آج تک کسی یونیورسٹی کے پروفیسر نے کوئی کتاب لکھی ہو جس میں کسی علمی مسئلے میں مغربی علماء سے مدلل طور پر اختلاف کرنے یا اپنی طرف سے کوئی رائے پیش کرنے کی جرأت کی ہو۔ ذوقِ جمال کی کیفیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اکثر حضرات کے کمرے ادنیٰ بازار کی تصویروں سے آراستہ ہوتے ہیں اور بڑے آرٹ گالری جڑاتے ہیں۔ اب رہا اخلاق تو وہ مذہب کے ساتھ ہی علم و فضل کے ان مبادی سے رخصت کر دیا گیا ہے اور ان کی خالص علمی مضامین اس غیر علمی چیز کے لئے کہیں گنجائش نہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان حضرات کی تعلیم سے نوجوانوں کے انفرادی ذہنی کی نشو و نما پر کیا اثر پڑے گا۔ مجذبی تقریر ختم ہونے پر خواجہ غلام الہی صاحب جو یونیورسٹی کے پروفیسر کے لئے کھڑے ہوئے آپ نے فرمایا کہ بات کی ضرورت کے مختلف پہلو اور مختلف مدد ہوتی ہے۔ مجھے جناب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم ناقص ہے اور اصلاح کی محتاج ہے۔ اس کی نمایاں بجے خالی جناب

ہم نے دیکھا ہے کہ اس کی صفی گوئی ہی موصوف کی طرح ضروری سمجھتا ہوں مگر یہ مجھے تسلیم نہیں
 کہ اس کی تعلیم کو ہی تجر تک و قوم کے لئے مفید ہے۔ اس ملک میں اس تجر کا مخالفت ہوں۔ مجموعی
 تعلیم سے کسی چیز کے حسن و قبح یا فائدے اور ضرر کے اندازے کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ میاں کمال پر برکتی
 جائے اور جب وہ اس پر پوری نہ اترے تو کھوٹی سمجھ کر کسر رو کر دی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی
 دیکھنا چاہیے کہ زمانے کے لحاظ سے 'امکانی صورتوں کے لحاظ سے' دوسری چیزوں کے مقابلے میں
 اس چیز کی حدود قیمت کیا ہے اور پھر یہ کہ اس کے فوائد زیادہ ہیں یا نقصانات۔ موجودہ تعلیم جس زمانے
 میں شروع ہوئی وہ ہمارے ملک کے لئے انتہائی تنزل کا زمانہ تھا۔ ہاں یہی اتنا کچھ سچ بولی تھی اور
 ایک بیرونی قوم ہم پر حاکم ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں جو مشرقی تعلیم رائج تھی، اس کا محض ایک حصہ ہی
 ہندوئی سے ثابت تھا کہ اس نے ہمیں ان دنوں کو پہنچایا۔

ہماری کاغذی تھا کہ ہمارے قدیم تہذیب و تمدن کے جو عناصر

سنبھال کر رکھنے کا کسی کو حوصلہ نہ تھا۔ اور ہمارے جدید مغرب

سارے مشرق کو تہ آب کر دے گا۔ ایسی صورت میں کچھ تو حاکم قوم کی صورت میں
 خواہش سے یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم کی بنیاد پڑی جس کا مرکز مغربی علوم کی تعلیم قرار دی گئی۔ غلامہ
 کہ یہ بہترین صورت نہیں تھی مگر شکل یہ ہے کہ سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں تھی۔ اس وقت
 سوال کشی کے طوفان سے بچ کر پار لگنے کا نہیں تھا بلکہ محض اتنا تھا کہ کسی طرح وہ پانی پر قائم ہے۔
 اب زمانہ بدلا ہے۔ ہمارے دل تنزل کے احساس اور ترقی کی آرزو سے بے چین ہیں۔ اگرچہ پوچھئے
 تو اسی ناقص تعلیم کا طفیل ہے۔ شعراء جبل کے احساس کو علم کا پہلا زینہ سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک
 تعلیم کا سب سے اہم مقصد یہی تھا کہ یہ احساس پیدا کیا جائے۔ یہ محض شاعری نہیں بلکہ گہرا فلسفیانہ نکتہ
 ہے۔ تنزل کا احساس بھی ممکن ہے جب ترقی کا نصب العین نظر کے سامنے ہو۔ موجودہ تعلیم میں لاکھ
 خوابیاں ہوں مگر یہ بڑی خوبی ہے کہ اس نے خود اپنی خرابیوں کا احساس ہمارے دل میں پیدا کر دیا ہے۔
 زندہ قوموں کے علوم اور ان کی زندگی کے مطالعے نے خواہ وہ کتنا ہی محدود ہو ہمارے دلوں میں زندگی
 کا حوصلہ بھرے ابھارا ہے اور یہ بہت بڑی چیز ہے۔ اب یہی ہمارے مذہب و اخلاق اور ہماری قدیم
 معاشرت کی بربادی اس کی ذمہ داری موجودہ تعلیم پر نہیں بلکہ اس گمن پر ہے جو ہماری زندگی کو پہلے

ہرگز نہ تھا کہ میں کے مدعا کرنے میں موجود تعلیم مائل نہیں ہوئی بلکہ مدد دیتی ہے۔

خود صاحب کی پرستش تقریب کے بعد ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی نے بھی میں صاحب کی مدد کی اور جن صاحب، ڈاکٹر عبدالمعین صاحب احراری سب نے تجویز کی تائید میں دلچسپی لیں خصوصاً سید نجل حسین صاحب نے اپنے طریقہ چٹکوں سے محفل کو کشت زعفران بنا دیا۔ انہوں نے کہہ کر خواجہ صاحب کو مارے مجمع میں کوئی تائید کرنے والا نہ ملا۔ اس اشارہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ساری ساری کے باعث تشریف لے گئے تھے اور یوں بھی چونکہ مخالفت کی تقریب کے بعد کل تقریریں لگتی تائید میں ہوئی تھیں اس لئے جواب کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی اس لئے جناب صدر نے معزز مقررین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جلسہ برخاست کر دیا۔ عام اصول کے خلاف لوگوں سے تجویز کے متعلق رائے نہیں لی گئیں کیونکہ اکادمی نے اپنے مباحثوں کا مقصد کسی کی فتح اور کسی کی شکست قرار نہیں دیا ہے بلکہ یہ کہ زیر بحث مسئلے کے ہر پہلو پر نظر ڈالی جائے اور سامعین کو بہ طور خود اس پر غور کرنے کی تحریک ہو۔

مباحثے کے بعد ان میں تاؤز اس کے بعد اکثر حاضرین نے اس قدر جوش ادا کیا کہ ظاہر کیا کہ اب اکادمی کے کارکنوں کا ارادہ ہے کہ ممکن ہو تو سال میں دو تین جلسے اس قسم کے منعقد کیا کریں مگر اکادمی کے اراکین میں سے کوئی صاحب آئندہ اگست کے بعد آخر ستمبر یا اکتوبر میں کسی مسئلے پر کوئی تجویز پیش کر کے مباحثے کا آغاز کرنا چاہتے ہوں تو براہ کرم ناظم اکادمی کو اپنے نام نامی سے اور اپنی تجویز سے مطلع فرمائیں۔



مولانا اسلم جیراجوری ڈاکٹر سید بدین ام لے اپنی ایچ ڈی۔
جلد ۱۸ بابہ ماہ مئی ۱۹۳۲

فہرست مضامین

۳۱۳	مولانا اسلم جیراجوری	۱۔ مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر
۳۱۹	رئیس احمد صاحب جعفری ندوی متعلم جامعہ	۲۔ ناطول فرانس کا فلسفہ زندگی
۳۲۶	عبدالحکیم صاحب ندوی متعلم جامعہ	۳۔ ادب المباحظ
۳۶۱	خواجہ منظور حسین صاحب اسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۴۔ بی سیادت کے خلاف عجمی تحریکیں
۳۶۹	اڈیٹر	۵۔ چٹا
۳۷۳	ڈ۔ ح	۶۔ تنقید و تبصرہ
۳۷۸	ن۔ ن۔ ن۔	۷۔ دنیا کی رفتار۔ ممالک غیر
۳۸۳	DELHI	۸۔ اسلامی ممالک
۳۸۹	اڈیٹر	۹۔ ہندوستان
		۱۰۔ مشذرات

محمد حبیب بی۔ لے داکٹرس، پرنٹر و پبلشر نے دفتر سالہ "جامعہ قرون وسطیٰ دہلی" سے شائع کیا۔

مصر کی قدیم تہذیب کے اسلام کا اثر

انتظام

ملوک قدیم کے زمانہ میں مصر کی جو آفاقی حالت تھی اس کا کچھ حال نہیں معلوم ہو سکا بجز اس کے کہ وہاں زمین کی ملکیت کا دستور تھا اور زیادہ تر زمینیں کاشتکاروں یعنی نہر سی پیشواؤں کے قبضہ میں تھیں جتن کا شکار اور غلاتوں سے پیداوار کا ایک بڑا حصہ لے لیتے تھے۔ عالقہ کے عہد میں جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے وزیر ہوئے اور فرعون ابوفیس نے ان کے لئے اپنی کرسی سے صرف چار انگلی چھوٹی کرسی بنوائی اور اس پر ان کو بٹھا کر ملک کے سیاہ و سفید کا پورا اختیار دیدیا تو انہوں نے قحط کے سات سالوں میں زمینداروں کے ہاتھوں سے جملہ زمینیں خرید لیں۔ پھر ان کو بقدر مناسب اس شرط پر جو بننے کے لئے دیدیں کہ پیداوار کا پانچواں حصہ حکومت لیا کرے گی۔

غالباً اسی عہد سے ملک مصر کی اراضی سرکاری قرار پائی اور بادشاہ اور رعایا کے درمیان سے زمینداروں کا طبقہ اٹھ گیا بجز ان امرا کے جن کو سلاطین کسی خدمت یا خوشنودی کے صلہ میں کوئی قطعہ زمین انعام یا جاگیر میں دیدیں۔

چونکہ مصر کی سرزمین نہایت زرخیز ہے اس لئے وہاں کی خوشحالی کے ذکر سے تاریخیں بھری پڑی ہیں لیکن میلاد مسیح سے تیس سال قبل جب سے رومیوں نے وہاں قبضہ کیا وہ اس کی پیداوار کا ایک اچھا حصہ اپنے ملک کو بیجانے لگے۔ انہوں نے مصریوں کو حکومت میں بھی کوئی حصہ نہیں دیا اور ان کی ہر چیز باغ، مویشی، اثاثہ البتہ یہاں تک کہ راستہ سے گزرنے والوں اور قبرستان میں جانے والے مردوں سب پر محصول لگا دیا۔ ان وجوہ سے مصری محتاج اور مفلوک ہو گئے اور ان کی ساری علمی ادنیٰ یعنی شان جاتی رہی۔ عرب بن عاص نے جب مصر کا انتظام کرنا شروع کیا تو سب سے پہلے باشندوں کی دلچسپی کی طرف توجہ فرمائی۔ ان کو ان کی جان و مال، اولاد، آبرو، دولت اور تجارت ہر چیز کی حفاظت کا پورا اطمینان

دلایا۔ مذہب اور رسوم میں آزادی بخشی۔ جلد غلامانہ قوانین اور ناجائز محصول موقوف کئے۔ خراج کی شخصیں
درتھیل کے لئے خود واقف کار اور معتبر قطبیوں کو مقرر کیا اور جا بجا عدالتیں قائم کر دیں۔

ملک مصر کی کیفیت کے تعلق انھوں نے دربار خلافت میں ایک ترجمہ بھی بھیجی تھی جو اب تک اہل ادب
میں مشہور ہے۔ فرانسیسی ادیب موسیو اوکٹاف اوزاں نے تو اس کو باعفت کا ایک حیرت انگیز نمونہ
قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ محمود عالم کے جملہ مدارس میں اس کو پڑھانا چاہیے تاکہ طلباء کو اشیا کی حقیقت
بیان کرنے کا طریقہ معلوم ہو۔ لیکن اور ٹیڈرنے بھی اپنی اپنی تاریخوں میں اس کے ترجمے درج کئے ہیں
ہم اس کو اردو میں نقل کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ترجمہ میں وہ لطافت جو اصل میں ہے نہیں دکھائی
جاسکتی صرف مضمون کا اظہار ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

مصر کی زمین سیر حاصل اور بارور درختوں سے ڈھکی

عرض دس روز کی مسافت ہے۔ اس کے بیچ میں۔۔۔

فرخ فرعام اور روانی شام مبارک انجام ہے۔ اس کے فینان میں

ہو جاتی ہے ادکبھی کمی۔ جس وقت چڑھتا ہے اور اس کی موسیٰ سر اٹھاتی ہیں اس وقت تمام
چنے اور نمیں لبالب ہو جاتی ہیں اور باشندوں کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے
آنے کے لئے ہجر کشی کے کوئی سہیل نہیں رہتی۔ پھر جب اس کا جوش پورا ہو چکے ہے تو پٹا
کھاتا ہے اندیزی کے ساتھ اتر کر اپنی حد پر آ جاتا ہے۔ اس وقت کاشتکار اس کے ساطوں
کے فرزا اور داموں کے نشیب میں نکل پڑتے ہیں۔ دانے بوتے ہیں اور خرمن کے آرزو مند
ہوتے ہیں۔

جب دانے جے ادکھیتیاں اگیں اور نیچے زمین کی نمی اور اوپر بارش کی تری سے پڑش
پاکر انہیں نشوونما دبا لیدگی ہوئی تو ہرے بھرے کھیت بلبھانے لگتے ہیں اور زمین کی دولت
اس کے شکم سے اس کی پشت پر آ جاتی ہے۔

امیر المؤمنین! میں اس زمین کا کیا حال لکھوں۔ ابھی گوہر سپید ہے ابھی عزیز سیاہ اور ابھی

زمرہ سبز۔ یہ قدرت الہی کے کرشمے میں جس نے اس میں ایسی صلاحیت رکھ دی اور باشندوں کی معیشت کے لئے اس کو ایسا بنادیا۔

حضرت عمر اس کو پڑھ کر شگفتہ ہوئے اور فرمایا کہ ابن عاص نے تو گویا مصر کی سرزمین میری آنکھوں کے سامنے رکھ دی۔

فراعنہ کے عہد سے مصر میں چار سالہ بندوبست کا دستور تھا۔ وہ چند سالوں کی پیداوار کا اوسط بحال کر شخص بنگان کیا کرتے تھے اور نقد و جنس دونوں میں وصول کرتے تھے۔ رومی اپنے عہد میں خراج کے علاوہ فوج کے لئے غلبہ بھی وصول کرنے لگے۔

لیکن مصر ایک ایسا ملک ہے جس کی زراعت کا دار و مدار نیل کے فیضان پر ہے اور اس کے مدارج میں ہر سال تفاوت رہتا ہے جس سے پیداوار میں بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ چند سالوں کی پیداوار کو دیکھ کر ممکن ہے کہ حکومت کو فی اوسط ستھین کرے مگر نادان کاشتکار تو اپنے مصارف کو اس اوسط کے مطابق سالوار نہیں تقسیم کر سکتا۔ اس لئے وہاں ہر سال آب نیل کی کمی یا زیادتی کے مطابق خراج کی یقینین قربان اوصاف ہے۔ اسی بنا پر عمرو بن عاص نے غلبہ کو کھٹکا :-

مصر کی زراعت کا انحصار نیل کے فیضان پر ہے۔ میں نے اچھی طرح تحقیق کر لیا ہے کہ اس کا پڑھاؤ جب ۱۴ ذراعی تک پہنچ جاتا ہے تو خشک سالی نہیں رہتی اور ۱۶ ذراع میں سارا ملک سیراب ہو جاتا ہے اور اس قدر پیداوار ہوتی ہے کہ دوسرے سال کے لئے بھی کافی ہو سکے۔ نیچے اور اوپر کی دو حدیں جو خوفناک ہیں وہ ۱۲ اور ۱۸ ہیں۔ ۱۲ میں قطر رہتا ہے اور ۱۸ میں طوفان سے فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

حضرت عمر نے حکم بھیجا کہ پانی کا پڑھاؤ معلوم کرنے کے لئے متقیاس بنواؤ۔ چنانچہ انھوں نے طولان میں متقیاس انیل بنایا جو آج تک قائم ہے۔ اس وقت سے مصر میں یہ قانون چلا آتا ہے کہ جب تک پانی ۱۶ درجہ پر نہ پہنچ جائے اس وقت تک عمال حکومت رعایا سے الگزار می تحصیل کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ چنانچہ جس دن نیل کی طغیانی سولھویں درجہ پر پہنچتی ہے اس دن بہت بڑا میلہ وفار انیل

کے نام سے لگتا ہے۔ مقیاس پر قاضی القضاۃ، ہجر شہادتوں کے بعد اپنے دستخط اور مہر ثبت کرتا ہے جس کے بعد سلامتی کی نوپیں سر کی جاتی ہیں۔

اسی پیمانہ سے پیداوار کا اندازہ لگا کر شخص لگان کی جاتی سے جس کے لئے ہرج برگینہ سے جزومودہ کا رخلع بلائے جاتے اور فصل اور پیداوار کا اندازہ پوچھ کر انھیں سے لگان کا تخمینہ لیا جاتا جس کے حساب سے تحصیل کی جاتی۔ جہاں کینیے اور حمام ہوتے ان کے اخراجات نیز مسلمانوں کی نفیث کے لئے صرفے جو منزلوں میں مقصد سے منہا کئے جاتے۔

کاشتکاروں کی شرح لگان کی مقدار سے پیشہ وروں سے بھی اتنی آہ فی پر خراج لیا جاتا۔ اس کے علاوہ اور قبضے حاصل تھے سب ایک قلم موقوف کر دئے گئے۔

خود حضرت عمر نے بھی قطبی رؤسا کو بلا کر بند و بست کر دیا۔

اور ان کے مطابق ہدایات بھیجیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

جو حضرت اسماعیل کی والدہ تھیں ۶۰ ہوں کو مصریوں کے ساتھ حسن

بند و بست میں نصوویت کے ساتھ وہاں نرمی برتی گئی اور شرح لگان کم سے کم لکھی نئی

مسلمانوں نے آنحضرت کے جدیدہ رشتہ کا بھی لحاظ رکھا اور قریہ حفن کو جو ضلع انصاریہ ہے

جہاں کی رہنے والی حضرت ماریہ قبطیہ سریرہ رسول تھیں خراج سے بری کر دیا۔

اس سالانہ بند و بست کی وجہ سے ہر سال کی وصولی کی کوئی رقم متعین نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ

عدم پیداوار کی وجہ سے کبھی کبھی بعض پرگنوں اور دیہاتوں کا خراج معاف کر دینا پڑتا تھا اس لئے رومیوں

کے مقابلہ میں مسلمانوں کی وصولی میں کمی ناگزیر تھی۔ چنانچہ سال اول میں تمام ملک مصر سے ایک کروڑ

میں لاکھ دینار وصول ہوئے۔

حضرت عمر کو معلوم تھا کہ مفوق نے پہلے سال دو کروڑ دینار وصول کئے تھے اس بنا پر انھوں

نے عمرو بن عاص سے باز پرس کی لیکن جب خراج کی تفصیل اور نوعیت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو جواب واضح

ہو جاتا ہے کیونکہ رومیوں کی ایک تو شرح لگان زیادہ تھی دوسرے انھوں نے بہت سے ناجائز فرائض

معیار پر لگا رکھے تھے اور عربین عاص ان دونوں کو گوارا نہیں سکتے تھے۔

لیکن باوجود اس نرمی کے زمانہ مابعد میں کبھی اس قدر وصولی نہیں ہوئی۔ صرف خلیفہ ثالث کے عہد میں عبداللہ بن سعد نے ایک سال دو کروڑ دینار وصول کئے تھے جس پر حضرت عثمان نے فخریہ عہد بن عاص سے کہا کہ انٹنی نے زیادہ دودھ دیا۔ بولے کہ ہاں لیکن اس کا بچہ بھوکا رہا۔

امیر معاویہ کے سلیقہ انتظام میں کس کو شک ہے مگر ان کے عہد میں تحصیل ۹۰ لاکھ تے آگے نہ بڑھی اور ان کے بعد بنی امیہ نیز بنی عباس بھی چالیس بلکہ تیس لاکھ سالانہ وصول کرتے رہے۔ خلفاء فاطمیہ نے اپنے زمانہ میں بہ نسبت سابق کے شرح لگان دگنی کر دی تھی لیکن پھر بھی ۳۴ لاکھ تے زائد نہ وصول کر سکے۔

اس زمانہ میں اگرچہ ملک مصر کی سالانہ آمدنی ڈھائی کروڑ پاؤنڈ سے بھی زیادہ ہے مگر اس کا بڑا حصہ ریلوے، ڈاکخانہ اور آبکاری وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے۔ زمین کی مالگزاری ۶۰ لاکھ گنی سے زائد نہیں ہے۔

عرب بن عاص نے مصر سے عرب کے ساتھ غلہ کی تجارت کے لئے ایک نہر دریائے نیل سے نکال کر بحیرہ قلمرم میں ملا دی۔ مورخین کا بیان ہے کہ یہ قدیمی نہر تھی جس کو بادشاہ سیتی اول (خاندان ۱۹) نے کھدوانا شروع کیا تھا اور بادشاہ نکاو (خاندان ۲۶) نے اس کی تکمیل کی تھی۔ رومیوں کے عہد میں یہ بالکل خراب ہو گئی تھی مگر نشانات باقی تھے۔ عرب بن عاص نے فسطاط کے کنارہ سے اسی نشان کے مطابق کھدوانا شروع کیا اور میں شمس اور وادی طیلات سے لاکر شہر قلمرم کے متصل بحیرہ میں گرا دیا۔

یہ نہر ۶۰ مہینہ کے عرصہ میں ۲۳۰۰ میں حضرت عمر کے عہد میں تیار ہو گئی تھی۔ اسی وقت سے غلہ مصر سے عرب میں آنے لگا۔ عبداللہ بن امیہ میں واپسوں کی غفلت سے اس کی مرمت نہ ہوئی اور جا بجا ریتاٹ گیا یہاں تک کہ بالکل بند ہو گئی۔ اس کے نشانات کہیں کہیں باقی تھے مگر ۱۸۹۶ء میں مصری حکومت نے ان کو پاٹنے کا حکم دیکر ان کو مٹا دیا۔

عرب بن عاص نے نہر سوئز کھودنے کا بھی ارادہ کیا تھا۔ چاہتے تھے کہ فرما کے متصل جہاں

ہجرۃ دوم اور ہجرۃ قلم میں صرف ۷ میل کا فاصلہ رہتا ہے کٹ کر دونوں کو ملا دیں۔ مگر حضرت عمر نے روک دیا اور لکھا کہ رومی اس رستے سے عرب پر حملہ کرنے لگیں گے۔ اس وجہ سے باز رہے۔

حضرت عمرو بن حاص نے انتظام کا جو طریقہ مصر میں قائم کیا تھا زائناہ ابعد میں بھی کم و بیش ہی چلا آیا۔ عبد عباسیہ اولیٰ میں البتہ والیوں کی جلد جلد تبدیلی کی وجہ سے ابتری رہی۔

شیخ سعدی نے گفتاں میں ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے کہ ہارون رشید نے کہا کہ اس ضد پر کہ مدحون نے ملک مصر کے گھنڈ پر خدائی کا دعویٰ کیا تھا میں اپنے ادنیٰ ترین غلام کو وہاں کی حکومت دے دوں گا۔ چنانچہ ایک حبشی کو جس کا نام نصیب تھا والی بنا کر بھیجا۔ اس کی عقل کا یہ حال تھا کہ غلاموں نے ایک بار اگر شکایت پیش کی کہ ہم نے رومی کی کاشت کی تھی وہ پانی کی لٹ سے ضائع ہو گئی تو اس نے کہا کہ تم کو اُون بونا چاہئے تھا کہ خراب نہ ہوتا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شاخو خانہ قصہ ہے۔ صورت یہ ہے:

وزیر کے سپرد ہوئی تھی جو اپنی طرف سے ایک کارندہ وہاں۔

اس کے وزیر جعفر بن یحییٰ برکی کے ہاتھ میں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے ارہمیں۔

بن عبد الحمید مصر میں امیر خراج تھا لیکن نہ وہ حبشی تھا نہ اہم بلکہ موزنین لکھے ہیں کہ نہایت مستحق اور

عادل تھا جس سے اہل مصر خوش تھے اور جس کے نام پر آج تک وہاں ایک نسبت منبتہ انھیں آبادی۔

خوش قسمتی سے مصر کو تھوڑے تھوڑے زمانہ کے بعد اچھے اچھے مدبر اور منظم ملے گئے جس کی

وجہ سے ہر خزاں کے بعد اس میں بہار آتی رہی۔ ان لوگوں کے نام اب تک اہل مصر عزت اور محبت

کے ساتھ لیتے ہیں۔

عباسیہ کے عہد میں احمد بن طولون ان کا غلام مصر کا حاکم تھا۔ اس نے مرکز یعنی بغداد کی ابتری

اور بغلی کی وجہ سے ۵۸۰ھ میں اپنی خود مختاری کا علم بلند کر دیا اور اپنے حسن انتظام سے مصر کی حالت

ایسی درست کی کہ رعایا خوشحال اور فارغ البال ہو گئی جس کی وجہ سے اس کی طاقت اس قدر بڑھ گئی

کہ دربار خلافت نے رومیوں کے مقابلہ کے لئے شام کی ولایت کا فرمان بھی اس کے نام لکھ دیا۔

ابن طولون کو دوبار بڑے بڑے پرانے دھینے بھی ملے۔ ایک سے عایشان جامع تیار کرائی جس کے نشانات اب تک باقی ہیں اور دوسرے سے ایک شفا خانہ تعمیر کرایا۔ غربا کے مفت مصالحہ کے لئے اطباء لازم رکھے اور عمارات اور دوکانیں بنوا کر اس کے خرچ کے لئے وقف کیں۔

اخیشی خاندان کے آخر میں ان کا غلام کا فوراً ^{۳۵۹} میں تخت مصر پر آگیا۔ یہ بھی منظم اور مصلح تھا عرب کا مشہور شاعر تنہی سیف الدولہ کا دربار چھوڑ کر اس کے پاس آگیا تھا اور اس کی مدد میں قصیدے لکھتا تھا۔ اس کے زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ مصر میں کسی واعظ نے اپنے وعظ میں کہا کہ دنیا کی خواری دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے کیسے لوگوں کو اس کا مالک بنا رکھا ہے بغداد میں معتزلہ وہ دینی جہ لہلا اور مصر میں کا فوراً خیشی ہے وہ خفی۔

یہ بات کا فوراً تک پہنچی ہنسنا اور اس واعظ کو بلا کر کچھ رقم دیدی جس کے بعد وہ اپنے وعظوں میں کہا کرتا تھا کہ حسام کی اولاد میں سے تین ہی شخص کامل بچے ایک نعمان حکیم دوسرے حضرت بلال مؤذن رسول اللہ تیسرے موالی کا فوراً خیشی خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ۔

فاطمی خلفاء کے عہد میں حروب صلیبی اور نیز اندرونی غلغلا روں کی وجہ سے جب انتظام میں سخت ابتری پڑ گئی تھی مستنصر باللہ کے وزیر بدر جہالی متوفی ۶۸۸ھ نے اپنے حسن انتظام سے پھر مصر کی حالت سنبھالی اور تجارت اور زراعت کو فروغ دے کر ملک کو مالا مال اور رعایا کو خوشحال کر دیا۔ اسی بدر جہالی کے بیٹے افضل امیر الجیوش نے عثمان سے امام حسین علیہ السلام کے سر مبارک کا مشہد مصر میں منتقل کیا اور اس پر ایک جامع تعمیر کرائی۔

فاطمیہ کے انقراض کے بعد سلطان صلاح الدین کے عہد میں بھی مصر میں رفاہیت رہی لیکن یہ اس کے وزیر بہاء الدین اسدی کا کارنامہ تھا جس نے ایک طرف رعایا کو خوش رکھا اور دوسری طرف سلطان کو درنہ صلاح الدین نے تو اپنی زندگی کا بڑا حصہ صلیبوں کے مقابلہ میں گزارا۔ اس کو انتظام ملک کی فرصت کہاں تھی۔ اس نے صرف ایک قلعہ قاہرہ کے متصل اپنی سکونت کے لئے بنوایا تھا جو اس وقت موجود ہے اور مصر کے کل قلعوں سے زیادہ سنگین اور موقع کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے۔

ایونی خاندان کے بعد مالیک بھری میں سے ملک غاھر ہرپس بڑا مدبر اور شجاع گزرا ہے جس نے ملک کے انتظام کو بھی ٹھیک رکھا اور ایک طرف طلبیوں اور دوسری طرف تازیوں کو نکالا۔

مالیک کے بعد جب ترکی پاشاؤں کی بد تدبیری سے مصر کا حال تباہ ہو رہا تھا اس وقت محمد علی پاشا نے اس کی حالت درست کی اور بالآخر اپنی دولت اور قوت اس قدر بڑھائی کہ باب عالی سے استقلال مصر کا سنا بعد نسل فرمان حاصل کر لیا۔ چنانچہ اب تک مصر کی حکومت اسی کے خاندان میں ہے۔ اُسی کے پوتے خدیو اسماعیل پاشا نے اپنی فضول خرچیوں کی بدولت فرسے لے جن کی ضمانت کے لئے انگریزوں نے مایہ میں مداخلت کی۔ احمد عربی پاشا نے اس بے دردی مداخلت کی منافقت شروع کی جس کے اوپر منہ کا مہ ہوا اور آخر کار انگریزی فوجوں نے مصر پر قبضہ کر لیا۔

دینی جماعت نے مصطفیٰ کمال پاشا اور فریدیہ وغیرہ کی قیادت

آج تک جاری ہے لیکن ابھی وہ دن قریب نہیں دکھائی د

مصر کی زمین زرخیز ہے۔ فراغت کی دولت اور ثروت و

اور دینیوں سے بھی ملتی ہے جو زیر زمین سے کبھی کبھی برآمد ہوتے ہیں۔ قاعدن جس کے ڈالوں کی اہمیت کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے مصری کا ایک معمولی عمدہ دار تھا یعنی مہتمم جنگلات۔

اسلامی حمد میں بھی جب کبھی مصر کو استقلال نصیب ہو گیا اس کی وہی دولت اور ثروت عود کر آئی۔ چنانچہ ابن طولون کی خود مختاری کے بعد اس کے بیٹے خارویہ کی دولت و ثروت اور شان و شوکت مصر کے کسی قدیمی بادشاہ سے کم نہ تھی۔ اس کے محل کی دیواریں لازور و محلول اور طلا اور مختلف قسم کی چوہی تصویروں سے آراستہ تھیں۔ دربار اس عظمت و جلال کا تھا کہ داخل ہونے والے کے ہوش اڑ جاتے تھے۔ علاوہ دیگر سامان سطوت و جبروت کے زندہ شیر اور چیتے بھی اس کے اطراف میں بندھے ہوئے رکھے جاتے تھے۔

اس کی خواجہ بھی عجیب و غریب تھی۔ ایک حوض پارہ سے بھر کر اس کے دونوں کناروں پر چاندی کے کڑوں میں ریشم کی ڈوریاں باندھی گئی تھیں اور ان پر ایک چربی گڑا ہوا سے بھرا ہوا

ڈال دیا گیا تھا جس کے اوپر وہ سوتا تھا۔ سبب یہ تھا کہ اس کو کم خوابی کی شکایت تھی، طبیب نے بتلایا کہ چھپے سے نیند آجائے گی۔ اس نے کہا کہ میری طبیعت گوارا نہیں کر سکتی کہ میرے بدن پر کوئی ہاتھ لگے۔ اس نے یہ صورت اختیار کی گئی کہ چونکہ پارہ کی وجہ سے بستر برابر حرکت کرتا رہتا ہے جس سے نیند آجاتی تھی اس نے اپنی بیٹی قطر الندی کی شادی بغداد کے خلیفہ مستنصر باللہ کے ساتھ کی تھی۔ اس کو ہمیز میں اس قدر ساز و سامان دیا تھا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں۔ جوڑوں کی قیمت کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکے گا کہ ایک ہزار انار بند تھے جن کا صرفہ بارہ ہزار دینار تھا۔ رخصتی کے وقت مصر سے بغداد تک ہر ہر منزل پر اپنے محل کے مشابہ ایک ایک قصر تعمیر کرا کے آلات و فروش سے آراستہ کر دیا تھا تاکہ مصر سے بغداد تک عروس اپنے باپ ہی کے گھر میں قیام کرتی ہوئی جائے۔ آغاز محرم ۶۲۸ھ میں اس کا داخلہ بغداد میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ہوا۔

اسی طرح فاطمہ جن کی خلافت مصر میں تھی ان کی دولت و ثروت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ان کے ایک وزیر امیر الجیوش نے مرنے کے وقت جس قدر دولت چھوڑی تھی اس میں علاوہ بے شمار ساز و سامان کے ابن خلکان کے قول کے مطابق ساڑھے نو دینار نقد تھے اور پانچ سو صندوق خاص اس کے پینے کے کپڑوں سے بھرے ہوئے تھے۔

آخری خلیفہ فاطمی عاصد باللہ کے عصر پر اس کی وفات کے بعد جب سلطان صلاح الدین نے قبضہ کیا ہے تو اس کے ائمہ و اموال کی فہرست سے تاریخ کے صفحات تنگ نظر آتے ہیں۔ زرو جواہر کے علاوہ تقریباً دو لاکھ کتابیں تھیں جن میں سے بہت سی آج جرمنی میں موجود ہیں۔

اگر فیو اسامیل نے اپنی فضول خرچیوں سے مصر کو قرضہ میں مبتلا نہ کیا ہوتا تو آج وہ عالم اسلامی کا ایک عظیم الشان خزانہ ہوتا۔

علوم

مصری تہذیب مورخوں کے نزدیک دنیا کی قدیم تہذیبوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ان میں علوم و فنون کا ذوق آغاز حمد سے تھا۔ چنانچہ پہلے ہی خاندان کے ایک بادشاہ ستانے طب کا ایک رسالہ

لکھا تھا۔ دوسرے خاندان کے بادشاہ اتنس نے اس کی تکمیل کی۔ خاندان سوم کے بادشاہ نیکانے بھی
 طب کے کچھ نوٹس چھوڑے تھے جو پہلی صدی مسیحی تک رائج رہے۔ اس نے فن کتابت اور سنگ تراشی
 کو بھی ترقی دی تھی۔ خاندان چارم کے بادشاہ اسکات کو ہندسہ سے بہت ذوق تھا۔ اس نے آلات
 حسابی بنائے تھے۔

ان علوم کے علاوہ شعبہ کائنات اور بحر میں بھی معنی فائق تھے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ انیسویں
 خاندان کے عہد میں جس زمانہ میں کہ حضرت موسیٰؑ کی بخت ہوئی سو کا اس قدر چرچا تھا کہ سال میں ایک
 دن مقرر تھا جس میں جادو گروں کا جلوس نکلتا تھا۔ کوئی شیر پر سوار ہو کر پلٹا، کوئی آتش نشان اڑھے
 پر اور کوئی چلتے ہوئے شعلوں میں۔ شہر کے لوگ اس دن خوف سے اپنے دروازے بند رکھتے تھے
 اور کوٹھوں اور چھتوں پر سے تماشا دیکھتے تھے۔ ان جادو گروں کو
 کرچکے ہوں شاہی دربار میں اعزاز ملتا تھا اور جو ساتوں ستارہ
 ان کو فرعون اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتا تھا۔

چھبیسویں خاندان کے عہد میں جب مصر میں بڑے مدارس قائم ہوئے اس وقت سب
 ہیئت اور نجوم کے علاوہ فلسفہ اور علم الاضام کی بھی تعلیم ہونے لگی۔ یونانی قبضہ کے بعد تو اسکندریہ علوم
 کا مرکز ہو گیا تھا۔ ارسطو اسی شہر میں درس دیتا تھا۔

فنون تعمیر و سنگ تراشی و مثال گری میں ان کو جو مہارت تھی اس کی شہادت ان کے آثار
 سے ملتی ہے۔

رومیوں نے اپنے زمانہ میں مصریوں کے قدیم علوم و فنون کی کتابیں جلا دیں بعض عیسائی
 مورخوں نے دینی تعصب کی وجہ سے اس کا الزام مسلمانوں پر لگانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ انھوں
 نے لکھا ہے کہ عمر بن حاص نے فتح کے بعد اسکندریہ کے عظیم الشان کتب خانہ کو خلیفہ اسلام کے
 حکم سے جلا دیا۔

لیکن دراصل محض افترا اور بتان ہے۔ مولانا شبلی مرحوم نے اسی عنوان سے ایک رسالہ

لکھ کر اس الزام کی اچھی طرح تردید کر دی ہے بلکہ ان سے پہلے ہی جس وقت یہ سلسلہ سباط بحث پر آیا اسی وقت خود یورپ کے محقق مورخوں شلاگن، بٹلر، سیدو اور گستاخی بان وغیرہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا اور اس کے تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کر دیا۔

ڈاکٹر بٹلر لکھتا ہے کہ فتح اسلامی کے وقت اس کتب خانہ کا وجود ہی نہ تھا کیونکہ یہ پہلی بار قیصر جولیس کے حکم میں ۱۸۳۰ء میں جل چکا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ جو کتا میں جمع ہوئیں وہ اسقف نوئل کے حکم سے ۱۸۳۹ء میں جلادی گئیں۔

جب سے مصر میں مسلمان پوپنچے اور وہاں کے قبیلے کے قبیلے اور خاندان کے خاندان اسلام میں داخل ہونے لگے اس وقت سے وہاں اسلامی علوم کا دور شروع ہوا۔ حضرت عمر بن عباس کے ساتھ جو جماعت گئی تھی ان میں کم سے کم دو سو صحابہ کرام تھے جن میں سے حضرت زبیر عشرہ مبشرہ میں سے ابو الدرداء، عاتب بن بلتعہ اور عبادہ بن صامت وغیرہ اہل بدر میں سے، کم سے کم نثر آدمی سمیت رضواں کے قتل کار میں سے نیز عبداللہ بن عمر اور عمار بن عباس وغیرہ سادات قریش اور ثوبان اور ابو رافع خاندان رسول اللہ بھی تھے۔

ان حضرات میں سے اکثر ایسے تھے جن کے پاس لوگ جمع ہوتے اور قرآن کی آیات اور آنحضرتؐ کے حالات سنتے۔ اس طرح تفسیر اور حدیث کا سلسلہ رائج ہو گیا اور جا بجا اس کے طے قائم ہو گئے ۱۹۲ء میں جب خلیفہ ولید بن عبدالملک اموی کے حکم اور ابن یربوع قراری کی کوشش سے مصر کا دفتر حکومت عربی میں منتقل ہو گیا اس وقت سے اہل مصر عربی زبان حاصل کرنے لگے اور اسلامی علوم بھی۔ دوسری صدی ہجری کے آخر میں وہاں لیث بن سعد جیسے امام ہوئے جن کو خلیفہ منصور عباسی نے مصر کی ولایت دینی چاہی مگر قبول نہ کی۔ امام شافعی بھی پہنچ کر وہیں سکونت گزریں ہو گئے اور زید بن ابی حنیبلہ اور دیگر ائمہ نے شہرت پائی اور فسطاط اسلامی علوم کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ ۳۵۰ء میں جب فاطمیہ کے غلام اور مصر کے فاتح جوہر نے قاہرہ اور اس کے ساتھ طبع انہر تعمیر کی تو اس میں علوم اسلامی کا درس شروع ہوا۔ زمانہ مابعد میں اس مدرسہ نے بہت ترقی کی۔ سلاطین

دلوک مصر نے خصوصیت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کی اور اس پر بڑے بڑے اوقات کے چنانچہ آج تک یہ مدرسہ قائم ہے اور غالباً دنیا کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ اس کے طلباء کی تعداد کم و بیش پندرہ ہزار رہتی ہے جس میں ہر ملک اور ہر قوم کے مسلمان شامل رہتے ہیں۔ یہاں کی تعلیم قدیمی اصول اور نصاب کے مطابق ہے لیکن منفی محمد عبودہ مروجہ کی کوششوں سے اصلاحات کا بھی اس میں دخل ہو گیا ہے جس سے امید ہے کہ یہ مدرسہ زمانہ کا ساتھ دے سکے گا۔

حاکم بام ائندہ طیفہ عالمی نے پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں بغداد کے بیت الحکمت کے متعجب پر اپنے قصر کے ساتھ دار الحکمت تعمیر کرایا جس میں کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔ یہاں ہر شخص کو مطالعہ کے لئے کتابیں ملتی تھیں اور نقل لینے والوں کو سامان تھا۔

ایوبی خاندان کے عہد میں مدرسہ صلاحیہ سلطانہ

مدرسہ صالحیہ ملک صالح نجم الدین کا خاص طور پر مشہور ہوا۔

اپنے زمانوں کے امام تھے اور کل اسلامی علوم پڑھائے جاتے۔

ان میں علوم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔

مالیک کے عہد میں مدرسہ ظاہریہ ملک ظاہر بریس کا اور مدرسہ منصوریہ وناظریہ خانہ

فلاذون کے اسلام کے مشہور مدارس تھے۔

علماء مصر نہ صرف اپنی علمی قابلیت بلکہ تقویٰ اور عمل کے لحاظ سے بھی ممتاز تھے۔ چھٹی اور

ساتویں صدی ہجری میں علامہ اسکندرانی ابن دقین العید اور عز الدین بن عبدالسلام جیسے لوگ ہم کو

وہاں دکھائی دیتے ہیں جن کی نظیر سے دوسرے اسلامی ممالک اس وقت قابضہ خالی

نظر آتے ہیں۔

شیخ عز الدین کا یہ واقعہ ذکر کے قابل ہے کہ ایوبی خاندان کے آخری زمانہ میں جبکہ وہ مصر کے

قاضی تھے ملک صالح نے بہت سے غلام خریدے تھے جن کے ہاتھوں میں سلطنت کی نہ صرف وزارت

اور سپہ سالاری بلکہ تقریباً جملہ مناصب و امارات تھیں۔ چنانچہ آخر میں وہی حکمران بھی ہو گئے۔ قاضی

مزا الدین کے نزدیک کسی مقدمہ کی شہادت کے دوران میں یہ امر بایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ یہ مالیک جن کو سلطان نے مسلمانوں کے بیت المال سے خرید کیا ہے آزاد نہیں کئے گئے ہیں۔ اسی وقت انھوں نے اعلان کرایا کہ ان کے جملہ خود مختارانہ تصرفات از قلم بیع و شرا و نکاح و طلاق وغیرہ بوجہ عدم حریت ناجائز ہیں اور ان کو حکم بھیجا کہ عدالت میں حاضر آئیں۔

مالیک نے جب یہ سنا تو قیامت برپا ہو گئی۔ نائب السلطنت نے غضبناک ہو کر کہا کہ ہم روئے زمین کے ملک ہیں قاضی کی کیا مجال ہے کہ ہمارے سامنے دم مار سکے۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اپنے ہاتھ سے اس کی گردن مار دوں گا۔ یہ کہہ کر اپنے اعوان کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر چلا۔ سب کے سب غصہ میں بھرے ہوئے اور ننگی تلواریں ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے۔ جب ان کے گھر کے پاس پہنچے تو قاضی مذکور کا لڑکا دیکھ کر سہا ہوا اندر بھاگا اور باپ کو اطلاع کی۔ انھوں نے بے پرواہی سے کہا کہ تیرے باپ کا یہ رتبہ کہاں کہ اس کا خون راہ حق میں بہایا جائے۔ یہ کہتے ہوئے باہر نکل آئے۔ نائب السلطنت کی سمجھ بوجھ ان کے اوپر پڑی تو بھلاں حق سے کانپنے لگا۔ تموار ہاتھ سے گر گئی اور بولا کہ یا مولانا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا کہ تم سب کو فروخت کروں گا۔ بولا کہ قیمت کون لے گا۔ کہا کہ میں اور اس کو بیت المال میں داخل کروں گا۔ چنانچہ یہی کیا۔

ساتویں صدی کے وسط میں احوال بغداد کے بعد جب سے مصر میں خلافت عباسی قائم ہو گئی اس وقت سے وہی اسلامی علوم و حضارۃ کا مرکز ہو گیا۔ اسی عہد میں علامہ ابن تیمیہ حافظ ابن حجر اور جلال الدین سیوطی وغیرہ جیسے ائمہ وہاں ہوئے جن کی تصنیفیں آج تک مسلمانوں کا سرمایہ افتخار ہیں۔

۹۲۳ء میں سلاطین عثمانیہ اسلامی خلافت کو تو مصر سے روم میں لے گئے مگر علوم اسلامی کو وہیں چھوڑ گئے۔ چنانچہ ان کا مرکز آج تک بھی مصر ہی ہے اور اس کے علمی احسانات کا فیض دنیائے اسلام میں برابر جاری ہے۔

خدایوی خاندان کے عہد میں علوم حاضرہ یعنی طب، قانون، زراعت اور انجینئرنگ وغیرہ کے کالج بھی مصر میں قائم ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں مصری طلباء مغربی ممالک میں بھی جا کر تعلیم حاصل کرتے

لے تیار ہو گئے۔ اور آخریت جگڑوں کے بعد ایک یعقوبی بطریق کی کرسی انھوں نے قائم کر لی لیکن رومی حکام بوجہ مذہبی تعصب کے ان کے اوپر برا بھلا کرتے رہے۔ اس وجہ سے اہل مصر نہ صرف قومی اور ملکی حیثیت سے بلکہ مذہبی لحاظ سے بھی رومیوں سے الگ اور بیزارتے۔ اور ان کی زبان 'ریم' ہاس اور ہر چیز کو انھوں نے چھوڑ دیا تھا۔

سنہ ۱۱۷۱ء میں جب ہرقل قسطنطنیہ کے تحت پر مٹیا تو اس کی غفلت اور پیش پستی کو دیکھ کر ایرانیوں نے مشرق میں چڑھائی کر دی اور شام و فلسطین لیے ہوئے مصر پر پڑے۔ رومی سپہ سالار نیکیٹس مقابلہ سے عاجز رہا اور مصر چھوڑ کر چلا گیا۔ ایرانی قابض ہو گئے۔ انھوں نے مصریوں کے مذہب میں دخل نہیں دیا جس کی وجہ سے ان کو اس مشرقی دولت کے سایہ میں امن نصیب ہوا اور انھوں نے اپنے پشوا بینین کو مصر کے بطریق کی کرسی پر بٹھا دیا جس کی تمام ملک میں خوشی مانی گئی۔ لیکن یہ خوشی زیادہ عرصہ قائم نہیں رہی کیونکہ ہرقل نے خواب غفلت سے بیدار ہو کر سنہ ۱۱۷۳ء میں ایرانیوں پر حملہ کیا اور اپنے سارے علاقے ان سے واپس لے لئے جس کی شہین گوئی قرآن کریم میں کی گئی تھی کہ

غلبت الروم فی ادنی الاوض وحمہ من بعد | رومی قریب کی سرزمین میں منسوب ہو گئے لیکن وہ منسوب غلبہم سیغلبون فی بضع سنین | ہو جانے کے بعد چند سال میں غالب آجائیں گے۔

اب رومیوں نے جوش انتقام میں مصریوں پر بہت سختی شروع کی۔ بنیامین خوف سے بھاگ گیا مگر اس کا بھائی مینا گرفتار ہو گیا۔ رومیوں نے اس کو مجبور کیا کہ غلقدونی فیصلہ کو تسلیم کر لے۔ اس نے انکار کیا۔ اس پر اس کے چہرہ کو مشعل سے یہاں تک جلایا کہ چربی پکھنے لگی مگر وہ اپنے قول پر قائم رہا۔ پھر اس کے دانت ایک ایک کر کے اکھاڑ ڈالے اس پر بھی وہ اپنے عقیدہ سے نہیں ہچرا۔ اس کے بعد اس کو ریت کے تیلے میں ڈال کر ساحل پر لے گئے اور عین بار کما کہ غلقدونی عقیدہ کو مان لے تو جان بخشی کر دی جائیگی۔ جب اس نے نہیں مانا تو سمدر میں غرق کر دیا گیا۔ اہل مصر ان سختیوں سے تالاں تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح رومی یہاں سے نکل جائیں۔

ہرقل نے ایک قبلی شراذمیں متوقس کو اپنے پاس رکھ کر تربیت دی تھی جو بخلات اپنی قوم کے

ملی عہدہ کا تھا۔ اسی کو مصریوں کی سیاست کے لئے مصر کا والی بنایا تھا لیکن وہ بھی کچھ دنوں کے بعد وہیں کے مظالم دیکھ کر درپردہ بیوقوفی ہو گیا تھا اور اپنی قوم کی طرف داری کرنے لگا تھا جس کی وجہ سے اس میں اور رومی الٹی کشمکش میں سخت مخالفت ہو گئی تھی۔ اسی درمیان میں اسلامی حملہ ہوا قبطیوں نے عرب کے انصاف اور رواداری کو دیکھ کر ان کا ساتھ دیا اور لڑائیوں میں مدد پہنچائی۔ خود مقوقس نے بھی ان سے مصالحت کر کے رومیوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ فتح کے بعد عمرو بن عاص نے مصریوں کو مذہبی آزادی بخشی۔ ان کے عزیز ترین پیشوا بنیامین کو جو تیرہ سال سے وادی نظرون میں روپوش تھا بلا کر اسلندریہ کی بحریرق کی کرسی عطا فرمائی۔ اس کا شاندار استقبال کرایا اور کنفیہ کے متعین اس نے جو جو درخواستیں کیں سب منظور فرمائیں۔ ان کے اس برتاؤ سے تمام قبطیوں کے دلوں میں مسلمانوں کا اسلام کا محبت پیدا ہوئی۔ اسقف یاسلی نے اپنی تقریریں کہا کہ

دین سے خارج ستم پیشہ رومیوں کے جو رد و ظلم کے

دیکھتا ہوں۔

اسقف ساویرس نے کہا کہ

آج کے دن ہماری بیڑیاں کٹ گئیں اور ہم آزاد ہو گئے۔

قبطیوں نے مسلمانوں کے تقویٰ، دیانت، راستبازی، عدل اور سادات وغیرہ بے نظیر اوصاف کو دیکھ کر اسلام کی طرف قدم بڑھایا اور قبیلے کے قبیلے اور خاندان کے خاندان مسلمان ہوئے گئے۔ مقوقس کا خود اسلام لانا تو ثابت نہیں مگر اس کا ماموں زاد بھائی شطانامی مسلمان ہو گیا۔ اس نے ہزاروں قبطیوں کو مسلمان بنا کر ایک فوج مرتب کی اور اسلامی لشکر کے ساتھ جہاد کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے شریک ہو گیا تینیس کے معرکہ میں شہادت پائی قبطیوں نے اس کو دیماط کے باہر دفن کیا۔ اس کی اس قدر عظمت اور محبت ان کے دلوں میں تھی کہ اس کی برسی منانے لگے چنانچہ آج تک ہر سال پانچویں شعبان کو جو اس کی شہادت کا دن ہے اس کی قبر پر سیلہ لگتا ہے۔

۹۲ء سے جب سے کہ مصر کا دفتر عربی زبان میں منتقل کر لیا گیا قبطیوں نے عربی زبان

اور علوم کی تحصیل شروع کی اور کثرت کے ساتھ اسلام لائے گئے۔

اہل عرب نے ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی قائم کئے اور ان کو بالکل اپنے برابر رکھا اس اختلاف کی وجہ سے بہت تھوڑے عرصہ میں نہ صرف زبان و لباس بلکہ دین اور اخلاق کے لحاظ سے بھی وہ بالکل عرب ہو گئے۔

اسلامی مذاہب کے لحاظ سے وہاں زیادہ تر مذہب شافعی پھیلا کیونکہ امام شافعی خود وہاں پہنچ گئے تھے۔ دیگر مذاہب کے علماء کے ذریعہ سے ان کے مذاہب بھی پہنچے۔

خلافت فاطمیہ کے عہد میں اسماعیلیت کی اشاعت ہوئی۔ اس کے لئے ایک خاص مرکز انہوں نے قائم کیا تھا جس کے رئیس کا لقب داعی الدعوت تھا اور جس کا درجہ قاضی القضاۃ کے برابر سمجھا جاتا تھا اس میں طریق دعوت اور اسرار امت کی تلقین کر کے مبلغین دوسرے ممالک میں بھیجے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ملیہ کی باطنی جماعت کا تعلق تھا جو مہنگ کے استعمال کی وجہ سے متشنیں کہے جاتے تھے اور عراق کی سرطلی جماعت کا بھی جس نے بغداد کی عباسی خلافت کو مضطرب رکھا تھا حسن بن صباح کوہ الموت کی بہشت کا شہاد بھی اسی مرکز کا تعلیم یافتہ تھا۔

یہ جماعتیں ایک عرصہ تک قائم رہیں۔ آخر میں ان کو ہلاک کرنے اور باقی ماندہ کو ملک ظاہر ہریرا نے ساتویں صدی ہجری کے وسط میں ناک کیا۔ فاطمیہ نے اپنے عہد میں مصر میں چار مذاہب کے قاضی مقرر کئے تھے شافعی، مالکی، اسماعیلی اور اشاعری۔

فاطمیہ کے بعد ایوبی عہد میں اسماعیلیت مٹ گئی اور پھر شافعی مذاہب کو غلبہ ہو گیا اور اس کے قاضی مقرر ہونے لگے۔ اسی خاندان کے آخری تاجداروں میں ملک صالح نجم الدین کی کینز خاتون شجرۃ الدر تھی۔ اسی کے عہد سے مصری محل یعنی خلافت کعبہ ہر سال مصر سے مکہ کو بھیجا جانے لگا جس کا سلسلہ برابر جاری تھا مگر ادھر ہر پانچ سال سے بعض وجوہ سے بند ہو گیا ہے۔

ملک ظاہر ہریرا نے اپنے عہد میں پھر چار قاضیوں کی رسم جاری کی۔ مگر یہ منیوں کے چاروں فرقوں کے ہوتے تھے۔ غالباً اس کے عہد میں حرم مکہ میں چاروں مذہب بھی الگ

ملک قائم کئے گئے۔

مالیک بھری تیر مالیک چرس نے اپنے اپنے نانوں میں مصر میں بڑی بڑی مسجدیں اور خانقاہیں
تیر کرائیں بلکہ مصر کی زیادہ تاریخی یادگاریں انہیں کے عہد کی ہیں۔ ان کے زمانہ میں دیوثی اور فقری کا
زیادہ رواج ہوا۔

صوف کا اثر بھی مصر میں کم نہ تھا بلکہ حضرت ذوالنون متوفی ۴۸۰ھ بن کور سالہ شیرینہ میں اسلامی
صوف کا بانی کہا گیا ہے مصری کے مقام انجم کے باشندے تھے۔ شیخ ابن فارض کے پڑپڑ معرفت تھانہ
بھی مصری کی برکات ہیں۔ وہاں کے صوفیہ کبار میں سے رفاعہ بن احمد اور سید احمد جدی خصوصیت کے
ساتھ شہرت رکھتے ہیں جن کے پیرو لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں ترجمہ ۱۰۰ کے حصہ ۲، صفحہ ۱۰۱
ردیفوں کے تکیے اور زاوے پائے جاتے ہیں خاصکر قاہرہ میں
عربوں کے احتلاط اور مسادات نے قبیلوں کو بہت
کہ وہ ہر لحاظ سے عرب ہو گئے اور ان کی نہ صرف دینی اور اخلاقی

عرب کی تھی۔ ان میں زیادہ تر انہیں علوم نے رواج پایا جو خالص عربی سے یہی تھیں نہ یہ۔ یہ عرب
سیرۃ و تاسخ و غیرہ برخلاف عربوں کے علوم و خیلہ یعنی منطق و فلسفہ و غیرہ کی طرف انکار و جان کم رہا۔
یونانیوں اور رومیوں کی صدیوں غلامی نے اہل مصر کے شجاعانہ جذبات کو تقریباً فنا کر دیا تھا مگر
اسلام کی بدولت پھر وہ زندہ ہو گئے۔ چنانچہ ان لڑائیوں میں جو عہد اسلام میں پیش آئیں ان کی ببادی اور
شجاعت، دوسری مسلمان قوم سے درجہ دوم پر نظر نہیں آتی۔

صلیبوں کو جن کے مقابلہ کی سوائے نور الدین زنگی شہید کے خلافت عباسیہ نے بھی کبھی جرات
نہیں کی آخر میں مصریوں ہی نے سرزمین مقدس سے نکالا۔ تاتاریوں نے مشرق سے لیکر مغرب تک
اسلامی ممالک کو تاخت و تاراج کر ڈالا تھا مگر شام سے مصریوں ہی نے ان کا منہ پھیرا۔ بلکہ ۷۴۰ھ میں
بغداد بھی ان سے واپس لیا۔ ۷۴۰ھ میں ابا قباغاں سپر ملا کو نے جب عراق غم پر چڑھائی کی تو ملک
ظاہر ہرے نے پیرچ کر ایسی ہزیمت دی کہ تقریباً ایک لاکھ انہیں میدان جنگ میں چھوڑ کر وہ بھاگا۔ اسی

طرح دوبارہ منتہ میں جب وہ پھر اپنی پوری طاقت سے حملہ آور ہوا اس وقت ملک منصور قلاؤن نے
پہنچ کر ہر رجب کو محصل کے متصل اس کو شکست دی جس کے بعد کبھی مصر کی طرف رخ کرنے کی ہمت
نہ ہوئی۔ انگریز مصریوں نے ہر مقابلہ میں تقریباً وہی شجاعت اور سیاست دکھلائی جو عرب دکھلاتے تھے۔
صنعت

مصر کی قدیمی صنعت قصب بنی تھی۔ اسلامی عہد میں خاص کر فاطمیہ کے زمانہ میں اس کو خصوصیت کے
ساتھ ترقی ہوئی اور قصب مصری دنیا بھر میں جانے لگا۔ دوسری صنعت سنگ تراشی تھی۔ نہ صرف ان کے
پر بنے بت بلکہ قدیمی عمارتیں وغیرہ بھی ایک قسم کی سنگ تراشی ہی کہی جاسکتی ہیں۔ بڑا ہرم جو تقریباً پندرہ
ایکڑ زمین پر واقع ہے صرف ترشے ہوئے چوکور ۲۳ لاکھ پتھروں کا مجموعہ ہے اور کچھ نہیں ماسلامی زمانہ میں
معاذہ مسجد اور محلات وغیرہ کی بدولت مصر میں فن تعمیر آیا اور جوں جون زمانہ گزرتا گیا اس میں ترقی ہوتی گئی۔
چنانچہ مالیک کے عہد کی عمارتیں اپنی خوبیوں کے لحاظ سے فن تعمیر کا عمدہ نمونہ شمار کی گئی ہیں اور قلعہ قدسی
کے بیان کے مطابق ان کے کتبے دینکے جملہ عربی کتبوں سے خوشنما ہیں۔

مردم شماری

ہیرڈوڈس نے کہا ہے کہ مصر میں دو نہر اتر ہیں۔ دیودورس نے وہاں کی آبادی ستر لاکھ لکھی ہے
اور بومیفوس یہودی نے اپنی کتاب آثار الاسرائیلیین میں ۵۰ لاکھ۔ اسلامی عہد میں یہ تعداد بڑھ کر دو کروڑ
ملک پہنچ گئی تھی مگر خلفاء فاطمیہ اور فاطمہ مالیک کے زمانہ میں اندرونی فتنوں، صلیبی جنگوں، بلاؤں، وباؤں
فتلوں اور سب سے بڑھ کر بظلمیوں کی وجہ سے گھٹ کر صرف تین تیس لاکھ رہ گئی۔ خدیوی عہد سے پھر
ترقی پر ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء کی مردم شماری تقریباً ۱۲ ملین تھی جس میں سے صرف ایک ملین غیر مسلم ہیں اور باقی مسلمان۔
ان غیر مسلموں میں بڑی تعداد یونانیوں کی ہے جو عربی خوب بوسے اور کھتے ہیں۔ زیادہ تر اہل دفاتر اور
قانون پیشہ لوگ ہیں۔ ان کے علاوہ انگریز، فرانسیسی، اطالین، جرمن اور آرمین وغیرہ ہیں۔ قدیم طبعی مصری
جو معقوبی فرقہ کے مصلابی ہیں اب آٹھ ہزار سے زیادہ نہیں ہیں۔

اناطول فرانس کا فلسفہ زندگی

انسانی زندگی

مال میں میری نظر سے ایک کتاب گذری ہے جس میں مصنف صاحب نے جو فلسفی بھی ہیں اور شاعر بھی، ہمارے تعارف ایک ایسی قوم سے کر لیا ہے جو رنج، خوشی، ذوق، ہمنواں سب سے بالکل بری ہے، مگر اس خیالی دنیا سے نکل کر جب ہم اپنے چاروں طرف انسانوں کو زندگی کا حقیقی منظر دیکھتے ہیں تو ہمارے دل میں ان کی کتنی جگہ ملتی ہے اور ان اطمینان پوتا ہے! اس وقت ہم کو احساس ہوتا ہے کہ سچی

درو کی دوا بھوٹ بنے والے درو آشنادخت کے زخموں سے۔

حاصل ہو سکتی ہے۔ اس خیالی دنیا کے باشندوں نے جذبات اور خواہشات کو فنا کر کے نبوی اور ربی، تم اور لطف، نیکی اور بدی، ذوق حسن بلکہ خود جو ہر اخلاق ان سب کو بھی مٹا دیا ہے۔ وہ لوگ عقل مند ضرور ہیں مگر ان کی کوئی قدر قیمت نہیں ہے۔ کیا وقعت ہے اس کام کی جو بلا کوشش اور دقت کے ہو سکے؟ کیا وقت ہے اس زندگی کی جو دروازہ ہو مگر جوش حیات سے خالی، جو پوری طرح سے بسر نہ کی جائے صرف کاٹی جائے؟

اس کتاب کے مطالعہ سے مجھے انسان کی موجودہ حالت بہت کچھ عزیز ہو گئی ہے، اس رنج و غم کی زندگی سے میں بہت کچھ مانوس ہو گیا ہوں، میرے دل میں اپنے ہم صنموں کی قدر زیادہ ہو گئی ہے اور انسانی ہمدردی کا جذبہ پھر ابھر آیا ہے۔ اس کتاب میں ایک یہ بھی خوبی ہے کہ یہ ہم کو واقعات سے رغبت دلاتی ہے اور وہم و خیال سے خبردار کرتی ہے۔ ہمارے سامنے ایسے لوگوں کو پیش کر کے جو تمام برائیوں سے بری ہیں یہ ہم کو دکھاتی ہے کہ وہ ”خوش قسمت“ لوگ دراصل ہم سے کمتر ہیں اور اپنی حالت

کو ان کی حالت سے دیکھنا اگر ممکن بھی ہو تب بھی ہماری انتہائی بیوقوفی ہوگی۔

وہ "خوش نصیب" لوگ بھی کس قدر بد نصیب ہیں جو جذبات کو رد کر کے "ارٹ" کو بھی کھینچے ہیں! بلا اہل ہیں کوئی شاعر کیونکر پیدا ہو سکتا ہے جبکہ وہ نہ تو زمیہ شاعری سے لطف اٹھا سکتے ہیں جو محبت اور نفرت کے تمام غیر جذبات پر منحصر ہے نہ وہ ظریفانہ شاعری سے خط موصول کر سکتے ہیں جو انسان کی ہلکے خیز خامیوں پر مبنی ہے، "وید" اور "فائدہ" دونوں ان بیچاروں کی سمجھ سے باہر اور ان کے خیال سے بالا ہیں۔ ان کی "سنگٹیں" ان کے کان دونوں اس شاعری سے محروم ہیں جو ہماری دنیا میں جنت کی خوبیاں پیدا کر دیتی ہے۔ ان میں ایک "دگر گل" بھی نہیں ہے پھر بھی ہم سمجھتے ہیں کہ ان کو خوشی حاصل ہو! محض اس وجہ سے کہ وہ کبلی کی مدد سے زینوں کی زحمت برداشت کئے بغیر مکان کی ایک منزل سے دوسری منزل پر جا سکتے ہیں! حالانکہ سچ پوچھو تو دنیا کی خوشی میں تمام بہترین شینوں کے مقابلہ میں ایک خوبصورت مصرعہ سے کم ہیں زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔

ترقی! بے پناہ ترقی! ان انجیر لوگوں میں نہ تو جذبات ہوتے ہیں نہ شاعری نہ محبت۔ افسوس! وہ محبت کو کیا جانیں! وہ تو خوش اور مطمئن ہیں! محبت کی کبلی طرف غم ہی کی فضا میں کھلتی ہے۔ ایک گرفتار محبت کی عرض حال ایک مصیبت زدہ کانا نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک انگریزی شاعر در محبت سے متاثر ہو کر کہتا ہے "اگر میری جگہ کوئی دیوتا مانتا تو اس کا رنج سے کیا حال نہ ہوا ہوتا! ایک دیوتا میں نہ تو اتنی قوت برداشت ہے کہ تیرا دیا ہوا غم سہہ سکے نہ اس کی اہلیت ہے کہ تیرے قدموں پر اپنی جان نثار کر سکے۔"

ہم کو چاہئے کہ ہم رنج و غم سے صلح کر لیں اور یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جہاں تک ہماری عقل کی

لے دو دینائی عورتیں جن کی دردناک زندگی کی روایتیں مشہور ہیں۔ دونوں جذبات کے علاوہ کامیاب نہیں اور دونوں کی زندگی کا خاتمہ خودکشی ہی پر ہوا۔

مٹے لاطینی زبان کا سب سے بڑا شاعر جس کو انگریزی میں "ڈیل" (Dante) کہتے ہیں۔

شیطان کا دم دکرم | برائی کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اگر وہ نعمتی تو اچھائی بھی نہ ہوتی۔ اچھائی کا وجود ہی برائی کے وجود پر مبنی ہے۔ اگر خوفِ حق تو بہادری ایک بے سنی خیال ہے، اگر مصیبت اور غمِ نموں تو ترس اور ہمدردی کا ہونا بھی ممکن نہیں جس دنیا میں خوشی ہی خوشی ہو وہاں خدمت اور ایثار کے کیا سنی جب تک بدی نہ ہو نیکی ایک مہل لفظ ہے، بغیر نفرت کے محبت ناممکن ہے، خوبصورتی کا خیال بدصورتی کے خیال سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ محض برائی کا صدقہ ہے کہ دنیا رہنے کے قابل ہے، غم ہی کی بدولت زندگی قابلِ برداشت ہے۔ لہذا شیطان کو بجائے برا بھلا کہنے کے ہم کو اس کا احسان ماننا چاہئے اور اس کی صناعت اور دانشمندی کی داد دینا چاہئے۔ کم از کم آدمی دنیا تو اسی کی کارگیری ہے اور اس آدمی اور دوسری آدمی کا اس طرح گوشت اور ناخن کا ساتھ ہے کہ اگر ایک کو پھیرا تو دوسری کو صدمہ پہونچنا لازمی ہے۔ ہر بدی کے ساتھ کوئی نہ کوئی نیکی لگی ہوئی ہے اور بغیر اس نیکی کو مٹائے بدی کو فٹ کرنا ممکن نہیں۔

کچھ عرصہ ہو ایسے دیہات کے ایک میلے میں گیا اور وہاں کٹھ پتلیوں کا تماشہ دیکھنے لگا۔ حضرت آنتھونی کی نقل ہو رہی تھی۔ یہ وہ تماشہ ہے جس کے فلسفہ کے سامنے شیکسپیر کے تمام ایسے اور ہلکے دنیوی صاحب کے تمام ڈرامے سب ایچ ہیں۔ خدا اور شیطان، دونوں کے رحم و کرم کو کس قدر واضح طور پر دکھا دکھایا ہے!

جب پردہ اٹھا تو تماشہ گاہ (اسٹیج) پر ایک بیسٹک ریگٹان نظر آیا مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ

لے یہ میری صدی عیسوی کے آخر اور چوتھی کے شروع میں ایک بہت بڑے عیسائی ولی گزرے ہیں۔ یہ مصر کے باشندے تھے اور ہر سوں افریقہ کے ریگٹانوں میں خدا کی عبادت میں مشغول رہے۔ وہاں ان کی سخت سے سخت آزمائش ہوئی۔ شیطان طرح طرح کے بھیس بدل کر آتا تھا اور کبھی ان کو درغلطاتا تھا، کبھی لالچ دلاتا تھا کبھی ناقابلِ برداشت زرد کو ب بھی کرتا تھا مگر حضرت آنتھونی ایمان کے راستے سے نہ ہٹے اور امتحان میں پورے

اترے۔

فرشتوں اور شیطانوں سے بھر گیا۔ کچھ تو ان فرشتوں اور شیطانوں کے تماشا گاہ پر باری باری آنے سے اور کچھ کٹھن تیلیوں کی چال ڈھال سے یہ شروع ہی سے خیال ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا کے حکم سے ہو رہا ہے یا یوں کہے قسمت کا لکھا پورا ہو رہا ہے۔ پھر بھی جب حضرت آنتھونی نے حمد اور دعا ختم کی اور سجدے سے سر اٹھایا۔ ان کی پیشانی بے شمار سجدوں سے اونٹ کی مٹی کی طرح سخت اور گٹھے دار ہو گئی تھی اور ان کی آنسو بھری آنکھوں کے سامنے ملکہ سبائے سنہرے لباس میں ناز و انداز سے ہنستی اور دونوں ہاتھ پھیلائے دکھائی دی تو ہمارے بدن میں سنسنی پڑ گئی اور ہمارا دل اس اندیشہ سے دھڑکنے لگا کہ کیاں حضرت آنتھونی ملکہ سبائے جال میں پھنس نہ جائیں۔ اسی طرہ ان کی باقی آزمائشوں اور صیبتوں کو بھی ہم اپنا دل تھامے دیکھتے رہے۔

حضرت آنتھونی کے ساتھ ہماری پرچش ہمدردی،

آپ کو دیکھتے تھے۔ جب ان کی فتح ہوئی تو وہ ہماری فتح تھی۔
اس جدوجہد میں جو ازل سے جاری ہے اور اب تک جاری

انقصہ حضرت آنتھونی جو اتنے بڑے ولی ہیں تو محض اس وجہ سے کہ وہ ملکہ سبائے جال میں نہ پھنسے اور آزمائش میں پورے اترے اگر ہم اتنا مانتے ہیں تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شیطان نے ملکہ سبائے حضرت آنتھونی کے پاس بھیج کر وہ کام کیا جس کے بغیر وہ دلی ہو ہی نہیں سکتے تھے۔
اس طرح کٹھن تیلیوں نے میرے اس یقین کو کامل کر دیا کہ دنیا میں اچھائی سے پہلے برائی کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ شیطان ہی وہ ستون ہے جس کے سہارے دنیا کی ساری اخلاقی خوبیاں قائم ہیں۔

الفاظ کا جادو | میرے سامنے یہ کتاب ہے اور مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ جس طرح قدرت ہم کو اپنی موزونیت کے نادر لمحوں میں طرح طرح کی شکلوں اور رنگوں سے فرحت بخشی ہے اسی طرح چند نغموں میں جو کسی زبان سے مانگ لئے جائیں اسی قوت سے کہ وہ ہمارے دل و دماغ میں سرور پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ چند اشارے ہمارے دماغ میں الہامی تصویریں کھینچ دیتے ہیں۔ اسی کو میں

مہذبہ کتبہوں۔ ایک خوبصورت شعر ہماری روح کے راگ بھرے تاروں کو چھیڑنے میں اس مضراب کا کام کرتا ہے جو کسی استاد کی انگلی میں ہو۔ شاعر ہمارے گوش دل کو اپنے خیالات نہیں ہمارے ہی خیالات کے گیت سناتا ہے۔ جب وہ اپنی محبوبہ کا ذکر کرتا ہے تو ہمارے دلوں میں ہمارے اپنے وصل اور مجھ کے قصے تازہ ہو جاتے ہیں۔ شاعر کو دراصل روح کا جگانے والا کنا چاہئے۔ جب ہم اس کے مطلب کو بھی طرح سمجھ لیتے ہیں تو ہم خود شاعر ہو جاتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک میں ہمارے تمام شاعروں کا ایک نمونہ موجود ہے۔ اول نونوں سے کوئی بھی واقف نہیں ہے اور جب ہم میں اس نذرے کا نویہ نمونے بھی سب ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے۔

بجلا یہ ممکن تھا کہ اگر یہ شاعر وہی باتیں نہ کہتے جو ہمارے دل میں ہیں تو ہم کو ان کے کلام سے اس قدر رغبت ہوتی؟ ہرگز نہیں یہ محض خام خیالی ہے۔ بلند سے بلند خیالات کا شاعر بھی اصل میں خود ہیں اور خود پرست ہے۔ اس میں خودی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور کچھ بھی نہیں۔ ہر شاعر نے اپنے کلام میں اپنی ہی تصویر کھینچی ہے اور ہم اس میں صرف اپنی تصویر دیکھتے ہیں۔ شاعر محبت کی راہ دکھاتا ہے اور ہمیں اس منزل میں سہارا دیتا ہے۔ بس اتنا ہی شاعروں سے فائدہ ہے یہی ان کا کام ہے اور یہ ان کی پیاری خود پسندی کو تسکین دینے کے لئے بھی کافی ہے۔ ان کے اشعار کی تعریف کرنا اسی قدر فضول ہے جس قدر عورت کی تعریف کرنا۔ جن شعروں کا اثر دل سب سے زیادہ قبول کرے گا وہی سب سے زیادہ خوبصورت ہوں گے۔ رہا لوگوں سے یہ قبول کرنا کہ ہماری پسند لا جواب ہے یہ تو خدائی فوجداروں کا کام ہے نہ کسی سمجھدار آدمی کا۔

ادبُ الجاخط

عنوان بالا سے ابھی حال میں ایک کتاب مصر سے شائع ہوئی جو کتاب صوری و مصنوعی ہر اعتبار سے نہایت دیدہ و زیب و دلپذیر ہے۔ مفاصل مؤلف کا نام "حسن السندوبی" ہے۔ سندوبی صاحب مصر کے اہل انشاء میں ایک مرتبہ خاص کے مالک ہیں۔ تلاوش و جستجو حرح و تنقید اور روایت و روایت کا نہایت خوبی سے استعمال کیا ہے اور چرچہ یہ ہے کہ نگینۂ عبارت اور حسن بیان بھی اس کتاب کی خصوصیت خاصہ ہے۔

اصل کتاب دُعاۃِ سوسنحات کو محیط ہے، میں نے۔

کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں، یعنی کوئی تاہم ہا۔

اتنے نہ ہوں کہ گراں گزریں۔

قبل اس کے کہ اصل موضوع شرمع کر دوں، یہ ظاہر کر دینا ضرور ہے۔ مولینا سورتی صاحب مدظلہ سے محض مطالعہ کی غرض سے لایا تھا۔ کتاب کے پڑھنے کے بعد میری بھی یہی رائے ہوئی کہ اس کے ضروری حصص کا ترجمہ کر دوں اور مولینا موصوف نے بھی یہی ارشاد فرمایا۔ اس لئے مولینا سورتی صاحب کجنگریہ واجب ہے کہ ان کی عنایت و شفقت سے یہ کتاب میرے پاس اتنے دنوں رہی کہ میں اس کے ضروری مباحث اردو میں منتقل کر سکوں۔

رئیس احمد جعفری ندوی

اصل و نسب | سلسلہ نسب ابو عثمان عمرو بن بحر بن محبوب بن قزارة الیشی کنعانی ہے، بعض ارباب سیرت بیان ہے کہ قزارة ابو القلس عمرو بن قلع الفقی کا غلام تھا، قلس کی اصابت رائے اور نفوذ اثر کا ہر شخص معترف تھا۔ یہ جس مہینہ کو چاہتا تھا حلال کر دیتا تھا، جس مہینہ کو چاہتا تھا حرام کر دیتا تھا۔ یہ خصوصیت و اقتدار

اس کے خاندان میں نسل ابعد نسل قائم رہی عرب میں اس شان کا نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ کسی میں یہ جرأت تھی کہ اس کی کسی رائے کی مخالفت کر سکتا۔

اس معتد رفاندان میں جاخط نے اپنے ایام نشو و نما پورے کئے اور نہ صرف اس نے بلکہ اس کے آبا و اجداد نے بھی ہمیں پرورش پائی۔ یوت بن المزیع کہتا ہے کہ فزارہ ایک سیاہ رو آدمی تھا اور عمر بن قلع کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔

یہاں سے جاخط کی عربیت اونیل کے متعلق ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جاخط عربی ساسی نسل سے تھا یا قرب و جوار کی وجہ سے افریقی عناصر عربی عناصر میں مزوج ہو گئے؟ یا اس کے آبا و اجداد میں سے کوئی غلام تھا یا اس کی نسل غلامی کی کدورتوں اور آلائشوں سے پاک تھی؟ اور وہ اچھا خاصا ”حر“ پیدا ہوا تھا؟

میرا جواب تو یہ ہے کہ سیاہ رنگ ہونا تو عربی الاصل ہونے کے خلاف کوئی مقول دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ یہ رنگ عربوں میں پایا جاتا تھا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس رنگ پر فخر بھی کیا جاتا تھا۔ بہت سے ایسے لوگ تھے جو اسے پسند کرتے تھے، محبوب رکھتے تھے اور دوسرے رنگوں پر اسے ترجیح دیتے تھے، لہذا جاخط کے جد املا کا سیاہ رنگ ہونا اس کی تعجیت کی دلیل کیوں کر ہو سکتا ہے؟

دہی غلامی تو ماہرین انساب و اخبار دور وادہ میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ اس کے آبا و اجداد میں کوئی بھی غلام رہا ہے؟ اسی طرح یہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ اس کے اسلاف میں سے کوئی شخص کبھی اسیر کیا گیا ہو۔

فزارہ کو آل فقیہ کا ”مولیٰ“ کہتے ہیں، تو لفظ ”ولا“ حریت کی نفی کب کرتا ہے؟ یہ لفظ تو محب، صدیق، نصیر، غلام، آزاد سب منطبق ہوتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے معنوں میں

دعا فی صفحہ ۴۱۱، اصطلاح میں اسے ”منی“ کہتے ہیں، قرآن مجید کی یہ آیت اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے ”انما انسی زیادہ

فی الکفر فیصل بہ الذین کفرو ایلو نہ علما و یحرمونہ مانا“ ۱۷۔

استعمال جتنا ہے، ایک صحیح نسب قبیلہ دوسرے قبیلہ کا ہمیشہ ”مولیٰ“ رہا کرتا تھا۔

اب خود جاحظ کو یچے۔ اس کی کتابوں اور روایتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عربیت میں اسے بہت غلو تھا، کسی قوم کو عرب سے افضل و اعلیٰ وہ تسلیم ہی نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اس قدر اپنے اس نیل میں متشب تھا کہ انسانیت کی ہر فضیلت، بزرگی اور اولیت کا ہر ادہ عرب ہی کے سر رکھتا تھا۔ اس کے باوجود محققین نے اعتراف کیا ہے کہ جاحظ خالص النسب عرب تھا، ابو القاسم لمی اور ابن حزم کہتے ہیں کہ وہ عرب تھا، عرب خاندان سے تھا اور عرب کے ایسے گھرانہ میں پرورش پائی کہ مجدد شرف اس کے رگ ریشہ میں پیوست ہو گیا۔

لقب | لقب جاحظ تھا ”اس لئے کہ وہ بہت ہی مشکل تھا“ اس کی ہنگامہ نہ بٹھٹھ نہ ... کے علم فضل کے آگے یہ عیب کوئی اہمیت نہیں رکھتا، ”ما ظمربا“ سے بھی زیادہ بد شکل و بد توارہ تھے مثلاً شیخ الفلاسفہ سقا۔

اور ہونٹ موٹے موٹے تھے، جاحظ تو بہر حال سقراط سے کم تھا۔ ”عرد کوئی نہیں لیتا، اس کی کنیت“ ابو عثمان ”سے کوئی یاد کرتا ہے، کتنا ہے تو جاحظ۔“

جہاں تک جاحظ کا تعلق ہے وہ اس لقب (جاحظ) کو بہت ناپسند کرتا تھا اور جو کوئی اسے اس لقب سے پکارتا تھا تو وہ برا مانتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ لوگ اس کا اصلی نام یاد کریں۔ وہ اپنے اصلی نام ”عرد“ سے اتنا خوش تھا کہ کہا کرتا تھا کہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں یہ نام بہادوں کے لئے، بادشاہوں کے لئے، سرداروں کے لئے، رئیسوں کے لئے، مخصوص رہا مثلاً عمرو بن سعید الکبر عمرو بن العاص، عمرو بن معدیکرب وغیرہ۔

وہ کہا کرتا تھا لوگ مجھے ”عرد بن جبر“ کیوں نہیں کہتے؟ یہ کیا ہے جس کو دیکھئے وہ اسی اصل لقب جاحظ سے یاد کر رہا ہے۔“

بات بھی یہی ہے کہ جب کوئی لقب آدمی کے کسی عیب کو ظاہر کرتا ہو تو برا معلوم ہی ہوتا ہے اگر جاحظ کو یہ معلوم ہوتا کہ اس کا یہ لقب بڑے بڑے لوگوں کے لئے باعث شرف و مجد ہوگا بلکہ معیار

فضیلت قرار دیا جائے گا تو شاید وہ خوش ہوتا بلکہ بعض مرتبہ تو یہ خطاب دوسروں کے لئے خصوصیت کا سبب بھی بن جاتا تھا اور ویسے ایک مستقل فضیلت تو تھی ہی۔ ابو جہان توحیدی ابن علیہ سے اس لئے برسرِ پناش تھے کہ ”باحظ ثانی“ وہ بھی کہلاتے تھے مالانکہ وہ صرف اپنے تئیں اس خطاب جلیل کا حقدار سمجھتے تھے، محمود بن غزیز، میا فاضل اہل ”باحظ ثانی“ کے شرف کا مالک تھا، ابو محمد امین بن خلّاف کے متعلق ابن ندیم کہتا ہے کہ ”وہ باخط کے مسلک کے پیرو تھے۔ ابو القاسم آندی جیسے شخص کے متعلق ابن ندیم ان کے مصنفات کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے ”وہ باخط کے ہم مذہب تھے۔“

مولد و نشا | باخط کے مولد کے بارے میں مورخین اور رواۃ میں اختلاف ہے، بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اسکی ولادت ۱۵۹ھ میں ہوئی، بعض کچھ اور کہتے ہیں، لیکن صحیح تر روایت خود باخط کی ہے جسے یا قوت نے اپنی ”معجم“ میں نقل کیا ہے کہ باخط کہتا تھا ”میں ابو نواس سے ایک سال بڑا ہوں۔ میں ۱۵۹ھ کے اوائل میں کتم مردم سے عالم وجود میں آیا، اور وہ اواخر میں.....“ خود باخط کی اس ”نفس“ کے بعد شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

ابن خلکان کی روایت حد درجہ تعجب خیز ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد سے یہ قول نقل کیا ہے کہ ”ابو نواس کی پیدائش ۱۳۲ھ میں ہوئی لیکن اس قول کی اہمیت باخط کے اس قول سے ناکمل ہو جاتی ہے جس میں اس نے اپنی اور ابو نواس کی عمر بیان کی ہے۔ باخط بصرہ میں پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں بصرہ دکنہ ہی دوشہر تھے جو تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور لغت و ادب کے مرکز تھے۔ بغداد اس وقت تک بعد طغلیت میں تھا۔ اس کی عزائیت و حضارت ابھی اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی، اگرچہ عراق و تمدن کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

باخط کی نشو و نما بصرہ ہی میں ہوئی اور وہیں سے اس کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ بحث و استقرا اور علماء عصر سے استفادہ کی خاطر وہ بصرہ چھوڑ کے اس زمانے کے دوسرے اسلامی ممالک کی طرف گیا جہاں سے وہ کامیاب و کامران واپس ہوتا تھا، جب اس کی عمر پچاس سے متجاوز ہو گئی تو اس نے بغداد کا رخ کیا، اور اسی کو اپنا مستقل مستقر بنالیا۔ بغداد جب وہ پہنچا تو

امامون الرشید کا عہد سعادت تھا اس وقت تک بغلہ ترقی و سرفرازی کی ساری ستریں طے کر چکا تھا۔ بغداد میں اس کا داخلہ سترہ میں ہوا جب اس کے قیام کی شہرت ہوئی تو علماء و فضلاء کی ایک جماعت کی جماعت شائق زیارت ہو کر آئی اور طالبان علم کا تو دریا اُمڈ آیا ہر صنف اور ہر جنس کے طلبہ موجود تھے مسل و قوم کا کوئی امتیاز ہی نہیں تھا باحفظ کتا ہے ”نظار میرے پاس علم کلام حاصل کرنے کے لئے آیا“ لیکن اس کو اس فن سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ باحفظ کو علم حدیث سے کوئی لگاؤ نہیں تھا بسکن واقعہ یہ ہے کہ علوم حدیث میں بھی وہ کمال حاصل کر چکا تھا اور مسندوں کی زینت بن چکا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ بصرہ میں تھا اور ابی نعید او نہیں گیا تھا۔ خطیب بغدادی:

ہیں کہ جن لوگوں نے باحفظ سے حدیث کی سند لی ہے ان سے داؤد کہتے ہیں ”میں بصرہ میں تھا تو ایک بار باحفظ کے ہاں گئے

روشن و ان سے جھانکا اور پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا: اس ب

”کہا تم نے مجھے ”شویہ“ سے گفتگو کرتے کبھی دیکھا ہے؟ میں نے کہا میں ابو داؤد کا بیٹا ہوں۔ کہا ”افاہ“ ”اؤ۔ یہ کہہ کر وہ نیچے اتر آیا اور پوچھا کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا مجھ سے کوئی حدیث بیان کیجئے۔ کہا ”لکھو“ عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی حفصہ“ خطیب نے سلیمان بن اشعث سے ایک حدیث کی ہے کہ میں باحفظ کے ہاں گیا اور کہا کوئی حدیث بیان کیجئے۔ کہا ”لکھو“ عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اقمیت الصلوۃ فلا صلاۃ الا المکتوبہ۔ یہاں ایک غلط فہمی رفع ہو جانا چاہئے۔ یعنی باحفظ ہر محدث کی ”شویہ“ سے نہیں تعریف کرتا تھا۔ یہ خیال اس کا انہیں لوگوں کے متعلق تھا ج

سے ابو داؤد کا باحفظ سے ملائی ہوتا مشتبہ ہے (مستحکم)

سے ”مہل“ بے لوگ۔ سے ”قالین“ دری

لکھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اقامت ہو جائے تو فرض کے علاوہ اور نماز نہ پڑھنا چاہئے۔

لوگ کہتے تھے کہ کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔

عبد باطلہ کے اسلوب تعلیم | قبل اس کے کہ ہم اس امر پر گفتگو کریں کہ باطلہ کی تعلیم کیوں کر ہوئی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے اسلوب تعلیم کا ایک مختصر سا خاکہ بھی آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

غور و فکر اور بحث و استقراء کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں تعلیم و تعلم کا دستور یہ تھا کہ پہلے بچہ ابتدائی طور پر لکھنا پڑھنا سیکھتا تھا، پھر کچھ صرف و نحو کی تعلیم ہوتی تھی، پھر کچھ تہذیب و ادب کا مطالعہ کیا جاتا تھا، پھر قرآن مجید پورے طور سے قرأت وغیرہ کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا، اس کے بعد بچے کو کسی داستان گو کے سپرد کر دیتے تھے جو بادشاہوں کی جنگ و فتح کے قصے سناتا تھا، بہادریوں کے حالات بتاتا تھا، شہسواروں اور سپہ سالاروں کی کہانیاں سناتا تھا، اصحاب جنگ و جہل کی سیرت بیان کرتا تھا، اور یہ سب وہ اس طرح کرتا تھا کہ جہت و موعظت کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے پاتا تھا، یہ باتیں پورے طور سے بچے کے دل میں گھر کر جاتی تھیں، اسی سلسلہ میں عابدوں اور زاہدوں، غلو ت فشیون اور بزرگوں کے حالات بھی بیان کرتا جاتا تھا، ان متفرق معلومات پر عبور حاصل کر لینے کے بعد مساجد عامہ کے مقلماے درس میں شریک ہوتا تھا، فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد محدث کے حلقہ کا رخ کرتا تھا، پھر اہل نفعہ کی مجلس میں جاتا تھا، وہاں سے ماہرین انساب کے درس میں شریک ہوتا تھا، وہاں سے ماہرین اخبار و آثار کے پاس حاضر ہوتا تھا، پھر منطقی کی مجلس میں، وہاں سے فلسفی کے حباب میں، پھر منحل ادب میں، وہاں سے سندس کے ”محل“ میں، پھر مفسر کے ہاں نانوائے شاگردی تہ ہوتا تھا، وہاں سے اصولی و منطقی کی جماعت میں، پھر منحل روایت میں، اور وہاں سے شاعر کے مجلہ فکر و ذکر میں، پھر انشا پردازوں کے دفتر میں، اور وہاں سے منجمن کے رصد خانوں میں، پھر کیمی اسطرلابی کے حضور میں، اور وہاں سے کسی جغرافی کے سامنے، پھر بزم موسیقی کے کسی ”استاد“ کے دولت خانہ پر، وہاں سے کسی ساز و چنگ کے مرشد کے پاس، پھر کسی دف و نئے بجانیاوے کے گھر پر۔ یہ تھا اس عہد کے اسلوب تعلیم کا ایک مختصر خاکہ جس سے لڑکے اور لڑکیاں دونوں کو تہذیب و استعداد حصہ ملتا تھا۔

جب طالب علم اپنے علم و فن میں استحکام حاصل کر لیتا تھا تو اسے اپنے ”شیخ الجامعہ“ کی

طرف سے سنہلتی تھی۔ اس کے بعد اسے حق حاصل ہو جاتا تھا کہ وہ مسند درس و تدریس کو منجبال ہے، لیکن بہت سے ان اسناد پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے بعد بھی بادیہ گردی کرتے تھے۔ بڑے بڑے شیوخ و علماء سے ملاقات کرتے تھے، استفادہ کرتے تھے، مجلس مناظرہ منعقد کرتے تھے۔

اسی نظام و دستور کے مطابق باخظ نے بعبرہ اور کوفہ کے اکابر علماء سے تعلیم حاصل کی۔ جن لوگوں سے اس نے تعلیم حاصل کی، ان میں سے چند کے اسماء گرامی آپ بھی سن لیجئے، مثلاً ابو عبیدہ، سر بن ثنی، اہمی، ابو زید انصاری، اخفش اور ابو اسحق نظام سے اس نے علوم کلام و مذہب، عزراہل کی تعلیم حاصل کی۔

اس نے اپنے شیوخ سے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ تو کئی کئی بار دہرایا کرتا تھا، اور تازہ وارد و احواب بادیہ سے فصاحت و بلاغت۔

اس میں عرب تجارت اور اسباب تجارت

آیا کرتے تھے۔ خطبا و شعرا، رواۃ و نساب، رجز خواں اور۔۔۔

متعلق ہوتے تھے سب ہی آتے تھے، اپنے نتائج افکار پیش کرتے تھے، رد و فصاحت دیتے تھے، اور خراج تحسین لیتے تھے، یہ مرید گویا اسلام میں ”سوق عکاظ“ کا دوسرا نمونہ تھا۔

باخظ نے علم حدیث بھی بہت سے ثقت اور قابل استناد بزرگوں سے حاصل کیا تھا مثلاً قاضی ابو یوسف شاگرد امام ابو حنیفہ (قاضی القضاۃ، چیف جسٹس، بغداد)، یزید بن ہارون سری بن عبدویہ، جلعن بن محمد بن حماد بن سلمہ وغیرہ۔

باخظ سے جی بہتوں نے اس فن کو حاصل کیا مثلاً مبرور، یونس بن مزیع اور ابو بکر بن ابی داؤد

لے احواب بادیہ کی فصاحت و بلاغت ہمیشہ میاں رہی، اب کہ دنیا اس قدر تہذیب و تمدن سے آشنا ہو چکی ہے اور زبان عربی بھی غفلت اور اسے گزر چکی ہے، با اینہم اب تک احواب بادیہ کی عربی سند ہے۔ (مترجم)

لے ۹ (مترجم)

سببانی وغیرہ۔

اسباب سبب اور | باخط کے ابتدائی ایام بہت تنگدستی اور فقر و فاقہ میں بسر ہوئے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ نرسیمان پر مہلی اور روٹی بیچا کرتا تھا۔ یہ روایت صحیح ہو یا نہ ہو بہر حال عرت و باہ

اس سے یہ تو ثابت ہی ہوتا ہے کہ ابتدائی ایام اس کے بہت عسرت و فلاکت میں گزرے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے اس کی سبکی ہوتی ہو جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے فضل و کمال کا ایک نامہ قائل ہے، اس کی تصنیفات سارے عالم میں پھیلی ہوئی ہیں، جب وہ روشناس خلق ہوا تو ساری دنیا اس کی طرف منڈ پڑی، اس کے اسباب معیشت وسیع ہو گئے اور وہ عیش و عشرت میں اپنی زندگی بسر کرنے لگا۔ اب تو حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ دوزار دولت اور عائد سلطنت اس سے قرب رکھنے لگے مثلاً خاندان براہمہ کے افراد آل طاہرہ کے اشخاص، فتح بن خاقان، ابراہیم بن عباس الصولی، محمد بن عبد الملک زیات، احمد بن ابی داؤد وغیرہ۔

سیمون بن ہارون نے یہ دیکھ کر کہ اب تو اس کی خوب مزے میں بسر ہوتی ہے ایک بار اس سے حیاقت کیا، کیا بصرہ میں تمہارے پاس کوئی جاگیر ہے؟

باخط مسکرایا اور کہا، ”ہاں، میں ہوں، میری جاگیر ہے، ایک خادمہ ہے جو اس کی خدمت کرتی ہے، ایک نوکر ہے، ایک گدھا ہے، بس یہ ہے میری کل کائنات، ایک باریں نے اپنی کتاب ”الحیوان“ محمد بن عبد الملک زیات کو ہدیہ بھیجی تو اس نے مجھے پانچ ہزار دینار عطا کئے، ”البیان و التبیین“ احمد بن ابی داؤد کو میں نے عطیہ بھیجی، اس نے بھی مجھے پانچ ہزار دینار بخشے، اسی طرح کتاب ”الزرع و النخل“ ابراہیم بن عباس الصولی کو میں نے بھیجی اس نے بھی مجھے پانچ ہزار دینار عنایت کئے، اب میں بصرہ میں ہوں، میری جاگیر میرے ساتھ ہے جو نہ تجدید کی محتاج ہے نہ اس کی کہ کھاد وغیرہ کی فکر کی جائے۔

جبکہ باخط کی مالی حالت اتنی تنگم گئی تھی تو پھر یہاں باعث حیرت نہیں رہ جاتا کہ اس نے زمین کے چپچپ کو علم سے لبریز کر دیا اور اپنے امثال و اقربان سے فضل و قہم میں بہ مدارج بڑھ گیا اور

برہم فن پر متعدد تصانیف کا ایک ذخیرہ تیار کر دیا اس لئے کہ تم خطایا آدمی کو بے فکر کر دیتے ہیں اور وہ اپنی استعداد کے مطابق اپنے ذوق سے کام لیتا ہے۔

باحظ کے بعض احباب داغوان اس کے پاس آئے اور پوچھا ”کہو اب عثمان کیا حال ہے؟“
 باحظ نے جواب دیا تمہارے سوال کے دو پہلو ہیں دونوں کا الگ الگ جواب سن لو۔ حال تو میرا
 یہ ہے کہ وزیر میری رائے پر عمل کرتا ہے جو میں کہہ دیتا ہوں اس کو نافذ کرتا ہے اعلیٰ کے انعامات
 و اکرامات کا ایک سلسلہ ہے کہ جاری ہے، پرندوں کا گوشت کھاتا ہوں، نرم ویشی لباس پہنتا ہوں،
 اس خبرستانی گدہ پر بٹھتا ہوں اور دیکھو یہ تکیہ لگاتا ہوں اور اب چاہتا ہوں کہ خدا کسی طرح یوم عیش
 و مسرت لائے، ان میں سے ایک نے کہا ”اب جس حال میں ہو۔“ اور مسرت نہیں ہے؟ باحظ
 نے جواب دیا ”عیش و مسرت تو جب حاصل ہوگی جب۔“

ان الفاظ میں گویا خود باحظ نے اپنی عزت و
 کی تمنا تو یہ اس کی حرص ہے پایاں کا ایک ثبوت۔

اگر ایسی بات وہ بنجیدگی سے کہتا تو اس کا نتیجہ بھی نہایت تلخ ہوتا۔
 بات کیوں کرتا۔ مریض میں یہ بات اس کے منہ سے نکل گئی ہوگی۔

میرنشی | میرنشی کا منصب اسلامی مالک میں نہایت اہم عہدہ تھا، حکومت عامہ کی سیاست اسی محور پر
 گردش کرتی تھی۔ اس منصب جلیل پر وہی مہمور کیا جاتا تھا جو مختلف علوم و آداب میں دسترس رکھتا
 تھا جس کا شمار اصحاب سیاست و تدبیر میں ہوتا تھا اور جو اپنی دانش و بینش کی بنا پر عام طور سے
 ممتاز سمجھا جاتا تھا۔

امون الرشید نے باحظ کی فضیلت کی بنا پر اسے اس عہدہ پر مامور کر دیا۔ بعض لوگوں
 کو اس کی یہ سرفرازی و قدر افزائی گراں گزری۔ وہ لوگ طرح طرح کے چیلے سوچنے لگے اور امون
 تک اس کی جہلی بھی پہنچنے لگی۔ یہ ننگ دیکھ کر تین ہی دن کے بعد باحظ نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ
 دے دیا جو منظور ہو گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا باخطان آزاد نگاروں میں تھا جو اپنا علم آزاد رکھتے ہیں اور اصحاب دولت و اقتدار، خلفاء و ملوک اور دزدار و ارباب دولت سے مرعوب نہیں ہوتے یا ان لوگوں میں تھا جو اس قسم کے مناصب کو حصول عزت و جاہ کا ایک ذینہ سمجھتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا میلان آزاد نویسی ہی کی طرف تھا۔

علم و وسعت علم | باخط نے بہت سے علوم میں کمال حاصل کیا تھا، فلاسفہ، یونان، حکماء، ہند، علماء، فارس اور اربابِ رومان کی اکثر کتابیں اس نے مطالعہ کی تھیں، ان کے افکار و آراء پر اس نے غور کیا تھا، کسی علم و فن کی کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جو عربی میں ترجمہ ہوئی ہو اور باخط نے اس کا مطالعہ نہ کیا ہو۔

ابو سفیان کہتے ہیں ”باخط سے زیادہ کتابوں کو محبوب رکھنے والا نہ میں نے کبھی دیکھا نہ سنا۔ جو کتاب بھی اس کے ہاتھ پڑ گئی بس ختم کر کے دم لیا، یہ شوق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ کتب فروشوں سے رات رات بھر کے لئے ان کی دوکان کرایہ پر لیتا تھا اور رات بھر کتابیں دیکھا کرتا تھا۔ حافظہ بھی غضب کا تھا۔ بہت زیادہ وسیع الروایۃ، قوی الحجۃ اور تیز زبان تھا۔ اسے علم و فضل کی ”انسا نیکلو پیڈیا“ کہنا چاہئے، دنیا کی کون ایسی چیز تھی جو اس کے احاطہ معلومات سے خارج تھی؟

اس کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی جانتا تھا۔ اس دعوے کی کوئی ایسی مسکت دلیل نہیں ہے جو پورے طور سے اس کو ثابت کرتی ہو لیکن اسی کی عبارت و الفاظ سے ایسے قرائن ضرور ملتے ہیں جو اس رائے کے مؤید ہیں۔

ابو بکر احمد بن علی کا یہ قول باخط کی وسعت علم و کمال پر ایک مزید شاہد ہے وہ کہتا ہے:-
”باخط اصحابِ نظام میں سے تھا۔ علم کلام میں وہ پورے طور سے اہر تھا۔

علوم دین و دنیا میں بھی وہ بہت بڑا فاضل تھا۔ اس کی بہت سی مشہور کتابیں دین و مذہب کی حمایت میں ہیں، نیز آداب و اخلاق اور عرفات و توحید کی سے متعلق بھی اس نے

بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ لوگ ان کتابوں کو پڑھتے ہیں ماحول کے فضل و کمال کے قائل ہوتے ہیں۔ جاخط معترکہ وغیرہ متزلزلہ ہر جماعت میں نہایت عظمت و عزت کا مالک تھا۔ جو ملکہ انھیں کے قد شناس اور مبالغہ فہم ہیں وہ اسے خوب جانتے ہیں؟

جاخط کی کتابیں دوسروں کے نام سے [عبدیہ] کہ ہر عہد و ہر زمانہ میں ارباب قلم آفات فقر و فاقہ میں مبتلا ہوئے جاخط بھی نہ بچ سکا۔ قدامت کے آثار کی عظمت، گزشتہ لوگوں کا اعتبار لوگوں کے دلوں میں نیا وہ ہوتا ہے بہ نسبت اپنے زمانہ کے چنانچہ مسعودی نے اپنی کتاب "الاستیعاب" میں دایہ کی بے جا خط باوجود اپنی جلالت قدر کے کتا تھا۔

"میں نے بہت سی کتابیں تالیف کیں جو کثرت مساوی اور ہر کتاب کا ایک بار پڑھا۔"

لیکن میں نے لوگوں کی توجہ اس طرف نہیں دیکھی۔
تالیف کیں کسی کو میں نے عبد اللہ بن متفع کی طرف نہ
کی طرف یا ان کے علاوہ متقدمین میں سے کسی اور کی طرف۔

نئے ہاتھوں ہاتھ مل جاتے تھے۔ ان کتابوں میں سو اس کے کوئی بات نہیں ہے۔
میں نے انھیں متقدمین کی طرف منسوب کیا تھا۔

اس قول صریح سے ثابت ہوتا ہے کہ جاخط نے اپنی بہت سی کتابوں کو ابن متفع اور سہل بن ہارون وغیرہ کی طرف منسوب کیا۔

تعب خیز بات ہے کہ اس اعتراف صریح کے باوجود اب تک دس صدیاں گزر چکی ہیں لیکن کوئی ایسا مرد باخدا نہ ہوا جو ابن متفع کی کتابوں کا مطالعہ کر کے جاخط اور اس کے اسلوب کا فرق مد نظر رکھ کے کوئی تحقیق کرتا۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ابن متفع کے اب انہاری کیا موجود ہیں جس طرح جاخط کی بہت سی کتابیں محو ہو گئیں سہل بن ہارون اور ابن متفع کی کتابیں بھی نذر دور ایام ہو گئیں۔ جس طرح جاخط نے اپنی بہت سی کتابیں دوسروں کی طرف غلط طور سے منسوب کر دیں

اسی طرح دوسروں نے بھی اس کی طرف بہت سے مصنفات (شاید طلبِ نعمت کے خیال سے) منسوب کر دیے، جیسے کتاب ”الابلی“ اور کتاب ”المدایا“ حبِ تہمتیں یا قوت (صاحبِ مہم) ایک موصوفہ اس کی طرف منسوب ہیں، تنبیہ الملوک والکائد بھی اس کی طرف منسوب ہے جس کی جانب احمد ذکی پاشا نے اشارہ بھی کیا ہے۔

”الحامس والاضداد“ کتاب ”انتاج“ ”اللائل والاعتبار علی النطق والتدبیر“ اس کی طرف غلط طور سے منسوب ہیں۔ جاخا کا اسلوب نگارش تو ان میں پایا نہیں جاتا۔
جاخا نگاہ اعدائیں | اربابِ علم و دانش کی ایک مخالف جماعت بھی ان کے قد و انون اور قد و انراؤں کے ساتھ ساتھ ہمیشہ رہی ہے، جاخا بھی اس خصوصیت سے متصف نہیں تھا، اس کے بھی دشمن تھے، بداندیش تھے اور یہ سب کے سب اس کے فضل و کمال کے منکر بھی تھے اور اسی طرح ذریعہ شامت تھے جس طرح عقیدتمندوں اور دوستوں کی جماعت، اس کے خصوصیات و کمالات کی تبلیغ کیب کرتی تھی۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کے خصوم و اعدائے اس پر جو تار و الزامات لگائے ہیں وہ آپ کے سامنے پیش کر دیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ واقعہ کیا ہے؛ سب سے پہلے ہم ابنِ قتیبہ کے مطاعن سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں، وہ کہتا ہے:-

”جاخا کا شمار آخرِ متکلمین میں ہے۔ وہ ننگِ متقدمین ہے۔ اس کا انداز عجیب و غریب ہے۔ وہ جب چاہتا ہے رائی کا پاڑ بنا دیتا ہے اور جب چاہتا ہے پہاڑ کو رائی کر دکھاتا ہے۔ کبھی وہ کالوں کو گوروں پر بڑے شد و مد سے ترجیح دیتا ہے، کبھی وہ عباسیان عثمانیہ کو دوافض سے بہتر ثابت کرتا ہے اور کبھی وہ یزیدیوں کو عثمانیوں اور اہل سنت پر تفوق دیتا ہے، کبھی وہ حضرت علیؑ کی فضیلت بیان کرتا ہے اور کبھی ان کی تنقیص کرتا ہے۔ کبھی وہ ایک کتاب لکھتا ہے جس میں مسیائیوں کی طرف سے مسلمانوں پر اعتراضات ہوتے ہیں اور کبھی وہ احادیثِ رسول کے ساتھ تمسخر اور استہزا کرتا ہے جو ”اہلِ علم سے پوشیدہ

نہیں مثلاً..... جبر اسود کے متعلق وہ کہا کرتا تھا کہ وہ تو سفید تھا مشرکین و کفار نے اسے اپنی سیاہ کاریوں سے سیاہ کر دیا تو چاہئے تھا کہ اسلام جب پھیلا اور لوگ مسلمان ہوئے تو پھر وہ سفید ہو جاتا۔ اسی طرح صحیفہ رضاءت پر بھی وہ کہا کرتا تھا..... الخ :-

اب آئیے ذرا ابن قتیبہ کے اس طعن کی حقیقت پر غور کریں جبر اسود کے متعلق ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ جبر اسود جنت کے پتھروں میں سے ایک پتھر تھا: "و اوئے کی طرح سفید تھا بلکن مشرکین و کفار کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا" لیکن حضرت محمد بن الحنفیہ و حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صحابہ فرماتے تھے کہ جبر اسود اپنی عام پتھروں میں سے ایک پتھر تھا۔ ابن عباس کی طرف جو قول منسوب ہے اس کی ندرت کی بنا ہو کر اسے سفید کیوں نہیں کر لیا؟

اب رضاءت کے مسئلہ کو یہی ہے: حضرت عائشہ صدیقہ فاطمہ رضاعت کے متعلق وحی آئی: "وہ ایک کانٹا ہے میرے بستر کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت رکھی ہوئی تھی۔ جب آنحضرت نے انتقال فرمایا تو ہم اس میں مشغول ہو گئے۔ اسے میں کسی قبیلہ کی ایک بکری آئی اور اسے کھا گئی"..... یہ عجیب بات ہے علماء اخاف اس مسئلہ میں جامعہ کے ہم آہنگ ہیں۔ "جو اہر مضیئہ میں ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تحریم رضاعت قلیل و کثیر دونوں سے ہوتی ہے اور امام شافعی کے ہاں پانچ رضعات کے بعد ہوتی ہے۔ ابوحنیفہ تو دلیل میں حدیث پیش کرتے ہیں "الرضاعة من الجماعة" لیکن شوافع کی دلیل کیا ہے؟ اخاف کہتے ہیں کہ دلیل تھی تو شوافع کے پاس بھی لیکن اسے بکری کھا گئی!

باخط بلکہ تمام مقلد اس قسم کے خوفات و ہملات سے انکار کرتے ہیں اور واقعہ تو یہ ہے

کہ ان کے دلائل بھی بڑے قوی ہیں۔ اس واقعہ کو وہ قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں ”وإنه لكتاب عزيز“
 وایتہ اباطل من بین یدہ یہ دلائل غلطہ تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس مہی عزیز و متکلم چیز کو کبھی ایسی
 فرض باطل ہو جائے اور دلیل ساقط ہو جاتی؟ دیے تو دنیا کی ہر شخصیت اسے نہ باطل کر سکتی نہ محو کر سکتی
 ہے لیکن ایک بکری کے قبضہ تصرف میں یہ کیسے؟ اور اگر ایسا تھا بھی تو قرآن کی اس آیت کی
 کیا تاویل ہوگی؟ ”الیوم اکملت لکم دینکم“ یہ کہنے کے بعد خود خدا نے اسے بھیج دیا کہ وہ کھائے؟
 اور کیوں کر ممکن ہے کہ وحی کو بکری کے کھانے کے لئے چھوڑ دیا جائے اور اس کی حفاظت و
 صیانت کا کوئی انتظام نہ کیا جائے؟ اور پھر وہ آیت نازل ہی کیوں کی گئی اگر اسے معمول بہ
 نہیں بننا تھا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ باخط کے اعتراض کی بنا پر ابن قتیبہ کو اس سے پر خاش تھی اور عقو
 قعصب کا یہ نہایت عجیب نمونہ ہے کہ ایک غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور
 صرف کر دیا جائے۔

رہی ابن قتیبہ کی تنقیص کہ وہ ایک چیز بڑی شد و مد سے ثابت کرتا ہے اور اسی زور و شور سے
 اس کی تردید بھی کرتا ہے تو یہ تو گویا اس کی قوت بیان کا اعتراف ہے۔ اسے ابن قتیبہ نے کیوں کر
 فراموش کر دیا کہ یہ اعجاز بلاغت ہے و خدا کی طرف سے صرف باخط ہی کے حصہ میں آیا تھا یا اسے
 بھی چھوڑے۔ اس پر غور کیجئے کہ کیا دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز ہے جو معائب سے بری ہو؟ یا یکسر
 خیر ہو یا سرسر شر؟ ظاہر ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے دو پہلو نہ نکلتے ہوں، ایک خیریت
 سے وہ مزاد و رستائش ہوتی ہے تو دوسرے اعتبار سے سختی مذمت اور یہ باخط کا کمال ہے کہ وہ
 جو چیز پیش کرتا ہے وہ اس قدر مجمل اور مشرح طور سے کہ دوسرا نہیں کر سکتا۔

ابو العباس ثعلب سے روایت کی جاتی ہے کہ ایک مجلس میں اس نے کہا ”باخط کا ذکر
 چھوڑو“ وہ تو غیر فقہ ہے۔ شاید اسی قول کی بنیاد پر ابو منصور ازہری کا یہ قول بھی ہے کہ ”باخط کو
 زبان و خطابت میں ملکہ حاصل تھا“ علوم و فنون میں نہایت وسیع النظر تھا، لیکن اہل علم و معرفت

اس کی برائی کرتے ہیں اور اس کے صدق کو شبہ سمجھتے ہیں۔
 اس قسم کے اقوال سے جا خط کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے جن پر نہ کوئی دلیل ہو نہ برہان۔
 بات تو وہ قابل التفات ہوتی ہے جو دلائل و براہین سے محکم ہو۔
 بیع الزماں سہانی اپنے ایک مقام میں جا خط کا ذکر بایں الفاظ کرتا ہے:-

”جا خط بلاغت کے دو سچوؤں میں سے ایک میں خوشہ چینی کرتا ہے اور دوسرے
 میں ٹھہراتا ہے۔ طبع تو وہی کہلاتا ہے جس کی شروظ نظم کا پلہ برابر بواشرت اس کا
 کلام داغدار نہ ہو جاتا ہو۔ تو جا خط کا کوئی عمدہ شعر میں سے کسی کو معلوم ہے؟ ہم نے کہا
 نہیں، تو کہا اس کا کلام لاؤ تمہیں معلوم ہو گا کہ اس کے کلام میں کیا عیب ہے؟
 قریب المقوم ہے، استعارہ بھی شاذ نہاد ہیں، کلام میں :-
 کلام وہ استعمال کرتا ہے۔ کیا تم میں سے کسی نے اس کا
 پر بار ہو؟“

بیع الزماں کے اس قول کو میں جا خط کی حمایت میں سمجھتا ہوں مخالفت میں ہیں اس سے
 کہ یہ ایسے اوصاف ہیں جو ادبا میں بہت کم پائے جاتے ہیں لیکن جا خط میں تھے۔
 لغزش | جا خط اپنی وسعت علم، گیرائی فہم اور دانش و ہوش کے باوجود کبھی کبھی ٹھوکر بھی کھا جاتا ہے اور
 دنیا میں کون ایسا ہے جس سے کوئی نہ کوئی کبھی نہ کبھی غلطی نہ ہوئی ہو۔ وہ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا
 مثلاً مسعودی نے جغرافیہ میں اس کی ایک غلطی نکالی ہے کہ:-

”سندھ میں مکرون نامی جو نہر ہے جا خط اسے دریائے نیل کا ایک حصہ سمجھتا تھا اور نیل
 اس پر یہ لاتا تھا کہ اس میں بھی گھڑیاں ہیں جس طرح نیل میں ہیں۔ کم سے کم میری سمجھ میں تو
 آتا نہیں کہ گھڑیاؤں کا وجود دلیل کیوں کر بن سکتا ہے؟ اس نے اپنی کتاب ”امصار“
 میں لکھا ہے کہ اس نے نہ کبھی دیکھا نہ سفر کیا، نہ وہ کوئی بڑا بھاری سیاح تھا، نہ راستوں سے
 واقف تھا، اس کی حالت تو اس شخص کی سی تھی جو رات کو جنگل سے اندھیرے میں لکڑیاں

جن، اہو ایسے ہی وہ بھی دوسروں کی کتابوں سے نقل کر دیتا ہے :

اس میں شبہ نہیں کہ مسعودی کا اعتراض بجا ہے، علاوہ ازیں وہ اس فن میں مہارت تامہ بھی رکھتا تھا۔ لیکن اس تقریر سے باخظ کا درجہ کم نہیں ہو جاتا اس لئے کہ علم و عمل کے میدان میں اس نے ایک جزائی کی حیثیت سے قدم نہیں رکھا تھا۔

باخظ نگاہ حق شناس میں ایک وہ شخص جو اس کی فضل و منزلت سے واقف ہو اس کے نزدیک تو باخظ بلاشبہ عربی انشا پردازوں کا سردار، ادب و عرب کا شیخ، اور ارباب علم و بیان کا امام ہے، فصاحت و بلاغت کا ستون ہے، ارباب غلط و حکمت اور اہل علم و ادب میں سے کوئی شاید ہی اس جیسے کمال تک پہنچا ہو۔ اس کے معارف کا درجہ تو یہاں تک بلند ہے کہ اسے ان لوگوں میں شمار کرنا چاہئے جن پر اسلام کو فخر ہے !

ابو حیان تو حیدری نے ایک مستقل کتاب ”تقریظ الباخظ“ کے نام سے لکھی ہے۔ ہمیں اس کتاب کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن یا قوت نے اس کتاب سے یہ عبارت نقل کی ہے :-

”ہم سے صاحبین کی ایک جماعت نے بیان کیا کہ ثابت بن قرہ نے کہا کہ امت عربیہ میں تین ہیشیاں بہت زیادہ قابل رشک گزری ہیں، ان میں سے پہلی سہی تو عمر بن الخطاب کی ہے، دوسری ذات حسن بصری کی ہے، اور تیسری شخصیت ابو عثمان الباخظ کی ہے بے خلیب السلین، شیخ المتکلمین کیسے تو بجا ہے۔ وہ جب

لے کافر

لے پورا نام ابو الحسن ثابت بن قرہ ہے، مذہباً صابانی تھا، طیب و فیلسوف، صاحب فضل و کمال تھا، حکمت و ادب میں خاص و شگاہ رکھتا تھا۔ ۱۷۰ھ میں ولادت ہوئی اور ۲۴۵ھ میں بمقام بغداد انتقال ہوا۔

لے صاحب کتاب نے اس مقام پر ان دونوں بزرگوں کے متعلق ثابت بن قرہ کی تفصیلی رائے نقل کر دی ہے، لیکن چونکہ اس کا اس موضع سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا اس لئے اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ (ترجمہ)

گفتگو کرتا ہے تو معلوم نہ تھا ہے کہ سبائے کی فصاحت و بلاغت سے کان آہٹا ہو رہے ہیں۔ وہ اگر
 مناظرہ کرتا ہے تو نظام کو مات کر دیتا ہے۔ اگر تنبیہ کی ہے کچھ کہتا ہے تو عامر بن عقیس سے
 بھی بڑھ جاتا ہے اور اگر نہل و مذاق پر آتا ہے تو مزید سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ جو جملہ
 وہ تھا جس سے دل کو سرور اور روح کو تازگی حاصل ہوتی ہے۔ وہ شیخ العرب اور سان العرب
 تھا۔ اس کی کتابیں ایک ایسا باغ ہیں جو کلیوں سے لبریز نہوں اور اس کے رسائل ان کے
 پھل، بڑے بڑے غلغا اس کی عظمت کے قدر شناس تھے اور امر اس کی تعریف میں طبعان
 بادشاہ اسے اپنا ندیم بناتے تھے اور علماء اس سے کسب علم کرتے تھے۔ یہ بڑے بڑے مغز و مشہر
 اس کے فضائل کو تسلیم کرتے تھے اور عامہ مخاطب اس کی محبت میں نہ شائع تھی۔ وہ زبان و قلم
 دونوں کا مالک تھا، علم و ذہانت دونوں اس کے حصہ میں تھے۔
 قابو حاصل تھا، نہ نظم کا بھی وہ بادشاہ تھا اور نظم و ذکا۔
 کی عراچی خاصی ہوئی، اس کی حکمت سارے جہان میں ہو۔
 کے نقش قدم پر ملنا باعث سعادت سمجھا، اس کے نام سے کتاب
 اور جنہوں نے اس کی پیروی کی وہ کامیاب ہوئے بلاشبہ اسے ”حکمت“ اور ”نعل خطاب“
 دونوں جو ہر پختے گئے تھے۔

ابو جہان کہتا ہے یہ قول ایک صابی کا ہے جس کے دل میں اسلام کی ذرا بھی حرمت نہیں ہے
 مسلمانوں کا کوئی احترام ہے، اس نے یہ تنقید کی ہے اور حق کو ایسی نظروں سے دیکھا ہے کہ ہوا و ہوس
 کے جذبات دور کر دئے ہیں، ایسی عقل سے کام لیا ہے کہ تقوٰی و حیا کے لئے وہ تعصب کو فراموش

لے جہان دائل مشہور عربی خطیب۔

لے فصاحت و بلاغت میں مرتبہ خاص کا مالک تھا۔

لے ابو احنیٰ مزید نوادرات و نکات میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔

کر گیا ہے، ہم اپنے دوسرے اسلاف و اخلاف کے فضائل و محاسن سے ناواقف نہیں ہیں لیکن ہمیں اس شخص کی یہ بات پسند آئی کہ جو اگرچہ ہمارا ہم قوم و ہم زبان نہیں ہے اور جو شاید حضرت عمر بن الخطابؓ کے سوانح حیات پر پورا عبور بھی نہیں رکھتا، اور اسی طرح جاحظ کے علم و ادب پر پوری وسعت نظر بھی نہیں رکھتا، لیکن با اینہم وہ ایسی بات کہتا ہے اور اس طرح رشک کرتا ہے اور جاحظ پر اپنے کلام کو خستہ کرتا ہے، ایک عیب جو جاحظ میں معائب ہی معائب دیکھتا ہے لیکن وہ اس سے قطع نظر کر کے اس کی صفائی دیتا ہے۔

ابو حیان کہتا ہے میں نے ابو محمد الاندلسی سے (جو سیرانی کی جامعیت کے ایک رکن تھے) کہا، ہم ابو سعید سیرانی کی مجلس میں سرگرم مکالمہ کرتے، کہ ایک اختلاف آن پڑا اور وہ اختلاف ہے جاحظ اور ابو حنیفہؒ صاحب ”النبات“ کی فصاحت و بلاغت کے متعلق اور ہم سب تمہیں حکم بنانے پر راضی ہیں، اب کو تمہاری کیا رائے ہے؟

محمد نے کہا، میں ان دونوں کی حمایت یا مخالفت میں کچھ کہنے کی اپنے اندجرات نہیں رکھتا میں نے کہا، بہر حال کچھ تو کہئے۔

محمد نے جواب دیا، ابو محمد ندوۃ کے اعتبار سے زیادہ ہیں اور ابو عثمان (جاحظ) حلاوت کے لحاظ سے بڑے ہوئے ہیں، ابو عثمان کے معافی دل پر اثر انداز ہوتے ہیں کانوں کو گراں نہیں

لے پورا نام ابو محمد عبداللہ بن محمود الزبیدی الاندلسی، نحو، لغت اور شعر کے امام تھے۔ جاحظ کے کلام سے بہت پسند رکھتے تھے یہاں تک کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جنت میں اس کے سارے اسباب تنعم کے بجائے اگر مجھے جاحظ کی کتابیں ملجائیں تو میں اس ”تبادلہ“ پر تیار ہوں۔ ابوسلیمان مغلطی اور ابو سعید سیرانی کی جامعیت کے ایک بہت مستاز رکن تھے۔

علامہ ابو حنیفہ احمد بن داؤد بن دینار الدینوری، مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ ایک کتاب نباتات پر لکھی اس میں بہت زیادہ مشہور ہوئے۔ ۳۳۳ھ میں وفات پائی۔

گزرتے، ابوحنیفہ کے الفاظ بہت زیادہ شیریں ہوتے ہیں، اور اسالیب عرب کے بہت زیادہ آئینہ دار ہوتے ہیں۔

یا قوت کے قول کے مطابق ہنر شناسان علم کلام کی متفقہ رائے یہ ہے کہ دنیا میں بس تین مکمل گزرے ہیں، جاحظ، علی بن عبیدہؒ اور ابو زیدؒ۔ ان میں سے جاحظ تو وہ ہے جس کے الفاظ معانی سے زیادہ ہوتے ہیں اور علی بن عبیدہ وہ ہے جس کے معانی الفاظ سے زیادہ ہوتے ہیں اور ابو زید وہ ہے جس کے لفظ و معنی دونوں کا توازن بالکل درست ہوتا ہے، لیکن اس رائے کے باوجود خود یا قوت نے روایت کی ہے کہ ابو زید کو ”جاحظ خراسان“ کہا جاتا تھا۔ جاحظ کی بلاغت شان و عظمت کے لئے یہ کافی ہے کہ ابو زیدؒ بھی جیسا فخر روزگار اس کی طرف منسوب کیا جائے۔

ابو الفضل بن عمید ان لوگوں میں سے تھے جو

ہیں۔ اسی کے اسلوب و مذہب کے وہ عامل تھے۔ اگر

ہوتے، ان کا سینہ جاحظ کی عظمت و بزرگی سے بھرا ہوا۔

پاس آتا اور وہ اس کا امتحان لینا چاہتے کہ عقل و ذہانت میں کیسا ہے و پتہ و رہنمائی

اس کی رائے دریافت کرتے، اگر وہ بغداد کے خصوصیات و محاسن سے واقفیت کا ثبوت دیدیتا

تو گویا یہ اس کے فضل و عقل کا مقدمہ ہوتا، پھر جاحظ کے متعلق پوچھتے۔ اگر دیکھتے کہ اس کے انداز

گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جاحظ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، اس کی تصنیفات سے

استفادہ کیا ہے، اس کے بحر علم و کلام سے جرء نوشی کی ہے تو اس کے متعلق فیصلہ کر دیتے کہ

اس کی پیشانی پر علم و ادب کا نشان چمک رہا ہے۔ اور اگر دیکھتے کہ یہ شخص بغداد کی برائی کر رہا ہے

علامہ علی بن عبیدہ الریجانی نہایت ذکی و ذہین شخص تھا، مامون الرشید کے صاحب اعتماد لوگوں میں شمار ہوتا تھا،

فصاحت و بلاغت میں بھی بڑا پایہ رکھتا تھا۔ حکمران کے طرز پر اس کی بہت سی کتابیں ہیں، بعض لوگوں نے اس پر

نزدقہ کا الزام بھی لگایا، لیکن یہ غلط ہے بلکہ مقررہ کی جامعیت کا ایک دقیقہ شخص تھا۔

باحظ کے واجیات و معارف سے نا آشنا ہے تو پھر وہ چاہے جتنے محاسن رکھتا ہو سب بے کار۔
 ابوالقاسم سیرانی بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے استاد ابوالفضل بن حمید وزیر کے دولت خانہ پر
 حاضر تھے باتوں باتوں میں باحظ کا ذکر نکل آیا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اس کی برائیاں
 بیان کرنا شروع کیں لیکن وزیر صاحب خاموش رہے۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے پوچھا تعجب ہے
 آپ اس آدمی کی باتوں پر خاموش رہے حالانکہ اور لوگوں سے آپ خوب بحث کرتے ہیں۔

انہوں نے جواب دیا اس کے مقابلہ سے زیادہ بلیغ صورت یہ تھی کہ اسے اس کے جمل
 پر باقی رہنے دیا جاتا۔ اگر میں اسے روک کے دلائل پیش کرنے لگتا تو وہ باحظ کی کتابوں کا مطالعہ
 کرتا اور اے ابوالقاسم وہ آدمی بن جاتا، باحظ کی کتابیں عقل سکھاتی ہیں پھر علم و ادب اور یہ میں
 چاہتا نہیں کہ وہ آدمی بنے!

ابن عساکر کہتے ہیں تین علوم ایسے ہیں کہ تمام دنیا ان کے بارے میں تین آدمیوں کی
 "عیال" ہے۔

فقہ میں امام ابوحنیفہؒ

کلام میں ابوالاندلسؒ

فصاحت و بلاغت میں ابوعثمانؒ باحظ۔

ابومحمد الحسن بن عمرو البخاری کا ایک عجیب و لمبیپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ
 میں اندلس میں تھا۔ میں نے سنا کہ یہاں باحظ کے ایک شاگرد ہیں جنہیں سلام بن یزید کہتے ہیں اور
 ابوعلف کہنت کرتے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا۔ وہ ایک مس آدمی تھے۔ میں نے ان سے باحظ
 کی ملاقات کا حال دریافت کیا اس لئے کہ باحظ تو کسی اندلس میں آیا نہیں تھا انہوں نے کہا۔

۱۵ ابوالاندلس بصری، ان کا شمار اکابر مقررہ اور افاضل اہل کلام میں کیا جاتا ہے۔ صاحب علم و نظر بزرگ
 تھے منطق و فلسفہ وغیرہ میں متقدمین کی تمام کتابوں پر نہایت وسیع نظر رکھتے تھے۔

مشرق کے طلبہ ہمارے بادشاہوں کے ہاں اس لئے شرف و عزت کے مستحق سمجھے جاتے تھے کہ وہ ماحصلے شرف و ملاقات حاصل کر چکے ہیں۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں اس کی ایک کتاب ”الترویج والتدویر“ آئی، اس کے بعد ہی اس کی دوسری کتاب ”البيان والبنين“ آئی، پھر ”نعل کھڑا ہوا“ اور کسی مائع کی پروا نہیں کی۔ جب بغداد پہونچا تو معلوم ہوا وہ جبر میں ہے۔ ادھر کا قصد کیا تو معلوم ہوا وہ بصرہ جا چکا۔ بصرہ جب پہونچا تو غیر اس کے سامنے حاضری کا موقع حاصل ہوا۔ جاحظ بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد بے ریش و بروت بیٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ سو اس نے کسی اور کی اس مجلس میں ڈاڑھی تھی ہی نہیں۔ اس منظر سے میں کچھ کھیرا لایا جس نے بہت پسند کیا۔

تم میں سے ابو عثمان کون ہے ؟
اس نے میری طرف گھور کے دیکھا اور کہا
”کہاں سے آئے ہو ؟“

میں : ”اندلس سے“

جاحظ : ”احمقوں کی سرزمین“ اچھا نام کیا ہے ؟

میں : ”سلام“

جاحظ : ”ایک کتے کا نام“ ابن ؟

میں : ”ابن یزید“

جاحظ : ”بہت خوب، کنیت ؟“

میں : ”ابو طلحہ“

جاحظ : ”سگ زبیدہ کی کنیت، تشریف کیوں لائے ؟“

میں : ”علم حاصل کرنے“

جاحظ : ”تشریف لے جائیے“ کامیابی مشکل ہے۔

میں : ”آپ نے انصاف نہیں کیا“ میں طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر کے یہاں تک پہونچا

ہوں:

باحظ: ”تم نے میرے ارد گرد میں رٹکے دیکھے، سو امیر کسی کے ڈاڑھی نہیں تھی، پھر مجھے پہچاننے میں دقت کیا پیش آئی۔“

”ان تمام باتوں کے باوجود میں باحظ کے ہاں بیس سال تک مقیم رہا۔“

میرا خیال ہے کہ باحظ نے سرزمین اندس کے متعلق جو کچھ کہا وہ بالکل بجا اور درست ہے۔ عربوں کے دغوں سے پیشتر اس میں مجدد شرف کا کوئی سامان نہیں تھا، نہ کوئی قدن تھا، نہ تہذیب، لیکن عربوں نے جب اسے فتح کیا تو وہ اپنے ساتھ صرف فوج و سپاہ نہیں لے گئے بلکہ عقل و سنجہ، دہن صافی، علوم صالح، حضارۃ نافعہ، بہت مردان کے خزانے بھی لے گئے، ’وہ اپنے ساتھ جراثیم حیات اور اصول عمرانیت بھی لے گئے۔ انھوں نے وہاں مدنیت قائم کی، حضارت قائم کی، انسانیت کے شرف و بزرگی کا راستہ کھول دیا، لیکن جب وہ عہد مسعود ختم ہو گیا ان کی قوت عزیمت ضعیف پڑتی گئی، ان کی بہت دہتی گئی، تا آنکہ سب کچھ ختم ہو گیا!

تصنیفات کی شہرت | عرب انشا پر دازوں میں شاید کسی شخص کی کتابوں نے وہ شہرت دوام اور ہر دلعزیزی نہیں حاصل کی جو باحظ کی تصنیفات کو حاصل ہوئی۔ جب بھی وہ کوئی کتاب یا رسالہ لکھتا تھا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے تھے، اس کے نسخے ہاتھوں ہاتھ جاتے تھے، کوئی زبانی یاد کرتا تھا، کوئی نقل کرتا تھا، غرض ایک دھوم مچ جاتی تھی۔

عالموں کی مجلسیں اور اویوں کی محفلیں باحظ اور اس کی تصنیفات کے ذکر سے بھری رہتی تھیں۔ جہاں کسی شہر میں کوئی کتاب بیونچی بس اس کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ابو حیان توحیدی کہتے ہیں کہ ہم سے علی بن عیسیٰ نحوی بیان کرتے تھے کہ میں نے اپنے شیخ

لے ابو الحسن علی بن عیسیٰ بن عبد اللہ الرمائی، اخشیدی اور وراق سے مشہور ہیں لیکن زیادہ تر ”رامانی“ ہی

کہے جاتے ہیں۔ مختلف علوم و فنون میں دست گاہ رکھتے تھے، بہت بڑے متکلم تھے۔ ۲۶۹ھ میں ولادت

ہوئی اور ۳۴۴ھ میں وفات۔

ابن خشید کو کہتے ہوئے سنا کہ

”باحظ نے اپنی کتاب الامیوان میں اپنی تمام کتابوں کی فہرست لکھ دی ہے۔ اس نے ”الفرق بین النبی والمتنبی“ اور ”دلائل النبوة“ کا ”الفرق“ کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ”الفرق“ کا ذکر چوتھی جلد میں پھر کیا ہے۔ میں نے دونوں کتابیں دیکھنا چاہیں اور ان دونوں میں سے ایک ہی پر میں کامیاب ہو سکا یعنی ”دلائل النبوة“ پر جسے غلطی سے ”الفرق“ بھی کہتے ہیں۔ مجھے اپنی اس کامیابی پر افسوس ہوا۔ جب میں مصر سے کہ میں داخل ہوا تو عرفات میں (جہاں دنیا بھر کے لوگ موجود تھے اور ایسا عجیب و غریب منظر تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا) میں نے پکارنا شروع کیا، خدا اس شخص پر رحم کرے جو ”الفرق بین النبی والمتنبی لمباحظ“ لکھا۔

ہی اور کسی نے بھی اس کتاب کا اعتراف نہیں کیا۔ نہ پتہ بتایا۔
صرف یہ تھا کہ اپنے دل سے کہہ سکوں کہ میں جو کچھ کر سکتا تھا۔

یا قوت کتا ہے ابو عثمان باحظ کی فضیلت کو یہ کافی ہے۔

جو فلسفہ کا ایک بڑا مبصر اور مستر لہ کا ایک نہایت گراں پایہ سردار تھا باحظ کی کتابوں واسطے درجہ عزیز و محبوب رکھتا تھا کہ عرفات و بیت الحرام میں مذاق تیار رہا۔

ایک مجلس میں ابو سفیان سے پوچھا گیا کہ تم باحظ کی ہجو کیوں نہیں کرتے؟ حالانکہ وہ تمہیں پیٹھنے سے باز نہیں آتا۔ اس نے جواب دیا، خدا کی قسم اگر باحظ ایک معمولی سارا لہ بھی لکھ دے تو اس کی شہرت چین تک پہنچنے لگی اور میں اگر ایک ہزار بیتیں بھی کہہ ڈالوں تو ہزار برس تک وہ یوں ہی رہیں گی۔

انصافی الفاضل جیسا شخص اقرار کرتا ہے کہ تمام انشا پردازان عمد باحظ اس کی کتابوں سے نفع اٹھاتے تھے۔

لہ ابو علی عبد الریم انصافی الفاضل، صلاح الدین ابو بلی کا وزیر باندہ بیڑ جو اپنی اصابت رے، سیاست و انی فصاحت

اہل بصرہ اہل کوفہ سے تفاخر کیا کرتے تھے اور اسی طرح اہل کوفہ اہل بصرہ سے خطیب بغدادی روایت کرتے ہیں کہ بصرہ کے لوگ کوفہ والوں سے ان کتاہوں پر تفاخر کیا کرتے تھے کتاب المیوان للباخط کتاب السبویہ کتاب الصین للخلیل۔

ابوالقاسم اسکافی کہاتے تھے کہ تین چیزیں ہیں جن کو میں بلاغت کا معیار سمجھتا ہوں (۱) قرآن مجید (۲) کلام باخط (۳) اور بحری کے اشعار۔

ابن دہبہ کے سامنے دنیا کی مسرت افزا چیزوں کا ذکر کیا گیا، انہوں نے کہا یہ چیزیں تو زیادہ سے زیادہ ”فردوس نظر“ ہو سکتی ہیں۔ وہ چیزیں کہاں ہیں جو دل کو طراوت بخشی ہوں؟ لوگوں نے پوچھا وہ کیا؟ کہا باخط کی کتابیں، محدثین کے اشعار اور ابوالعین کے نوادر۔

ابو محمد اندلسی کہاتے تھے کہ جنت کے سارے سامان تنعم پر میں باخط کی کتابوں کو ترجیح دیتا ہوں۔

پایہ تحقیق و شوق سفر | باخط ادب میں فروغ دیتا تھا نہ صرف ادب میں بلکہ تمام علوم و فنون میں وہ کیاں مہارت رکھتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو مسائل علیہ سے دلچسپی لیتے ہیں اور اہل بحث و نظر کی طرح گفتگو کرتے ہیں۔ اس نے نہایت کی اس بڑی غلط فہمی کو رفع کیا ہے انہوں نے اپنی جہات کی وجہ سے نہ معلوم کیا سے کیا کر دیا تھا مثلاً زبیر بن بکار سے روایت کی جاتی ہے کہ ان کا خیال یہ تھا کہ ام نصر بن کنانہ ابن خزیمہ کا نام برہ بنت مر بن اد بن طابجہ تھا اور کنانہ نے اپنے باپ خزیمہ کی وفات کے بعد ان سے نکاح کر لیا تب نصر کی پیدائش ہوئی دجسی کہ عرب جاہلیت میں عادت

دقیقہ ۴۴۴، بلاغت، ذکاوت اور بہت سے ممتاز خصائص میں مشہور نام ہے۔ ولادت ۵۲۹ھ ہجری میں بمقام سلطان ہوئی اور وفات ۵۹۶ھ میں بمقام قاہرہ ہوئی۔

۱۵ ابو عبادة الوليد بن مبيد الجعري مشهور شاعر تھے ولادت ۳۲۰ھ وفات ۳۸۳ھ۔

۱۶ ابو بكر محمد الحسن بن دريد الازدي فن لغت و ادب کے امام ۳۲۲ھ میں بمقام بغداد فوت ہوئے۔

تھی کہ سوتیلے لڑکا اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنی ماں سے نکاح کر لیا کرتا تھا، لیکن جاخذ نے اس فقرہ کے محذوٰد کچھ کر کے کہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان سے کنانہ کی کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی نہ از قبیل ذکر نہ انہی، لیکن ان کی بہتی بوہ بن مر بن اد بن طابخہ تھیں جن کی کنانہ بن خزیمہ سے شادی ہوئی تھی اور ان سے نصر پیدا ہونے لگے، یہ صرف دو ناموں کا ایک مونا ہے اس سے اتنی غلطی پھیلی.....
 یہی وہ صحیح مسلک ہے جس پر اہل علم و اہل نسب کا اتفاق ہے۔ جاخذ کہتا ہے کہ اس کے علاوہ جو شخص عقیدہ قائم کرے کہ قرآن کریم کا مرتکب ہو گا..... میرا تو یہ خیال ہے کہ جاخذ اپنے اس کارنامہ کی بنا پر یوم آخرت میں ماجر ہو گا۔

تحقیق علمی ہی کے خیال سے اس نے متعدد دثنہ دس میں سفر کیا، وہ مصر بھی گیا اور وہاں ایک عرصہ دراز تک مقیم رہا اور اپنے تجربات کی آزمائش کرتا رہا۔
 تعجب خیز بات یہ ہے کہ جلال الدین سیوطی نے اہل علم کا ذکر کیا ہے جنہوں نے مصر کا سفر اختیار کیا کہ وہ معتزلی تھا، میں سمجھتا ہوں یہ مختصر نمونہ اس باب میں کافی ہے۔
 فن ترجمہ اور جاخذ اگر ششہ صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ عربی میں کسی غیر زبان کی کوئی ایسی کتاب منتقل نہیں ہوئی (عام اس سے کہ وہ کسی علم و فن سے تعلق رکھتی ہو) جسے جاخذ نے پورے طور سے ضبط بلکہ بقول بعض "ہضم" نہ کر لیا ہو، اگرچہ اس زمانہ میں نہ پریس کی یہ عالمگیر ترقیاں تھیں نہ سہولتیں۔ کتابوں تک پہنچنے کا ذریعہ سفر تھا یا خود نقل کرنا تھا یا کتب فروشوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا تھا۔

جن کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا اور وہ گرہیں جو شروح و حواشی، تعلیقات و تفاسیر و تاویلات میں بعض اہل بحث نظر مثلاً فارابی، ابن سینا، ابن رشد اور غزالی نے مقررات و افلاطون، بقراط و ارسطو، جالینوس و فیثاغورث وغیرہ کی کتابوں میں پیدا کر دی تھیں اور علماء و مفکرین حیران تھے کہ کیا صورت تھے کہ اہل بیان حاصل ہو۔ جاخذ نے اس دشوار گزار راہ میں بھی رہنمائی کی اور ان گروہوں

کی گرہ کشائی کی۔

قبل اس کے کہ آپ کے سامنے باطل کی رائے پیش کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حمد کے اسلوب نقل اور طریق ترجمہ کا ایک مختصر سا نقشہ پیش کر دیا جائے۔
اس زمانہ میں نقل و ترجمہ کی دو صورتیں تھیں۔

ایک تو وہ طریقہ تھا جسے یوحنا بن بطریق اور ابن ناعمہ طبری کا طریقہ سمجھنا چاہیے، یعنی لفظ بہ لفظ رکھنا جس لفظ کو یونانی یا کسی اور زبان میں دیکھا اسی کا عربی میں مترادف تلاش کیا اور اسے اہل جگہ پر رکھ دیا یا یہاں تک کہ ساری کتاب کا ترجمہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ حد درجہ جمل ہے اس لئے کہ مترجم پوری زبان عربی پر مہارت تو رکھ نہیں سکتا تھا کہ ہر غیر زبان کے لفظ کے مقابلہ میں بالکل دیا ہی وسیع المفہوم لفظ عربی سے تلاش کر کے اس کی جگہ پر رکھ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کتاب نہ عربی ہی ہوتی تھی اور نہ عجمی۔ اس طریق ترجمہ سے بہت نقصان ہو چکا اور یونانی، فارسی، ہندی، سریانی اور لاطینی کے بہت سے کلمات اسی طرح رہ گئے، مخصوص ترکیبیں دوسری زبان کی ویسی مخصوص ترکیبیں نہ حاصل کر سکیں، مجازات و استعارات کے استعمال میں بھی یہی صورت رہی۔

دوسرا طریقہ خن بن اعثم اور عباس بن سعید جو ہری کا ہے وہ یہ کہ ترجمہ کرنے والا پورا جملہ پڑھ لیتا ہے، اپنے ذہن میں اس کے معنی مقرر کر لیتا ہے، پھر اسے ایسے عربی جملہ میں نقل کرتا ہے کہ پورا پورا مفہوم ادا ہو جاتا ہے خواہ الفاظ ہم آہنگی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں۔ ظاہر ہے یہ اصول بہت زیادہ کامیاب ہے، اسی لئے لوگوں کا خیال ہے کہ خن بن اعثم کی کتابیں جو طب، منطق، طبیعیات،

لغہ، بوزخین بن اعثم جباری، علوم ادائل کے ماہر تھے، طبیب تھے، بہت سی قدیم کتابوں کو عربی میں نقل کیا ہے یونانی، سریانی اور لاطینی خوب جانتے تھے۔ بعض علما کتاب کے برابر سونا ٹھاکر دیا کرتے تھے۔ ۳۲۰ء میں وفات ہوئی۔

۳۳۰ء عباس بن سعید الجوهری بہت بڑے فکری اور منجم تھے، ارماد اور اس کے آلات میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے، انکی "زنج" مشہور ہے، اکابر مہندسین و حساب میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔

اور اہلیات سے متعلق ہیں وہ کسی قسم کی تہذیب و اصلاح کی محتاج نہیں ہیں، اس علوم یا مضمون میں ان کی جو کتابیں ہیں وہ بلاشبہ نظر ثانی کی محتاج ہیں اس لئے کہ اس فن میں انہیں پورا پورا عبور نہیں حاصل تھا۔ اس زمانہ کا یہ دستور تھا نقل و ترجمہ کا۔

اب حسب وعدہ ہم باخط کا قول فیصل "اس باب میں پیش کرتے ہیں، وہ کتاب ہے۔"

"مترجم ان معانی کو ہرگز ادا نہیں کر سکتا جن کا حکیم نے غاڑ رکھا ہے، نہ ان نکتوں اور حقائق کو سمجھ سکتا ہے جو کتاب میں بیان کئے گئے ہیں، جب تک وہ خود اس علم یا فن میں جس کا وہ ترجمہ کر رہا ہے اصل مصنف کی سی استعداد نہ رکھتا۔"۔ مترجم کے لئے یہ ضروری ہے کہ جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اس میں اپنی مادری زبان کی سی مصلحت رکھتا ہو۔

ہمارا یہ قول تو کتب ہندوہ تہذیب، حساب اور موسیقی

میں ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔

یہ ہیں باخط کے خیالات نقل و ترجمہ کے بارے۔

کارائے روشن تر کر دیا ہے۔

(باقی)



عربی سیادت کے خلاف عجمی تحریکیں

(کوئٹہ سے پوسٹہ)

عبداللہ بن میمون

بہر حال یہ عملی جماعت باوجود اپنی تمام کوششوں کے ایک عرصہ تک کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ عبداللہ بن میمون ایک مجوسی سردار ان کو ایسا بل گیا۔ جس کی کوششوں نے چند روز کے اندر ہی اندر وہ کام کیا۔ جبکہ اس کی ہم مشرب جماعت صدیوں میں بھی نہ کر سکی تھی۔ اس کے مبلغین نے عباسی خلفاء کو اس درجہ پریشان کیا۔ کہ بار بار کی جنگ پر بھی ان کی دیکھ مختصر سی جماعت کو یہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ بلکہ اس کے برعکس حمدان قرمط بانی مذہب قرمط اور اس کے ساتھیوں نے بحریں اور شام کے علاقے پر قابض ہو کر عرصہ تک حکومت کی۔ عام فہمین کے بیان کے مطابق عبداللہ کا پوتا ابوسعید مغرب اور مصر کی خلافت فاطمی کا بانی ہوا۔ اور پھر اپنی خفیہ سازش کی بنا پر تمام ممالک اسلامیہ کو غارت اور تباہ کیا۔ مذہبی عقائد میں تشکیک کے عقیدے کو رواج دیکر کچے مسلمانوں کو گمراہ سے بے راہ کیا۔ اور اس بارہ میں مذہب معتزلہ وغیرہ کے رواج نے جو اس سے بہت پہلے رائج ہو چکے تھے بڑی امداد بہم پہنچائی۔ عبداللہ بڑا ہی ذہین اور مختلف طبیعتوں کے مختلف رجحانات کو پرکھنے کی خاص لیاقت رکھتا تھا۔

عہد دولت فاطمیہ جو ۳۵۵ھ سے ۵۴۱ھ تک افریقہ اور مصر میں رہی۔ عام مورخین کا خیال ہے کہ اس کا بانی ابوسعید عبداللہ بن میمون کا پوتا تھا۔ اس نے اپنے کو امام کبیر کی اولاد بتایا۔ چنانچہ سب سے پہلے فاس کے متصل کٹامہ میں ابومحمد عبداللہ کے نام سے ہمدویت کا اعلان کیا اور اسے اور غالبہ کی جماعتوں نے اس کا ساتھ دیا۔ ان کی استعانت اور مدد سے رفتہ رفتہ وہاں اس نے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا بالآخر ۵۴۱ھ میں قرآن کو بھی جو افریقہ کا مرکز تھا۔ فتح کر لیا۔ اور جب قوت کافی ہو چکی تھی اپنی خلافت کا باقاعدہ اعلان کر دیا لیکن ابن خلدون اور مقریزی کا خیال ہے کہ عبیدی خلفاء کا عبداللہ کی طرف انساب کرنا فتنہ غلطی ہے۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ قادر باللہ نے فاطمی خلفاء کی ٹہری ہوئی طاقت اور اسے مرعوب بنیہ منہ ۴۲۵ھ

”مذہب اسمعیلیہ کی اشاعت عبداللہ بن میمون کے ذریعہ عمل میں آئی یہ انسانی فطرت کو پرکھنے اور مذہبی اعتقادات کو مختلف طبائع کے موافق بنانے میں عباسیوں کے فرقہ بیوٹی کے بانی سے کہیں بڑھ چڑھ کر استعداد رکھتا تھا۔ نویں صدی عیسوی میں اس شخص نے اسمعیلیہ فرقہ میں نئی روح پونکی۔“

عبداللہ بن میمون کی ذہانت اور استعداد کا خاکہ جن لفظوں میں ڈی گویئے اور ڈونزی نے کھینچا ہے۔ اس سے بہتر تصویر لفظوں میں نہیں کھینچی جاسکتی۔ کھتے ہیں ”عرب اور اسلام کی دشمنی نے عبداللہ بن میمون کو ایک ایسے ارادہ پر مائل کیا کہ جس کے طور طریق میں ذہانت، جرأت، یقین اور جوش حیرت انگیز تھا۔“

”کو ایک لڑی میں پرونا، مذہب کو بار بکھنے والی جماعت۔“

”میں مجتمع کر دینا۔ مومنوں سے کفر اور الحاد کی تخم ریزی کر

کی حکومت مٹانے کا آلہ بنانا۔ غرض کہ ایک ایسی جماعت تیار۔“

”مخد اور سر فروشت نہ جذبہ رکھتی ہو۔ اور جو کیسی ہی سخت وقت کیوں نہ ہو۔ ہمدرد کے حکم کے خلاف کرنا گناہ عظیم سمجھتی ہو اور یہ اس لئے کہ وقت پر اس کو یا اس کے خاندان والوں کو سخت و محکومت دلو اسکے۔ یہ ہوس کیسی ہی خراب کیوں نہ ہو لیکن اس نے نہایت ہوشیار اور علم انفس کی گہری واقفیت اور علمیت کے ساتھ پوری کر لی۔“

طریق دعوت: یہ تمام اسباب تو تھے ہی لیکن عبداللہ کی کامیابی کا اصل راز دراصل اس کے طریقہ دعوت میں منظر تھا۔ جن جن طریقوں سے اس نے لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا وہ حیرت انگیز

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۶۔ ہو کہ بغداد میں بڑے بڑے علماء کی زبان سے یہ قاعدہ یہ کہلایا۔ کہ یہ لوگ فاطمہ کی اولاد سے نہیں ہیں بلکہ عبداللہ بن میمون کے خاندان سے ان کا تعلق ہے۔ یہ اس لئے کہ عام مسلمانوں کی نظروں میں ان کا مقام اس طرح کیسے گھٹا دیا جائے۔ امیر علی مرحوم نے ان مومنین کے علاوہ ابو الفداء کی تہیہ سومو خاندان کو اہل حق قرار دیا ہے۔ مکتبہ ۱۲۲۱ اپریل آف اسلام۔ علیہ the preaching of Islam

ہیں۔ اس نے اپنے داعیوں کو تاجروں کے عیس میں ملک کے دور دراز خطوں میں مدد مانگ کیا جہاں وہ بظاہر ایک پیشہ ور جماعت ہوئی لیکن ہر وقت تبلیغ و دعوت کے موقع کی تلاش ہی رہی۔ یہ داعی جن اصولوں کے ماتحت تبلیغ کر رہے تھے۔ اس کا ایک خاکہ ذیل کی سطروں میں کھینچا جاتا ہے۔

جاہلوں میں جب پہنچتے تو ان کو طرح طرح کے شعبہ دھمکاتے یہ لوگ اس کو ان کی کرامت پر محمول کرتے۔ اور معجزہ سمجھتے۔ مذہب کے سخت پابند لوگوں میں جاتے تو بزرگی اور تقدس کی مجسم تصویر بن جاتے۔ ایسے لوگوں میں جب پہنچتے، جو مذہبی عقائد میں جہاں بین کے قائل ہوتے۔ تو عام عقائد کے عجیب عجیب معنی پہنچاتے۔ مذہب سے برگشتہ لوگوں میں جاتے تو مذہب کی پابندیوں سے آزاد ہو کر تمام باتیاں جائز کر دی جاتیں مسلمانوں کی بڑی تعداد کو امام مہدی، یہودیوں کو مسیح اور عیسائیوں کو فارقلیط کا منتظر پکار ان کے آئینے بشارت دیتے۔ لیکن اس بشارت میں یہ عقیدہ بھی شامل کرتے کہ حقیقی نجات حضرت مسیحی درضی اللہ ہی اگر دلائیں گے۔

اسی کو محقق ڈچ ڈی گوئج نے یوں لکھا ہے۔

عبداللہ نے حصول مقصد کے لئے مختلف طریقہ اختیار کئے جو حقیقتہ کوئی عمدہ طریقہ نہ تھا۔ انسانی کمزوریوں پر حملہ کا کوئی طریقہ اٹھانہ رکھا گیا۔ پابند مذہب اور نیک دل لوگوں کے سامنے زہد و تقویٰ، عیاش اور ادب باش لوگوں کے سامنے ہر قسم کی ہوسا کی جائز کی گئی۔ بلند تخیل والوں کے لئے فلسفہ کا ڈھونگ، جو شیلے انسانوں کے لئے باطنیت اور رہبانیت اور عوام کو حیرت اور تشکیک میں ڈالا گیا۔ بالآخر یہود کے لئے ایک مسیح موعود، عیسائیوں کے لئے ایک فارقلیط اور مسلمانوں کے لئے ایک مہدی مہیا کیا گیا۔

تعبات اور اس کے مختلف مدارج! ان تمام طریقوں میں سے جس طریقہ سے بھی کوئی

اس جماعت کا ارکن بننا چاہتا تو اس کو پہلا سبق دیا جاتا کہ شریعت کے جتنے احکام ہیں۔ اس کے دُرُخ ہیں ایک اس کا ظاہر اور دوسرا اس کا باطن اور اُسرا صرف انہیں لوگوں پر آشکار ہوتا ہے جو امام وقت کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ اس بات کے ذمہ نشین کرانے کے بعد اس کو اپنی جماعت میں داخل کرتے اور سب سے پہلے درجہ پر اس سے اطاعت کا حلف اٹھوایا جاتا۔ اور دوسرے درجہ پر یہ بتایا جاتا کہ پہلے ائمہ اور علمین نے اسلام کو غلط سمجھا ہے اس لئے وہ لوگ ظاہری احکام کے پابند تھے۔ خدا ظاہری عمل پر خوش نہیں ہوتا۔ تاہم قیامت کے روز اس کے باطنی احکام کو دیکھ کر عمل نہ کرے۔ تیسرے درجہ پر یہ بتایا جاتا کہ امام صرف سات ہیں۔ اور دوسرے شیعی فرسے غلطی پر ہیں۔ چوتھے درجہ پر یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ امام بنین نہ تھے۔ بلکہ اسمعیل بن جعفر ہیں۔ پانچویں درجہ میں اور یہ عبادات اور ارشادات تخص اس زمانہ کے لئے

حج، زکوٰۃ وغیرہ کو ترک کرنے کی تعلیم دیتے۔ ساتویں دور میں جو پورے تعلیم دیکر عقیدہ توحید سے باز رکھتے۔ آٹھویں درجہ پر ادھ کی تمام تعلیمات پر عمل درآمد کرانے کی پوری پوری کوشش کرتے اور آخری نویں درجہ پر پہنچ کر رہے ہیں اسلامی اثرات کا خاتمہ کر دیا جاتا۔

نقائد! اس سے تقریباً یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ان کا عقیدہ کیا تھا۔ وہ توحید کے قائل نہ تھے۔ بلکہ ان کے نزدیک پیدائش عالم کے دو خالق ہیں، خالق اول اور خالق ثانی، خالق اول خدا ہے جس نے نفس اول کو پیدا کیا اور پھر نفس اول نے عالم کو، یہ عقیدہ مجوسیوں اور زرتوئیوں کے عقیدہ سے مشابہ ہے۔ یہ دونوں فرقہ بجائے اول اور ثانی کے خالق عالم نور اور ظلمت کو بتاتے ہیں۔ عقیدہ رسالت کے متعلق وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانتے۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ابتدائے عالم سے اس وقت تک صرف سات پیغمبر ہوئے۔ حضرت آدم، نوح، ابراہیم

۱۔ صفحہ ۴۴۹ Encyclopedia of Islamic History، دبستان المذہب، الملل والنحل، رسالہ نصیریہ، ج ۱، صفحہ ۴۴۹۔

کا اظہار کیا، کچھ اس اثر سے اور زیادہ تر کھر جادو کی بدولت عوام اور جاہل طبقہ میں اپنی شخصیت کو منوایا۔ اور پھر امام مہدی کا فرستادہ تباکران کو اپنی جماعت میں کثرت سے شامل کیا یہ شخص شام اور بحرین کے علاقہ میں امام اسماعیل کے لئے دعوت و تبلیغ کرتا اور طبع طبع کی ابتدا دلا کر غلاتا اس معاملہ میں یہ اپنے مقتدا عبد اللہ کے نقش قدم پر چل رہا تھا ہاں البتہ اپنے پیروں سے عدم تشدد کے معاملہ میں مخالف تھا۔ وہ دن دھاڑے اپنی جماعت کے مادر اور لوگوں کو لٹنے اور غارت کرنے کی پالیسی کا قائل تھا چنانچہ اُس نے اسی اصول پر کام شروع کیا۔ اسکی دعوت کا دار و مدار دو شخصوں پر تھا۔ ایک اُن میں سراج بن یحییٰ تھا جسکا لقب ذکر وہ تھا۔ اور دوسرا ابوسعید جنابی، اول الذکر سواد کوٹہ اور بعد ازاں شام، عراق، مصر، اندلس، کربلا کی، باوجود کوشش دولت کی بنا پر قائم نہ کر سکا۔

بصرہ اور کوفہ پر لیکن کامیابی نہ ہو سکی بہت سے مارے گئے۔

جماعت مختلف اطرافِ عالم میں منتشر ہو گئی۔

ثانی الذکر ابوسعید جنابی نے بحرین میں دعوت کی ابتدا کی۔ اور ایک عرصہ تک لخصاً اور اس کے خاندان والوں نے حکومت کی، چنانچہ وہاں دعوت و تبلیغ کر کے مہدی کے نام پر ایک چھوٹا سا فوجی دستہ تیار کیا۔ اس دستہ سے سب سے پہلے ۲۸۳ھ میں بصرہ پر حملہ کیا، والی بصرہ کو شکست دیکر قبضہ کیا۔ اور پھر اسی سلسلہ میں ہجر پر قابض ہو گیا۔ اس فتح کے بعد ابوطاہر کو جو ابوسعید کا جاسزدار تھا، مالک تخت بنا کر واپس آیا اور دوسرے مقامات پر دعوت و تبلیغ کرتا پھر رہا تھا کہ اسی اثنا میں انگریز ابوطاہر کے ہاتھ سے بصرہ نکل گیا۔ اور عرصہ تک محروم حکومت رہا۔ لیکن دوبارہ ۳۱۱ھ میں ابوطاہر نے بصرہ پر حملہ کیا۔ بازاروں کو لوٹا، بیشمار جانوروں کو قتل کیا۔ جامع مسجد کو مسمار اور ویران کیا۔ اور پھر دوسرے سال ۳۱۲ھ میں حاجیوں کے قافلے لوٹے۔

علیہ سب واقعات ابن اثیر، ابن خلدون اور ابوالفداء سے لئے گئے ہیں۔

بچوں اور عورتوں کو قید کیا۔ مال و اسباب چھینا، اور بہت کم لوگ اس قافلہ کے اپنے گھر پہنچ سکے۔

اس شخص کے جو ردِ ظلم کی انتہا یہ نہ تھی بلکہ ۳۱۴ھ میں کوفہ کی تباہی اور قبضہ ابو بکر ۳۱۵ھ میں عمان پر قبضہ کے بعد ۳۱۶ھ میں مکہ پر فوج کشی کی، بیشمار عابیوں کو قتل کیا کل اہل مکہ کے گھربار اور مال و اسباب کو لوٹا خانہ کعبہ کے میزاب اور دروازوں کو اکھڑ ڈالا۔ غلاف کعبہ کو چیر چار کر تقسیم کیا گیا۔ اور پھر حبر اسود کو اکھاڑ کر اپنے ساتھ بکیرین لے گئے۔ بکیرین میں حبر اسود لے جانے کی غرض یہ تھی کہ حج بجائے مکہ کے بکیرین میں ہو جیسا کہ ان کے اس اعلان سے جو مکہ سے واپسی کے وقت کیا ظاہر ہوتا ہے، ایک عرصہ تک خلیفہ وقت اور رعایا کو قتل و غارت سے پریشان کر کے اس برس کی حکومت کے بعد اس دنیا سے کوچ کیا۔ ابوطاہر کے بعد احمد ابو منصور اور پھر ابو منصور کا بیٹا ابو علی حسن بن احمد سربراہ ہوئے، ابو منصور، ابوطاہر کا بہائی تھا وہ ابو منصور کے لڑکوں کو تخت سے محروم کر کے خود حکمران بن گیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان دونوں خاندانوں میں کشمکش پیدا ہو گئی۔ اور پھر یہ کشمکش ایک عرصہ تک جاری رہی، آپس کی نا اتفاقی کے باعث کچھ عرصہ کے بعد ۳۶۹ھ میں حکومت ابو منصور کی اولاد میں رہ سکی، اور نہ ظاہریوں میں، اکیاشی برس تک یہ خاندان بکیرین کا حکمران کہلایا۔

واقعات کی اس کھوتی میں ادھر کہیں ذکرِ دیہ کے قتل کا ذکر کیا جا چکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے۔ کہ اس کے ساتھ کے لوگ ادھر ادھر مالکِ اسلامیہ کے ہر ہر گوشہ میں پھیل گئے تھے۔ ان لوگوں میں اپنے سردار کے مقتول ہو جانے کے بعد اتنی جرأت تو باقی نہ رہی تھی کہ کھلے بند کو مقابلہ کر سکتے۔ البتہ ایسا ضرور ہوا کہ چھپ چھپ کر اپنے خیالات در عقائد کی تبلیغ کرتے۔ اور موقع پا کر مناسب مقام پر چھپ چھپ

مارنے، اور اسی مناسبت سے سب سے پہلے اہل عراق نے انکو باطنیہ کے لقب سے پکارا۔ اور پھر ان کو اسماعیلیہ بھی کہا گیا، اور سب سے آخر میں ان کا ایک اور تمیزا نام رکھا گیا۔ اور وہ نزاریہ ہے۔ اور یہ اس لئے کہ مستضیٰ علوی کے زمانہ خلافت میں اس کے بیٹے نزار نے بیعت نہ کرنے پر اسماعیلیہ کے ہوا خواہوں کو قتل و تیغ کیا اور جن بن صباح جس کا تذکرہ ابھی آئیگا۔ نزار کے بعد اہمہ کی امامت سے مصر میں انکار کیا بہر حال ان کا فتنہ و فساد ملکشاہ کے زمانہ حکومت میں جبکہ ویم اور سلجوقی اسلامی مالک پر حکمرانی کر رہے تھے بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس وقت کے سلاطین اس قدر بھی خائف نہ رہتے تھے کہ ان کے فتنہ و فساد کو فرو کر سکتے۔ اس لئے

دعا داکرتے۔ اور فتنہ و فساد کا بازار گرم کرتے، نہ رینا
اس قابل ہو گئے کہ اپنی قوت کی نمائش کر سکتے تو بہت

ہو گئے۔ سب سے پہلے قاین کے پاس ایک قلعہ تھا، جہاں پر ان دنوں ہمیں ایک شخص ملک تھا۔ وہاں گئے اور اس کو اپنا مرکزی مقام بنایا اور یہیں سو دن رات ان قافلوں کو جو ادھر سے گذرتے اور قرب وجوار کی آبادی کو لوٹتے، انہیں دنوں کا ایک واقعہ کہ ایک بہت بڑا قافلہ کرمان سے روانہ ہوا۔ جو قاین کا عازم تھا، ان لوگوں نے اس پر چھا پہارا، سب کو قتل کیا ایک ترکمانی شخص اتفاقاً پانچ گیا تھا، جس نے قاین پہنچ کر اس غمناک حادثے کی اطلاع دی یہ واقعہ محض اس لئے لکھا گیا ہے کہ قارئین ان کی سخت دلی کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ اس واقعہ کے تھوڑے دن بعد قلعہ اصفہان پر قبضہ کیا۔ پھر قلعہ الموت پر، یہ ایک پرانا قلعہ تھا جو کہ البرز کے سلسلہ میں رودبار کے اُس حصہ میں جسے طالقان کہتے ہیں۔ تروین سے رشتہ کو جانے والی سڑک پر واقع تھا پانچ درپانچ گھاٹیوں میں ایسا گھرا ہوا تھا۔ کہ مشکل کوئی وہاں پہنچ سکتا جس بن صباح نامی اس جماعت کے ایک مشہور سردار نے چالاکی، اور ہوشیاری کو اس پر قبضہ کیا

اور اس کو اپنی تبلیغ اور دعوت کام کر بنایا۔ یہ شخص نہایت چالاک اور فطرۃً بہت ذہین تھا ہلالک اور عیاری کی بدولت کچھ دنوں کے بعد حکمران کہلایا اور ایسا حکمران کہ جس کے نام سے تمام سلاطین تھراتے جس سلطان، وزیر کو جس عالم و فاضل کو چاہا۔ اپنے جانشین سپاہیوں کے ذریعہ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جو طریقہ اپنی تختہ دہی اور بڑی کے اختیار کئے وہ حیرت انگیز اور بلاشبہ یکتا و مثال سے ذیل میں مختصر طور پر اس شخص کے حالات اور کارناموں کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

حسن بن صباح

یہ شخص چوتھی صدی ہجری کی ابتدا میں اضلاع خراسان کے ایک شہر طوس میں پیدا ہوا باپ ایک مفلوک الحال اور تنگ دست آدمی تھا۔ تعلیم و تربیت کے خیال سے اس نے اپنے بیٹے حسن کو امام موقت الدین کے حلقہ درس میں بٹھایا۔ عام مورخین کی روایت ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں حسن کی اپنے دو ساتھیوں عمر خیام اور قیام الدین جو بعد میں نظام الملک طوسی کے نام سے مشہور و معروف ہوا، عہد ہوا تھا کہ جو شخص ہم میں سے کبھی بلند درجہ پر سرسراز ہو وہ اپنے بقیہ دو ساتھیوں کی امداد کرے زمانہ نے قیام الدین کو ملکشاه سلجوقی کا چٹا وزیر بنایا۔ حسن کو خبر ہوئی تو تکمیل معاہدہ کی امید میں گیا۔ اور ایک معزز عہدہ پر سرفراز ہوا۔ حسن چالاک اور حوصلہ مند بچہ ہی سو تھا اس لئے یہ اس تاک میں رہنے لگا کہ نظام الملک سے کسی نہ کسی طرح اپنی ذہانت اور ہوشیاری تسلیم کرائے چنانچہ ایک دن موقع مل گیا۔ اور وہ واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ نے قیام الدین نظام الملک سے کہا کہ جو دفتری نظام ہمارے سلطنت کا جو اس سے حاصل اور خرچ کے صحیح صحیح علی مولوی محمد مسلم صاحب نے اپنے ایک معنوں حسن بن صباح میں ہو کر وہ ایک مستشرق کی تائید کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ یہ معاہدہ قرین قیاس نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تینوں ہمعصر نہ تھے۔ نظام الملک بیس برس حسن سے بڑا تھا۔ البتہ عمر خیام اور حسن بن صباح قریب قریب ہم سن تھے۔

معلوم کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہو۔ کوئی صورت ایسی نکالو کہ یہ دشواری جاتی رہے۔ وزیر موصوف نے اس کام کی اہمیت کو کچھ کر کافی ہمت چاہی۔ حسن جو موقع پر موجود تھا۔ بول اٹھا کہ کہ اتنی ہمت اس حقیر کام کے لئے زیادہ ہے اس کو چالیس روز میں میں کر سکتا ہوں۔ بادشاہ ملو خوش ہو کر یہ کام حسن کے سپرد کیا لیکن حسن نا کامیاب رہا اور دربار سے نکالا گیا جس یہاں سے محل کرادھر اور حصار مار مار پھر رہا تھا کہ اتفاقاً اس کی ایک ایرانی داعی سے ملاقات ہو گئی یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک طرف باطنیہ کے داعی اطراف ملک میں خفیہ خفیہ اپنے مقصد کے حاصل کرنے کی کوششیں کر رہے تھے اور دوسری طرف اسی اصول پر عبیدی خلفاء کے ایٹمی بھی عباسی خلفاء کے خلاف مسلمانوں کو اکسا رہے تھے حسن داعی کے ہاتھ سے یہ کام بھی انجام دے دیا۔ وہاں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ کچھ دیر سے جو عبیدی خلفاء کی طرف سے ہوئی امرار اور سرور

اس لئے مجبوراً اس کو یہاں سے ہٹنا پڑا۔ یہاں سے روہمہ کھٹوفان نے جہاز کو آگھیرا بچنے کی کوئی امید نہ تھی جس نے جہاز کے دوسرے رخسروں سے کہا کہ میرے نزدیک تو کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے خدا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہم نہ ڈوبیں گے، اتفاق کی بات کہ جہاز ڈوبتے ڈوبتے بچ گیا۔ لوگ اس کی اس پیشین گوئی پر آکر اس کے ہاتھ چومتے۔ اور اپنی انتہائی عقیدت کا اظہار کرتے۔ بعض مورخین کا خیال ہے اور سچ ہے کہ جس کی چالاک اور دانائی تھی وہ سمجھتا تھا کہ اگر جہاز ڈوب گیا تو کوئی تکذیب کرنے والا نہ رہیگا اور اگر بچ گیا تو مقصد حاصل ہے بہر حال یہ جہاز سوا مل شام سے آگیا۔ یہاں سے آکر ایشیا کو چک اور ایرال کے تمام بڑے حصوں کے مقام کی سہ سالہ سیر اور دعوت و تبلیغ کے بعد قلعہ آمو تپس کا تذکرہ اور کیا باچکا ہے قابض ہوا۔ ملکشہ شاہ سلجوق نے اپنے ہاتھ سے قلعہ کو جاتے دیکھ کر حلقہ کیا۔ کوئی باقاعدہ فوج حسن کی ایسی تو تھی نہیں کہ اس کو اس کے مقابل لانا۔ ترکیب یہ کی اور خوب تھی کہ ایک لڑکے کو فریادی بنا کر نظام الملک کے پاس بھیجا

اس نے جب اپنے معاملہ میں نظام الملک کو مشغول بنالیا تو یکایک خلاف دہم دگمان حملہ کر دیا۔
 اٹھ ہر اس قدر جلد ہوا کہ نظام الملک کو خبر بھی نہ ہوئی کہ پیٹ میں خنجر پہنچ چکا تھا وزیر موصون
 کی موت کے بعد فوج ہنالی گئی۔ یہ حربہ ایسا کاری تھا کہ آئندہ سے حسن نے اپنی کامیابی کے
 لئے یہ طریقہ بہت پسند کیا چنانچہ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ اس نے ایک جانب ہار جماعت فدائیوں کی
 تیار کی اس کو جانباز بنانے میں جو جو طریقہ استعمال کئے گئے اسی سے اس کی دماغی بلندی،
 رخت خیل، اور پھر عیاری اور چالاک کی کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے، اوّل تو اپنے زہد و تقشف
 بھائی اور ایمانداری کا سکھ ان لوگوں پر جو اس کے ہم رکاب تھے جمایا گیا۔ کہا گیا ہے کہ اس اثر کو
 ان پر ڈالنے کے لئے وہ قلعہ کی بلند جگہ پر چڑھ گیا۔ تو برسوں میچے نہیں اترے، ساتھی یہ سمجھ رہے
 تھے کہ شیخ یا دالہی میں مصروف رہتے ہیں یہ دین سے تمام احکامات مذہبی شکل میں نافذ کرتا۔
 سخت سے سخت احکامات کے نافذ کرنے میں عزیز و اقربا کا لحاظ نہ کرتا۔ چنانچہ شراب پینا کبھی جرم
 قرار دیا تو اپنے ایک بیٹے کو جس نے اس جرم کا ارتکاب کیا فوراً قتل کا حکم صادر کر کے اس
 کا خاتمہ کیا۔ اسی طرح ایک فدائی کا واقعہ ہے کہ اس کے ایک دوسرے بیٹے نے اسے جان سے مار
 ڈالا تھا جس کے قتل کے حکم سے وہ بھی نہ بچ سکا جس کی زائدانہ زندگی اور تعزیرات کو
 خوف کے علاوہ جو چیز فدائیوں کو اپنی پیاری جان تک قربان کرنے سے باز نہ رکھ سکتی
 وہ اس کی خود ساختہ بہشت تھی،

حسن کی بہشت ! اس نے الموت کے ارد گرد سرسبز اور شاداب کہسار میں جنت بنائی
 دلغریب وادیوں اور جانفزا مرغزاروں میں چاندی سونے کے خوبصورت محل تعمیر کرائے
 بیش بہا جواہرات محل زمرود سے اس کی پھلکاری کی گئی عمدہ عمدہ آرائش اور زیبائش
 کی چیزوں سے محل آراستہ کیا گیا۔ ہر طرف باغ لگائے گئے، حور اور غلمان کے تخیل نے
 خوبصورت اور نازک نازک لڑکیوں اور لڑکیوں سے اس کو آباد کیا گیا۔ دودھ اور شہد
 کی نہریں بہائی گئیں۔ بعض نہریں ایسی بھی تھیں کہ جن میں عمدہ اور سبک کشتیاں چلائی گئیں

الغرض تمام عیش و نشاط کی چیزیں فراہم کی گئیں۔ اس بہشت کے بنانے میں اس نے اتھائی تھیل
سے کام لیا جس فدائی کو اس کی ایک دفعہ سیر کرا دی گئی اسکی یہ جال زخمی کہ شیخ کے حکم
کی خلاف ورزی نہ کر سکے۔ بہشت میں پہنچانے کی جو صورت تھی وہ یہ تھی کہ ایک نیشاپور
جس کو عربی میں شیش کہتے تھے فدائی کو اس کا شربت پلایا جاتا وہ پیتے ہی مہوش
ہو جاتا آنکھ جب کھلتی تو وہ اپنے کو کسی نازک نازنین کی گود میں پاتا۔ اس حسین و جمیل منظر
سے وہ ایسا متاثر ہوتا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی وہاں سے باہر آنے کے تخیل ہی سے باز
میں بچنی اور تکلیف محسوس کرتا۔ اس کو یقین کامل ہوتا کہ وہ اسی بہشت میں ہے۔ کچھ کچھ
کا خدا نے اپنے نیک بندوں سے وعدہ کیا ہے۔

کہ پھر اسی شربت سے بے ہوش کر کے باہر پہنچا
جانا کہ حقیقتاً تم اس مادی اور ناپاک جسم سے بہشت

سکتے۔ تا وقتیکہ تم اس کو پاک و صاف نہ کر لو اور یہ سب

امام کی پوری پوری پیروی کرو یہی وہ فدائی تھے کہ جو بہشت کی طبع : لاکر اطراف ملک
میں پھیلائے گئے۔ جس نے ذرہ برابر ان کی مخالفت کی اس کی قضا اس کے سر پر پہنچتی
سینکڑوں علماء و فضلاء ان کے شکار ہوئے۔ علماء تو علماء خلفاء بھی ان کی تلوار بے نیام
سے نہ بچ سکے، خلیفہ مسترشد اور خلیفہ راشد انہیں کے ہاتھوں شہید ہوتے یہ فدائی
کھلے بندوں مقابلہ نہ کرتے۔ بلکہ جس کسی سربراہ اور ہاتھوں کو مارنا مقصود ہوتا اس کی
خدمت میں آہستہ آہستہ اپنا سوخ اور اقتدار بڑھاتے خواہ خدمت کر کے یا اور دوسرے
طریقوں سے، مدتوں ساتھ رہتے بہتے۔ جب کبھی اچھا موقع مل جاتا تو اس سے فائدہ
اٹھاتے، فدائیوں کے علاوہ عقیدت مندوں کے دو طبقہ اور تھے۔ جو ان سے کم تر تھے
پر تھے۔ ایک داعیوں کا جو باطنیت کی خفیہ تبلیغ کرتے پھرتے اور دوسرے فقیروں کا جو
علا اسی مناسبت سے حق کے ساتھیوں کو حاشائیں کہا گیا ہے۔

مشیر کی حیثیت رکھتے اور مجتہد کہلاتے۔ بعضوں نے ان کے پانچ طبقہ بتائے ہیں سب سے بڑا فیہر شیخ الجبل کہلاتا۔ اس کے ماتحت تین داعی القرباں ہوتے جو زمین صوبوں کے امیر ہوتے اس کے بعد داعیوں کی جماعت ہوتی جو تمام خفیہ اصولوں سے واقف ہوتے۔ اور اس مقصد کے مبلغ ہوتے چوتھے رفقہ کی جماعت ہوتی۔ پانچویں فدائیوں کی۔

حسن نے ان ان طریقوں سے پچیس سال تک قلعہ الموت اور اس کے ارد گرد بہت سے دوسرے قلعوں پر فرماں روائی کی۔ یہ قلعے خراسان سے شروع ہو کر سارے کنارے کنارے افریسیان تک اور پھر یہاں سے جنوب کی طرف عراق اور خجستان تک اور اسی طرح سواحل روم تک۔ ہزار ہا میل تک کو ہستان ہی کو ہستان میں چلے گئے تھے۔

حسن کے انتقال کے بعد کیا بزرگ جو اس کا خاص معتقد تھا تحت نشین ہوا، اس سے پیشتر فدائیوں کے سلسلہ میں خلیفہ مستتر شد اور ارشد کی شہادت کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس کے زمانے میں وقوع میں آیا تھا۔ اس کے زمانے میں شام کی افنی جماعت بھی باقی تھی۔ لیکن ایرانی کچھ کمزور پڑ گئے تھے۔ تیسرا تاجوران کا محمد اول تھا۔ یاطینوں کے خیال کے مطابق یہ ان کا کوئی قابل حکمراں نہ تھا۔ اس سے زیادہ اس کے بیٹے حسن کی طرف ان کی توجہ تھی چنانچہ محمد کے بعد یہ جانشین بنایا گیا۔ ۶۴۳ھ کا واقعہ ہے کہ اس نے امام مہدی کا ایک خط پیش کیا۔ جس میں امام موصوف کی طرف سے عوام الناس سے یہ مطالبہ تھا۔ کہ حسن کی فرمانبرداری کریں اس لئے کہ یہ سچا اور ایماندار داعی ہے۔ اس خط کو سنا کر حسن نے اعلان کیا۔ کہ اسلام کے وہ بعض ظاہری اصول جو کبھی ہمارے پیشروں نے بھی ضروری قرار دئے تھے سب ختم ہو گئے۔ خوب عیش

علاء الدین خلجی یا برٹانیکا۔

کر دے اور خوشیاں منا دے۔ اس سلسلہ میں اس نے امام خلیفۃ اللہ ہونے کا دعویٰ کیا وہ کہتا تھا کہ میں محمد کا بیٹا نہیں بلکہ تزار خلیفہ مصر کا بیٹا ہوں لیکن ابھی اس دعویٰ کا اعلان ہی ہوا تھا کہ اس کے سارے نے اس کو قتل کر دیا، اس کے بعد محمد ثانی جانشین ہوا۔ جو چھیا لیس سال تک حکمران رہا۔ باپ کے قاتل اور۔ اس کے تمام خاندان کو تباہ کر دیا اور اس نے آٹھ سال تک سلطان نور الدین اور پھر صلاح الدین سے جنگیں کیں۔

صلاح الدین پر اکثر و بیشتر فدا یوں نے وار کیا۔ لیکن بہت یہی ایک ایسی شخصیت تھی جو ان کے ہاتھوں بچ سکی۔ سلطان صلاح الدین نے

پڑوالا تھا۔ اٹھایا اس لئے پہر ان باطنیوں نے اس

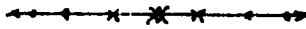
آزادی سے متعلق بہت مشہور ہے بیان کیا گیا ہے

متعلق یہ شبہ ہوا کہ اگر باطنیوں کی تائید نہیں تو

صفائی کی خاطر ایک دن منبر پر باطنیوں کو بہت سخت سخت شاہ بابا سی امام حسن اہل بیت کو جب اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تو اس نے ایک فدائی کو بھیجا یہ ایک طالب علم کے ہمیں میں سات ہینہ تک وہاں رہا آخر کار ایک دن موقعہ پا کر امام کے سینہ پر سوار ہو گیا اور خنجر نکالا امام کی عاجزی سے وہ اتر پڑا لیکن اس نے کہا کہ ہمارے امام کا بس اسی قدر حکم تھا۔ ورنہ آپ کی عاجزی اور منت کوئی اثر ہمارے قلب پر نہ ڈال سکتی، اس وقت شامی شاخ داعی سنان کے زمانہ میں صلیبیوں سے مل گئی تھی صلیبی جماعت نے بھی ان کو بعض لوگوں کے قتل کا آلہ کار بنایا تھا۔

اس کو اس کے بیٹے جلال الدین حسن ثالث نے ترہر دیدیا تھا اور خود جانشین ہوا اس عہد میں کوئی واقعہ قتل اور خونریزی کا پیش نہیں آیا غالباً اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ بہت جلد قتل کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ اس کے بیٹے محمد ثالث کو بٹھایا گیا۔ اس نے جب نام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو نو برس کا بچہ تھا۔ باپ کا طریقہ چھوڑ کر حسن بن صباح کے طریقہ کو

پھر سے رائج کیا۔ ۱۲۵۵ء میں تیس سال حکومت کے بعد یہ بھی اپنے بیٹے رکن الدین کے ہاتھ مارا گیا۔ یہ ان کا آخری حکمران تھا۔ حکومت کا دوسرا ہی سال تھا کہ ہلاکو نے ایران کے کوہستانی علاقہ پر چڑھائی کی۔ الموت اور تمام اردگرد کے قلعہات پر قبضہ کیا۔ رکن الدین کو گرفتار کیا۔ مگر اس کی خواہش کے مطابق لنگوٹاں دہلا کر کے باپ کے ہاں بھیج دیا گیا۔ لیکن راستہ میں دغا بازی کی اور وہیں قتل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ تقریباً بارہ ہزار حشاشین دہا طینین قتل کئے گئے۔ اور اس طرح ایران میں ان کی قوت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ شامی شاخ اس کے بعد کچھ عرصہ تک تھی کہ تیسرے سلطان مصر نے ختم کر ڈالا۔ اس کے بعد بھی چھوٹی چھوٹی جماعتیں باقی رہیں۔ جو آج تک موجود سمجھی جاتی ہیں۔ ان سے ملتے جلتے خیالات اب بھی شمالی شام و ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ ریف کے لوگوں کے متعلق بھی یہی یقین کیا جاتا ہے۔ آئندہ سلسلہ میں انشا اللہ یہ بتانے کی کوشش کی جائیگی کہ ہندوستان میں اس قسم کی جماعت کا کیونکر نشوونما ہوا اور انہوں نے یہاں کے خیالات و عقائد پر کیا اثر ڈالا۔



بستا

اپنا دکھڑا کسے سناؤں؟

شام کا جھپٹا بگیلی برف کے بڑے بڑے گائے بازار کے لیمپوں کے جواہری جلائے گئے ہیں اور گرد و مٹی رقعار سے گھوم رہے ہیں، چیتوں پر، گھوڑوں کی پیٹھ پر، بازوؤں پر، ٹوپیوں پر، برف کی باریک نرم تہ جمی ہوئی ہے، گاڑی بان ایونا، بھوت کی طرح سفید، ان کی کورج کسر رہے ہیں، دیرکت گھسری بنا بیٹھا ہے، اس سے یہ دیکھنا انسان کی

ہے، کہ اگر برف کے تودے کے تودے اس پر آ پڑیں، تو

اُس کی سوکھی سہمی گھوڑی بھی سفید اور ساکت ہے۔ اُس کے

ی سیدھی ٹانگوں کو دیکھ کر اُس پر مٹکے کی مٹھائی کے گھوڑے کا شبہ ہوتا ہے۔ سایہ کی دھیر دھیر بی ہوئی ہے، جس غریب کو ہل بکھرے ان مٹیالے مناظر سے جو اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے ہیں، زبردستی چھڑا کر اس تنجیل میں پھنسا دیا جائے۔ جہاں ڈراؤنی روشنیاں، غل غبار، لوگوں کی لگاتار ان تھک دوڑ دھوپ ہو، وہ سوچ میں کیسے نہ پڑے؟

ایونا اور اس کی گھوڑی کو ایک جگہ سے ہٹے بہت دیر ہو گئی تھی، دوپہر سے پہلے نکلے تھے اور اب تک ایک سواری نہیں ملی، شہر پر شام کی تاریکی چھا رہی ہے، بازار کے لیمپوں کی دھندلی روشنی تیز ہو رہی ہے۔ اور سڑک کا شور شغب بڑھ رہا ہے۔

دانی برگ اسکا پاکے لئے گاڑی! ایونا کے کان میں آواز آتی ہے، 'گاڑی'!

ایونا فکڑکڑتا ہوا اپنی برف سے دھکی ہوئی ٹکڑیوں میں سے لیکٹو کو دیکھتا ہوا جڑا فوجی کوٹ پہنے کھڑا ہے۔

دانی برگ اسکا پاکو! افسر پھر کہتا ہے۔ سو رہے ہو؟ دانی برگ اسکا پاکو! افسر کی بات سمجھ کر ایونا باگ کو جھٹکا دیتا ہے، برف کے ٹکڑے گھوڑی کی پیٹھ اور پیچھوں

پر سے ہوا میں اڑتے ہیں، انسر گاڑی میں بیٹھ جاتا ہو، گاڑی بان گھوڑی کو لٹکارتا ہو، بطور
 طبع گردن آگے کو نکالتا ہے، اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہو، اور گواہ کی ضرورت نہیں ہو، مگر عادی
 کے مطابق چابک چماتا ہو، گھوڑی گردن آگے کو نکالتی ہو، اپنی بانس کی سی ٹانگیں سیکھرتی ہو، اور
 بادل ناخواستہ چلنے لگتی ہے،

تاریکی کے انبار میں سو جو اس کے سامنے ادھر سے ادھر گردش کر رہا ہے۔ ایونا کے
 کان میں چخوں کی آواز آتی ہے، شیطان، کہاں گھسا چلا آتا ہے، کدھر چڑھتا ہے؟
 دائیں کو چلے!

تمہیں چلاتا نہیں آتا، دائیں کو چلاؤ، انسر گبڑ کر رہتا ہے۔

ایک کوچوان جو کسی کی ذاتی گاڑی چلا رہا ہے، اُسے جھڑکتا ہے۔ سڑک پار کرتے ہوئے
 ایک راہ گیر کے شانے گھوڑی کی ناک سے رگڑ کھاتے ہیں۔ وہ اُس کی طرف غصے کی نظروں
 سے دیکھتا ہے اور اپنی آستین جھٹکتا ہو، ایونا بکس پر اس طرح پہلو بدلتا ہے، جیسے کانٹوں
 پر چڑھ گیا ہو، اور چاروں طرف مبہوت ہو کر کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہو، کہ کہاں
 ہوں، اور جہاں ہوں، وہاں کیوں ہوں،

یہ سب لوگ کتنے بدمعاش ہیں! افسر از راہ تسخّر کرتا ہو، پوری کوشش کرتے ہیں۔ کہ
 تمہارے راستے میں حائل ہوں، یا گھوڑی کے پاؤں سے کچلے جائیں، ضرور جان بوجھ کر ٹھنڈا
 کرتے ہیں!

ایونا اپنی سواری کی طرف دیکھتا ہے، اور اپنے ہونٹ ہلاتا ہو... بظاہر کچھ کہنا چاہتا ہو،
 مگر سو اے سو سوں کے منہ سے کچھ نہیں نکلتا۔

کیا کہا؟ افسر پوچھتا ہو۔

ایونا کھینا ہو کر مسکراتا ہو۔ اور گلے پر زور ڈال کر روکی آواز میں شکل یہ لفظ ادا کرتا ہو
 میرا لڑکا... میرا لڑکا اس ہفتہ گزر گیا حضور!

ہوں ایک شکایت تھی !

ایونا پوری طرح سواری کی طرف پلٹ کر کہتا ہے :
خدا جانے ! بخار ہو گا۔ تین دن ہسپتال میں گزارا ، اس کے بعد گزر گیا۔ جو خدا کی مرضی
شیطان ٹکر کر دیکھ ! اندھیرے سے آواز آتی ہے ، کہتے : باؤ لا ہو گیا ہے ؟ انھیں کھول کر دیکھ
کہ صحر چلا جا رہا ہے !

چلے چلو ! چلے چلو ! افسر کہتا ہے۔ اس رفتار سے کل تک بھی نہیں پہنچ سکتے ، تیز چلو !
گاڑی بان چہر گردن آگے کو نکالتا ہے : اپنی جگہ ٹھہر کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ چابک گھماتا ہے کئی بار
چہرہ افسر کی طرف دیکھتا ہے ، افسر نے آنکھیں میچ لی ہیں ۔
دائی برگ اسکیا پر سواری کو اتار کر ایونا ایک تہوہ خ
اور پھر سکر کر بکس پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک گھنٹہ گزرتا ہے ، پھر دوسرے

تین نوجوان ، دو کشیدہ قامت ، اور دو بے پٹیلے ، ایک پستہ در اور بڑا ، اب دوسرے
پتھرے کتے ، اپنے برساتی جوتے پہنے ، کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اُس طرف آتے ہیں ،

گاڑی بان اُلوس کے پل کو چلو ! کبڑا جوجری آواز سوچلاتا ہے ، تینوں کے بیس کو بک
ایونا باگ کھینچتا ہے ، اور گھوڑی کو لٹکارتا ہے ، اصل کرایہ بیس کو پک سوزیادہ ہوتا ہے ، گرتے

اس کا خیال نہیں ، ایک روپل ہو یا پانچ کو پک ، اس کی پرواہ نہیں ، اس سواری مل جائے
تینوں آدمی ایک دوسرے کو دھکیلتے ، بدزبانی کرتے ، گاڑی کی طرف آتے ہیں ، اور تینوں
یہ کوشش کرتے ہیں ، کہ ایک ساتھ بیٹھ جائیں ، تصفیہ طلب سوال یہ ہے ، کون سی دو ٹھیکیں ، اور
کون کھڑا رہے ! بے چوڑے بحث مباحثے ، تو تو میں میں ، گالی گلوچ کے بعد یہ فیصلہ ہوتا ہے
کہ کبڑا کھڑا رہے ، کیونکہ وہ سب سے مختصر ہے ،

چلو کبڑا کھڑا ہو کر کہتا ہے ، ایونا کی پیٹھ پر اس کا سانس محسوس ہوتا ہے ، فروٹ ہو جاؤ ! دوست
تمہاری ٹوپی عجیب و غریب ہے ، اس سے رومی ٹوپی سارے پتیر برگ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی

ہی ہی ہی! ایو ناہنتا ہو بس گز ارے کے لائق ہی،
 'خیر' خباب گز ارے کے لائق، ذرا تیز چلے! تمام راتے اسی چال سے چلو گے؟ کیوں؟
 دوں تان کر ایک چٹاغا؟

میرا سر ٹپا جاتا ہو، کشیدہ قامت نوجوان میں ہی ایک کہتا ہے، 'دکھا سوٹ کے ہاں کل
 واسکا اور میں مل کر برانڈی کی چار بوتلیں اڑا گئے'،
 'سمجھ میں نہیں آتا تم اتنی کبواں کیوں کرتے ہو؟ دوسرا کشیدہ قامت نوجوان خفا
 ہو کر کہتا ہو، 'دیشیوں کی طرح جھوٹ بکتے ہو!'

اپنی جان کی قسم! سچ کہتا ہوں!
 یہ ایسا ہی ہو، جیسے یہ کہنا کہ جوں کھانستی ہے!
 ہی ہی! ایو ناہنتا ہے، صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں!
 'مردود! کبڑا غصے میں آکر خنیا ہو، چلاتا ہو، ملعون، نہیں! گٹاری یوں چلائی جاتی
 ہے! چلانے کا یہ طریقہ ہے! لگا ایک چابک - کم بخت کی چابک سے خبرے -

ایو نا کو اپنے پیچھے کپڑے کے ہٹنے چلنے اور کھپتی ہوئی آواز کا احساس ہوتا ہو، وہ منہ ہا
 کہ مجھے گایاں دی جا رہی ہیں، لوگوں کو دیکھتا ہو، اور تہائی کا بوجھ اُس کے دل پر سے ہلکا ہو جاتا
 ہے، کبڑا اُسے بڑا بھلا کہتا ہو، یہاں تک کہ اپنے چٹھے دار گرم گرم فقروں سے اُس کے گلے میں
 پسند اُپر جاتا ہو، اور کھانسی اُس کی زبان بند کر دیتی ہو۔ اُس کے کشیدہ قامت رفیق ندائندہ
 پترونا ایک عورت کا ذکر چھیڑتے ہیں، ایو نا اُن کی طرف دیکھتا ہو، تھوڑی دیر انتظار کر کے جب
 وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے ہیں، تو پھر مڑ کر دیکھتا ہو اور کہتا ہو -

'اُس جنتے... میرا...! کا گز ر گیا!'

'سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہو! کبڑا ٹھنڈا سانس کہنیتا ہو، اور کھانسنے کی ہونٹ پہنچتا ہو
 'خیر' تیز چلاؤ، تیز - یا رومجہ سے یہ چوٹی کی چال نہیں دیکھی جاتی! نہ معلوم کب پہنچائے گا؟

ذرا اس کی بہت بڑھاؤ... لگا دو گون پر ایک ہاتھ!،
 'ملوں، سُنتا ہے؟ مزہ اچھا دوں گا، تم لوگوں کا مذاق کرنے سے پیدل چلنا اچھا
 بھینے سُنتا ہے، یہاں کچھ ہم لوگ کہہ رہے ہیں، تیری جوتی کی نوک سے؟'
 ایونا کی مٹھی پر تھپڑ پڑتا ہے جس کا ٹراغا اُسے چوٹ سے زیادہ سنائی دیتا ہو۔
 'ہی ہی! وہ ہنستا ہے۔ صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں، خدا آپ صاحبان کو سلامت
 رکھے!'

دگڑی بان تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ ایک کشیدہ قامت یو چھتا ہو۔
 'میری؟ ہی ہی! صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں۔ اب گلاب!'
 ہو ہو ہو! یعنی قبر اُڑا سوچو، میرا بیٹا چل بسا، اور میں
 موت اٹکل پوچھ کر خیر کھٹکھٹاتی ہو۔ میرے پاس آنے کے بجائے۔
 ایونا ٹکرائیں اپنے بیٹے کی موت کا حال سُنتا ہو، مگر یہاں پہنچ
 کہتا ہے شکر ہے منزل مقصود پر آپہنچے۔ اپنے بیس کوپک لے کر ایونا دیر تک اُن اوباشوں کی
 طرف دیکھتا رہتا ہے، وہ ایک اندھیرے پھاٹک میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے
 ہیں، ایونا کے لئے پھر وہی تنہائی وہی ہو کا عالم چھا جاتا ہے، جو مدد گھڑی بھر کو ہلکا ہو گیا
 تھا وہ پھر اُبھرتا ہے۔ اور اس کے دل پر اتہائی شدت سو ٹوٹتا ہے، اُس کی نظروں سے
 غم و اندوہ ٹپکتا ہو، وہ بچیں نکالوں سے سڑک کے دونوں طرف لوگوں کی ریل پیل پر نظریں
 ڈالتا ہے، کیا اس ہزاروں کے مجمعے میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں، جو اُس کی دُکھ بھری
 کٹھائے؟ لوگ اُس سے، اُس کے غم سے غافل گزر رہے چلے جاتے ہیں... اس کا غم بے انتہا
 سخت، اندازے سے باہر ہے، اگر اُس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس کا غم اُس سے
 پھوٹ بیٹے، تو وہ تمام دنیا میں سیلاب کی طرح پھیل جائے، پھر بھی وہ کسی کو نظر نہیں آتا
 اُس نے ایک ایسے حیر خول میں چھپنے کو جگہ نکالی ہے کہ دن کے وقت چراغ لے کر ڈھونڈو

تب بھی زندگانی دے۔۔۔

ایونا کی نظر ایک دربان پر پڑتی ہے، جس کے ہاتھ میں ایک پلندہ ہے، وہ اُس سے تباہیت کرنے کی ٹھانتا ہے،
'بھئی کیا وقت ہوگا؟'

'دس بج چاہتے ہیں۔۔۔ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ آگے بڑھو!'

ایونا چند قدم آگے بڑھ جاتا ہے، اتنا جھکتا ہے کہ دوسرا ہو جاتا ہے، اور اپنے غم میں ڈوب جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ لوگوں سے کسی قسم کی امید رکھنا بے فائدہ ہے۔ پانچ منٹ نہیں گزرتے کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ سر اس طرح ہلاتا ہے جیسے سخت درد میں مبتلا ہے، اور باگ کھینچتا ہے۔۔۔ اب اس سے تکلیف نہیں سہی جاتی۔

واپس اصطلیل کو بڑا اپنے دل میں کہتا ہے: 'اصطلیل کو!'

گھوڑی اس کے خیالات کو تار کر ڈل گئی چلنے لگتی ہے۔ ڈیرہ گھنٹے بعد ایونا ایک غیلظ بڑے آتش دان کے پاس بیٹھا ہے، آتش دان پر، فرش پر، منچوں پر لوگ پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ ہوا بویں بسی ہوئی اور کشیف ہے، ایونا سونے والوں کی طرف آتا ہے۔ اپنا بدن کجاتا ہے، اور افسوس کرتا ہے، کہ ناحق اتنے سویرے گھر واپس آیا، مزدوری سے دانے کے دام بھی نہیں نکلیں گے! سوچتا ہے یہی وجہ ہے کہ میں اتنا غلین ہوں جو اپنا کام ٹھکانے سے کرتا ہے۔۔۔ جسے پیٹ بھر کھانے کو میسر ہے، جس کے گھوڑے کو پیٹ بھر دانا ملتا ہے، وہ ہمیشہ چین سے رہتا ہے۔۔۔

ایک کونے میں سے ایک نو عمر گاڑی بان اٹھتا ہے، کچھ سوتے کچھ جاگتے ٹھنکھارتا

ہے۔ اور پانی کی بالٹی کا رنج کرتا ہے،

'کچھ پیو گے؟ ایونا پوچھتا ہے،

'معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے؛

، خدا اس لائے۔ بھئی، دیکھو میرا بیٹا گزر گیا..... سنتے ہو؟ اس ہفتے، ہسپتال

میں... عجیب معاملہ ہے..

ایونا دیکھتا ہے کہ اُس کے لفظوں کا کیا اثر ہوا، مگر کچھ نظر نہیں آتا، نوجوان اپنا منہ پیٹ کر سو جاتا ہے، بذحاہ بھرتا ہو اور اپنا بدن کھجاتا ہے جس طرح نوجوان کو پانی کی پیاس تھی، اسی طرح وہ بات چیت کا پیاسا ہے، اس کے لڑکے کو مرے غم قریب ہفتہ بھر سو جائے گا، اور اب تک اُسے کسی سے کھل کر باتیں کرنے کا موقعہ نہیں ملا، وہ اس بارے میں ٹھٹھکنے لگا ہے، بھر کر باتیں کرنی چاہتا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتا ہے، کہ یہ بیٹا کیا کس طرح بیمار پڑا، اُس نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں، مرتے دم کیا کہا، کیونکر مرا...۔

سنائے، اور بتائے کہ کیونکر اپنے لڑکے کے کپڑے لینے۔

انیسا دیہات میں رہتی ہے، وہ چاہتا ہے کہ اُس

بہت کچھ کہنا سننا ہے، جس سے وہ باتیں کرے اُسے چاہیے کہ...

انہما کرے، اور اُس کے سوگ میں شریک ہو... اگر عورتیں بات کرنے کو بل جائیں تو اور بھی اچھا ہو، گو وہ بے وقوف ہوتی ہیں، اور بات شروع نہیں ہوتی کہ بسور نے لگتی

ہیں،

دھلیں، گھوڑی کو ایک نظر دیکھ آئیں، ایونا سوچتا ہے، سونے کے لئے بہت وقت

پڑا ہے... نیند کہیں نہیں گئی...،

کوٹ پہن کر گھوڑی کے تھان میں داخل ہوتا ہے، اسے دانے چارے، موسم کا خیال آتا ہے،... تنہائی میں وہ اپنے لڑکے کا خیال نہیں کر سکتا... کسی اور سے اس کا ذکر کر سکتا ہے۔ مگر اُس کا خیال کرنا اور تصور باندھنا یہ اذیت اُس کی برداشت سے باہر

ہے...

روانہ چارہ ہی ہو، اپنی گھوڑی کی روشن آنکھیں دیکھ کر پوچھتا ہے: اچھا جگالی کئے

جاؤ، کئے جاؤ... دانے کے لئے کافی مزدوری نہیں ملی تو ہم بھی، گھاس کھا کر گزارہ کر
لیں گے... ہاں... میری عمر اب گاڑی چلانے کی نہیں رہی، اب میرا نہیں، میرے
رہے کا کام سنبھالنے کا وقت تھا... وہ پورا گاڑی بان تھا... اسے کچھ دن اور
بیٹا تھا.....

ایونا تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو جاتا ہی، پھر کہتا ہے:
’بیٹی یہ بات ہے،... کزن مایو پنچ چل بسا... مجھ سے رخصت ہو گیا، بلا وجہ، اچانک
جان دے دی... اچھایوں سمجھو کہ تمہارا ایک بچہ پیرا ہے، اور تم اس قہقہے سے کھڑے
کی ماں ہو... اور کیا ایک وہ بچہ پیرا مر جائے... تو تمہیں اُس کا رنج ہو گا کہ نہیں؟
گھوڑی منہ چلاتی ہے، سننتی ہے، اور اپنے مالک کے ہاتھوں پر سانس لیتی
ہے، ایونا کا دل بھرتا ہے، اور وہ اُس کے سامنے اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے،
راز چھپوف مترجمہ خواجہ منظور حسین صاحب،

تفتیہ و تبصرہ

کتاب

یورپ میں دکنی مخطوطات | مولفہ سید نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ تقطیع ۲۰ x ۲۶ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ صفحات ۱۲۷ صفحات قیمت غیر مجلد فی نسخہ للہ مجلد صر مولف سے ملجا گورہ ترب بازار حیدر آباد دکن کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں ان دکنی قلمی نسخوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جو انگلستان۔ اسکاٹ لینڈ اور پیرس کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ دکنی مصنفین کے حالات اور ان کے کلام کے نمونوں کے ساتھ متفرق اردو اور فارسی نسخوں جن کتابوں اور مصنفوں کی نسبت اس کتاب۔

زبان کے قدیم ترین کارنامے اور اساتذہ ہیں جن سے با

اردو زبان کی تاریخ میں یہ کتاب نہایت اہم ہے۔ اور ہاں کی دوسری کتابوں کی طرح اردو زبان کی تنقیدی تحقیقی کارناموں میں ایک منظر کار نامہ ہے۔ کیونکہ جب تک اس سے مدد نہ لی جائیگی۔ کوئی تاریخ اردو زبان کی مکمل نہ ہو سکیگی قانون وقف علی الاولاد | مصنفہ مولوی محمد اسماعیل صاحب عینی ایڈوکیٹ میرٹھ حجم ۵۷ صفحہ تقطیع ۲۰ x ۲۶ لکھائی چھپائی کاغذ معمولی قیمت فی نسخہ مولف سے مل سکتی ہے۔

یہ قانون جو مسلمانوں کی جائدادوں کی حفاظت کے لئے وضع ہوا ہے۔ اور ان کے لئے بید مفید ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک عام طور پر اہل اسلام اس سے غافل ہیں۔ مولوی محمد اسماعیل صاحب نے اس کو صاف اور سلیس اردو زبان میں لکھ دیا ہے تاکہ مسلمان اس کو دیکھیں اور اس سے نفع اٹھا سکیں۔ ہر صاحب جائداد مسلم کو چاہئے کہ

اس کا مطالعہ کرے اور اس پر عمل درآمد کر کے اپنی ملکیت کو اپنی اولاد کے لئے محفوظ رکھ جائے
ریحان حمید | دیوان فارسی جناب مولوی حمید الزماں صاحب حمید شاہجہاں پوری
 قلعہ ۲۰۶۲۶ حجم پانچ جزو۔ کھائی، چھپائی اور کاغذ اعلیٰ درجہ کا۔ قیمت درج نہیں مطبعہ آگرہ
 اخبار سے شائع ہوا۔

مولوی حمید الزماں صاحب کو فارسی زبان سے ذوق ہے۔ اور وہ اکثر غزلیں یا
 قطعات لکھتے ہیں۔ کبھی کبھی اردو میں بھی زمرہ سنجی کرتے ہیں۔ اب انہوں نے اپنے کلام کا
 ایک مختصر مجموعہ مذکورہ بالا نام سے شائع کیا ہے جس میں بڑا حصہ فارسی کلام کا ہے۔ اور آخر
 میں اردو غزلیں ہیں۔ کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان کو زبان پر قدرت ہے۔ بیان صاف
 ہے۔ اکثر اس تذہ کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ نمونہ دو چار اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

تاسرے پلے اُن بت گلرود ہنادہ ایم کوئیں را اگر فتنہ بیک سو ہنادہ ایم
 واعظ بنار بزم سیر نقبیل قال ماسر بطاق گوشہ ابرو ہنادہ ایم

ز غرور حسن دنی سر خود فرزند کردن بہ کرشمہ از دو چشمت در قفہ باز کردن
 چہ خوش است جانِ جاناں بہ تم جو کہ گوئی بنش یعنی پسندم گلہ را در اند کردن

اردو کا نمونہ یہ ہے۔

سنا تھا غیر کے ہمراہ آپ آتے تھے یہ سیکے دل میں میری ریج تپا آتے تھے
 مدد کے ساتھ میں آنے سے مدد عاید تھا ہمارے دل کو دکھانے جاب آتے تھے

گلزار عثمانی | مولوی عبدالقوی صاحب قاتی ایم۔ اے (علیگ) معلم شعبہ فارسی وارو
 کمنیونیورسٹی نے شہزادگان اصف جاہی کی تقریب کدخدائی پر فارسی تصانیف بطور تہنیت کے

پیش کئے۔ نیز چند قصیدے ہزارگز المیڈ ہائی نس اعلیٰ حضرت نظام کی مدح میں بھی اس مجموعہ میں ہیں۔

یہ قصائد لسانی اور شاعرانہ دونوں خوبیوں کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے قصائد ہیں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ مصنف نے اپنی زبان دانی کی قدرت کا تماشا دکھایا ہے کہ خاقانی سے لیکر قاضی تک کے رنگ میں قصائد لکھے ہیں۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجہ۔ حجم ۴۸۰ صفحات۔

سواراج دین ودنیا | مصنف محمد شرف الدین گندپی شیردوار

حیدرآباد دکن۔ تقطیع خورد۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ

آج جب کہ دنیا سواراج کے لئے میدان ملے

سے مقابلہ کر رہی ہے۔ مولوی محمد شرف الدین صاحب نے دین

اس چھوٹے سے رسالہ میں چند اخلاقی سبق لکھ دئے ہیں۔ ممدوح کا قول یہ ہے نہ اُن کے بار بار

پڑھنے اور اُن پر عمل کرنے سے دونوں جہان کا سواراج مل سکتا ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے نصیحتیں اچھی منتخب کی ہیں لیکن اس امر کی طرف خیال نہ فرما

کہ حکمت اور ہے اور حکومت اور۔

بارش اور قرآن | مصنف طبیب علی عبدالرسول شاہ۔ تقطیع خورد۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی

حجم تین جزد۔ لئے کا پتہ نسیم سحر آنس۔ راجہ سنگھ اسٹریٹ جلیپور۔ قیمت فی نسخہ ۴

یہ ایک مضمون جو جس کو مصنف نے کسی رسالہ میں شائع کرایا تھا۔ پھر اس کو الگ چھاپا

ہے۔ اس میں بارش کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ بتلایا گیا ہے۔ اس کو تفصیل کے ساتھ بیان

کیا ہے۔ اور موجودہ علم طبعی کی اس کے ساتھ مطابقت دکھائی ہے۔ قرآن کی آیتوں سے

یہ بتایا ہے کہ بادل کیونکر بنتے ہیں۔ اور انکی کتنی قسمیں ہوتی ہیں۔ پھر بارش کیونکر ہوتی ہے اور کتنے

اقسام پر تقسیم ہے نیز اس سے دنیا کو کیا کیا فائدے پہنچتے ہیں اور کن کن آیات ربانی پر استدلال ہوتا ہے



یہ کتابیں کئی برسوں سے کتابخانہ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں اور
 جاننا چاہتے ہیں کہ اسی قسم کے علمی رسائل قرآن کریم سے کچھ جاتیں۔ طیب علی صاحب کے آثار
 کار سے ہماری دل میں امید پیدا ہو گئی ہے۔ کہ آئندہ وہ اور ان کو دیکھ کر دوسرے طلباء قرآن
 اس منزل میں قدم رکھیں گے۔

انہوں نے جس خوبی سے اس رسالہ کو لکھا ہے۔ اور جس طرح اس مضمون کے متعلق آیات
 قرآن کا امتیاع کیا ہے۔ وہ بہت قابلِ داد ہے۔

مشاہدات داؤدی بوہرہ اوقات کے چشم دید حالات۔ نوشتہ جناب سیلاب اکبر آبادی
 قلعہ خور۔ حجم چار جزو۔ قیمت فی نسخہ ہر
 نے کا پتہ نسیم سحر آمن سنگر اسٹریٹ۔ جلیپور

اس رسالہ میں جناب سیلاب صاحب نے بطور خود داؤدی بوہرہ اوقات کے حالات
 کی تفتیش کی۔ ان کی کیفیت دیکھی۔ اور جو کچھ دیکھا۔ اس کو لکھ کر شائع کر دیا۔ انکی تحقیقات کا نتیجہ
 ان کے الفاظ میں یہ ہے۔ کہ داؤدی بوہرہ اوقات کی حالت بالکل قابلِ اطمینان ہے انتظامات
 نہایت قابل اور تجربہ کار ہاتھوں میں ہیں۔ اور اوقات کی نگرانی اور ان کی آمدنی کا جمع خرچ
 نہایت احتیاط سے ہوتا ہے۔

رسائل۔

مورخ ایہ رسالہ چھوٹی قلعہ پرہم صفحہ ماہوار کا مولوی سید علی اظہر صاحب عابدی کی ادارت
 فیض آباد سے نکلتا شروع ہوا ہے جس کا پہلا نمبر اپریل ۱۹۳۲ء کا تنقید کیلئے موصول ہوا ہے
 قیمت سالانہ پچاس روپے۔

اس رسالہ کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یعنی خدمتِ تارک۔ چنانچہ زیرِ تنقید
 رسالہ میں تاریخی ہی مضامین ہیں۔ لیکن لکھائی چھپائی نہایت رومی اور کاغذ اس سے زیادہ
 مضامین بھی موصول ہیں۔ کائنات مذہب میں اسکی موری مسموئی دفتوں مشیتوں کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے۔

دنیا کی رفتار مالک غیر

چین اور منچوریا | شنگائی کے علاقہ میں جنگ بند ہو گئی اور بظاہر جمعیۃ اقوام کی ٹانگیں اٹھیں۔ دنیا کو ایک مادہ عظیم سے

جایا۔ اگرچہ کھوتہ ہونے سے پہلے جو حالات پیدا ہوئے ان سب سے اس کا اعلان ہونا تھا کہ طرفین کے اہل مابین

نہیں چھین اپنی بے بسی کی وجہ سے ایک کڑوا گھونٹ پنی رہا ہے اور بازار کے ہٹانے کے جانتا ہے کہ منچوریا پر تو اس کا تسلط ہو ہی گیا۔ قدم نہ

اور منچوریا میں صورت حال کچھ اچھی نہیں۔ جاپان اور روس میں کشیدگی

چین کے دونوں سیاسی مرکزوں لیوانگ اور نانکنگ کو مطلع کر دیا ہے

پیام بھیج دیا گیا ہے کہ اب چین ہماری طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ بے کار چوری مابین

طرف سے بھی ایک پیام جمعیۃ اقوام کو ملا ہے کہ "منچوریا کی نام نہاد خود مختار حکومت تمام و کمال جاپانی اڑیں ہے اور

اس کے کارکن آزاد اور خود مختار نہیں ہیں۔" جدید دستور اساسی کا اعلان ہو گیا ہے جس کی رو سے تمام طاقت ڈکٹیٹر

کے ہاتھ میں ہے جسے قوم کے سامنے جواب دہ بتلایا گیا ہے۔ وزارت اس ڈکٹیٹر کے زیر فرمان ہے۔ ڈکٹیٹر اپنی

مشیر جماعت کی رائے سے تمام ایسے قوانین بھی منظور کر سکتا ہے جسے جماعت قانون ساز مسترد کر چکی ہو! پہلا طبقہ

بولانی میں ہونے والا ہے!

لیکن دستور کے اعلان نے ملک میں پرمی کم نہیں کی کچھ بڑھ چکی ہے۔ ہر طرف اس نئی حکومت

کی شدت سے مخالفت ہو رہی ہے اور یہ جاپانی ہندوؤں کے دہرائے کو قائم کئے ہوئے ہے دیکھنا ہے تاکہ

روسی سرحد پر بھی برابر کچھ نہ کچھ چھڑ جائے جاری ہے۔ روسی وزیر خارجہ کاراخان اور جاپانی سفیر ہیرودائیمہ

گرم گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن روس اپنے کو بہت روکے ہوئے ہے اس لئے کہ ڈر ہے کہ اس کی مخالفت میں

فرانس اور انگلستان جاپان سے مل کر اسے سخت نقصان پہنچا دیں گے۔

جاپان | خود جاپان میں اس مہینہ میں وزیر اعظم انوکائی کے قتل کا حادثہ اندرونی حالات کی پیچیدگی کا منظر ہے۔ یہاں بھی یہ قتل ایک اہم واقعہ ہوتا لیکن موجودہ حالات میں اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہے کہ اس سے جاپان میں آئینی حکومت کے مستقبل کا مسئلہ وابستہ معلوم ہوتا ہے اور دوسری قوموں کے لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی جاپانی وزارت جو معاہدہ کرے وہ قابل اعتماد بھی سمجھا جاسکتا ہے یا نہیں۔ جاپان میں آئینی حکومت کے قیام کو کوئی ۲۴ سال ہوتے ہیں اس لئے یہ توقع ہے جاپان میں اس طرز حکومت کی عادی ہو چکی ہوگی۔ لیکن حال میں جو صورتیں پیدا ہوئی ہیں وہ اس توقع میں شبہ کا عنصر شامل کر دیتی ہیں۔ ایک طرف سیاسیین کی کمزوری ہے اور خود غرضی دوسری طرف فوجی جماعت کا غور ہے اور بے مبری۔ اور اندیشہ ہے اس کشاکش میں جاپان کا نظام حکومت درہم برہم نہ ہو جائے۔ ۱۹۳۱ء کو جب واکٹسکی کی وزارت ختم ہوئی تو گویا اکثریت کی حکومت کو ایک ضرب کاری ملی۔ اس لئے کہ ملک کے ایلیاتی طرز عمل میں تبدیلی پیدا ہو۔ پھر یہاں پہلے کے معاملہ میں بھی فوجی گروہ نے بہت کچھ اپنی مرضی پر کام کیا۔ شنگھائی کا سرکہ جس میں بحری دہری افواج کی بڑی تعداد ملک سے باہر بھیجی گئی وہ جب شروع ہوا ہے تو اس سے پہلے اس کا ذکر بھی جاپانی پارلیمنٹ میں نہ ہوا تھا! جب مصارف کی منظوری کا مسئلہ پارلیمنٹ کے سامنے آیا تو ہر رکن نظر قتل سے اپنی پیشانی کے سامنے ایک بھرا دیو اور دیکھتا تھا اور ظاہر ہے کہ کم لوگ اس حال میں آزادی سے رائے دے سکتے ہیں۔ چنانچہ مصارف منظور کر دئے گئے۔ ایوان خاص کے ایک معزز رکن ڈاکٹر فی تو بے نے کہیں کہہ دیا تھا کہ ”یہ فوجی جتنے اور اشتراکی جماعتیں قوم کو تباہ کئے ڈالتی ہیں“ تو انھیں سخت بیماری کی حالت میں ہسپتال سے نکال کر معافی شنگھائی لگائی۔ سب کو معلوم تھا کہ سابقہ وزیر مال اتویہ اور بیرن تاکوآوان کے قاتلوں کو ہسپتال مشہور بحری کمانڈر فوجی نے دئے تھے جو نو بد کو شنگھائی کے سرکہ میں کام آیا۔ غرض چار طرف ”وطن دوست“ جماعتوں کا دور دورہ ہے جو قوم کی اصلاح بالجبر کے دریے ہیں اور جن کا کام میں فرشتے بنانا ہے کہ کس کس متاثر شخص کو جلد سے جلد کوئی کا نشانہ بنایا جائے تاکہ قوم ترقی کرے! ان فرشتوں میں جاپان کے تقریباً سب مشہور مدبر شامل ہیں!

جاپان میں یہ چیز بالکل نئی ہے۔ جاپانی سیاسی جماعتیں پہلے ہی رڑتی تھیں لیکن جب کوئی فیصلہ ہوجاتا تھا تو شاہی منظوری اسے مقدس بنا دیتی تھی اور ہر جاپانی اسے اپنا فیصلہ جانتا تھا۔ اور یہ چیز جاپانیوں کے لئے یہ حیثیت قوم بڑی قوت کا باعث تھی معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ حال کی گونا گوں مشکلات کے بارے میں اس

بدایت کو ختم کر دیا ہے۔ اور وزیر داخلہ انوکائی کا قتل اس کے خاتمہ کا اعلان ہے۔ اس خاتمہ کی ذمہ داری
اشتر کی اور فوجی جاسوسوں کے سر پر ہے۔ اشتر کیوں کو تو حکومت دہلیتی تھی، مگر فوجی اور بحری قتلوں میں ضروری
کی اس کی کا علاج حکومت کے پاس کیا ہے؟ سیاست میں فوج کا طرفدار ہونا اور فوجی قاتلوں کا سیاسی
جسٹوں سے وابستہ ہو جانا پہلے ہی سلطنتوں کو تباہ کر چکا ہے۔ سلطنت روم میں یہی ہو "چین کی قوت اسی
سے منتشر ہوئی، کیا جاپانی سپاہی بھی قوم کے خادم ہونے کی جگہ اس کا آقا بننے کی ہوس میں جاپانی غفلت
کے انتقام کا آغاز کر رہا ہے؟

فرانس | اپنا سالانہ میزانیہ منظور کرنے کے بعد فرانسیسی پارلیمنٹ کے
کی توجہ تمام انتخابات کی جانب ہو گئی تھی۔ انتخابات پہلی
یہ انتخاب کا طریقہ یہ ہے کہ ملک کو انتخابی قتلوں میں تقسیم کر دیا گیا۔
پہلے انتخاب میں اس شخص کو منتخب شدہ سمجھتے ہیں جسے اپنے دوسرے
عائیل کی ہوں۔ جن قتلوں میں کوئی شخص اتنی رائیں نہیں پاتا وہاں پھر انتخاب
انتخاب کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے۔

انتخاب سے پہلے فروری میں ایوان عام (جمیر) میں طریقہ انتخاب میں ترمیم کی تجویز منظور ہوئی تھی
جس کی رو سے دوسرا انتخاب غیر ضروری قرار دیا گیا اور عورتوں کو حق انتخاب دینے کی تجویز تھی۔ (کیسی عجیب
بات ہے کہ دنیا کی سب سے قدیم جمہوریت میں آج تک عورتوں کو رائے دینے کا حق نہیں ہے!) لیکن
ایوان خاص (سینٹ) نے تقریباً بیک آواز اسے مسترد کر دیا۔ جب یہ تجویز دوبارہ جمیر میں آئی (دراستح کو)
تو عام انتخابات سر پر آچکے تھے اس لئے جمیر نے اسے فروری کے واسطے فیصلہ کو واپس لے لیا۔

دوسرا انتخاب ہرمی کو ہونے والا تھا اور ہرمی کو ایک پاگل روسی ڈاکٹر نے صدر جمہوریہ "موسیو
دوے" کو کئی گولیوں کا نشانہ بنایا اور وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ روس میں ذہنی کام کرنے والوں
کے ساتھ عموماً اور موجودہ نظام حکومت کے مخالفوں کے ساتھ خصوصاً جو بدسلوکی روا رکھی جاتی ہے اس نے
ان گنتی روسیوں کو پردیس میں ہجرت کر جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ پاگل ڈاکٹر بھی انہیں سماجین میں سے ہے
جن کے ساتھ فرانس نے حق الوبح اچھا سلوک کیا ہے! مگر یہ اپنے دل کی بے چینی کو کیا کرتا! اپنے ملک کی

سیاسی حالت جس نے گھر چھڑایا اس کے بدلے سے بدلتی تھی، 'ناکامی پر غصہ تھا' اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کی طرح ساری فرانسیسی قوم کو بھی غصہ کیوں نہیں اور وہ اس کی خاطر دوس پر حملہ آور کیوں نہیں ہو جاتی، چنانچہ اس کے نزدیک وہ بھی اسی قدر نفرت کی مستحق قرار پاتی تھی جتنی کہ دوس کی موجودہ حکومت۔ بس کیا تھا، مونٹے ملا اور اس نے اس حکومت کے صدر کو قتل کر دیا۔ اس پر نہ تعجب ضروری ہے نہ اس سے نفرت کہ جنون کی منطق ہی جہاں ہے!

اس واقعہ نے یوں تو چند روز کے لئے فرانس کو ماتم کہہ بنا دیا لیکن انتخابات پر اس کا ذرا اثر نہ پڑا۔ اس لئے کہ قاتل پر ویسی تھا اور ملک کی کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ سینٹ کے صدر ماریو لوبرون جو اعتدال پسند سیاسی ہیں اور اپنی اصابت رائے کے لئے بہت مشہور ہیں، صدر جمہوریہ منتخب ہو گئے۔

عام انتخابات میں پچھلے ایوان عام کی مخالف جماعتوں کو زیادہ کامیابی ہوئی۔ پچھلے ایوان میں قدامت پسند جماعتوں کی اکثریت تھی۔ اس مرتبہ Radical Socialism اور اشتراکی جماعتوں کے نمائندے بڑھ گئے ہیں۔ مخالف جماعتوں کے پاس انتخاب کے سرکہ میں یہ حربے تھے کہ موجودہ حکومت ملک کے معاشی مصائب کی ذمہ داری ہے، بحث کی تمام دشواریاں انھیں نے پیدا کیں، بسن بنگوں کو بدلنے کے لئے بہت بڑی بڑی رقمیں صرف کی گئیں، بہت سے شخصی کاروبار کرنے والوں کو خیر رقمیں دی گئیں اور جذبی مشرقی یورپ کی دیوالیہ قوموں پر نہ جانے کتنا کچھ صرف کیا گیا، تخفیف اسلحہ کی تجارت کی حمایت حکومت نے دل سے نہیں کی۔ اور بریاں نے دول یورپ میں باہمی تعاون اور اتحاد کی جو کوششیں کی تھیں انھیں بھی حکومت نے اچھی طرح پھینچنے نہ دیا۔

جنوب مشرقی یورپ کا معاشی اتحاد | قوم پرستی کی تنگ نمبر نے یورپ کی معاشی زندگی کو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کی تدبیریں برابر سوچی جا رہی ہیں۔ کچھ حصہ ہوا جرمنی اور آسٹریا میں اتحاد معاشی کی تجویز نہایت زور سے اٹھی تھی لیکن فرانس کے سیاسی دباؤ نے اسے رو براہ نہ آنے دیا۔ اب ساحل ڈینیوب والی ریاستوں میں اتحاد معاشی کی تجویز پیش ہے۔ اس تجویز کا آغاز تو انگلستان میں کوئی تین مہینے پہلے ہوا تھا، مگر اسے فوراً فرانس نے اپنا لیا۔ فرانس اور انگلستان کی طرف سے تجویز یہ تھی کہ چکوسلوواکیا، آسٹریا، ہنگری، رومانیہ اور یوگوسلاویہ اپنے آپس کے حاصل درآمد میں ۱۰ فی صدی کی کمی کر دیں، دوسرے ممالک کو جو مخصوص جدا جدا حقوق حاصل

ہیہ وہ ان سے دست کش ہو جائیں اور ان کے مال پر جو در آمد کے حاصل لگائے ہیں ان میں اب مزید اضافہ نہ کریں۔ ان ممالک کی زرعی پیداوار پر جو حاصل در آمد دوسرے ممالک میں ہیں ان میں کمی کر دی جائے اور زرعی ضروریات کے لئے ان ممالک کو کوئی ۵ اکروڑ روپیہ کا قرضہ دیا جائے اور اس قرض کے خاص انجمنان 'فرانس' جو مینی اور اٹلی ہوں جو من اور اطالوی غائبہوں نے اس تدبیر کو طے پسند کیا کہ ان کے نزدیک اس سے دینیوبی ممالک کی بھی کچھ مدد نہ ہو سکے گی اور خود ان کے ملکوں کو غیر ضروری معاشی مشکلات میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ یہ دونوں قومیں اس تجویز کی زیادہ حامی اس لئے بھی نہیں کہ یہ صاف طور پر ان سرکاری ممالک میں فرانسیسی اثر کو مستحکم کرنے کی ایک اور تدبیر ہے جس پر عمل اس لئے آسان ہوگا کہ شہر کاہنوں سے انٹر مالی اعتبار سے پہلے ہی سے فرانس کے دست نگر ہیں۔ فرانس اور اٹلی کے علاوہ بولنڈ کے اندراجات بھی اس تجویز کی کم دیش مخالفت ہی کر رہے ہیں اور اس پر توثیق قائم ہی ہو تو اس میں بولینڈ کی شرکت ضروری ہے۔

غرض فرانس کی خود غرضی اور دوسری دول کی رقا

مگر صورت حال ایسی ہے کہ کوئی نہ کوئی حل نکالنا لازمی ہے جس سے ریاستوں کو ادا کرنی پڑی ہے اس کا بوجھ اب اٹھائے نہیں اٹھتا۔ جنگ سے پہلے آسٹریا ہنگری کی سلطنت اگر پہلی اور سانی اعتبار سے مختلف اور متضاد عناصر سے مرکب تھی اور اس لئے سیاسی رقابتوں کا جونا گاہ تھی مگر معاشی خوشحالی کی خاصن بھی تھی۔ سلطنت کے زراعتی اور صنعتی علاقوں میں خوب تبادلہ اجناس ہوتا تھا اور اندرونی تجارت ہی خوشحالی قائم رکھنے کے لئے کافی تھی۔ اب جو نئی ریاستیں بنیں وہ سب اپنی سیاسی آزادی کے ساتھ معاشی خود مختاری کی بھی خواہاں ہیں۔ قوم پرستی کا بھوت سب کے سر پر سوار ہے اور یہ زرخیز اور خاصا ترقی یافتہ صنعتی علاقہ فلاکت و افلاس سے دوچار ہے۔ آسٹریا اور یوگوسلاویا کی صنعتی پیداوار ہنگری میں نہیں جاسکتی اور ہنگری کا غلہ آسٹریا میں نہیں آسکتا اور یہ ملک جو پہلے آپس میں خوب لین دین کرتے تھے اب بس یورپ کے دوسرے ممالک سے تجارت پر مجبور ہیں اور یہ تجارت اتنی نہیں کہ ان کے مال کی نکاسی ہو سکے۔

ہر چند کہ اس وقت اس اتحاد معاشی کی تجویز ملتوی ہو گئی ہے لیکن یقین ہے کہ معاشی دشواریاں پھر مسئلہ کو سامنے لائیں گی اور شاید اتحاد یورپ کا وہ خواب جو چند مغربی مفکرین نے سیاست کے ہنگاموں

سے دور دکھایا تھا اور جیسے بریائیں نے اپنا کرم و دار سیاست کا جزو بنا دیا ان منصوبوں میں اپنی قبریں بنائیں اور پھر تنگ نظر قوم پرستی کے نقصانات سے تنگ آکر اپنے نظام سیاسی و سماجی میں ترمیم کی طرف متوجہ ہو۔

اسلامی ممالک

افغانستان انگریزوں کی نظر میں | ایک انگریز نامہ نگار لکھتا ہے :-

”تاجدار افغانستان کی یہ کوشش ہے کہ وہ شاہ مغزول کی قائم کردہ بنیادوں پر ایک مضبوط عمارت تیار کریں۔ افغانستان میں ویرانی حکومت کی ابتدا ہوئے کم و بیش ایک صدی گزر چکی ہے۔ اسی اثنا میں اکثر خوزیریاں ہوتی رہیں چنانچہ ابھی تک ملک میں انقلاب ۱۹۲۹ء کے آثار باقی ہیں۔“

بائیں ہمہ اگر افغانستان کو دنیا میں عزت کی زندگی بسر کرنا ہے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ موجودہ صورت حالات کو یکسر بدل ڈالے۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایک جاہل اور غیر تمدن قوم اعلیٰ درجے کی مہذب اور تعلیم یافتہ قوموں کے درمیان آزادانہ حیثیت اختیار کر سکے۔ افغانستان کی آبادی شاید ایک کروڑ ہوگی۔ جنوب اور مشرق میں بھٹان اور افغان بے ہیں وسط میں تھاماری اور ہزار قبائل مغرب میں ایک قبیل آبادی ایرانیوں کی ہے اور شمال میں حدود روس تک تاجیک اوزبک اور مختلف ترکی عناصر آباد ہیں۔ ان لوگوں میں اتحاد و اتفاق کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے۔ ہزار قبائل اور ویرانی پشتاپشت سے ایک دوسرے کے دشمن پچھے آئے ہیں۔ ترکی عناصر کسی خارجی دباؤ یا اثر کو پسند نہیں کرتے اور تاجیک جو نسبتاً زیادہ امن پسند ہیں افغانوں کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

اس وقت افغانستان میں ستر ہزار قواعداں سپاہی ہیں لیکن ان کی جنگی صلاحیات کم و بیش ختم ہیں۔ اگر نظم و انضباط پر زور دیا جائے تو بھٹان نہایت اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ محکمہ پولیس اگرچہ ایک ایسے افسر کی زیر نگرانی ہے جو اسکاٹ لینڈ یا رڈ کا تربیت یافتہ ہے لیکن

اس محکمہ کا اثر زیادہ تر شہروں تک محدود ہے۔ دیہات میں لوگوں کے تعلقات آپس میں خوشگوار ہیں اور قسطنطنیہ کے اضلاع بہت کم۔ اگر افغانستان میں آبپاشی کا مقول انتظام ہو جائے تو زرعی پیداوار میں بہت کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔ قندھار کے قرب و جوار میں اعلیٰ درجہ کا گیسو پیدا ہوتا ہے حکومت کی طرف سے گیسوں اور چلوں کی کاشت کے لئے اکثر اضلاع میں ”مزرعے“ دیگر کھجور، عارم، نام کے گئے ہیں۔ مصر اور امریکہ سے کپاس کا بیج حاصل کیا گیا ہے اور مصنوعی شیشے کے شیشے کے ملک کے محتاج نہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ کپاس کی کاشت۔

سے سوتی کپڑے ملوانے کی ضرورت باقی رہے۔ باب شروع کر دے ہیں لیکن ان کی نسل کشی کے لئے افغانستان میں پالتو جانور کچھ بہت اچھی قسم کے نہیں۔ اس وقت افغانستان میں کپاس تنباکو تیس کے

ہوتی ہے۔ تقریباً ایک لاکھ ایکڑ پر آبپاشی کا سلسلہ پیدا ہو رہا ہے۔

یا کچھ نہیں ہیں۔ ہزار قبائل زیریں دوزخوں کی تیاری میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ یہی حال ان ایرانیوں کا ہے جو وادی مہمند اور قندھار میں آباد ہیں۔ افغان زیادہ تر غلام بدویش ہیں۔ ان کے ایک تہائی حصے کا مستقل قیام کسی علاقے میں نہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر وہ آبپاشی کو وسعت دی جائے تو بہ نسبت اس وقت کے تین حصے زائد زمین کاشت کے قابل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ تاجدار افغانستان آبپاشی کی ایک بہت بڑی اسکیم پر غور کر رہے ہیں۔ افغان کاشتکار وہی پرانا اہل استعمال کرتا ہے جو اب دلا بادل سے اس کے ملک میں رائج ہے۔ اس کا کام کھالوں کا بیجنا اور کپاس، نمک اور کپڑا خریدنا ہے۔ قرض کی ضرورت ہو تو اس کے لئے کسی سنی مسلمان، شیعہ ایرانی، ارمینی عیسائی، یہودی یا ہندو کے ہاں ہینتا ہے۔ قحط سالی سے اسے زیادہ نقصان نہیں ہینتا۔ اول تو افغانستان میں قحط سالی ہوتی بہت کم ہے اور جو بھی قحطانہ بدویش قبائل کو اس سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ ٹیکسوں کو اس نے کبھی پسند نہیں کیا۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ حکومت صرف پیداوار کے پانچ یا پچھلے حصے کی مستحق ہے۔

انسانوں پر جدید خیالات کا مطلق اثر نہیں۔ صرف دو ایک شہر میں جن میں سینا موجود ہیں۔ ریڈیو بھی صرف اہل شہر تک محدود ہے۔ سوائے قرآن خوانی کے تقریباً تمام آبادی لٹریچر سے غامض ہے۔ عام عورتیں اگرچہ بے نقاب رہتی ہیں لیکن ان کا مردوں سے مطلق میل جول نہیں۔ دیہات میں اخبار کبھی نہیں پہنچتے اور اہل تو شہروں میں بھی اخبارات کا وجود کس گنتی میں ہے۔ یونہی کبھی کبھی دیہات میں شہر کی کوئی خبر پہنچ جاتی ہے۔ دیہاتیوں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ مجلس ملی کے لئے اپنا نمائندہ چن لیں۔ تعلیم سے ان کو کوئی رغبت نہیں۔ مدارس سے صرف ساجد یا زمیندار فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اہل دیہات صرف اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب ملا ان سے یہ کہتے ہیں کہ مذہب خطرے میں ہے مثلاً امان اللہ خاں نے فرنگی ٹوپی کیوں پہنی یا قادیانی کو سنگسار کر دیا گیا تو بہت اچھا کیا۔

اہل دیہات کا مطلق نظر صرف اس وقت بدل سکتا ہے جب ملک میں ہر طرف ریڈیو اور ٹیلیگرافیں پھیل جائیں۔ قضائی آمدورفت عام ہو جائے۔ ہر طرف امن و امان قائم ہو۔ لوگ قانون کا احترام کریں۔ حکومت باقاعدہ اور منظم ہو لیکن اس کے لئے انٹیکسوں میں اضافہ کرنا ناگزیر ہوگا اور ٹیکس انفاستان میں نہایت ناپسند کئے جاتے ہیں۔ انفاستان کی حکومت کوئی چھوٹی کی سیج نہیں۔ تاجدار انفاستان کا راستہ مشکلات سے پر ہے لیکن اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی ایک نہایت ہی محتاط اور مدبر حاکم ہیں اور وہ جو قدم اٹھاتے ہیں سوچ سمجھ کر اٹھاتے ہیں۔

اتحاد عراق و ایران | پچھلے مہینے شاہ فیصل ایران تشریف لے گئے جہاں ان کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا گیا۔ طہران میں دعوتوں اور استقبالوں کی بھرمار تھی۔ شاہ فیصل تم کی زیارت کرتے ہوئے سلطان آباد آئے اور وہاں سے ہرمئی کو عمرہ پہنچے، البتہ نوری پاشا براہ راست اسی روز بغداد پہنچ گئے۔

جبکہ اس سے پہلے عرض کیا تھا شاہ عراق کا مقصود اس سفر سے یہ تھا کہ دولت ایران و عراق میں دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔ عراق اور ایران کی ایک دوسرے سے کشیدگی کی بڑی وجہ کر دی قبائل کی نقل و حرکت تھی جو بین الاقوامی ذمہ داریوں کا خیال کئے بغیر اپنی آزادی اور سرکشی کی وجہ سے عراق سے ایران اور ایران سے عراق کی سرحد میں پلے آتے تھے۔ اس صورت حالات میں اگرچہ

کوئی مسئلہ بغیر نہیں ہو لیکن بایں جمہ سیاسی معلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ ایران و عراق کے تمام باہمی اختلافات دور ہو گئے ہیں اور عقرب دونوں مہمایہ مالک کے درمیان دوستانہ معاہدہ قائم ہو جائیگا۔ اس کے لئے جس قسم کی گفت و شنید کی ضرورت ہے اس کے لئے بغداد میں ایرانی اور عراقی نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوگی۔ عراق میں اس معاہدہ کو غیر معمولی اہمیت دی جا رہی ہے اس لئے کہ جب تک عراق کے خارجی معاملات صلح و آشتی سے طے نہیں ہو جاتے اس کا مجلس اقوام میں داخل ہونا دشوار ہے۔ چنانچہ عراق کے برطانوی ہائی کمشنر جنیو اور انہوں نے ہو چکے ہیں تاکہ فائنل انتداب کے لئے جو شرائط پیش کیا رہی ہیں ان پر غور و خوض کر سکیں۔ عراق اور شام کی سرحد کے تقصیف کے لئے جو کمیشن بنایا گیا تھا اس کی مدت کرنل اسٹلین کے سپرد کی گئی ہے۔ صدر مذکور سوستان کے نہایت سرگرمی سے انجام دے رہے ہیں۔

عراق کا تذکرہ ان صفحات میں اس کثرت سے۔

کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اب تک

کے باہمی تعلقات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل ان لوگوں کے خیالات ہی تصیری ہو دوں براہیہ پر اعتماد ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ جن کے نزدیک عراق کی ترقی مجلس اقوام اور انگریز یا سین کے ساتھ اشتراک و تعاون پر موقوف ہے۔ ہیں اس سلسلہ پر کوئی خاص اعتراض نہیں اس لئے کہ اہل عراق اپنے مصالح کو ہم سے بہتر سمجھتے ہیں لیکن ہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ امت عربیہ کی تقسیم و تفریق کا جو سلسلہ مجلس اقوام نے مشرقِ قریبہ میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام سے شروع کیا ہے وہ اسلام کے دینی اور تمدنی مصالح سے قطع نظر کرتے ہوئے عربوں کے سیاسی اور معاشی مفاد کے لئے بھی کسی طرح موزوں نہیں اور غالباً اسی لئے قرب و جوار کے اسلامی مالک نے ان ریاستوں کو کسی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ جب تک ان ریاستوں میں غیر قوموں کا ہاتھ رہے گا اس کا کوئی نہ کوئی ناخوشگوار اور غیر پسندیدہ اثر مہمایہ مالک پر ضرور پڑے گا تا نیا عرب اقوام کی یہ جبری تفریق ان کے باہمی اتفاق و اتحاد میں بہت بری طرح سے مائل ہے۔ محض سیاسی اور معاشی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تب بھی اس امر کا اقرار کرنا پڑے گا کہ ایسے علاقے پر جس کے معاشی اور سیاسی مصالح تقریباً یکساں ہیں ایک کی بجائے پانچ چھ حکومتوں کا خرچ ڈالنا دور اندیشی سے بعید ہے۔ علاوہ ازیں عراق کی حقیقی آزادی صرف اس

وقت ممکن ہے جب اس کے اقتصادی معاملات خود اس کے ہاتھ میں ہوں، سیاسیات میں اسکا طرز عمل اس کی مرضی کا پابند ہو لیکن یہ مجلس ارقام کی شرائط اور اس کی پابندیاں، یہ تعلیموں کے حقوق و مراعات، یہ تیل کے ٹیکے، بین الاقوامی ذمہ داریاں اور یہ برطانیہ کے فضائی مستقر جب تک یہ چیزیں موجود ہیں حریف کو آزادی کا درجہ کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟ ارباب بصیرت اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟

حوادث فلسطین | فلسطین میں یہودیوں اور عربوں کے درمیان ایک نیا قضیہ رونما ہوا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عرب ان تمام زمینوں پر قابض ہو رہے ہیں جو یہودیوں نے ان سے خریدی تھیں۔ عربوں کا اندر یہ ہے کہ ان زمینوں کی فروخت میں بہت سے قانونی ستم باقی رہ گئے ہیں علاوہ انہیں عرب کاشتکاروں کو ان کو موروثی زمینوں سے زبردستی الگ کر دیا گیا تھا۔ اس پر فلسطین کے یہودی نہایت خفا ہیں اور ان کے نزدیک یہ ساری کارروائی صیونی تحریک کو شکست دینے کے لئے کی جا رہی ہے۔ یہودی ناپذدوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میابیوں کے قبضے میں بہت سی زمین بالکل بے کار پڑی ہے لیکن مملکت اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

جب یہ قضیہ عدالت عالیہ میں پیش ہوا تو جسٹس میکڈنل نے اس کے متعلق یہ فیصلہ دیا کہ اس قسم کے تمام مقدمات میں ملکیت زمین کے دعویدار مدعی اور اس زمین کے اصلی مالک مدعا علیہ تصور کئے جائیں گے۔ جسٹس میکڈنل کے اس فیصلے سے یہودی نہایت خفا ہیں۔

۱۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو فیلیڈلفیا میں امریکی کی صیونی جمعیت کا ایک اجتماع ہوا جس میں صیونی جمعیت عالم سے درخواست کی گئی کہ وہ حکومت برطانیہ کو اس بات پر مجبور کرے کہ حکومت فلسطین یہودی ایتھنی سے اشتراک عمل کرے اور یہودی تارکین وطن کو وادی اردن میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے۔ مندوبین فیلیڈلفیا نے کہا کہ ہم اپنے اس عزم کا ایک مرتبہ پھر اعادہ کرتے ہیں کہ ہم اپنے عرب ہمسایوں سے ہر بات میں اشتراک و تعاون کریں گے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت فلسطین نے متوسط درجے کے یہودیوں کو شکار ہجرت و شکاروں اور کاشتکاروں کو فلسطین میں آباد ہونے کے لئے بہت سی سہولتیں دیدی ہیں اور اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ فلسطین میں آتے وقت ان کے پاس صرف ڈھائی ہزار ڈالر کی رقم موجود ہونی

پہلے۔ عراق و فلسطین کے باشندے اس بات پر بھی منت ناراض ہیں کہ چنگی اور محصول کے قوانین میں ان دونوں ممالک کو "خارجی" ممالک کا درجہ دیا گیا ہے حالانکہ ان دونوں ممالک میں انگریزوں کی ساٹی مدین کو دیکھتے ہوئے ان کا "خارجی" قرار دیا جانا سراسر تم طرعی ہے۔

عباس علی پاشا جنہوں نے حال ہی میں شام، فلسطین اور ترکی کا سفر کیا تھا اور جن کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ وہ تخت شام کے آرزو مند ہیں اب تحت فلسطین دواورائے اردن کے حصول کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اتحاد فلسطین دواورائے اردن کے بعد ممکن ہے اس میں جزیرہ نمائے کنعان کا اضافہ بھی کر دیا جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ حکومت مصر خدیوہ عزولہ کی ان سرگرمیوں سے کچھ بہت زیادہ خوش نہیں اور صدیقی پاشا کے خیر فلسطین کا ایک نقشہ جمع کیا تھا کہ قریب موصوف کی کوششوں کو بار آور نہ ہونے دیں۔

ہندوستان

دفاقی مجلس مالیات کی رپورٹ [گول بیگز کانفرنس کے دوسرے اجلاس کے بعد ہندوستان میں دفاقی حکومت کے قائم کرنے کی غرض سے متحدہ مجالس کا تقرر اس غرض سے عمل میں آیا تھا کہ وہ اس طرز کی حکومت کے لئے یہاں کے حالات پر نکتہ پہلوؤں سے غور و تحقیق کے بعد رپورٹ پیش کریں تاکہ انہی کی روشنی میں اس جدید حکومت کی داغ بیل ڈالی جائے چنانچہ ایک مجلس بیاں کی مالیاتی حالت کی تحقیقات کے لئے لارڈ پرسی کی صدارت میں مقرر کی گئی تھی جس نے مہینوں کی محنت و کوشش کے بعد اب اپنی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس مجلس کے دوسرے اراکین میں سر لوئی گیرشا، سر اکبر حیدری، کرنل ہاسکر، سٹر رائسن اور مسٹر منہم تھے۔ مجلس مذکور نے اپنی سفارشات اس تہید کے ساتھ پیش کی ہیں کہ موجودہ معاشی حالات کی خرابی زیادہ حوصلہ تک باقی نہ رہے گی اور بہت جلد تجارتی حالات اپنے اعلیٰ رنگ پر آجائیں گے اور ایشیا کا زرخ اگر بالکل بدستور سابق نہ ہو جائے گا، پھر بھی موجودہ شرح سے کہیں زیادہ بڑھ جائے گا۔ اس بنا پر دفاقی حکومت کی آمد و خرچ کا آئینہ جو نقشہ ہو گا وہ مطابق ذیل ہو گا۔

آمدنے	خراج
عامل	سود ۱۱۲۵۰۰۰۰
نمک	ضلع شدہ ۶۵۰۰۰۰۰
افیون	فوج ۴۶۰۰۰۰۰۰
ریلوے	سود کی جنت ۱۶۰۰۰۰۰۰
مکمل	استقامت ملکی ۶۸۵۰۰۰۰۰
متفرق	پیشیں ۲۶۵۰۰۰۰۰
مجلس سے امداد	صوبہ سرحد ۱۰۰۰۰۰۰۰
اکم ٹیکس	استقامی امور ۱۶۰۰۰۰۰۰
	میکلٹ اتھسٹریٹر ۱۵۵۰۰۰۰۰
کل میزان	کل میزان ۸۰۱۰۰۰۰۰۰

اس حساب سے کل بجٹ وفاقی حکومت کے خزانہ میں ۵۰ کروڑ ۵۰ لاکھ کی ہوگی۔

اب اس کے بعد دوسرا کام مجلس مذکور کا یہ تھا کہ وہ صوبوں کی مالیاتی حالت کا اندازہ کرے اور اس غرض سے اس نے ۱۹۳۳ء سے لیکر ۱۹۳۸ء تک کے جو ریزائنے تھے، ان پر تھیس کر کے ہر صوبہ کی مالیاتی حیثیت کا جو نقشہ تیار کیا ہے، وہ حسب ذیل ہے۔ ثبت کی علامت (+) سے بچت اور منفی کی علامت (-) سے خسارہ مراد ہے۔

نام صوبہ	دقہ
۱۔ مدراس	- ۲۰ لاکھ
۲۔ بمبئی	- ۶۵
۳۔ بنگال	- ۲ کروڑ
۴۔ صوبہ متحدہ	+ ۲۵ لاکھ
۵۔ پنجاب	+ ۳۰
۶۔ بارہ اولیہ	- ۶۰

نام صوبہ	رقبہ
۱۔ صوبہ متوسط	- ۱۶ لاکھ
۲۔ آسام	- ۶۵

صوبوں کے اس مالیاتی نقشہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وفاقی حکومت کی شرکت میں انھیں ابتدائیت مشکلات کا سامنا ہوگا اور اگر انھوں نے اس حصہ میں اپنے نقصانات کو پورا کرنے کی کوشش نہ کی تو ان کی صوبہ جاتی خود مختاری بہت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ لیکن بعض حالات کی بنا پر یہ توقع ہوتی ہے کہ اگر انھوں نے بعض معاملات خراج میں تخفیف سے کام لیا یا آمدنی کے نئے ذرائع نکالنے کی فکر کی تو ان کی مشکلات بہت حد تک رفع ہو جائیں گی مثلاً تہمتی سے صوبہ سندھ کے عظیمہ ہوجانے کی صورت میں صوبہ آندھرا

۱۰۰ لاکھ کے درمیان بچت ہوگی۔ اسی طرح صوبہ بہار و اڑیسہ بھی تخفیف کرنے کے بعد اپنی اس کمی کو پورا کر لے گا جیسا کہ ۱۹۳۲ء میں اس کے علاوہ مجلس مذکور نے صوبوں کے لئے کچھ

ایک تنباکو و یا سلائی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں پر محصول کے اضافہ کی ہے۔ ان سب سے متعلق بھی تجویز کئے ہیں کہ کون کون سے قرضے وفاقی حکومت ادا کرے گی اور کون کون سے صوبوں کے ذمہ رہیں گے۔ پھر وفاقی حکومت اور صوبہ جاتی حکومتوں کے درمیان تعلقات کیسے رہیں گے جن کا ادارہ زیادہ تر تین مسائل پر ہے۔ ۱۱۔ ریاستوں کے ساتھ سمجھوتہ ۱۲۔ سندھ کی علیحدگی اور ۱۳۔ وفاقی نظام حکومت کے قیام سے مزید اخراجات کی صورت۔ اول الذکر ہر دو مسائل کے متعلق تو عظیمہ و عظیمہ مجلس مقرر کی گئی ہیں لیکن سو خوالہ ذکر کے لئے مجلس مذکور نے صاف طور پر یہ سفارش کی ہے کہ آئندہ نظام حکومت کے قیام میں بہت کم سے کم اخراجات ہونے چاہئیں۔ ہندوستان جیسے ایک زراعتی ملک کے لئے موجودہ نظام حکومت خود ایک بہت بڑا گراں قیمت نظام ہے۔ استقامت ملی سے متعلق مبنی بات ہیں ان کے اخراجات میں زیادہ سے زیادہ کمی کرنی چاہئے۔

سب سے آخر میں مجلس مذکور نے محصول لگانے کے اختیارات سے بحث کی جو جس کا اختیار صرف وفاقی حکومت کے ہاتھ میں رکھا ہے اور اس کی تین صورتیں تجویز کی ہیں۔ ۱۔ وہ ذرائع جو وفاقی حکومت کے ساتھ مخصوص ہوں گے مثلاً معدنیات، جنگلات، ریلوے، ڈاک اور تار وغیرہ وغیرہ ۲۔ محصول آبکاری

شکایت و شکایت کی نشاندہ اور نمک وغیرہ (۳۱) وہ محصول جس سے صوبوں کو فائدہ پہنچتا ہو صوبوں کو صرف اتنی صورت میں محصول لگانے کا اختیار دیا گیا ہے اور وہ بھی وفاقی حکومت کی اجازت سے۔ اسی طرح قرضے لینے کے متعلق بھی صوبوں کو اختیار ہو لیکن مرکزی حکومت کی اطلاع اور اجازت سے۔
یہ جو کہ ہے کاغذ کے صفحات پر ہے لیکن اس پر عمل درآمد کب سے ہو رہا ہے اور عمل کی صورت میں کیا کیا شکایات پیش آئیں گی؟ اس کے لئے ابھی ہندوستان کو اور انتظار کرنا ہے۔

گلینی کیشن اور باران وطن کا احتجاج | تقریباً ایک سال ہوتا ہے کہ ریاست جموں اور کشمیر کی مسلمان معاہدہ دہلی سے اپنے جائز اور ناقابل انکار حقوق کا مطالبہ کر رہی ہے اور اس سلسلہ میں اس نے ہر وہ قربانی کی ہے جو ایک آزادی پسند جماعت کر سکتی ہے۔ اگرچہ اس آزادی کی قیمت زیادہ تر ریاست کے حدود سے باہر برطانوی علاقہ میں ادا کی گئی ہے اور آج مجلس احرار کے کوئی تیس مئیس ہزار امان جیل کی تختیاں جھیل رہے ہیں اس تمام مطالبہ اور شورش کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی طرف سے سرگلینی کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر ہوا جو ان کی شکایات کی تحقیقات کر کے ایک رپورٹ پیش کرے اور پھر اس رپورٹ کی سفارشات پر حکومت کو تیسرے عمل درآمد کرے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کمیشن نے اپنا کام ختم کیا اور رپورٹ شائع ہوئی جس میں ریاست کے قوانین میں کچھ عام اصلاحات کے ساتھ مسلمانوں کو بعض حقوق بھی دئے گئے ہیں مثلاً عام اصلاحات کے سلسلہ میں جیل کے قوانین میں یہ ترمیم کی گئی ہے کہ قیدیوں کی اس سے دو قسمیں ہوں گی، ایک معمولی جو عام جرائم کے مرتکب ہوں گے اور جن کے ساتھ کوئی رعایت نہ ہوگی۔ اور دوسرے خاص جن کے لباس و طعام اور دوسرے معاملات میں عام قیدیوں کے مقابلہ میں کچھ رعایتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں مثلاً انہیں جیل کا عام کپڑا اور کھانا نہیں ملے گا بلکہ ان کے لئے اس کا مخصوص انتظام ہوگا، وہ ہنگڑیوں سے بجز حالات خاص کے مستثنیٰ ہوں گے۔

اسی طرح ریاست کے قانون مطابق میں بھی کچھ ترمیم کی گئی ہے اور اس کے ذریعے حکومت کے اختیارات میں اضافہ اور اٹھارہ اے و خیال کی آزادی میں بہت کمی کر دی گئی ہے۔ پہلے کوئی شخص پریس قائم کرنا چاہتا تو اس کے لئے صرف ۵۰۰ کی ضمانت داخل کرنی اور مہاراجہ سے اجازت لینا کافی تھی۔ اب ایک ہزار کی ضمانت لی جائے گی اور اجازت کے تمام اختیارات وزیر اعظم کو حاصل ہوں گے۔ نفرت کے جذبات پھیلانے کسی کو کسی کے قتل پر آمادہ کرنے اور اسی قسم کے دوسرے ارتکاب جرم پر وہ ضمانت فوراً ضبط کر لی جائے گی اور

پہرہ صری غفلت ایک تہا سے دس ہزار کے درمیان لی جائے گی۔

لیکن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری کمیشن کی وہ سفارشات ہیں جو اس نے یہاں کے سوادِ اعظم
حصہ آبادی کے متعلق کی ہیں اور ان کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے اس میں سب سے بڑی چیز ایک انتظامی
بیس کی بنیاد ہے جو کل ۵۰ لاکھ پر مشتمل ہوگی۔ ان لوگوں کا تناسب سرحدت یہ ہوگا کہ مسلمان ۷۳،
ہندو ۱۵، سکھ ۱۰، ویزا اور عمال کے نمائندے ۱۹، غیر سرکاری نامزد لاکھ ۵۔ اور اس کے علاوہ
سرکاری ملازمتوں، تعلیمی و تعلیمیوں اور دوسرے معاملات میں مسلمانوں کی تعداد کو کچھ بڑھا دیا گیا ہے جو اب
بھی ان کی آبادی کے تناسب سے کم ہیں۔

بہر حال اس رپورٹ کا شائع ہونا تھا کہ برادرانِ وطن:

ہنگاموں کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ ڈاکٹر مونجے نے جو مسلمانوں

کے صدر بھی ہیں فوراً ایک تار دیا کہ کمیشن کی سفارشات پر عمل۔

کہ صاحبزادے کے نمائندوں سے ملاقات نہ کر لی جائے، سکھوں نے ا۔

میں، ۵ میں سے سکھوں کو صرف ایک نشست دی گئی ہے، حالانکہ انھیں اس سے زیادہ میاں چاہئے۔ ریاست
کشمیر کے ہندو پنڈتوں کی جماعت نے جو ریاست کے اندر سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور اثر و اقتدار رکھنے والی
جماعت ہے، شورش اور ہنگامے کا ایک لاکھ لاکھ شروع کر دیا اور ہر کشمیری پنڈت کی زبان سے یہ شور و
جھار کی آواز اٹھنے لگی کہ ہم تک خوارانِ سلطنت قدیم سے حکومت کے دامن سے وابستہ چلے آتے ہیں مسلمانوں
کو ملازمتوں کے اندر مزید حقوق دینے سے ہم کا سر لیانِ سلطنت کا کوئی اور ذریعہ معاش نہ رہے گا اور ایک
طویل درخواست گورنر کشمیر کی خدمت میں پیش کی گئی جس میں مسلمانوں کے ساتھ مراعات کے پہلو پہلو اپنے
حقوق کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے۔ ان تنگ دل انسانوں سے کوئی پوچھے کہ آج جن سفارشات کو تم مراعات
سے محروم کر رہے ہو اور جن کی بنا پر تم اس قدر انگاروں پر لوٹ رہے ہو وہ دیکھو تو سہی کہ مراعات ہیں یا ان
کے معمولی حقوق ہیں۔ حقیقت میں تمہارے لئے اب تک مراعات کا درجہ کھتی تھیں اس لئے کہ تم اپنی
آبادی کے تناسب سے کم ہیں زیادہ فائدہ اٹھا رہے تھے اور دوسروں کو ان سے مستفید ہونے کا موقع
نہیں دیتے تھے۔

ریاست جموں اور کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی کوئی ۹۰ فی صدی ہے، لیکن سرکاری ملازمتوں

میں ان کا تناسب منفرد کے برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تعلیم میں بہت پیچھے ہیں اور کشمیری بہشت جو تعلیم سے
 بہرہ ور ہیں قدرتنا تمام سرکاری محلوں اور ملازمتوں پر عادی ہیں۔ مسلمانوں کے تعلیم میں پیچھے رہنے کے
 اسباب میں ایک بڑا سبب ان کا اقتصادی افلاس ہے۔ وہ زیادہ تر کاشتکار ہونے کی وجہ سے اپنی مشکلات
 نہیں رکھتے کہ اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم بھی دلا سکیں اور یہ سن ہی سے اپنے خوش شکل بچے اور بیویوں کو شادی
 و چاول، کے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ شام کی روٹی کا بندوبست کر سکیں۔ بعض
 قصبات اور شہروں میں جو صنایع اور کارگریں ہیں وہ اپنے افلاس اور غربت سے تنگ آکر تھوڑی تھوڑی اجروں
 پر دو تہہ آدھتھیوں کا کام کرتے ہیں جو تمام تر کشمیری بہشت اور باہر کے تاجر ہوتے ہیں۔ یہ اسباب ہیں جو
 دیہاتی و قصباتی ہر دو قسم کی مسلمان آبادی کو تعلیم حاصل کرنے اور پھر اس کی وجہ سے زندگی کی نعمتوں سے
 بہرہ اندوز ہونے کی راہ میں حائل ہیں اور ان کا اپنا وطن "کشمیر بہشت" نظیر حقیقت میں ان کے لئے ان
 خاصان حقوق کے باعث "دوزخ نشان" بن گیا ہے جس سے اگر گلیسی کمیشن یا اور کوئی دوسرا ذریعہ
 نکالنے میں کچھ امداد کر کے تو انسانی سہروری اور غیرت کا تقاضا یہ نہیں کہ کوئی جامعہ اس پر اس درجہ
 آتش براہ نام ہو اور لوگوں ہنگامہ اور شدت سے مستحقوں کو اپنے حقوق سے فائدہ نہ اٹھانے دے !



شذرات

ہیں بہت افسوس ہے کہ ماہِ پانچ کا پرچہ ایک ہفتے کی اور اپریل کا پرچہ دس دن کی دیر سے شائع ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جامعہ کے مستقل کاتب علیل ہو گئے ہیں اور رخصت پر چلے گئے ہیں۔ اس لئے پرچہ لکھوانے کا عارضی انتظام کرنا پڑا جس میں کتابت میں خاطر خواہ نہیں ہوتی اور اشاعت بھی وقت پر نہیں ہو پاتی۔ بہر حال یہ پرچہ انشاء اللہ قارئین کرام کے پاس وقت پر پہنچ جائیگا۔ اور امید ہے کہ یکم جون سے کتاب جامعہ می وائس آجائے گی

اردو اکادمی کے کارکنوں کا ارادہ تھا کہ

جلسہ اور منعقد ہو جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اس

ستمبر سے پھر کوڑوں کا سلسلہ شروع کر دیا جائیگا۔ اور ختم ساں۔ بین پیر در۔ بہتہ
مباحثہ ہو سکے گا۔

اس بار کئی سال کے بعد جامعہ کے وفد روانہ کئے گئے ہیں ایک وفد پرنسپل محمد مجیب صاحب کی سرکردگی میں لنکا، اور مالدیپ کے قصد سے گیا ہے دوسرا ذوالعلیٰ صاحب اور ان کے رفقاء برائے گئے ہیں۔ اور تیسرا جو سعید انصاری صاحب اور بعض اور اساتذہ جامعہ پر مشتمل ہے۔ بنگلور اور ملابار جا رہا ہے۔ گوچندہ جمع کرنے کے لحاظ سے یہ زمانہ وفد کے لئے کچھ موزوں نہیں ہے لیکن اول تو جامعہ ملیہ کے وفد کا مقصد محض چندہ نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر قومی تعلیم کے مقاصد کی تبلیغ و اشاعت مد نظر ہوتی ہے۔ دوسرے جن لوگوں سے جامعہ ملیہ کو مالی امداد ملتی ہے۔ وہ باوجود غلطی کے

کامیاب ہونے سے نہیں ڈرتے۔ اس لئے ہمیں پورا یقین ہے کہ یہ دفو کامیاب رہے گی۔
 انہیں گے۔ دور اندیش مجاہد قوم جانتے ہیں کہ معاشی مشکلات کی وجہ سے چاہے اور ب
 کام ترک جانیں مگر بچوں کی تعلیم کبھی نہیں رُکنا چاہئے۔ اور جامعہ کے موبدین کا طلق
 انہیں دور اندیش حضرات تک محدود ہے۔

پنجاب کے دفتر اطلاع عامہ نے صوبے کی تعلیمی رپورٹ ۱۹۳۱-۳۲ء کے
 اس حصے کے متعلق جہیں لڑکیوں کی تعلیم کا ذکر ہے۔ ایک بیان شائع کیا ہے جس سے
 معلوم ہوتا ہے کہ سال پوئستہ لڑکیوں کی تعلیم پر ۲۵۱۵۱۲۰ روپیہ صرف ہوا لڑکیوں
 کے مدارس کی تعداد میں ۴۳۹ کا اور طالبات کی تعداد میں ۵۵۶ کا اضافہ ہوا۔
 اس اضافے کے بعد طالبات کی مجموعی تعداد میں ۸۴۳۰۲ ایک پہنچ گئی۔ چار نئے
 ثانوی مدارس کھلنے کے بعد اب لڑکیوں کے ثانوی مدارس ۲۶ ہیں جن میں سے
 ۲۰ ہائی سکول ہیں۔ کل ۱۵۲ لڑکیوں نے اس سال میٹرکلیوشین کا امتحان دیا۔ جن
 میں سے ۱۱ کامیاب ہوئیں۔ کالجوں میں بھی لڑکیوں کی تعداد بڑھی ہے اور ۳۳۸
 لڑکیوں نے محلات کی حیثیت سے تربیت پائی۔ جن میں سات نے ٹریننگ کالج سے سند
 حاصل کی۔

ان اعداد پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ گوالی تھک پڑھنے والی لڑکیوں کی تعداد
 آبادی کے تناسب سے کہیں کم ہے۔ مگر پھر بھی بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس میں
 آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً محلات کا شمار بڑھنا اس بات کی علامت ہے
 کہ تعلیم نسواں پر سرزرتی ہو رہی ہے۔ خواہ اس کی رفتار کتنی ہی سست کیوں نہ ہو۔
 افسوس ہے کہ اس رپورٹ میں طالبات کی تقسیم مذہب کے لحاظ سے نہیں کی گئی ہے

اس لئے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اس میں مسلمان لڑکیاں کتنی ہیں۔ مگر جہاں تک ہمیں اپنے طور پر معلوم ہوا ہے، ان کی تعداد مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے۔ یہ حال پنجاب میں ہے۔ جہاں لوگ لڑکیوں کی تعلیم کے اتنی سختی سے مخالف نہیں۔ جتنے دوسرے صوبوں میں ہیں۔

آج کل تعلیم نسوان کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے بچھاؤ کا ہو گیا ہے۔ عورتوں کے جاہل رہنے سے جو معاشی، معاشرتی، جسمانی اور روحانی نقصانات اٹھتے ہیں، ان کے علاوہ اب یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ یہ چیزیں لئے ہلک ثابت ہوگی۔ ہندوستان میں نیاستی نہ گرا بہت جلد وہ زمانہ آ رہا ہے کہ واقعی ملک کا

ہوگا۔ اور یہ کونسلیں جو اب تک اسکولوں کے دارالمبایع سے زیادہ دوسریں رکھتیں، امور سلطنت کے مرکز بن جائیں گی۔ اس وقت ساری ہندوستانی قوم کو خصوصاً ملت اسلامی کو اس کی ضرورت پڑے گی کہ ان کے زیادہ سے زیادہ افراد سی حقوق کو سمجھ سکیں اور ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ظاہر ہے کہ اگر پوری صنف نسوان جو تعداد میں کل آبادی کے نصف کی برابر ہے۔ جاہل رہے تو سیاسی قوت کے لحاظ سے مسلمانوں کی جماعت آدمی رہ جائیگی۔ شاید لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ جداگانہ انتخاب کی بدولت کونسلوں میں مسلمان ممبروں کی ایک مقررہ تعداد پہنچ جائیگی۔ خواہ ووٹ دینے والوں کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ مگر یہ محض دھوکہ ہے۔ جداگانہ انتخاب زیادہ دن تک نہ والی چیز نہیں۔ اس کے بڑے سے بڑے حامی بھی تسلیم کرتے ہیں، کہ یہ محض وقتی مصوت پر مبنی ہے۔ کچھ دن کے بعد نہ اس کی ضرورت رہے گی۔ اور نہ اس کا امکان رہے گا۔ اس کے علاوہ جماعت کی سیاسی قوت محض کونسل کے ممبروں کی تعداد پر موقوف نہیں

حقیکہ سیاسی احساس اور قابیلیت اس کے افراد میں ہو جس جماعت میں لوگ
مجاہد ہیں اور بہت کم افراد اتنی ذہنی روشنی رکھتے ہوں کہ ملکی مسائل کو سمجھ
سکیں وہ جماعت ہمیشہ دوسرے لوگوں کے سیاسی خیالات سے متاثر رہتی ہے اور
اس کے نائید سے اس کے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس
کی سیاسی آزادی معدوم ہو جاتی ہے۔ اور وہ غیروں کے اشارے پر چلتی ہے
خواہ کونسلوں میں اس کے ممبروں کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اس لئے تمام
ہندوستان خصوصاً پنجاب والوں کو جو سیاسی تحفظات پر سب سے زیادہ زور
دیتے ہیں تعلیم نسواں کی ترقی میں دل و جان سے کوشش کرنا چاہئے۔

جامعہ ملیہ کے بہت سے قدر دان کچھ دن سے جناب شیخ الجامعہ سے اصرار کر
رہے ہیں کہ جامعہ میں تعلیم نسواں کا شعبہ جلد سے جلد کھلنا چاہئے۔ ہمیں معلوم ہے
کہ موصوف اور ان کے رفقاء اس قومی ضرورت کا پوری طرح احساس رکھتے ہیں
لیکن افسوس ہے کہ جامعہ کی موجودہ مالی حالت ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ وہ ایک نئی
ذمہ داری اور وہ بھی اتنی بڑی اپنے سر لے لے۔ ان مخلص کرم خاؤں کو یہ معلوم
نہیں کہ جامعہ ملیہ موجودہ حالت میں اپنے اخراجات کس طرح پورے کرتی ہے۔ بلکہ
ان کو کہنا چاہئے کہ بغیر اخراجات پورے کئے کیوں کر گذر کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں ایک
نیا کام شروع کر دینا خود کشی کے برابر ہوگا۔ کیونکہ اس کے بعد موجودہ کام کا باقی رہنا
ناممکن ہو جائے گا۔ ہاں اگر چند مذاکے بندے جو قوم کا درد دل میں رکھتے ہیں اس
کیلئے تھوڑا سا سرمایہ جمع کر لیں تو جامعہ ملیہ بڑی خوشی سے یہ بوجھ اٹھانے کو
تیار ہو جائے گی۔

معلم حسن احسن جامعہ زیر ادا رت

مولانا اسلم جبر اچوئی ڈاکٹر سید با حسن ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

جلد ۱۵۰ بابۃ ماہ جون ۱۹۳۳

فہرست مضمون

پر و فیس

۱۔ ایران جدید	۲۔ مولانا محمد علی مروت کا ایک خط	۵۶۲
۳۔ ادب الیحا خط	رئیس احمد صاحب بنفیری ندوی معلم جامعہ	۵۱۰
۴۔ مکالمہ ارواح	ایمل زیدان مترجمہ ابو حمزہ سید زبیر حسنی صاحب	۵۴۵
۵۔ نقش بدایار	اے۔ وی۔ لوکس کے قلم سے	۵۵۸
۶۔ دنیا کی رفتار	۱۔ عالم اسلام	۵۶۲
۷۔ ”	۲۔ ہندوستان	۵۶۰
۸۔ ”	۳۔ مالک نعیم	۵۶۹
۹۔ شذرات		۵۸۶

(مجموعہ بی اے آکس پر نثر و پشتر نے دفتر رسالہ جامعہ قلوبان سے شائع کیا)

ایران جدید

انیا قانون ازدواج

اس وقت جب کہ ہندوستان میں مسلمان سارو ایکٹ کے خلاف احتجاج میں مشغول ہیں اس لئے یہ مطالعہ ناانہا دیکھپ اور سبق سموز ہوگا کہ ہمارے پڑوس کے ملک میں اس مسئلہ کو کس قدر سمجھداری اور دانشمندی کے ساتھ سلجھانے کی کوشش
ضمیمہ قانون اساسی ۱۹۰۶ء کی دفعہ ۱۷ کے مطابق تمام

کیا گیا تھا اور دیوانی مقدمات محکمہ عدلیہ کے سپرد تھے لیکن ان دونوں میں یہ نہیں قائم کئے گئے تھے اور یہ خیال تھا کہ شخصی قانون کے متعلق تمام معاملات اول الذکر نئے کے ذریعہ ہوا کریں گے اس کے علاوہ اس زمانے میں شریعت اور دیوانی قانون میں کوئی فرق بھی نہ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں رضا شاہ کے (جو اس وقت سالار سپاہ تھے) برسرِ اقتدار ہونے کے بعد ایران میں قانون سازی کا دور شروع ہوا اور اس وقت ایران میں قوانین و ضوابط کے مجموعوں کی تعداد دس سے بھی زیادہ محکمہ عدلیہ اس وقت بھی موجود ہے مگر اس کا عدم وجود برابر ہے لیکن اس موضوع پر میں دوسرے مضمون میں بحث کروں گا اس جگہ صرف اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ ۱۹۲۰ء سے اس وقت تک محکمہ عدلیہ کے اختیارات پر تین جملے کئے جا چکے ہیں، سب سے پہلے یہ کیا گیا کہ کوئی مقدمہ براہ راست نہ ان کے یہاں دائر کیا جائے اور نہ اس پر کوئی کارروائی کی جائے وہ صرف انھیں مقدمات پر غور کر سکتے ہیں جو محکمہ عدلیہ کی طرف سے ان کے پاس بھیجے جائیں اور محکمہ عدلیہ کے لئے یہ بھی لازم کیا گیا کہ ہر مقدمہ کے متعلق اپنی تفارسات سے محکمہ عدلیہ کو مطلع کر دیا کریں۔ اس کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ محکمہ عدلیہ سوا ان مقدمات کے جو نکاح طلاق کے متعلق یا این و مربی مقرر کرنے کے متعلق ہوں اور کوئی مقدمہ محکمہ عدلیہ کے پاس نہ بھیجیں۔ جن مقدمات

میں کوئی فریق شہادت نہیں پیش کر سکتے تھے ان میں علف لینے کا کام محکمہ شرعیہ کے متعلق تھا، بالآخر تیسری کارروائی یہ کی گئی کہ جنوری ۱۹۲۷ء کے ایک قانون کے مطابق قیہ اختیارات بھی محکمہ شرعیہ سے چھین لئے گئے اور محکمہ عدلیہ کو ہدایت کی گئی کہ آئندہ کوئی مقدمہ محکمہ شرعیہ میں نہ بھیجیں الا یہ کہ آئندہ کسی خاص قانون کے ذریعے ان کو دوبارہ کوئی حکم دیا جائے، یہ قانون ابھی تک مجلس نے منظور نہیں کیا ہے اور اس وقت محکمہ شرعیہ چین کر رہا ہے اس کے پاس کوئی کام نہیں ہے محکمہ شرعیہ کا حلقہ وہی ہے جو عدلیہ کی عدالت ابتدائی کا ہے یعنی ایران کا ایک ضلع یا ولایت کا ایک مجتہد میر عدالت ہوتا ہے اور حکومت ہی اس کو مقرر کرتی ہے۔ اگر اس کے پاس کام بہت زیادہ ہو جائے جس کی شنایہ کبھی نوبت آتی ہو، تو ایک مددگار بھی اس کو دے دیا جاتا ہے۔ یہ شخص ترقی کا باقاعدہ متحق نہیں ہوتا لیکن حکومت اگر اس کے کام مطمئن ہو تو اس کی تنخواہ میں بعد پانچویں حصے کے اضافہ کر سکتی ہے۔ ایک طرف محکمہ شرعیہ کے اختیارات سلب ہو جانے کی وجہ سے وہ مجبوراً بے کاری کی زندگی گزار رہا ہے اور دوسری طرف ہی اختیارات محکمہ عدلیہ کو حاصل ہو گئے ہیں۔

جدید قانون ازدواج عمومی سے شریعت کے تسلیم کردہ رسم و رواج میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوئی اور اگر کوئی فرق ہے تو اس قانون کے مطابق نکاح کا معاملہ دیوانی قانون کے متعلق کر دیا گیا ہے قوانین کی تاویل اور تشریح کا اختیار محکمہ عدلیہ کو دیا گیا ہے اور قوانین میں ترمیم کرنے کا حق مجلس کو تفویض کیا گیا ہے۔ عہد سابق کے قادیانی کی بنا پر کوئی نظیر اب تسلیم نہیں کی جاتی ہیں صرف دیوان عالی تہمیز دینی ایران کے ہائی کورٹ کے فیصلوں کا حوالہ پیش کرنے کی اجازت ہے غرض اس وقت جہاں تک نکاح کا تعلق ہے دیوانی قانون ایران میں رائج ہے اور اس قانون کا عملہ آمد ہر ایرانی باشندے پر یکساں ہے خواہ وہ مسلمان ہو خواہ پارسی یا یہودی۔ نکاح کا ثبوت ایک عدالتی جبر کے ذریعے سے دینا پڑتا ہے اور بس ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ فریقین کو پورا پورا موقع دیا گیا ہے کہ آپس کے سمجھوتے سے اپنے اپنے حقوق اور فرائض جس طرح چاہیں مقرر کر لیں اور چونکہ ہر فرقے کے لوگ بہت سی رسومات کے پابند ہوتے ہیں اس لئے قانون دیوانی نے اس کا سبب بہتر حل یہ نکالا ہے کہ ان رسوم کو جہاں تک

عدالت کا تعلق ہے بالکل طر انداز کر دے اب یہ رسوم محض اختیاری ہیں اور کسی ایرانی کے لئے ان کی پابندی لازمی نہیں ہے۔ یہ ان کے اکثر جدید قوانین کی طرح قانون ازدواج بھی مجلس کی طرف سے نہیں نافذ کیا گیا ہے بلکہ اس کا نفاذ ایک عدالتی کمیشن کے ذریعہ کیا گیا ہے جو مجلس کے اٹھارہ اراکین پر مشتمل ہے اور ہر چھ مہینہ اس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ مجلس نے اس معاملہ میں قانون سازی کے جلد اختیارات اس کمیشن کو تفویض کر دئے ہیں اس قانون کی دفعات اچھی طرح غور کرنے کے قابل ہیں۔

دفعہ ۱۔ جن اضلاع میں وزیر عدالت نے ضروری دفاتر

اعلان بھی کر دیا ہے۔ وہاں قواعد و ضوابط کے مطابق

اگر کسی ضلع میں دفاتر قائم نہیں کئے گئے ہیں۔ تو

جو دفتر سب سے زیادہ قریب ہے، ہاں جا کر نکاح و طلاق کی رجسٹر

کرے گا تو وہ تینہا کم سے کم ایک ماہ اور زیادہ سے زیادہ چھ ماہ تک کی سزا سے فیہ کا مسخ ہو گا۔

دفعہ ۲۔ اگر وزارت عدلیہ کے قواعد و ضوابط کے مطابق نکاح و طلاق کی رجسٹری کرائی جائے

تو ایک مندرجہ دی جائے گی در نہ سند عادی دولت حکومت، رجسٹری کی کوئی فیس

وصول نہ کرے گی۔

ان دفعات کے مطابق نکاح و طلاق کا جواز رجسٹری پر موقوف نہیں ہے حالانکہ اگر شوہر

نکاح و طلاق کی رجسٹری نہ کرائے تو وہ چھ ماہ تک کی سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ رجسٹری اگر قواعد و ضوابط کے

مطابق ہو تو وہ بجائے خود کافی ہے خواہ فریقین اپنے اپنے مذہبی احکام اور شریعت کے مطابق کچھ

رواسم کا اس میں اضافہ کر لیں۔

دفعہ ۳۔ اس شخص سے نکاح منوع ہے جو شادی کی عمر کو نہیں پہنچا ہے جو کوئی ایسے شخص

سے شادی کرے گا جو جہانی حیثیت سے شادی کے لائق نہیں ہے اس کو تین ایک سال ہو

کے کرین سال تک سترہ قید دی جاسکتی ہے نیز دو تلو تو ان سے لے کر دو ہزار تو ان تک جہانہ بھی اس پر کیا جاسکتا ہے۔ اس دفعہ کے تحت تمام مقدمات خاص عدالتوں کے سامنے پیش کئے جائیں گے جو وزارت عدلیہ کے قواعد و ضوابط کے مطابق قائم ہوں گی۔ غیر عدلیہ شدہ نکاحوں کی طرح یہاں بھی نکاح کے جواز سے انکار نہیں ہے لیکن نابالغوں کے نکاح کو ایک عہدہ تصور قرار دیا گیا ہے جو سراسر اس کے لئے جوڑی کی گئی ہے وہ اس کو روکنے کے لئے کافی معلوم ہوتی ہے، ایرانی کے قوانین اس معاملے میں فرانس کی تعلیم کے جس کہ کم سے کم سزا مقرر کر دی جائے جس میں کسی کرنے کی اجازت عدالتوں کو نہیں دی جاتی ہے نکاح کے لئے کوئی عمر قانوناً مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ وزارت عدلیہ کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ جو عمر کو ام ایس قبول کرنے کو تیار ہوں وہ وزارت کی طرف سے مقرر کی جائے گی اور جوں جوں رائے مامہ تبدیل ہو عمر میں وقتاً فوقتاً اضافہ کیا جائے حکم شریعہ کو ان معاملات میں دخل نہیں ہو سکتا۔

مندرجہ بالا دفعات کے علاوہ نکاح کو خالصتہً ایک معاہدہ کی شکل دیدی گئی ہے اور دیگر معاہدوں کی شرائط کی طرح نکاح کی شرط بھی فریقین کے درمیان عقد کے وقت طے کی جاسکتی ہیں

دفعہ ۴۴۔ فریقین کو اختیار ہوگا کہ عقد سے قبل جو شرائط چاہیں مقرر کر لیں بشرطیکہ ان شرائط سے ازدواجی تعلقات کی نفی نہ ہوتی ہو مثلاً نکاح نامہ میں یہ شرط رکھی جاسکتی ہے کہ اگر شہر ایک معینہ مدت کے لئے غائب ہو جائے اور اس کا کوئی پتہ معلوم نہ ہو یا وہ اپنی بیوی کا نان و نفقہ نہ دے یا اس کو قتل کرنے کی کوشش کرے یا اس کو ظالمانہ برتاؤ کرے کہ ازدواجی تعلقات کا قائم رہنا ناممکن ہو جائے تو عورت کو یا اس کے ذمیل کو حق ہوگا کہ عدالت میں یہ ثابت کرے کہ نکاح نامہ کے کسی شرط کی خلاف ورزی کی گئی ہے طلاق کا دعویٰ کرے اس دفعہ کے تحت تمام مقدمات حکم تبدیلی کے سامنے ضابطہ دیوانی کے مطابق پیش کئے جائیں گے لیکن عدالت صوبہ یا دیوان عالی تیسرے درجے کی کوٹ میں مراجعہ کیا جاسکتا ہے شرائط نکاح

کے فح ہونے کے بعد فریقین میں سے کسی کی طرف سے چھ مہینہ کے اندر متعدد سزاؤں ہونا چاہئے۔
 ہر ایرانی کی روایات اور غریبی جذبات کا اس میں پورا لحاظ رکھا گیا ہے عیسائیوں کو صرف اپنی مذہبی ذمہ داریوں کا اندراج نکاح نامہ میں کرنا پڑتا ہے اور اس کے بعد وہ قانوناً آزاد
 جائز تسلیم کر لیا جاتا ہے اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ مخالف بقعہ قتل کی تاویل کم از کم بحالات موجود ہے
 محدود معنوں میں کی جاتی ہے۔ روغن کی تھلک فرقے کے لوگ جن کا اعتقاد ہے کہ نکاح کا رشتہ چونکہ
 آسمان پر جوڑا جاتا ہے اس لئے زمین پر اس کو کوئی توجہ نہیں دینا چاہئے۔ اس تو ذلت کا اعلان ہے۔
 طلاق کے ارکان کو بالکل ٹھوکر سکتے ہیں اور شیعوں کو بھی
 کہہ سکتے ہیں کہ ایک مدت معینہ کے بعد نکاح کی ذمہ داریاں
 عام طور پر صیغہ کہتے ہیں جدید قانون نے ممنوع نہیں کر
 ہے جو ہر ملت اور مذہب کے لئے موزوں ہے اور اس کے مطابق نکاح اور طلاق۔ جس سے
 سرکاری عدالتوں کے سامنے پیش ہو سکتے ہیں نیز عورتیں جواب تک یہ محسوس کرتی تھیں کہ مذہب یا
 رسم و رواج زمانہ ان کو وہ حیثیت نہیں دیتا جو وہ چاہتی ہیں۔ اب نکاح نامہ میں اپنے لئے زیادہ بلند
 مرتبہ حاصل کر سکتی ہیں مثلاً مسلمان شوہر کا یہ حق کہ جب جی میں آئے ہا کسی معقول وجہ اور عذر کے بغیر
 کو طلاق دینے نکاح نامہ کے ذریعہ چھینا جاسکتا ہے اور برعکس بیوی بھی دھمکا کہ مذکورہ دفعہ کی
 مثال سے واضح کر دیا گیا ہے شوہر کی زبردستیوں سے بچائی جاسکتی ہے یا مجبوراً عدالت سے طلاق
 حاصل کر سکتی ہے یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ متعدد مسائل کا فیصلہ عدالتوں کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے
 مثلاً اگر کسی نکاح نامہ میں یہ درج ہے کہ کوئی شوہر اپنی پہلی بیوی کی زندگی میں دوسرا عقد نہیں کر سکتا
 تو کیا اس شرط کی پابندی کی جائے گی یا کیا عیسائی یا یہودی جن کا مذہب متعدد ازدواج یا متعدد
 اہواز نہیں دیتا جدید قانون کے مطابق نکاح نامے کے ذریعہ اس قسم کی عیاشیوں کے مجاز ہوں گے
 یہ اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کو مجلس کے قوانین یا عدالتی قوانین کے ذریعے کرنا پڑے گا اس
 کے بعد ایران کا قانون ازدواج عمومی مکمل کما جائے گا۔

اس کے بعد کی تین دفعات میں دھوکے اور غلط بیانی کے لئے سزا مقرر کی گئی ہے
دفعہ ۵۔ اگر کوئی فریق خواہ شوہر ہو یا بیوی غلط بیانی کرے اور عدالت اس نتیجے پر پہنچے
کہ غلط بیانی نہ کی جاتی تو عقد نکاح نہ ہوا ہوتا تو ایسی صورت میں مجرم شوہر یا بیوی کو
تین سزائے قید دی جائے گی جو کم از کم چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ دو سال تک ہوگی۔
دفعہ ۶۔ ہر مرد کے لئے ضروری ہے کہ نکاح کے وقت اس عورت کو جس کے ساتھ شادی
کر رہا ہے نیز نکاح کے رسوم ادا کرنے والے قاضی کو مطلع کر دے کہ اس کے کوئی بیوی یا
بچیاں پہلے سے ہیں یا نہیں اور اس واقعہ کو بالتصریح نکاح نامہ میں بھی ظاہر کر دینا چاہیو
جو شخص خود کو کنوارا بتا کر عورت کو دھوکا دے گا وہ اسی سزا کا مستحق ہوگا جو دفعہ مابقی
میں تجویز کی گئی ہے۔

اس دفعہ سے بھی جو عقد پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اگر کوئی امیر عورت دھوکے میں آکر کسی غریب
سے شادی کرے یا کوئی تعلیم یافتہ عورت کسی مرد کی تمیزی یا چوتھی بیوی بن جائے تو وہ پھر بھی اپنے
آپ کو ایک عجیب مصیبت میں پاتی ہے اس کا نکاح قانوناً درست ہے اور اس کی اولاد ولد لکلال
ہوتی ہے۔ بہر کیف اگر عورت چاہے تو شوہر کو جیل خانہ بھیج کر اپنے دل کو تسکین دے سکتی ہے لیکن سہول
یہ ہے کہ وہ ایسا کر ناپسند بھی کرے گی خصوصاً اس صورت میں جب کہ عقد نکاح اور غلط بیانی کے انکشاف
کے درمیان ایک کافی مدت گزر گئی ہو قانون نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ دھوکے اور غلط بیانی
نا بانوں کی شادی کی طرح سے کوئی مجرمانہ فعل نہیں ہے اور اگر مظلوم فریق اس قصور کو معاف کر دینا چاہتا
ہے تو حکومت اس میں کوئی مداخلت نہ کرے گی۔

دفعہ ۷۔ مابقی دفعات میں جو سزا تجویز کی گئی ہے اس کا حکم اس صورت میں نافذ کیا
جائے گا جب کوئی مرد یا عورت جس کو دھوکہ دیا گیا ہے باقاعدہ مقدمہ دائر کرے اگر کوئی فریق
عدالت کے فیصلے سے قبل مقدمہ واپس لے تو پھر کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

اس کے بعد کی دفعات میں شوہر اور بیوی کے فرائض کی تصریح کی گئی ہے لیکن ان کا عمل مہتمم

اسی وقت ہوتا ہے جب اس کے خلاف کوئی بات نکاح نامہ میں درج نہ ہو۔

دفعہ ۸۔ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے ساتھ مکلف بہ معاشرت ہیں۔

دفعہ ۹ شوہر کا فرض ہے کہ بیوی کو نان و نفقہ دے۔

دفعہ ۱۰۔ نان و نفقہ سے مراد مکان۔ لباس کھانا۔ اور اساس الہیت ہے اگر کوئی شخص بیوی

کے گذارے کا انتظام نہ کرے تو بیوی عدالت میں دعویٰ کر سکتی ہے اور عدالت دستور کے

حالات پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کرے گی کہ بیوی کو کیا گزارہ ملنا چاہیے۔ دستور کو حکم دیں گی

کہ اس کا انتظام کرے اگر عدالت کے حکم کی تعمیل نہ ہو تو عدالت حکمہ عدلیہ کے ذریعہ مجبور کرے گی

سے منیج نکاح کے لئے درخواست کر سکتی ہے۔ یہ کارروائی اسی شز

تصدیق کی کارروائی حکمہ شرعیہ کا حوالہ محض سہی ہوتا ہے۔

علیحدگی یا طلاق کے حکم پر دستخط کر دیتے ہیں ان کو یہ اختیار نہیں

کر دیا اس پر نظر ثانی کریں چونکہ ایک سند یافتہ مجتہد کے فتویٰ سے اس مرجع امیب بند ہو

کا ضمیر بالکل مطمئن ہو جائے گا۔ اس لئے حکمہ شرعیہ کے حوالہ کی ضرورت پڑی۔

دفعہ ۱۱۔ عورت کو خاوند کے ساتھ رہنا پڑے گا اگر نکاح نامہ میں اس کے خلاف کوئی

بات درج نہیں ہے لیکن اگر بیوی یہ ثابت کر دے کہ اس نے اپنے خاوند کا مکان اس

لئے چھوڑ دیا ہے کہ اس کا مال و اسباب خطرہ میں تھا یا اس کو اندیشہ تھا کہ اس کے ساتھ

نا قابل برداشت سختیاں کی جائیں گی تو پھر عدالت اس کو خاوند کے گھر جانے کا حکم نہ دے

گی بلکہ شوہر کو حکم دیا جائے گا کہ جب تک اس کے طرز عمل کی وجہ سے بیوی کا اس کے

گھر واپس جانا ممکن نہ ہو سکے اس وقت تک وہ اس کے گزارہ کا انتظام کرے۔

دفعہ ۱۲۔ حالات مذکورہ دفعہ سابقہ جب تک خاوند اور بیوی کے مقدمہ کا فیصلہ

نہ ہو جائے بیوی ایسی جگہ قیام کریں ہوگی جو فریقین کے باہمی سمجھوتے سے ملے پائے اور اگر

فریقین میں کوئی سمجھوتا نہ ہو سکے تو عدالت فریقین کے قریب ترین رشتہ داروں کا لحاظ

رکھ کر بچہ کے قیام کے لئے کوئی جگہ مقرر کرے گی اگر قریبی رشتہ داروں میں تو عدالت اپنی رائے کے مطابق عورت کے لئے کسی جگہ انتظام کرے گی جہاں وہ حفاظت سے رہ سکے۔
شریعت اسلامی نے منکوحہ عورت کو اپنے مال و جائیداد پر جو وسیع اور کامل اختیارات دئے ہیں ان کو برقرار رکھا گیا ہے نیز دیگر ملّتوں کے لئے بھی ان کی توسیع کر دی گئی ہے بچے کی سرپرستی کے متعلق والدہ کے حقوق کی بھی تصریح کر دی گئی ہے:-

دفعہ ۱۴۔ منکوحہ عورت جس طرح چاہے بلا غاوند کی اجازت کے اپنے مال اور جائیداد پر تصرف کر سکتی ہے۔

دفعہ ۱۵۔ ماں اپنے بچے کی سرپرست بھی جائے گی۔ اگر لڑکا ہے تو پیدائش کے دو سال تک اور اگر لڑکی ہے تو پیدائش کے وقت سے سات سال کی عمر تک اس کے بعد سرپرستی کے فرائض باپ کے ذمہ ہوں گے۔

دفعہ ۱۶۔ اگر مدت سرپرستی کے اندر ماں اپنے پہلے شوہر کو طلاق دے کر دوسرے شخص سے نکاح کرے یا پاگل ہو جائے یا بچوں کی نگہداشت سے انکار کرے تو جس وقت تک مذکورہ وجوہ باقی رہیں گی سرپرستی کے فرائض والدہ کے ذمہ ہوں گے۔

اس دفعہ کے مطابق مطلقہ عورت کو بچوں کی سرپرستی کا حق رہتا ہے اور یہ حق صرف اسی وقت چھینا جاتا ہے جب بعد میں وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔

اسلامی شریعت ایک مسلمان مرد کو غیر مسلم عورت سے نکاح کرنے کی اجازت دیتی ہے لیکن ایک مسلم عورت کے نکاح کو کسی غیر مسلم مرد کے ساتھ ناجائز قرار دیتی ہے۔ شریعت اسلامی کی اس قدیم روایت کو برقرار رکھا گیا ہے لیکن بیرونی مردوں کے ساتھ ایرانی عورتوں کے نکاح پر خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم حکومت کو نگرانی کرنے کا اختیار دیا گیا ہے:-

دفعہ ۱۷۔ مسلمان عورت کا نکاح غیر مسلم مرد کے ساتھ ممنوع ہے۔ بیرونی مرد کے ساتھ ایرانی عورت کے نکاح میں اگرچہ کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہے لیکن اس کے لئے خاص اجازت کی ضرورت ہے

اور حکومت خاص خاص مقامات پر دفاتر قائم کرے گی جو اس قسم کی درخواستوں پر غور کر کے ضروری اجازت دیا کریں گے اگر کوئی پر مدنی شخص بلا اجازت کسی ایرانی عورت سے نکاح کرے گا تو اس کو تین سال سزا دی جائے گی جو ایک سال سے تین سال تک ہو سکتی ہے۔

اسی سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ایران کا قانون تابعت

ان تمام اشخاص کو ایرانی رعایا تسلیم کرتا ہے جو داخواہ ایران میں پیدا ہوئے ہوں یا بیرون ملک میں لیکن ان کے والد ایرانی رعایا ہوں ۲۱، وہ تمام اشخاص جو ایران میں پیدا ہوئے ہوں اور ان کے والدین میں سے کوئی ایرانی ہو۔

اکثر ایرانی شکایت کرتے ہیں کہ ان کی آبادی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ وہاں کوئی مردم شماری نہیں کی گئی ہے اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنے ہیں۔ پچیس برس سے کم عمر کی ایرانی لڑکیاں قدرت کی حسین ترین تعداد بھی ایسی ہے جو عظیم اور فطرتی طبع سے مرصع ہو۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس وقت برلن، سوئس، ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ایرانی عورتوں کی شادی پر کچھ اعتراض نہیں کیا ہے۔

دفعہ ۱۸۔ اگر نکاح و طلاق کی رجسٹری دفعہ قانون ہنگے کے مطابق ہو چکی ہے تو دفعہ ۱۸

دفعہ ۵ کے مطابق پروانہ شہری پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔

دفعہ ۱۹۔ اس قانون میں اضافہ کے لئے ضروری قواعد و ضوابط وزارت عدلیہ مرتب کرے گی

دفعہ ۲۰۔ اس قانون کا نفاذ یکم ماہ مہر مطابق ۲۴ ستمبر ۱۳۳۱ء سے ہو گا۔

قانون پروانہ شہریت کی دفعات چار اور پانچ جواب منوع ہو گئی ہیں، کے مطابق پہلے ہر شخص کو مجبور کیا جاتا تھا کہ سب سے قریب والے پولیس کے تھانہ کو نکاح اور طلاق کے وقوع کی اطلاع دے لیکن چونکہ اب ان دونوں واقعات کی باقاعدہ رجسٹری وزارت عدلیہ کے دفتر میں ہوتی ہے اس لئے پولیس کو اطلاع اب ضروری نہیں ہے ہر ایرانی رعایا کو پروانہ شہریت رکھنا پڑتا ہے جس میں نیٹو کے چار واقعات یعنی پیدائش، عقد، طلاق اور موت کا اندراج ہوتا ہے۔ نکاح کے متعلق حسب ذیل

لانے اس میں ہوتے ہیں۔							
بیوی یا بھیاں		قسم نکاح		تایخ عقد		دفتر اور رجسٹر کا نمبر	
نام	پر پختہ	دائم	منتقطع	سنہ ماہ	تایخ	دفتر محلہ	رجسٹر نمبر
							۱
							۲
							۳
							۴
							۵
							۶

آپ دیکھیں گے کہ ملبوعہ فارم میں صرف چھ بیویوں کے لئے گنجائش رکھی گئی ہے خواہ ساتھ ساتھ نکاح میں آئیں یا یکے بعد دیگرے اور دائم ہوں یا منتقطع لیکن اگر حالات اس قسم کے پیدا ہو جائیں کہ اور زائد بیویوں کے اندراجات کی ضرورت پڑے تو ایک نیا فارم ان لوگوں کو دیدیا جاتا ہے جو بازارِ نکاح میں اپنی مردانگی کا نمایاں ثبوت دیتے ہیں۔ ایران کے قانون ازدواج میں جو چیز نمایاں طور پر کسی شخص کو نظر آتی ہے وہ اس کی قدامت پسندی ہے تعدد ازدواج اور متعہ کو جو ایران کی معاشرتی زندگی کی سب سے بڑی لعنتیں ہیں روکا نہیں گیا ہے۔ ہندوستانی مسلمان اور ایرانی مسلمان دونوں کو شرعاً ازدواج کی اجازت ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایران میں اس کا زیادہ رواج ہے۔ ہندوستان کی بہ نسبت وہاں کی رائے عامہ اس کی اجازت زیادہ فرامدلی سے دیتی ہے۔ طلاق کا بھی یہی حال ہے۔ متعہ صغیر یا ازدواج منتقطع کا رواج بد قسمتی سے صرف ایران میں ہے لیکن چونکہ ایرانی ہندوستانیوں کے مقابلے میں زیادہ بنجیدہ اور ترقی پذیر اور نسبتاً نہر ہی جوش اور تعصب کم رکھتے ہیں اس لئے تعدد ازدواج یا متعہ کی مانعت ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ایرانی مصلحین اس معاملہ میں احتیاط کرتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ تیز رفتاری سے کوئی اصلاحی قدم نہ اٹھایا جائے نیز قابل عمل باتوں میں

اور مقابل عمل باتوں میں وہ اتمیا بھی کر سکتے ہیں۔ جو تبدیلیاں گذشتہ دس سال کے اندر ہوئی ہیں وہ ہرچند انقلاب آفریں ہیں لیکن رائے عامہ نے کسی تبدیلی کی کوئی مخالفت اب تک نہیں کی ہے جس وقت حالات اجازت دیں گے قانون ازدواج میں فوراً ترمیم کی جائے گی اور اس نتائج یہ حکومت کا وزارت عدلیہ کا جس کے صدر ایران کے متقن اعظم اعلیٰ اکبر خاں وادریں ایہ فرض ہے کہ ملک کی رائے عامہ کو مقصد سے قریب تر کرنے کی کوشش کریں۔

مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط

قاضی عبدالغفار صاحب کے نام

چھند واڑہ

۹ جولائی ۱۹۱۲ء

برادرم السلام علیکم

ہیں تمہارا خیال غلط ہے کہ ہم دونوں نے تمہیں بھلا دیا۔ واقعی بات یہ ہے کہ جب تمہیں خط لکھنے کو قلم اٹھاتا ہوں۔ ایک دفتر مضامین کا سامنے آکر ہوتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ اگر خط انگریزی میں لکھا جاتا تو چنداں دشواری نہ تھی۔ اردو میں لکھنے کو دل چاہتا ہے اور جو مشکلات اور دھڑکے تعلق پیشتر تھیں ان میں ہرگز کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ بہر حال آموں کا شکریہ یوں بھی واجب تھا مگر جس کثرت سے روزانہ پارسلیں آموں کی پہنچ رہی ہیں اس کے حساب سے تو شکریہ میں ایک کا ڈبی جانا چاہیے تھا ورنہ لغافوں کے ٹکٹ دیوالہ نکال دیں گے مگر تمہاری محبت اس سے بہت زیادہ کی تھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جو شخص جواب نہ دے یا دیر سے جواب دیا کرے اسے بالخصوص اتر خط لکھنا کس قدر گراں ہوتا ہے۔ مگر جہاں اور اس زمانہ کی مصیبتیں ہیں ان میں سے اسے بھی مجھو اور چارسی خاموشی کی پرواہ نہ کر د بلکہ خط برابر لکھتے رہا کرو اس سلسلہ میں آپ کے جوڑے وال جاب سے بھی کچھ عرض کرنا ہے جس طرح ہندوستان کی بارش موسمی ہوتی ہے ایک زمانے میں تو پے۔ دپے چار پانچ خطوط آ جاتے ہیں اور پھر وہ خشک سالی ہوتی ہے کہ الامان۔ اپریل میں جب کہ میں علیل تھا اور یونیورسٹی کے متعلق معروف بھی۔ ان کے چند خطوط آئے جن میں تمام دنیا کی شکایت تھی کہ میمبیل چھاپنے میں دیر کر دی حالانکہ میں صرف انھیں کو ذمہ دار سمجھتا ہوں خواہ وہ کہتے ہی

مداخلہ کیوں نہ ہو جائیں۔ جو کام شروع دسمبر تک ہو جانا چاہیے تھا اس کا آخر مارچ میں ملے پانا اور وہ بھی بری طرح ہرگز کسی اور کی لاپرواہی کا نتیجہ نہیں ہے۔ لیکن وہ اس میں بالکل بے قصور نہیں تاہم اس کا ذمہ وار کون ہے کہ آج تک مجھے اس کی اطلاع نہیں ملی کہ جواب کہا ملا یہی باتیں ہیں جو مجھے تنگ کر دیتی ہیں معلوم کس شخص نے ان سے کہ دیا کہ منظم نے ان کی وجہ سے شکایت کی اب منظم کو بھی بار بار شکایت لکھی اور مجھے بھی حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے میرے مہر دلی چھوڑنے کے بعد سے اخبار اور پریس کا جو شر ہو اسو موا۔ اب اس کا دکھڑا رونا فصول ہے گریٹک سمیریل کا جو جونا تھا سو اس کا اس طرح انتظام ہوا۔ خیر وہ بھی سہی۔ مگر برا ہے۔ ۱۱۰۰ کے انصاف سے تو مطلع کریں۔ ناکامی پہلے ہی یقینی تھی مگر جو جواب ملا اس

اطلاع کہ اس کا مطلب کیا تھا۔ اب تک صرف اس

کہ گورنمنٹ ہند کی جانب سے ایک غلطہ جانب صاحب

کچھ عرصے بعد منظم نے پھر لکھا تھا کہ سہارن پور کے اپیل کا جو فیصلہ ہوا تو آپ کو سومری بہار میں رہنے اس کو معلوم نہ تھا کہ اس فیصلہ کی اطلاع دینے والے جانب صاحب جیسے شخص تھے۔ براہو۔ اس کا کافی کالی شے کا جس کی ڈیپارٹمنٹوں تک ساتھ آئی تھی۔ جس نے اس راستہ کو جس کو اور لوگ ایک دن میں ملے کرتے ہیں تین دن میں ملے کر آیا اور پھر بھی جس نے سوار کو پیدل چلایا غائباً جانب صاحب کا خیال ہے کہ وہ اس کی اطلاع فیصلہ ملتے ہی مجھے کرچکے ہیں۔ بجائی ان سے کہہ دو کہ یہ تمام کرو فریب چینیانگیم صاحبہ کا ہے ورنہ میں تو آج تک اس معاملہ سے بے خبر ہوں۔ ان سے سلام کہنا اور یہ کہ دینا کہ یہ پیش و غیرہ پر اس قدر نظر عنایت کیوں ہے دنیا میں واقعات کا تھا نہیں پوچھنے کی کمی نہیں۔

اب اپنی سنو۔ علی گڑھ کالج کے معاملات ضرور تمہاری توجہ کے مستحق ہیں مگر واقعات سے بہتر کوئی شے نہیں رائے کو کم کرو۔ واقعات کو زیادہ کرو۔ کیا چودہری غلام حیدر خان کو علی گڑھ کے متعلق کاغذات دستیاب نہیں ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب کی انگلش ہاؤس ماسٹری کا معاملہ لیا

ہے کہ اس کا جواب ہی نہیں۔ پیر انسپکٹر کی رپورٹ۔ پھر اس پر نواب اسحاق خاں صاحب کالیک
 کیٹی بھر کر تاں کہ اولڈ بوائز والی کمیٹی اور ٹرسٹیوں کا کمیشن نہ بنے پائے پھر اس کمیٹی میں خواجہ
 کا بھی نام ہونا مگر آخرش عاجز وادہ صاحب کا تحقیقات کرنا اور رپورٹ تیار کرنا پھر اس سال اسکول
 کے امتحانوں میں طلبہ کو ترقی نہ دینا۔ پھر یونیورسٹی کے نتائج یہ سب توجہ کے مستحق ہیں۔ تم اسحاق
 خاں صاحب سے پوچھ سکتے ہو کہ گذشتہ پانچ سالوں میں اسکول کے ہر درجہ کے سالانہ امتحان میں
 کیا *percentage* ترقی دیا گیا اور ہر درجہ میں کیا *percentage* ترقی دیا گیا ہے
 گذشتہ پانچ سال کے اسکول کے نتائج کیسے تھے اور اب کیسے ہیں۔ یہ تو یقین ہے کہ سنہ ۱۹۱۶ء تک
 تین چار سال کے نتائج خواب تھے چنانچہ اس سال میں نے بجٹ کے طلبہ میں یہ امداد پیش کئے تھے
 گذشتہ سالوں کے طلبوں کی رودادیں اور بجٹ منگوا رکھو اور کبھی کبھی مطالعہ کر لیا کرو۔ جو رائیں
 میں نے اور شوکت نے گذشتہ دو اہلاسوں میں دی ہیں انہیں دیکھو اور خصوصاً خواجہ سے منگا کر
 وہ رپورٹ جو میں نے *de la* کے طلبہ میں بحیثیت ٹرٹی من جانب ایوسی ایشن
 اپنی سالانہ کاروائی پیش کی تھی یہ وہ چیزیں ہیں جن سے تمہیں اپنے پیارے کالج اور اس کے
 اسکول کے حالات صحیح معلوم ہوں گے۔ یعقوب کی تحریک اور اس پر ان کی رائے میں رطب
 و باس دونوں تھے اور جو کمیٹی بنوانا چاہتے تھے وہ محض بیکار اور صفر ہوتی اگر کچھ اصلاح کر سکتے
 ہو اور کرنا چاہتے ہو تو اصل کو پکڑو۔ فروغ سے زیادہ بحث نہ کرو اور پھر دو علی بیکار نہیں بلکہ صفر
 ہے یا کو کو قوم کا دشمن سمجھو کہ کسی نیت سے بھی ہو قوم کا نقصان کر رہے
 ہیں اصلاح کا کام دوسروں پر چھوڑ دو۔ ملی تعلیم سے یہ کام نہیں چلے گا۔ ارے ہاں خوب یاد آیا
 یہ تم سے کس نے کہ دیا کہ مسئلہ تعلیم کا بڑا اکسپورٹ ہے۔ یہ شخص محض احمق ہے۔ اسے اتنی
 عقل ہی نہیں ہے کہ کچھ سمجھے۔ اسے تو سازش آتی ہے اور غریب طلباء کا گلا گھونٹنا اور غدار می مکرو

خفیہ نہیں۔ رہائی یورپی کا معاملہ۔ اس کی مجھے کچھ بھی اطلاع نہیں۔ اطلاع دے تو کون۔ ڈاکٹر عبدالرحمن۔ پی ایچ ڈی ساکت و صامت ہیں۔ انصاری کچھ ناراض کچھ مصروف اور بالکل ناشی اسحاق خاں محض ملبوعہ کا غذات ایسوسی ایشن اور کالج کے بیچ دیتے ہیں۔ سہدرو کے نامزد کردہ نام کو ایسوسی ایشن سے خارج کرنا چاہتے تھے۔ مجھے لکھا کہ اس میں آپ کو تو عذر نہیں ہیں نے اپنے عذرات لکھ دیے اور یہ بھی کہ اگر یہ مسئلہ چیمبر آف تو یہ امر لیزہ ممبروں کی خدمت میں ارسال کر دیا جائے۔ اس کے بعد سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی

جو تم نے لکھا ہے وہ بالکل متوقع تھا ہرگز غیر متوقع نہ تھا

بے ایمان ہیں کسی امر کو سہم اور ان کے اعتبار پر نہ چھوڑنا

۵۰۵ off x کا سوال اسی وقت لے کر دینا چاہیے۔

کے سعلق ریز دلشیں میں کچھ درج انہیں کوئی شخص ۵۰۵ off نہیں بن سکتا یورپی کے مسئلہ میں جناب ہرگز اعتبار نہ کرنا یہ جناح کیوں کر دیا ہے۔ اصل میں یہ نقطہ معینا معنی تپا ہے اور ریز ۵۰۵ ہونا چاہئے تھا انہوں نے اس کو ۵۰۵ کر دیا تم جتنا کر دیا یا خواہ بہتر ہے کہ خبرہ کر دو مگر جناح کیوں کہو، میں بے اعتمادی نہیں برتا بلکہ تجربہ سے معلوم ہو گیا کہ جنبہ کی رائے ہے کہ یہ مسئلہ زیادہ اہم نہیں جس طرح ۵۰۵ ہو سکے کر دیا جائے۔ مسئلہ تعلیم پر جنبہ ۵۰۵ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ کالج کے ٹرسٹی کی حیثیت سے وہ نہایت بے توجہ اور لاپرواہ ہے ہیں۔ اس کی روایات سے نہ انہیں واقفیت نہ دلچسپی وہ تو پولیٹیکل مسائل میں کام کے آدمی ہیں اور وہ بھی کاغذی کارروائیوں میں۔ یہ مسئلہ تعلیمی ہے اور اس میں عبدالرحمن ہی پر عبور و سار کو وہ بھی اس وقت تک جب تک کہ سرگرمی اور مستعدی سے وہ کام کرے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ

۱۱ ماہر

(۲) برنبائے عہدہ (رکن وغیرہ)

ولایت سے آنے کے بعد سرگرم رہا یا نہیں۔ بھائی اب اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ ہاں اتنا اور لکھنا ہے کہ چٹا ہنی نے غریف مکہ کی عذاری پر (نہ معلوم یہ واقعہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ بن ظاہر صحیح نہیں ہے) میری ایک عزیزہ چار سال بیت اللہ شریف رہ کر ابھی واپس آئی ہیں، جو رائے دی تھی، اس میں ہمارے مقدس مذہب سے ناواقفیت کا کافی سے زیادہ اظہار کیا تھا۔ چونکہ میرے عنایت فرما ہیں میں نے بحیثیت ایک مسلمان کے اس معاہدہ کے مذہبی نوٹ پر ان کو ایک خط لکھا ہے۔ مندرجہ ذیل نے اس امر کو مذہبی تسلیم کر کے (کیونکہ میں نے سیاسی یا فوجی رخ سے بحث کرنے سے احتراز کلی کیا تھا) میرا خط بطیب خاطر روانہ کر دیا۔ غالباً تم کو اس خط کی چند دن میں نقل روانہ کر دوں۔ دیکھ کر واپس کر دینا۔ میں خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ ہم میں ہمارے مرشد مولانا عبد الہادی صاحب مدظلہ تعالیٰ صیے بزرگ اور مذہبی پیشوا موجود ہیں۔ لیگ نے بھی اس بار تو کچھ مذہبی خدمت ادا کی اور مسلمانان کلکتہ نے نبی ہم مسلمانوں کو ان کا بھی شکور ہونا چاہیئے جنہوں نے ہمارے مذہبی احساسات کا اس موقع پر برحفاظ کیا۔ جنگ پر رائے زنی کرنا ماہرین فن خنک کا کام ہے۔ سیاسیات پر میں نظر بندی کے باعث بحث کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ البتہ مذہبی معاملات میں ہمیشہ آزاد ہوں اور رہوں گا اور

عزراہم خدا سے دعا ہے کہ عذاب نہیں ملے ہمیشہ سے انکار کرتا ہوں کہ الہم (عزراہم السلام) و السلیمن و اخذل الکفرۃ و

البتۃ عتۃ و المشرکین دام سلطۃ عبدک السلطان ابن السلطان الخاقان ابن الخاقان سلطان السجود و خاقان البرین خادم الحرمین الشریفین الغازی المہادی فی سبیل اللہ سلطان السلام خلد اللہ تعالیٰ ملک و سلطۃ الہم الغفرۃ الغفرۃ کہو کہہ اسمہ حافظہ مویدہ و نامرہ و الحق بسبب الرقاب الطایفۃ البانویۃ الفرق الکفرۃ یا من بیدہ امر الدنیا و الاخرہ۔ خداوند کریم فرماتا ہے کہ انی اجیب للکدعوۃ الداع اذا دعان فلیست بیتیالی و لکیونوالی۔ چنانچہ ہماری دعاؤں کا تو قرآن پاک ہی نے فیصلہ کر دیا۔ کل تلاوت کر رہا تھا کہ یہ آیات باعث تسکین ہوئیں۔ و ماہم الا یغذہم اللہ و ہم یعیدون عن المسجد الحرام

ادب الجاحظ

(گزشتہ سے پیوستہ)

اعتزال اسلام میں | قبل اس کے کہ جاحظ کا مسلک اعتزال پیش کیا جائے، نامناسب نہ ہوگا اگر اعتزال کے نشوونما وغیرہ پر بھی ذرا بسط کے ساتھ کچھ عرض کر دیا جائے۔

مترکہ یا قدری یا اہل عدل و اسلام جو چاہئے کیئے وہ جماعت ہے جو مضبوط اور صاحب فکر و عمل جماعت ہے۔ اس کے شیوخ طلیق اللسان اور صاحب بیان تھے۔

یہ جماعت پہلی صدی ہجری کے اواخر میں پردہ ظہور پر آئی۔ یہ زمانہ ہے کہ خوارج کا ایک فرقہ "ازرقہ" نمودار ہوا ہے۔

بصرہ اور اہواز میں خاص طور سے اس کے اثرات و نقوش قائم تھے۔ ان کا معاملہ بہت زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت اور حجاج بن یوسف کے زمانہ ولایت و عراقین میں یہ صورت اور زیادہ سخت ہو گئی تھی۔ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کیا سمجھا جائے؟ یہ ایک سوال پیدا ہوا۔ ہر جماعت ہر فرقہ اور مذہب نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی جن میں سے "ازرقہ" کا خیال یہ تھا کہ گناہ خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ اس کا مرتکب مشرک ہے۔ چونکہ اس فرقہ کے نزدیک مشرک کی اولاد بھی مشرک ہوتی تھی اس لئے عورتوں اور بچوں کا قتل واجب تھا، عام اس سے کہ وہ اہل اسلام سے ہوں یا کسی اور مذہب سے مگر ہوں "مشرک"۔ "صغیرہ" نے بھی ان کی موافقت کی لیکن ان کے خیال میں بچوں کا قتل ناجائز تھا۔ نجدت

لے خوارج کا سب سے بڑا فرقہ "نفس بن ارقم" کی طرف منسوب ہے۔

لے خوارج کا ایک فرقہ زیادہ بن اصفہر کی طرف منسوب ہے۔

لے خوارج کا ایک فرقہ جو بندہ بن عامر کی طرف منسوب ہے۔

کھنٹی یہ تھا کہ گناہ کبیرہ جس پر امت نے اجماع کر لیا ہو اس کا مرتکب تو باشبہ مشرک و کافر ہے لیکن جس گناہ پر امت میں اختلاف ہو تو اسے اہل فقہ کے اجتہاد پر چھوڑ دینا چاہئے۔ ”اباضیہ“ کا تو یہ ہے کہ جس گناہ میں خدا کی طرف سے وعید ہو اور کرنے والا اسے جانتا ہو جو خدا کی طرف سے وعید آئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہو تو وہ کفرانِ نعمت کا مرتکب ہو گا لیکن ایسا کافر نہیں ہو گا جس نے کفر یا شرک کیا ہو۔ حسن بصری اور ان کے ہم خیال بزرگوں کا خیال یہ ہے کہ مرتکب گناہ کبیرہ منافق ہے لیکن جمہور امت کا فیصلہ یہ ہے کہ اس امت مومنہ کا مرتکب گناہ کبیرہ مسلمان تو ہے۔ اپنے اس اعتقاد کی بنا پر جو اس کو اللہ سے ہے اس کی نازل کی ہوئی۔

البتہ وہ اگر کوئی کبیرہ گناہ کرتا ہے تو وہ فاسق ہے لیکن :
لوگ انہی تخیلات میں تھے کہ اسی زمانہ میں ایک

مسجد میں اپنی مجلس میں رونق افروز تھے۔ اس نے سوال کیا :
جماعت پیدا ہو گئی ہے جو گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتی ہے۔ کبیرہ ان کے نزدیک ایسا کفر ہے کہ امت سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ تو ہونے ”وعید یہ“ (خارج)۔ ایک دوسری جماعت ہے وہ کہتی ہے کہ ایمان کے ساتھ مسیحیت کچھ نقصان نہیں پہنچاتی اور کفر کے ساتھ اطاعت بے سود۔ یہ لوگ ”مرجیہ“ کہلاتے ہیں۔ پھر آپ اس بارہ میں کیا فرماتے ہیں؟ حسن بصری نے جب یہ سنا تو وہ غور کرنے لگے قبل اس کے کہ وہ کوئی رائے قائم کر کے جواب دیں واصل بن عطا جواب دے بیٹھے کہ صاحب گناہ کبیرہ نہ تو مومن مطلق ہے نہ کافر مطلق بلکہ وہ ان دونوں کے درمیانی راستہ میں ہے۔ حضرت حسن کو ان کی اس جلد بازی سے غصہ آگیا۔ وہ اس جرأت نازیبا پر خفا ہوئے تو واصل اپنے ساتھیوں کو لے کر اٹھ گئے اور مسجد کے ایک ستون کے پاس بیٹھ کر اپنی رائے ظاہر کرنے لگے اسباب و علل بیان کرنے لگے امتداد و تنبیح ترتیب دینے لگے حسن بصری نے ایک شاگرد عمرو بن عبیدہ کو واصل کے پاس مناظرہ کے لئے

لے خوارج کا ایک فرقہ جو عبد اللہ بن اباض کی طرف منسوب ہے۔

بیجا۔ مناظرہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمرو بن عبید بھی واصل سے مل گئے۔

معتزلہ نام کیوں پڑا؟ اس میں کئی اقوال ہیں مثلاً حسن بصری سے جب واصل نے مفارقت اختیار کی تو انہوں نے کہا ”واصل ہم سے جدا ہو گئے“ قتادہ بن دعامہ حسن بصری کی وفات کے بعد جب ان کی مجلس میں بیٹھے تو انہوں نے عمرو بن عبید اور ان کے معتدین کو ”معتزلہ“ کہا۔ وہب بن نصیر کہتے ہیں کہ عمرو بن عبید اور ان کے اصحاب جب حسن بصری سے الگ ہو گئے تو ”معتزلہ“ کہلانے لگے۔ معتزلہ کے نعتانے پانچ اصول بتائے ہیں کہ یہی مذہب اعتراض کی اساس و بنیاد ہیں جس نے ان کو پورے طور سے مانا وہی ”معتزلی“ ہے اور جس نے ان میں کچھ کم یا زیادہ کیا وہ اس ”شرف“ کا مستحق نہیں ہے۔

(۱) التوحید:۔ یعنی اس بات کا اعتقاد کہ خدا ایک ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے وہ قدیم ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے حادث ہے، جو اس کا ادراک کسی طرح بھی اس دنیا میں نہیں کر سکتے ہیں اور نہ آخرت میں وہ کسی طرح بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا، ایجاد کیا۔ وہ اشباہ و امثال سے قطعاً بری ہے، نہ کوئی مکان اس کا حصر کر سکتا ہے، نہ کوئی زمانہ اس کو محدود کر سکتا ہے۔ نہ وہ جسم ہے، نہ عرض ہے، نہ غصہ ہے، نہ جزو ہے، نہ جوہر ہے۔ وہ تمام چیزوں کا صورت گر ہے۔ وہ عالم بالذات ہے عالم بعلم نہیں۔ وہ قادر لذاتہ ہے، حی بالذات ہے۔ اس کے صفات بھی قدیم ہیں اور معانی اسی کے ساتھ قائم ہیں، قدم (قدامت) میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ اصول اقوال فرقہ ”مجتہد“ کے رد میں وضع کیا گیا ہے۔

(۲) العدل:۔ یعنی اس بات کا اعتقاد کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، فساد کو نہیں پسند کرتا ہے اور شر کا صدور اس سے اسی وقت ہوتا ہے جب بندوں کے لئے اس میں کوئی مصلحت ہو اور اس سے

۱۔ اعتراض کے منہ میں ترک کر دینا، چھوڑ دینا، الگ ہو جانا۔

۲۔ ایک قدیم فرقہ جو اعضاء انسانی کی طرح اللہ کو بھی صاحب اعضا مانتا ہے۔

جو کچھ صادر ہوتا ہے وہ ہندوں کی مصلحت کے لئے ہوتا ہے۔ ہندوں سے جو خیر و شر، صلاح و فساد کے حرکات سرزد ہوئے ہیں ان کا انھیں پورا پورا بدلہ دیا جائیگا یعنی اچھی باتوں پر ثواب اور بری باتوں پر عذاب اس لئے کہ ان کو جو قدرۃ تفویض کی گئی ہے اس کی بنا پر وہ خلق افعال پر قادر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو وہ قوۃ و قدرت جب چاہتا سلب کر لیتا اور جب چاہتا باقی رہنے دیتا۔ اگر چاہتا تو مخلوق کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا تھا اور بصیحت سے روک سکتا تھا لیکن اس لئے ایسا نہیں کیا اپنے بندوں کو اس نے ایسی تکلیف نہیں دی جو ان کی طاقت سے باہر ہو اور نہ ایسی بات چاہی جو ان کی استعداد سے باہر ہو اور اللہ تعالیٰ نے حنات کے کہنے کا حکم دیا ہے انکا تمہارا ہے۔ جن سے اس نے منع فرمایا ہے، کوئی شخص کسی چیز پر قادر نہیں ہے۔

یہ اصول ”مجبرہ“ کے خلاف وضع کیا گیا ہے جن کے
(۳) الوعد والوعید — یعنی اس بات کا اعتقاد کہ اللہ تعالیٰ صادق الوعد ہے اور وعید نافذ کرنے والا ہے۔ جو مسلمان طاقت و استقامت پر وفات پاتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ نوازنا ہے۔ اگر کسی شخص نے گناہ کبیرہ کیا ہو اور بغیر توبہ کے مر گیا ہو تو وہ دائمی طور سے جہنم کا مستحق ہے، لیکن اس کا عتاب کافری سزا سے کم ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشادات بدلتے نہیں ہیں۔
یہ اصول ان لوگوں کے خلاف وضع کیا گیا ہے جو جواز کذب باری کے قائل ہیں۔

(۴) اسما و احکام — یعنی اس کا اقرار کرنا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ کافر ہے نہ موس بلکہ بین بین ایک چیز ہے لیکن اس کا شمار کفر و اسلام کے درمیان راستہ یعنی ”فسق“ میں ہو گا۔ اگر وہ ای

لے ایک فرقہ جس کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان مجبور محض ہے۔

لے جم بن صفوان رزندی، فارسی الاصل، فرقہ جبر یہ کے سرور و فرقہ ”جمیہ“ انہی کی طرف منسوب ہے۔ ۳۱۱ھ میں وفات پائی۔

مفق کی حالت میں مگر یا تو جہنم کا دائمی عذاب ہے اور وہ ہے۔ ہاں کافروں کا سا مخلوق فی النار نہیں ہوگا۔
یہی وہ اصل لاصول ہے جسے اعتزال کی جڑ کہنا چاہئے اس لئے کہ واصل بن عطا اور عمرو بن عبید کے نزدیک عبارت ہے عادات و خصائل خیرے۔ اگر خصائل خیر کسی شخص میں جمع ہیں تو بلاشبہ وہ مومن ہے۔ مومن ایک اسم مدح ہے اور قاسم چونکہ اس خیر سے خالی ہوتا ہے اس لئے وہ اس کا مستحق کب ہے کہ وہ بھی اس شرف سے مشرف ہو؟ اس لئے نہ اسے مومن کہتے ہیں نہ کافر اس لئے کہ خصال خیر اور اس کی ماتحت چیزوں کا وہ انکار نہیں کرتا لیکن اگر دنیا سے بغیر توبہ کئے ہوئے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے بعد رخصت ہو جائے تو بلاشبہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اس لئے کہ دارالجزا میں ”یا تو جنت ملے گی یا دوزخ“ (فریق فی الجنة و فریق فی السعیر)۔

(۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر — یعنی اس بات کا اقرار کہ اہل ایمان حدود خداوندی کے بجالانے پر مکلف ہیں اور یہ جو تکالیف ہیں یہ بھی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر لطف ہے۔ مقصد صرف امتحان ہے اور اس کی آزمائش کہ وہ اپنے فرائض ادا کرتے ہیں یا نہیں؛ اور ہر مسلمان پر یہ واجب ہے کہ ان باتوں کی طرف دعوت دے اور جو مخالفت کرے اُسے خدا سے ڈرائے۔
یہ اصول اس آیت پاک کی تعمیل ارشاد ہے ”وَلکن من کم امته یدعون الی الخسیر و یامرون بالمعروف و ینہون عن المنکر“

یہ ہیں وہ اصول پنجگانہ جنہیں فقہاء معتزلہ نے ترتیب دیا ہے، لیکن امام داماد کے باوجود یہ بھی ان کا ایک خاص مسلک ہے یعنی انتخاب امام امت کا حق جو وہ جس میں اس کی صلاحیت دیکھے کہ احکام خداوندی کا اجرا کر سکتا ہے اور حدود و شریعت نافذ کر سکتا ہے خواہ وہ قریش سے ہو یا کسی اور قبیلہ سے اسے وہ منتخب کر لے اس لئے کہ معتزلہ کسی شخص یا قبیلہ کے لئے امامت کو مخصوص نہیں سمجھتے ہیں۔ ”نہدات“ کے علاوہ تمام خوارج اور ”زیدیہ“ کی ایک جماعت معتزلہ سے متفق ہے

لفظ اس سے مخلوق فی النار کہاں سے ثابت ہوتا ہے؟ (مترجم)

یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت فرمایا کہ اگر سالم موجود ہوتا تو میں بلا مال خلافت اسے سونپ دیتا۔ سالم ایک انصاریہ عورت کے غلام تھے، عام طور سے سالم ”مولیٰ ابی مذنیفہ“ کے نام سے مشہور ہیں تو حضرت عمرؓ اگر امامت کو سارے مسلمانوں کے لئے جائز نہ سمجھتے ہوتے تو یہ بات نیچے فرماتے؟ اور سالم کی وفات پر اظہارِ ماتعت کیوں کرتے؟ اس باب میں امام ابو حنیفہؒ اکثر مرتبہ زید میں سے بھی غالب تعداد، تمام شیعہ اور راوندیہ کا اختلاف ہے۔ یہ لوگ سواتریش کے اور کسی امامت کا مستحق نہیں سمجھتے ہیں اور دلیل یہ لاتے ہیں ”الامامۃ فی قریش“۔

فرقہ معتزلہ کے بانی واصل بن عطا اور عمرو بن عبیدہ کی سب وفات ہوئی۔ اس وقت تک انبساطِ حکمت، منطق، طبیعیات اور الہیات وغیرہ کا یونانی ذخائر بائوں سے ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں نے اپنی وفات کے حالت میں چھوڑا تھا، دلائل و برہان سے محکم کرنے کی کوئی ضرورت۔

نصاحتِ بدویت، قوتِ بیان اور زورِ زبان پر اس عمارت کی تعمیر ہوئی سی۔ عباسیہ میں یہ علوم عربی میں متحل کئے گئے تو لوگوں نے بہت زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ اسی زمانہ میں علمِ کلام کی ابتدا ہوئی جس میں ابو الذہل علاف، ابوالحسن ابراہیم بن سيار، النظام خاص طور سے معروف و ممتاز ہیں، پھر ہمارے ”ہیرو“ جاحظ کی باری آتی ہے جس کا سارا عالم معتزلہ ہے۔

جاحظ اور اعتزال | تفصیل بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں اعتزال کی نشوونما کیوں کر ہوئی، واصل بن عطا اور عمرو بن عبیدہ نے اپنے استاد حسن بصری سے کیوں مفارقت اختیار کی، معتزلہ نام کیوں پڑا، ان لوگوں کے عقائد کیا ہیں، اصول کیا ہیں۔

یہ بھی معلوم ہو چکا کہ ابتداء میں یہ مسئلہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا، لیکن اس کے باوجود بعد میں اس میں بھی فرقے بنے، جماعتیں قائم ہوئیں، جتنہ بندی ہوئی اور جدل و بحث کا بازار گرم ہوا۔

جاحظ چونکہ شیوخ معتزلہ میں سے تھا وہ مخصوص رائے کا مالک تھا اور اپنی رائے میں بتوں سے متغیر رہی تھا اور ایک جماعت کی جماعت اس کی پیروی بھی تھی اس لئے ایک پورا فرقہ

”باحظہ“ کے نام سے قائم ہو گیا۔ اس کی کتابوں میں اکثر اہل کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس سے باہل
 مختلف ہے جو اس کے ”عنایت فرماؤں“ نے ازراہ عداوت و خصومت اس کے سر تقو پا ہے۔
 ابن راوندی، بغدادی، ابن خزم اور شہرستانی کو اس سے خاص طور سے عداوت تھی۔
 ان لوگوں نے باحظہ کی طرف طرح طرح کے قول منسوب کئے ہیں جو اس کے ہرگز نہیں ہیں۔ اور انہی
 پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ آگے بھی یہ سلسلہ جاری رہنے دیا۔ بعض کا اس کے انصار و احباب نے جواب
 بھی دیا ہے مثلاً مقریزی نے شہرستانی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ باحظہ کہا کرتا تھا کہ قرآن منزل از
 قبیل اجسام و اجساد ہے۔ یہ بھی ممکن ہے وہ آدمی ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حیوان، ظاہری اس
 سے بڑھ کر کذب صریح اور اقرار محض کیا ہو سکتا ہے؛ کون اسے یقین کر سکتا ہے کہ باحظہ ایسی گری
 ہوئی باتیں بھی کر سکتا ہے؛ حیرت ہے کہ شہرستانی نے ابن راوندی سے ایسی خفیت بات روایت کیے
 کر دی؛ اگرچہ ابوالحسن خیاط نے اپنی کتاب ”الانصار“ میں ان تمام مطاعن کی تردید کر دی ہے جو
 ابن راوندی نے معتزلہ پر عائد کئے تھے، بالخصوص باحظہ کی بہت صفائی دی ہے، باحظہ کے نقائص و
 معائب جو مشہور کئے تھے ان کا ایک ایک کا چن چن کر جواب دیا ہے، جو بات حد درجہ دلائل و
 براہین سے مستحکم ہیں لیکن اس قول کا اشارہ بھی اس نے نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ابوالحسن اشعری
 نے اپنی کتاب ”مقالات الاسلامیین“ میں وہ تمام روایات جمع کر دی ہیں عام اس سے کہ وہ
 اہمیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن اس قول کا کذب کا انھوں نے ذکر بھی نہیں کیا ہے۔

۱۔ ابوالحسن احمد بن یحییٰ الراوندی، انتشار و ازادہ فیلسوف تھے۔ ان پر زندہ کا الزام لگایا جاتا ہے۔ ایک روایت

یہ بھی ہے کہ توبہ کے بعد ان کا انتقال ہوا، سنہ وفات ۲۹۸ ھ۔

۲۔ ابو منصور عبد القاہر بن طاہر تہی البغدادی صاحب کتاب ”الفرق بین الفرق“ ۳۲۹ ھ میں غلام بغداد فوت ہوئے۔

۳۔ ابوالفتح محمد بن عبد الکرم الشہرستانی صاحب کتاب ”الملل والنحل“ عالم فاضل، نقیبہ، محقق، حکم سب ہی کچھ تھے، ۳۳۹ ھ

میں بمقام شہرستان کو لود ہوئے، ۳۳۹ ھ میں بمقام شہرستان وفات پائی۔

ابن تہیہ، ابن خزم اور ہندی سب کے سب باخظ کے دشمن ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی یہ قول نہیں نقل کیا ہے۔ اگر ان لوگوں میں سے کوئی شخص ایسا یا تعرضی کے طور پر باخظ سے اس فقرہ کا سدھالیتا تو ساری دنیا اس کے طعن و تشنیع اور تحقیر و اہانت سے بھر جاتی۔ لہذا ثابت ہوا کہ یہ قول بالکل غلط ہے اور کوئی عقل مند ایسی احمقانہ بات نہیں کہہ سکتا۔

ابن راوندی کا ایک اور افتراء باخظ پر یہ ہے کہ اس کا قول ہے کہ یہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اجسام کو ان کے وجود کے بعد معدوم کر سکے۔ اس پر ابن راوندی کہتے ہیں کہ اگر وجود کے بعد کسی جسم کا معدوم کر دینا محال ہے تو عدم کے بعد اس کا وجود بھی ممکن ہے۔

خیاط کہتا ہے 'باخظ فریغ یہ بھی یہ بت بڑا کذب ہے کسی آئمہ کے ہاں یہ عقائد ضرور ہوتا ہے اس کی صداقت جانچنے کے دو ہی میاں ہیں ایک تو یہ روایت کرتے ہوں 'دوسرا یہ کہ اس کی کتابوں اور رسالوں میں۔

کی کتابوں میں یہ قول پایا جاتا ہے؟ اس کی کتابیں تو مشہور عالم ہیں اصحاب میں سے اس کی کوئی روایت کرتا ہے؟ یہ بھی نہیں کسی آدمی کی وفات کے بعد یہی دو صورتیں ہیں جن سے صداقت معلوم ہو سکتی ہے اور جب ان سے پتہ نہیں چلتا تو ظاہر ہے یہ بالکل کذب ہے 'بستان ہے۔

اس کی کتابیں "نظم القرآن" "اثبات النبوة" وغیرہ دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اسے اسلام سے کتنی محبت تھی اور خدائے تعالیٰ اس کے اس عمل خیر کو صالح نہیں فرمائے گا۔

ابن راوندی ہمیشہ مقرر کہ تشنیع و طعن سے بدنام کیا کرتے تھے، انہوں نے باخظ پر ایک الزام یہ بھی لگایا تھا کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض تھا، نعموذا اللہ من ذالک۔ خیاط نے اس کی بھی تردید کی ہے کہ ابن راوندی کا باخظ پر بغض رسول اللہ کا الزام لگانا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دوست و دشمن میں تمیز نہیں کر سکتے اس لئے کہ باخظ سے زیادہ کسی مسلم نے نظم قرآن اور احتجاج نبوت پر ایسی کتابیں نہیں لکھیں جو اقل و دل ہوں، اثبات رسالت

اوصح احادیث و اخباریں اس کی کتابیں مشہور ہیں اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس سے زیادہ موکد خیر چھٹے رسول اور تصدیق نبی پر پیش نہیں کی جاسکتی۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ بڑے قوی دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ اس پر لازم لگایا جاتا ہے وہ سراسر بہتان ہے۔ وہ جاخط ہی تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کی تصحیح کی (جو غلط فہمی کی وجہ سے غلط سمجھا جاتا تھا) اور ثابت کر دیا کہ سب سے زیادہ اشرف و اعلیٰ نسب حضور ہی کا تھا کسی گزشتہ باب میں جہاں ام نضر کے نسب سے بحث کی گئی ہے اس سے حضور کا نسب ثابت ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل گزرتی ہے۔

جاخط اور ابن زیات | امراء دولت عباسیہ میں جاخط ایک ممتاز مرتبہ کا مالک تھا۔ وہ سب کے سب
داہن داؤد | اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے تھے اسے پسند کرتے تھے اور اس کے درجہ کو بلند سمجھتے تھے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ جاخط اس کی پارٹی میں شریک ہو جائے۔ اس نے بجائے ابو داؤد کے جو قاضی تھے ابن زیات کو جو وزیر تھے ترجیح دی اور انہیں کے ساتھ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حیلہ جوڑوں اور خلیفوں کی گرم بازاری ہو گئی اور وزیر و قاضی دونوں ہی متاثر کئے جانے لگے۔ ابن زیات کے اتے کان بھرے گئے کہ اس نے جاخط کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ جاخط بھاگ کھڑا ہوا۔ اس سے پوچھا گیا تم بھاگے کیوں؟ اس نے کہا بھائی میں ڈرا کہ تنور میں نہ جھونک دیا جاؤں۔ داہن زیات نے ایک تنور جوایا تھا۔ جس سے خفا ہوتا تھا اسے اس میں ڈلوادیتا تھا۔ جب تک وہ مرنے نہیں جاتا تھا تنور سے گلہ نہ ملتا۔ ممکن نہیں تھی، آخر پھر وہ پکڑے گئے اور قاضی ابو داؤد کے حضور میں پیش کئے گئے۔ اس حالت میں کہ گردن زنجیر سے بندھی ہوئی تھی، پیر بھی جکڑے ہوئے تھے، اور ایک پٹی پرانی قمیص زیب برتنی۔ قاضی کی جب اس پر نظر پڑی تو انہوں نے کہا خدا کی قسم تو بڑا فراموش کنندہ قسمت ہے، لیکن شکر ہے زیادہ نے تجھے زیادہ مہلت نہیں دی۔

باخط : اگر آپ مجھے بخش دیں تو انتقام سے یہ کہیں اچھا ہوگا۔
 بن ابی داؤد : خدا تجھے غارت کرے بکنت خدا کی قسم تو بہت بڑا غلط ہے۔ بتلا اس آیت کی تائید کیا
 کرتا ہے؟ ”وَكَذَلِكَ أَخْذُ الْعَرَبِ وَهُوَ عَالِمٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ“
 باخط : خدا قاضی صاحب کو اعلیٰ مرتبہ دے۔ اس کی بہترین تائید اس کی تلاوت ہے۔
 ابن ابی داؤد : آہنگر کو بلاؤ۔

باخط : خدا قاضی کو سر مبارک کرے۔ کس لئے؟ زنجیریں توڑنے کے لئے یا اس میں اور اضافہ کے لئے؟
 قاضی : تاکہ تجھ سے دور کر دی جائیں۔

پس آہنگر لایا گیا۔ اہل مجلس میں سے بعض نے اشارہ کیا کہ زنجیر اتار دیتے وقت بہر روز ادب ترک
 کام کرے۔ بس پھر کیا تھا جاحظ نے ایک آفت برپا کر دی اور کہنے لگا
 بلکہ ایک دن کا ایک گھنٹہ میں، بلکہ ایک گھنٹہ کا ایک منٹ میں بکنت
 ہم اوجہ کی پرواہ نہیں ہے۔ اس پر قاضی صاحب اور دوسرے

محمد بن منصور سے کہا میں اس کے ظرف پر تو اعتماد کرتا ہوں لیکن اس کے دین پر نہیں چہرہ پہ
 سے کہا اسے حمام میں لے جاؤ۔ پھر زنجیر وغیرہ اتار دی گئی اور وہ حمام میں داخل کیا گیا۔ پھر اچھے اچھے
 کپڑے بنا کر مجلس میں لایا گیا۔ قاضی نے کہا ابو عثمان اب کیا کہتے ہو؟ جاحظ بڑی دیر تک غوثِ مداد
 تعلق کی باتیں کرتا رہا۔

عروض و شعرے پرسی | جاحظ کی خواہش تھی کہ فن عروض و شعر میں بھی وہ مرتبہ کمال پر پہنچے، لیکن
 طبیعت کو زیادہ مناسبت تھی نہیں اس لئے وہ اپنی اس آرزو میں ناکام ہی رہا۔ پھر اس کی جولانگہ
 شری رہی۔ وہ کہا کرتا تھا اھمی سے میں نے شعر حاصل کرنا چاہا سو غریب و نادار اشعار کے اسے اور
 کچھ نہیں آتا تھا، پھر میں آغوش کے پاس پہنچا اسے سو اعراب کے اور کچھ نہیں معلوم تھا، پھر میں نے
 ابو عبیدہ کا رخ کیا وہ اخبار انساب اور لڑائیوں کے علاوہ ہر چیز میں کورے تھے۔ جو کچھ میں چاہتا تھا
 اس میں سوا انشا پر دازوں کے اور کسی سے اپنا مطلب نہ حاصل کر سکا۔

جس نانہ میں اس کو اس فن کے حاصل کرنے کا جنون سوار تھا وہ کہا کرتا تھا عرضِ شمس کے لئے
میزان و میاں رکھتا ہے۔ صبح و عقیقہ و زشت کا فرق اسی سے معلوم ہو سکتا ہے۔
لیکن جب اپنی اس تمنائیں ناکام رہا اور کامیابی کی کوئی صورت بظاہر نظر نہ آئی تو کتنی دلچسپ
بات کہی، کہتا ہے:

قروض ایک مردود علم ہے، ایک مجہول کلام ہے، عقول پر برا اثر ڈالتا ہے، مستغفل اور
مغفل کے سوا اس میں رکھا گیا ہے؟ اس سے نہ حاصل نہ محصول؟
شعر کے متعلق اس کی رائے کتنی نبی تھی ہے، کہتا ہے:-

”شعری فضیلت تو بس عجب ہی کے لئے ہے اور وہی کہہ سکتا ہے جو عربی جانتا ہو شعر
کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ اسے کسی دوسری زبان میں نقل کیا جاسکتا ہے اور اگر ایسا
کیا بھی جائے تو اس میں پرانگندگی پیدا ہو جاتی ہے، اس کی پسندیدگی رخصت ہو جاتی ہے
اور وہ شری طرح ہو کے رہ جاتا ہے۔ ہندوستان کی کتابوں کا ترجمہ ہوا، یونان کی کتابیں
عربی میں منتقل کی گئیں، فارسی زبان کا ادب بھی لیا گیا، اس ترجمہ کے بعد بعض کے حسن میں
تو اضافہ ہوا اور بعض یونانی ناقص، الخ۔“

کتابوں کی شداد اور ان کا مختصر تعارف | مسعودی کا قول ہے کہ باخط کی کتابوں سے فہن میں جلا
پیدا ہوتی ہے، اس کی کتابیں ہر اعتبار سے بے نظیر و لا جواب ہیں۔ جب اسے شبہہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا
اس سنجیدہ مضمون کو پڑھتے پڑھتے اکتا گیا ہوگا، تو وہ سنجیدگی سے ظرافت کا روپ بدل دیتا ہے اور ایسی
پرخیزاق باتیں کرتا ہے کہ آدمی کا سارا نگد رنچ ہو جاتا ہے۔ اس کی تمام کتابیں اسی خصوصیت سے
مخصوص ہیں۔ جماعت متفرقہ میں سلف و خلف کسی میں بھی ایسا فرد فرید نہیں پایا جاتا۔

میں نے اس کی کتابوں کی مقتضا میں اس کی کتاب ”العیون“ پر اعتماد کیا ہے۔ یا قوت
نے اپنی ”معجم الادباء“ میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس سے بھی میں نے خوشیہ منی کی ہے، اس کے علاوہ دوسری
کتب و اسفار بھی پیش نظر رہی ہیں۔ میں نے اس کی بھی کوشش کی ہے کہ بعض نسخوں نے باخط کی

کتابوں کے جو مختلف عنوانات دے کر لوگوں کو اس فکر کی وجہ سے متاثرہ میں ڈال دیا ہے اسے بھی رتبہ
 کر دیا میں نے چاہا ہے کہ فہرست بہت صحیح ثابت ہو ترتیب حروف بجا کا لحاظ رکھا ہو ملاحظہ ہو:
 ۱، کتاب آل ابراہیم بن المدبر۔ فن حکایت میں۔

۲، کتاب آمی القرآن۔ جاحظ کتا ہے اس کتاب میں میں نے وہ تمام آیات قرآنی جمع
 کر دی ہیں جن سے ایجاز و حذف اور زوائد و فضول واستعارات کا فرق معلوم ہو سکے۔
 ۳، رسالہ فی انجم السکر۔ بدستی کے گناہ کے بیان میں۔

۴، رسالہ الی ابی انجم دجوا۔

۵، کتاب اعالة القدر علی النظم

۶، کتاب الاحتجاج لنظم القرآن

۷، کتاب احد وثمة العالم

۸، کتاب الاخبار۔ دو کتابیں اور ذکر کی

دوسری تصحیح الاخبار غائبان ایک ہی کتاب ہے یہ کتاب

۹، کتاب الاخطار والمرتب والصناعات۔

۱۰، کتاب اخلاق الشطار۔

۱۱، کتاب اخلاق الفیثان وفضائل اہل البطالة۔ کتاب التاج میں ہے کہ یہ کتاب جاحظ کی

طرف غلط طور سے منسوب کر دی گئی ہے۔

۱۲، کتاب اخلاق الملوک

۱۳، کتاب الاخوان

۱۴، کتاب الاستبداد والمشاورة فی الحرب

۱۵، کتاب الاستقامة وخلق الافعال۔ یہ کتاب ان کتابوں میں ہے جن میں جاحظ نے

مذہب اعتزال کو ثابت کیا ہے۔

۱۳) کتاب استطائۃ النعم :- قاضی شہاب الدین خجندی نے اپنی کتاب طراز المجلس میں لکھا ہے کہ جاخط نے اس میں حکماء و شعراء کا ذکر کیا ہے۔

۱۴) رسالہ فی استیجاد الوعد

۱۵) کتاب الاسد والذنب

۱۶) کتاب اصحاب الالہام

۱۷) کتاب الاضام :- یہ وہ کتاب ہے جس میں جاخط نے جاہلیت عرب کے اصنام کا تذکرہ کیا ہے اور اسی میں نصر بن کنانہ جد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسیم کی ہے۔

۱۸) کتاب اصول الفیاء والاحکام

۱۹) الاعتراف وفصلہ :- شاید یہ وہی کتاب ہے جو جاخط نے "فضیلۃ المقرئ" کے نام سے ابن راوندی کی "فضیلۃ المقرئ" کے جواب میں لکھی تھی۔

۲۰) کتاب اقتدار اشتا والصیف

۲۱) کتاب افعال الطباع

۲۲) کتاب اقسام فضول الصناعات و مراتب التجارات

۲۳) کتاب الامامۃ علی مذہب الشیعہ :- ہو سکتا ہے کہ یہ وہی رسالہ ہو جو اس نے "بیان مذہب الشیعہ" کے نام سے لکھا تھا۔

۲۴) کتاب امامت معاویہ بن ابی سفیان :- اس میں رجال مروانیہ کا ذکر ہے اور بنی امیہ کی تائید ہے۔

۲۵) کتاب امامت ولد العباس :- اس میں وہ مذہب پر دلیل لایا ہے اور قصہ فذک کا بھی ذکر کیا ہے حضرت فاطمہ اور حضرت ابو بکر کی گفتگو بھی نقل کی ہے، یہ اور اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں جو اس موضوع سے تعلق رکھتی ہیں بیان کی ہیں۔

۲۶) رسالہ فی امتحان عقول الاولیاء

۳۰) کتاب الاشغال

۳۱) کتاب الامصار۔ شاید یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر مسعودی نے ”البلد ونہج کے نام سے کیا ہے۔ ہم نے احتمال منازت کے سبب یہاں ذکر کر دیا۔

۳۲) رسالہ فی الاصل والمأمول

۳۳) کتاب امسات الاولاد

۳۴) کتاب الانس والسلوة

۳۵) کتاب الاوافق والریاضیات

۳۶) کتاب البغلا۔ جاحظ کی نہایت بدیع کتاب

تدبیر منزل کے اصول اس سے استرا

نفع اٹھایا جائے؟ یہ اور بہت سی

بقام مصر طبع ہو چکی ہے۔

۳۷) کتاب بصیرۃ خاتم الرید۔

۳۸) کتاب البلدان۔ جیسا کہ گزر چکا ہے کیا عجیب کہ ”کتاب الامصار“ یہی ہو۔ ہم نے احتمال منازت کے سبب یہاں بھی لکھ دیا۔

۳۹) کتاب البیان والنبین۔ جاحظ نے یہ بے نظیر کتاب لکھی اور قاضی احمد بن ابی داؤد

کے حضور میں پیش کی جس کا صلیب پانچ ہزار دینار کی صورت میں ملا، متقدمین میں سے

اکابر علما اور اعانم ادبا کا اس پر اجماع ہے کہ ادب میں سب سے بہتر کتاب ہے۔

مسعودی کا قول ہے کہ جاحظ کی بہت بے نظیر کتابیں ہیں لیکن ”البیان والنبین“

سب میں فائق ہے اس لئے کہ اس میں نثر و نظم، منتخب و جدیدہ اشعار، بلغیہ سے بلغیہ

خطبے بہتر خوبی کے ساتھ جمع ہیں۔ ابن خلدون کا قول ہے کہ مکتب درس میں ہم نے

اپنے اساتذہ سے سنا ہے کہ فن ادب کے اصول و ارکان میں چار چیزیں سب سے

زیادہ خصوصیت رکھتی ہیں ایک تو ”کامل اللبرو“ دوسری کتاب البیان والہدیین للبھاظہ
تیسری ”کتاب النوادر لابن علی القاضی“ چوتھے ”ادب الکاتب لابن قتیبة“ ان چار
کے علاوہ جو کچھ ہے اسے انہیں کا ”فروع“ سمجھنا چاہئے۔ مطبع جوائب نے ۱۳۱۵ھ
میں یہ مقام قسطنطنیہ اسے شائع کیا۔ پھر ۱۳۲۶ھ میں میرے اہتمام سے مصر سے
شائع ہوئی۔

۴۰) رسالہ فی بیان مذاہب الشیعہ ۱۔ دیکھو نمبر ۲۶

۴۱) کتاب تحصیل الاموال

۴۲) کتاب التریج والتدویر ۱۔ یہ بھی نہایت عجیب و غریب کتاب ہے۔ اپنے ایک کرمفر احمد
بن عبدالوہاب کی بد صورتی کا جواب دیا ہے اور ثابت کیا ہے وہ نہایت حسین و جمیل
تھے۔ اسی طرح کے ادبی بحث سے خرافات و اساطیر میں یکن عبارت کی کششگی
اور معانی و معانی کی وقت نظر بہت زیادہ داخل ہے ۱۹۰۰ھ میں بمقام لندن
رسالہ ”مناقب الترمذی“ در سالہ ”فخر السودان علی البیان“ کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔
۴۳) کتاب تصویب علی فی حکیم الحکیم ۱۔ یہ کتاب اب ناپید ہے۔ صرف ایک کمرہ ہاری ہاتھ
لگا ہے جس میں حضرت علی کے قبول حکیم کا ذکر ہے۔

۴۴) کتاب التفتاح

۴۵) کتاب تفضیل منادۃ الکلام: مسعودی کہتا ہے کہ ”ہاشمیہ“ کے نام سے بھی یہ رسالہ
مشہور ہے۔

۴۶) رسالہ فی تفضیل النطق علی اصمت ۱۔ ۱۳۲۵ھ میں بمقام مصر طبع ہو چکا ہے۔

۴۷) کتاب الشکر والاعتبار

۴۸) کتاب التمثیل

۴۹) کتاب جمہور الملوک

۵۰) کتاب المجاہات

۵۱) کتاب جوابات کتاب المعرفہ

۵۲) کتاب الجوارى

۵۳) رسالۃ الحاسد والمسود :- ۱۳۲۳ھ میں بہ مقام مصر طبع ہو چکا ہے

۵۴) کتاب مافوت عطار

۵۵) کتاب المجاہات :- قاضی شہاب الدین خفاجی نے اپنی کتاب ”طراز الجلاس“ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۵۶) کتاب الحجۃ فی تثبیت النبوة

۵۷) کتاب الحجۃ والنبوة

۵۸) کتاب الخرم والحرم

۵۹) کتاب حکایۃ قول اصناف الزیدیہ

۶۰) رسالۃ الحللہ

۶۱) کتاب جیل اللصوص :- ابو منصور بغدادی نے اپنی کتاب ”الفرق بین الفرق“ میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جاحظ نے اپنی اس مہل کتاب کے ذریعہ سے چوری کی تعلیم دی ہے۔ ظاہر ہے یہ اس کے ایک دشمن کا قول ہے۔ اگر کتاب ہمارے پاس موجود ہوتی تو صدق و کذب کا پتہ چلانا آسان تھا۔

۶۲) کتاب جیل المکدین :- ابو منصور بغدادی نے اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

۶۳) کتاب المیوان :- جاحظ نے یہ کتاب محمد بن عبد اللہ الزیات کو بھیجی تو اس نے اس پر پانچ ہزار دینار مرحمت فرمائے۔ جاحظ کی نہایت بہترین کتابوں میں سے ہے۔

ابو منصور بغدادی جن کو جاحظ پر ہمت تراشیوں اور معترکہ کی عیب جوئیوں میں کمال حاصل ہے، یہاں بھی باز نہیں آئے ہیں اور کہا ہے کہ یہ بھی ”فوشہ چینیوں کا نتیجہ“

ہے کچھ درسطو سے لیا کچھ رائی سے اور کتاب الحیوان تیار کر دی لیکن یہ دفع
مض ہے، عبد اللطیف بن ہادی کی تحفۃ اخصار کتاب الحیوان کے نام سے
اور ابن سار کی تحفۃ ارض الحیوان کے نام سے موجود ہے، اور خود کتاب الحیوان
بھی ۱۱۳۳ھ میں بہ مقام میرے جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس سے تو معاملے کے
معاذ خدا محاسن کا پایہ بلند ہی ثابت ہوتا ہے۔

۶۶۔ رسالۃ فی الخرج

۶۷۔ کتاب خصوصۃ طول والوزن۔

۶۸۔ کتاب خلق القرآن

۶۹۔ کتاب الدلالة علی ان الامامة فرض

۷۰۔ کتاب ذکر امین الزیدیۃ والرافضیۃ

۷۱۔ رسالۃ فی ذم اخلاق الکتاب، مطبع سلفیہ ۱۳۳۲ھ میں اسے شائع کیا ہے،

۷۲۔ کتاب ذم الزنا۔

۷۳۔ کتاب فی ذم البغیۃ

۷۴۔ رسالہ فی ذم الوراۃ

۷۵۔ رسالہ فی الرد علی الجہشیہ

۷۶۔ رسالہ فی الرد علی القولیہ

۷۷۔ کتاب الرد علی النصارى ۱۳۳۲ھ میں مطبع سلفیہ اسے شائع کر چکا ہے

۷۸۔ کتاب احرام النساۃ

۷۹۔ کتاب الرد علی من الحکم فی کتاب اللہ

۸۰۔ کتاب الرد علی من زعم ان الانسان جزء لا ینفجر

۸۱۔ کتاب الرد علی الفتنانیۃ

- ۸۰۔ کتاب الرد علی المشیمہ
- ۸۱۔ کتاب الرد علی یہود
- ۸۲۔ کتاب الزرع والنخل والازتیمون والاعخاب جاہل نے یہ کتاب ابراہیم بن عباس الصولی کو جو میرنشی تھا، بھیجی اس نے پانچ ہزار دینار عنایت کئے
- ۸۳۔ کتاب السلطان و اخلاق اہل
- ۸۴۔ رسالۃ اشارب و المشروب
- ۸۵۔ کتاب الغر ج و البھار
- ۸۶۔ کتاب لصناعة الکلام شاید یہ وہی کتاب سلسلہ میں ہو چکا ہے
- ۸۷۔ کتاب الصواعق
- ۸۸۔ رسالہ فی طبقات المفتین جس کا ایک ٹکڑا ۱۳۲۳ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے
- ۸۹۔ کتاب الطغیانی
- ۹۰۔ کتاب العالم و الجاہل
- ۹۱۔ کتاب العباسیہ شاید یہ کتاب وہی ہے جس کا ذکر "اسامۃ ولد العباس" کے سلسلہ میں ہو چکا ہے
- ۹۲۔ کتاب العثمانيہ میرے پاس یہ کتاب اور اس کا نقص "نقص العثمانيہ لاسکانی" موجود ہے۔ غفریب میں دونوں کو شائع کرنے والا ہوں
- ۹۳۔ کتاب العرب و العجم
- ۹۴۔ کتاب العرب و الموالی
- ۹۵۔ کتاب الوجان و البرحان
- ۹۶۔ رسالہ فی النش و الند ۱۳۲۳ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے

۹۷ رسالۃ فی الصفو والصغ

۹۸ کتاب غماہر الآداب

۹۹ کتاب بخش الصناعات۔ ابو منصور بغدادی کا خیال ہے کہ باخانی نے اس کتاب سے

تاجروں کی تجارت کو بہت نقصان پہنچایا۔

۱۰۰ رسالۃ فی فخر السودان علی البیضان ۳۳۲ھ میں شائع ہو چکا ہے

۱۰۱ کتاب فخر عبد شمس مخزوم

۱۰۲ کتاب فخر ہاشم و عبد شمس۔ میرے پاس یہ کتاب موجود ہے، عنقریب میں اسے شائع

کرنے والا ہوں

۱۰۳۔ رسالۃ فی فوط جہل الکندی ۳۴

۱۰۴ کتاب فرق بین الجن والانس

۱۰۵ کتاب فرق بین الملائکۃ والجن

۱۰۶ کتاب فرق مابین البنی والمقتنی

۱۰۷ رسالۃ فی فضل اتخاذ الکتب

۱۰۸ کتاب۔ فضل مابین الرجال والنساء

۱۰۹ کتاب فضل العلم

۱۱۰ کتاب فضل الفرس علی الہمالج

۱۱۱ کتاب فضیلتہ المقرئۃ۔ ابوالحسین خیام نے اپنی کتاب الانتصار میں اس کا ذکر کیا ہے

۱۔ ابویوسف یعقوب بن اسحاق الکندی، اسلام کا مشہور فیلسوف سلسلہ نسب لوگ کندہ تک پہنچتا ہے، وہ پہلا شخص ہے جس نے مسلمانوں میں علوم فلسفہ میں بہت فہرت حاصل کی ہے۔ حدوث عالم کے بارے میں مذہب افلاطون کا پیرو تھا مختلف علوم و فنون میں اس کی متعدد تعانیف موجود ہیں اپنی وسعت علم کے اوج و کمال حد درجہ کا تھا اور باخانی نے اس کی

- کیا عجب کہ یہ وہی کتاب ہو جس کا ذکر الاعتزال و فخلہ کے نام سے ہو چکا ہے،
 ابن اراوندی نے اس کا روئے "فتوۃ المعتزلہ" کے نام سے لکھا تھا۔
 ۱۱۲۔ کتاب فضیلت الکلام۔ یہ ان کتابوں میں ہے جو کئی ناموں سے مشہور ہیں
 ۱۱۳۔ کتاب القباب۔ ابو منصور بغدادی نے اپنی کتاب الفرق بین الفرق میں ذکر کیا ہے
 ۱۱۴۔ کتاب القحطانیہ والعدنانیہ۔
 ۱۱۵۔ کتاب القفاۃ والولایۃ
 ۱۱۶۔ رسالۃ فی العلم۔
 ۱۱۷۔ کتاب القواد۔ قاضی شہاب الدین خفاجی۔
 کا ذکر "القواد و اسباب المضاعفات" میں ہے۔
 ۱۱۸۔ رسالۃ فی القیاس ۳۲۴ھ میں مطبع سلفیہ
 ۱۱۹۔ کتاب الکبر التمن والمستیبح
 ۱۲۰۔ رسالۃ فی کتمان البسر
 ۱۲۱۔ رسالۃ فی الکرم
 ۱۲۲۔ کتاب الکلاب۔ ابو منصور نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے
 ۱۲۳۔ رسالۃ فی الکیار
 ۱۲۴۔ کتاب المناجبات فی التوحید
 ۱۲۵۔ رسالۃ فی مدح التجار و ذم عمل السلطان ۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے
 ۱۲۶۔ رسالۃ فی مدح الکتاب

تو وہ کچھوں کا امام تھا ۳۲۴ھ میں فوت پائی

لے ان تینوں چیزوں کے ذم میں بھی ایک ایک رسالہ جافطہ کے قلم سے نکل چکا ہے (مترجم)

- ۱۲۷۔ رسالہ فی مدح النبیؐ
- ۱۲۸۔ رسالہ فی مدح الوراقہ
- ۱۲۹۔ کتاب الزراۃ والحد
- ۱۳۰۔ کتاب المسائل
- ۱۳۱۔ کتاب مسائل الثمانیہ
- ۱۳۲۔ کتاب مسائل کتاب المعرفۃ
- ۱۳۳۔ کتاب القرآن
- ۱۳۴۔ کتاب المفاہک، ابو منصور نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے
- ۱۳۵۔ کتاب الحاد والمعاش
- ۱۳۶۔ کتاب المعاون
- ۱۳۷۔ کتاب معارفۃ الزیدیہ
- ۱۳۸۔ کتاب المعرفۃ
- ۱۳۹۔ کتاب الملکین
- ۱۴۰۔ کتاب المغنیین والفتاویٰ العتقۃ
- ۱۴۱۔ کتاب مغاقرۃ السودان والحمران
- ۱۴۲۔ رسالہ فی مغاقرۃ المسک والرماد، صلاح الصفدی کا قول ہے کہ یہ نہایت بدیع، رسالہ ہے
- ۱۴۳۔ کتاب الملح والطرف
- ۱۴۴۔ کتاب الملوک والامم السالفہ والباقیہ
- ۱۴۵۔ رسالہ فی مناقب اہلک وعامتہ عبدالمخلافتہ، جاحظ نے یہ رسالہ فتح بن خاقان دزیر اعظم المتوکل باللہ کے حضور میں گزارا تھا، لیڈن سے سنہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہو چکا

ہے پیر ابیہم کب موٹلی نے اپنے انبار مصباح الشرق میں اسے شائع کیا ۱۳۳۱ھ
میں مصر سے شائع ہو چکا ہے۔

۱۴۶۔ رسالۃ فی من لم یلی من الشجر عمرآ۔

۱۴۷۔ رسالۃ فی موت ابی حرب الصغار البصری۔

۱۴۸۔ رسالۃ فی المیراث۔

۱۴۹۔ کتاب التاشی والتکاشی۔

۱۵۰۔ کتاب النمر دو الشریخ۔

۱۵۱۔ کتاب الفرائی والیہودی۔

۱۵۲۔ کتاب النخل۔

۱۵۳۔ کتاب نقض الطب۔ ابو بکر رازیؒ

طرح ابن مندویہ نے بھی ایک مستقل رسالہ اس

۱۵۴۔ کتاب نواد الحسن

۱۵۵۔ کتاب النوامیس۔ ابو منصور اس کتاب کے تعلق لکھتے ہیں حیدر گروں کے جلب زر
کا ایک عمدہ رہنما ہے۔

۱۵۶۔ کتاب وجوب الامامة۔

۱۵۷۔ کتاب الوعد والوعید ۱۳۲۲ھ میں مصر سے شائع ہوئی۔

۱۵۸۔ کتاب الوکلاء۔

۱۵۹۔ رسالۃ التیمیہ۔

دوسروں کی کتابیں جان خط کے نام سے

۱۔ کتاب اللابل۔ یا قوت کا قول ہے کہ یہ کتاب بہت زمانہ سے جان خط کے نام سے منسوب

پہلی آ رہی ہے ۔

۲۔ کتاب التاج یا اخلاق الملوک۔ احمد ذکی پاشا نے ^{۱۳۳۲ھ} ۱۳۳۲ھ میں ایک طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب جاخط ہی کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جاخط اس سے بری ہے۔ اس کے قلم سے یہ کتاب ہرگز نہیں نکلی داس کے بعد مولف کتاب حسن السند دبی صاحب نے دونوں کتابوں کے مقدمے لکھے ہیں اور ہر دو کتابوں کے اسلوب بیان اور طرزاد کے مخالف اور متباہن سے ثابت کیا ہے کہ جاخط کا رنگ اس کتاب سے بالکل ظاہر نہیں ہوتا، مثالیں چونکہ عربی کی ہیں اس لئے ان کا ترجمہ یہاں بے کار نظر آیا۔ بہر حال ثابت انھوں نے بھی کیا ہے کہ یہ کتاب جاخط کی نہیں ہے، اس طویل سوازن کے بعد فاضل مولف فرماتے ہیں، کون ایسا شخص ہوگا۔ جسے عقل سلیم یا دجوان مجھ سے ذرا بھی مناسبت ہو وہ اسے باور کرے گا کہ یہ کتاب جاخط کی ہے ؟ ان دونوں کا فرق اسلوب اسی طرح نمایاں ہے، جس طرح صدق و کذب، نور و ظلمت اور حق و باطل کا فرق محتاج بیان نہیں ہو کرتا، بہر حال یہ واقعہ ہے کہ یہ کتاب جاخط کی نہیں اور جو شخص اس پر اصرار کرے، وہ جاخط کو منزلہ رفیع سے گرا نا چاہتا ہے یا پھر وہ جاخط کا قدرئ اس نہیں ہے، ہماری مستقل رائے تو یہ ہی ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے کسی آدمی نے اس کی کسی کتاب میں یہ نام دیکھ لیا اور بحث ایک مضبوطی سے تیار کر کے شائع بھی کر دیا تاکہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں (سند دبی صاحب نے لفظ کتاب نے میں شدد اور جوش خطابت سے اس دعویٰ کو پیش فرمایا ہے کم از کم اس طرح تو ان کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا، واللہ اعلم بالصواب

۳۔ کتاب تبصیر الملوک والمکائد۔ یہ کتاب بھی جہل و حماقت سے اسکی طرف منسوب کر دی گئی ہے، ہم کتاب الحنین الی الاوطان جس شخص کو جاخط کے طرز سے ذرا بھی مس ہے۔ اور جو اس کے طریقہ تالیف

و تعریف سے واقف ہے وہ جانتا ہی سمجھ سکتا ہے کہ وراقوں نے ادھر ادھر کے چند اوراق جمع کر کے اس کے نام سے مشتبہ کر دئے ہیں تاکہ رواج عام حاصل ہو جائے تعجب ہے کہ شیخ طاہر جزائری رحمۃ اللہ نے بھی دھوکا کھایا یہ کتاب حاخط ہی کی بجھے رہے۔ حالانکہ یہ بالکل کذب و افتراء ہے۔ مین انٹرنیٹ سسٹم میں شائع کی ہے۔

۵۔ کتاب البیاض والاعقاب علی الخلق والامماریہ کتاب جی حاخط کے نام سے غلط طور پر منسوب ہے۔

۶۔ کتاب سلوۃ الحریف بمنافرة الریح والحریف

مطلع تھا اسے شائع کیا تھا۔ استنبور

پڑی بغیر یہ تحقیق کئے کہ اس نسخہ کا کاتب کون ہے۔ یہ نسخہ بہت پرانی ہے۔ صرف یہ دیکھ کر کہ اس میں حاخط کا نام ہے شائع کر دینا لینی میرا یہ دعویٰ نہیں کہ حاخط کی کتاب نہیں ہے اور نہ اس کی زندگی میں اس کے نام سے یہ پہچانی گئی، مثلاً مقدمہ کے بعد دیباچہ میں اپنے مدد کو "قوم الملک" اور نظام الدین وغیرہ القاب سے یاد کیا ہے۔ اور "قوم الملک" نظام الدین "عجۃ الاسلام" نور الملک "چال السلطۃ" اور "بھاؤ الدولہ" وغیرہ جیسے القاب و خطابات عہد سلاجقہ کی پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے شعرا اور انشا پردازوں کا ذکر ہے جو چوتھی صدی ہجری کے تھے، پھر حاخط نے ان چیزوں کو کہاں اور کیسے پایا؟ لہذا ثابت ہوا کہ یہ کتاب حاخط کی نہیں ہے۔

۷۔ کتاب المحاسن والاعضاد اس کے متعلق تو بہت سے لوگ فریب میں مبتلا ہیں اور غلطی سے حاخط کی ہی کتاب سمجھ رہے ہیں، قدام میں شیخ محی الدین عربی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ حاخط بچارہ اس الزام سے قطعاً

تبرتی ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ چوتھی صدی کے دراقین میں سے کسی نے یہ کتاب تیار کی ہوگی اور دیکھا ہوگا کہ یوں تو اس کی اشاعت ہوتی نہیں باخط ہی کی طرف منسوب کر دو۔ اس طرح یہ باخط کے نام سے مشہور ہوگئی۔ سب بڑی دلیل ہے کہ میں یوں ہی اس کتاب کے وقع اسٹ پلٹ رہا تھا کہ میری نظر صفحہ ۳۸ پر پڑی تو اس میں بھی ابن المعتز کے چند شعر دکھائی دئے، مجھے حیرت ہوئی کہ باخط ابن المعتز کے اشعار کیسے روایت کر رہا ہے، حالانکہ ابن المعتز ابھی سات برس کا بھی نہ ہوا تھا۔ کہ باخط کی وفات ہو چکی تھی، شعبان ۳۵۵ھ میں ابن معزی کی ولادت ہوئی اور محرم ۳۵۵ھ میں باخط کی وفات، تو اب سوفا، عطاء، عاذا کسی طرح بھی یہ ممکن ہے کہ ایک سات برس کا بچہ اتنا بڑا شاعر بے بدل ہو جائے کہ باخط جیسا شخص اس سے روایت کرے ہاں صفحہ ۱۴ پر ایک شعر میں قرامطہ اور محاج کی جنگ سے تلیح کی گئی ہے مگر یہ واقعہ جنگ باخط کی وفات سے پورے چالیس بعد پیش آیا۔ لہذا یہ کتاب قطعاً باخط پر افترا ہے اور ابو عثمان اس سے قطعاً ناواقف ہے۔

۸ کتاب الہدایہ۔ یا قوت کا قول ہے کہ ایک زمانہ دراز سے یہ کتاب باخط سے منسوب چلی آرہی ہے۔

نوادرات باخط

باخط اپنے حالات شان اور غلت عام کے باوجود بالکل ایک خشک سا انشا پر واز نہیں

۱۵۔ ایک طرح اس کتاب کے ایک حصہ کو اسی یا معنوی سمجھا جا سکتا ہے لیکن پوری کتاب کا انکار کر دینا بہت بڑی جرات ہے (مترجم)

تاکہ وہ ایک دندہ دل شونخ طبع اور دھچپ والی آواز فغان کا مالک تھا اس کے
اس ثنائت بیان، قوت زبان اور دوسرے فعال طبع کے ساتھ لطافت و طرائف نوادر
و طرائف امد غزل لطف کے بہت سے نمونے ملتے ہیں چند ذیل ہیں۔

(۱)

محمد بن ابراہیم بغدادی ہے تھے میں بھی ان کا سہر کاب ہو گیا بہم بوں ایک عجب میں
سوار ہوئے اور اس نے مغینہ کو گھائے کا حکم دیا اس نے ستار سبلا اور گھانا خروار کیا

کل یوم تلیقہ و عتاب تیغی در سبلا

لیت شعری انا حضرت لہذا لب و زانق

پہرہ خاموش ہو گئی اب کے حکم پاکر طنبوریہ نے گانا خروار کیا

وارمنا للعا شقینا ما ان اسی ام

کم بھروں و بصرموں و قیون فیصر دنا

موجود جانے والی نے پوچھا پھر عاشق کرتے کیا ہیں؟ اس نے جواب دیا یہ کرتے ہیں
یہ کہ کے اس نے ستار پھینک دیا اس وقت علوم ہوتا تھا وہ چودھویں رات کا چاند ہے
اور فوراً اپنے تئیں سہر دریا کر دیا محمد کے پاس ایک غلام ہاتھ میں مورچل لے کھڑا تھا وہ
اس کے من و مجال کو دیکھ دیکھ کر بہوت ہو رہا تھا وہ بھی اس جگہ پر آیا دیکھا وہ پانی میں چپکے
کھا رہی ہے اس لئے یہ شعر پڑھا

انت الی عنہ تنی بعد القضا تو تعلیمنا

یہ کہ کے خود بھی دریا میں پھاند پڑا دونوں ایک دوسرے سے چٹ گئے پھر ایسے ڈوبے
کہ ابھرنے کے محمد نے جو یہ اندوہ ناک متظر دیکھا تو بہت موثر ہوا اس نے کہا جا خط کوئی ایسی
بات کر جو میرے تکین و تلی کا سبب ہو ورنہ تجھے بھی ابھی ان دونوں کے پاس پہنچائے دیتا ہوں
مجھے ایک واقعہ یاد آگیا کہ نیرید بن عبدالملک عدالت میں بیٹھا ہوا عرضیاں دیکھ دیکھ کر

نیچے کھڑا تھا، ایک درخواست کا معنون یہ تھا کہ امیر المومنین اپنی خاں لونڈی کو حکم دیں کہ وہ مجھے تین مختلف ساگ سناھے اور بس یزید بہت برہم ہوا اسی وقت اس نے حکم دیا جس نے یہ عرض دی ہو اس کا سراڑ ادا، حکم کی تعمیل ہونے ہی والی تھی کہ ایک دوسرا قاصد پہنچا کہ امیر المومنین اس مغضوب بارگاہ کو یاد فرما رہے ہیں، وہ آدمی اس کے سامنے کھڑا کیا گیا امیر المومنین نے صیافت فرمایا، اسی گستاخی کی جرأت تجھے کیسے ہوئی، اس نے جواب دیا امیر المومنین کے علم و عفو سے، یزید بن عبد الملک نے اسے بیٹھنے کا حکم دیا، یہاں تک کہ مجلس برخواست ہو گئی پھر اسی لونڈی کو بلوایا، وہ عود لے کر حاضر ہوئی، اس نوجوان نے اس سے کہا یہ شعر کاؤ

افاظم مہلا بعض ہذا التدل وان كنت قد اذمت مرمی فاعلی

اس نے اسے گایا، یزید نے نوجوان سے کہا اور؟ اس نے کہا یہ شعر کاؤ

تالی البرق بحدیما فقلت لہ یا ایہا ابرق انی عنک مشول

اس نے اسے بھی گایا، خلیفہ نے کہا ابھی اور بھی باقی ہے؟ نوجوان نے کہا جہاں پناہ مجھے

ایک رطل شراب ملگا دیکھیے، وہ حاضر کی گئی، ابھی پوسے طور سے وہ بی بی نہیں چکا تھا کہ دفعۃً وہ اپنی جگہ سے اچھلا، اور ایک بلند جگہ پر چڑھ گیا، اور وہاں سے کو دہڑا اور غم ہو گیا، خلیفہ نے کہا انا للہ وانا

الیہ راجعون، دیکھا اس احمق کو، وہ یقیناً یہ سمجھا کہ میں اس باریہ کو اس سے لے لوں گا اس لونڈی کو اس کے اہل و اقربا تک پہنچا دو اور اگر کوئی نہ ہو تو اسے بیچ کر اس کی قیمت اس نوجوان پر صدقہ کر دو

لوگ اسے پکڑ کر لے پٹے، جب وہ گھر کے وسط میں پہنچی، تو اس نے لیک تالاب دیکھا جس میں بارش کا پانی جمع ہو کر تھا، وہاں پہنچ کر اس نے لوگوں سے اپنے آپ کو پھرا دیا، اور یہ شعر

من مات عشقا طلیت کذا لاخیر فی عشق ہلا موت

پڑھ کر اپنے آپ کو اس میں ڈال دیا، اور غم ہو گئی

محمد نے یہ قطعہ سن کر خوشنودی کا انہار کیا، اور مجھے گراں بہا انعام مرحمت فرمایا

محمد بن زیات نے فصیحیٰ تو حاطہ صیادت کو حاضر ہوا اور کہا:
”خدا آپ کو صحت عطا فرمائے، آپ کی نعمتیں اسی طرح برقرار رہیں“

ابن زیات: ”اچھا تو بتاؤ تم نذر کسے کو کیا لائے ہو؟
جا حطہ میں نے سوچا کہ آپ کی خدمت میں کچھ ہدیہ پیش کروں لیکن غور کرتا ہوں تو ہر چیز خدا نے
آپ کو دے رکھی ہے میرے پاس ایک نہایت بلند مرتبہ چیز کتاب سیبویہ ہے، کسافی نے اسے لکھا ہے
اور فراہی کی میراث سے میں نے خرید لیا ہے
ابن زیات: خدا کی قسم اس سے زیادہ پسندیدہ ہدیہ کوئی اور ہو؟“

۳

جا حطہ کہتا ہے مجھ کو عمر میں کسی سے شرمندگی نہیں اٹھاتا۔
بہت غفل کیا، جن میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے دروازہ پر نہیں
آئی اور کہنے لگی ”مجھے ایک بڑی سخت ضرورت درپیش ہے“ ذرا تھوڑی دور تک میرے ساتھ چلے چلے
میں اس کے ساتھ ہولیا، ایک یہودی سار کی دکان پر جا کر کھڑی ہو گئی اور اس سے مخاطب ہو کر کہا
”ایسا ہی“ اور یہ کہ کے چلتی بنی میں نے سار سے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے، اس نے کہا کہ اس عورت نے
ایک انگوٹھی مجھ سے بنوائی، اور فرمائش کی کہ میں اس پر شیطان کی صورت نقش کر دوں میں نے کہا
میں کیا جانوں شیطان کیسا ہوتا ہے؟ یہ سن کے وہ چلی گئی اور اب یہاں آکر جو کچھ اس نے کہا وہ
تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے؟

۴

ایک آدمی میرے پاس آیا اور فرمائش کی کہ اپنے دوستوں کی ایک سفارشی خط لکھ دیجئے
ضرورت ہے، میں نے ایک خط لکھا اور اس پر مہر لگا کے اس کو دیا
رقعہ لے کے جب وہ باہر پہنچا تو اس نے رقعہ کا لفظ بھاڑا اور خط پڑھ لیا، اس میں
میں نے لکھا تھا۔

یہ غافلکسکے ہیں جس نے کہا ہوا ہے کہ میں ذرا ہی نہیں پہنچتا، مگر آپس کی محبت پوری کر دیں تو میں آپ کے لئے کچھ کر سکتا ہوں گا، اور اگر اسے ناکام واپس کر دیجئے تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

وہ آدمی فوراً میرے پاس واپس آیا، میں نے کہا شاید تم نے میرا خط پڑھ لیا، اس نے کہا جی ہاں:

میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تمہیں گزند نہیں پہنچ سکتا، میں نے اپنی یہ علامت مقرر کر لی ہے کہ جب میں کسی کی سفارش کرتا ہوں تو ایسے ہی الفاظ لکھتا ہوں۔ اس نے کہا۔ خدا تجھ پر رحمت کرے، تیرے ہاتھ پاؤں بیکار کرے، میں۔ یہ کیا؟

اس نے جواب دیا۔ یہ میری علامت ہے جب میں کسی شخص کا شکریہ ادا کرتا ہوں، تو ایسے ہی الفاظ استعمال کرتا ہوں۔

۵

میں اپنے ایک دوست کے ہاں گیا، دروازہ کھٹکھٹایا، تو ایک سنبھلی لونڈی نکلی، میں اپنے آگے کہہ دو باخدا دروازہ پر کھڑا ہے۔ لونڈی، کہہ دوں جاہد مجھ کو ملنے والا، دروازہ پر کھڑا ہے؟ میں۔ نہیں۔ اس سے کہہ دو حتی دروازہ پر حاضر ہے، لونڈی کہہ دوں مطلق دروازہ پر ہے؟ میں۔ بس بھرا پیا، کچھ نہ کہو..... یہ کہ کے میں واپس ہو گیا،

۶

میرے پاس بعض لوگ آئے، اور کہا، کہ تمہارے پاس ایک ہزار ایسے جوابات ہیں جو دوسروں کو خاموش کر دیتے ہیں، کچھ ہیں بھی سکھاؤ گے؟ میں نے کہا، "مردنہ ایکسٹے کہا"

اگر کوئی شخص کسی نامعلوم اور کردہ الفاظ میں مخاطب کرے تو کیا جواب دیا جائے؟ میں نے کہا
جو کچھ وہ برا بھلا کہے تم صرف یہ کہو: بھارشاؤ

۷

علی بن عبیدہ ریحانی بیار پڑے تو میں ان کی عیادت کو گیا، میں نے ان سے پوچھا: کس چیز
کو جی جاتا ہے؟ ابو الحسن؛
انہوں نے کہا: ”رقیبوں کی آنکھیں، چلو رکی زبان، اور صد کرتے اونوں کو بھڑکتا ہیں۔“

۸

تین مرتبہ ایسا اتفاق پیش آیا کہ میں کینت ہو
کہ بجائی میری کینت کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ابو عثمان

اقوال جا خط

جا خط کے جن اقوال بدیع نے شہرت عام، اور ضرب الافعال کی حیثیت اختیار کر لی ہے
وہ لوگوں کی زبانوں پر ہے، ہم آج اس محبت میں اس کے بعض اقوال سے آپ کو روشناس
کرانا چاہتے ہیں، جو کسی نہ کسی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔

۱

آدمی کو لازم ہے کہ سختی ہو، قصوں خرچ نہ ہو، بہادر ہو لیکن سریع الغضب نہ ہو، شجاع
ہو، لیکن بزدل نہ ہو، گفتگو خوب کرتا ہو لیکن عامیہ نہ باتوں سے پرہیز کرتا ہو، خاموش ہو لیکن
گوشتا نہ ہو، حلیم اور ہمدرد ہو، لیکن دولت نہ قبول کرتا ہو، لوگوں کی مدد سے ذریعہ نہ کرتا ہو لیکن
ظلم بھی نہ کرتا ہو، باوقار ہو لیکن اجتماعاً نہ طور سے نہیں، حاکم ہو لیکن غصہ میں نہ آجاتا ہو،

۲

ہر عشق کو محبت کہہ سکتے ہیں، لیکن ہر محبت کو عشق نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ عشق محبت سے

اگ ایک متعل چیز ہے، جس طرح فضول خرچی اور سخاوت ایک نہیں، یا بخل و میانہ روی میں جو فرق ہے، یا بزدل اور جواں مرد میں جو تفریق ہے، بلکہ قصہ آجانے والے آدمی اور بخل میں جس طرح تفریق ہے اسی طرح یہ بھی الگ چیز ہے،

۳

یہ چیزیں ان آدمیوں میں مزدور پائی ہیں، گونگے میں ہلکاپن، لاجے آدمی میں غصہ کی سرعت، پتہ قدمیں غور، میانہ قد آدمی میں شرافت، احوال میں روشنی علم، افرس میں ذکاوت، اندھوں میں قوت حافظہ، عورتیں ثقالت، زباں، لنگڑے میں مسرت،

۴

ماخط کا قول ہے، جس نے اپنے ماں کی حفاظت کر لی، اس نے دو بزرگ چیزوں کو بچا لیا، ایک تو مذہب کو دوسرے آبرو کو

ماخط کی شاعری

نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت نو اورات زمانہ ہے، اور اگر یہ دونوں وصف کسی شخص میں جمع بھی ہوتے ہیں تو پہلہ برابر نہیں رہتا، نظم و لکشی ہوگی تو نثر رو کمی سوکھی، اور اگر نثر کا پہلہ جاری رہا تو نظم بس یوں ہی رہتی ہے، ظاہر ہے ماخط نے نثر میں بالخصوص کمال حاصل کیا تھا اپنے اسلوب حاضرہ سے وہ ماہر تھا اور کوئی اس تک نہیں پہنچ سکا۔ لیکن! ایں ہمہ وہ نثر شاعری کے میدان میں بالکل متبدی نہیں ہے بلکہ اچھا خاصہ ہے،

۱

راویوں کا بیان ہے کہ اس نے ایک قیعدہ ابوالفرج نجاج بن سلمہ کی تعریف میں لکھا اور اس میں اپنے ماہانہ کے کھول دینے کی درخواست کی تھی تو قیعدہ تو اب نایاب ہے ہاں چند اشعار باقی ہیں جن کا نمونہ یہ ہے،

اقام بہراہ الخفض راضی بخفضہ و ذوالعزم یسری حیث الامدیہ
یفین الرضا ثیبا سیرا مہونا و دون الرضا کاس امر من البعیر
سوار علی الایام صاحب حنکہ و آخر کلب لایریش و لا یری

۲

علم اور علماء کے فضائل و مناقب میں کتاب ہے۔
یلیب العیش ان تفتی حکیمان غدار العلم و انہم المصیب
فیکشف عنک جرۃ کل جہل و ففسر
شقام الحرم میں نہ شفا

بہجو

بعض شعراء نے جاخط کی جو بھی کی ہے، لیکن یہ شعراء پست درجہ کے ہیں، شعراء میں جو
لوگ صاحب اثر و اقتدار تھے وہ جاخط کی منزلت سے واقف تھے ان کی تو یہ تمنا رہتی تھی کہ جاخط
اپنی کسی کتاب میں ان کا ذکر کرے، خواہ وہ برسبیل تنقید یا بصورتِ ظرافت ہی کیوں نہ ہو، اس
نئے کردہ سمجھتے تھے کہ جاخط کا ذکر کر دینا شہرت و دو عالم کا ضامن ہے۔

۱

ایک بچہ جو منزل کا بہت بڑا دشمن تھا کہتا ہے،
لو یخ انخنزیر سنا ثانیہ اکاں الادوں منبج الجاخط
یعنی اگر سور کی صورت موجود صورت سے بھی زیادہ مسخ کر دی جائے جب بھی جاخط کا سنا ہو
کیا کر سکے گی۔

(اس نا خوشگوار عنوان کی زیادہ مثالیں غیر ضروری سمجھ کھنڈ کر دی گئیں)

(مترجم)

بیماری اور وفات

متوکل علی اللہ کے عہد میں جاحظ کی بیماری کا آغاز ہوتا ہے، اپنی طالت کے سانسے ملانے میں مصیبت و کمالت کا کام اس نے برابر جاری رکھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کس قدر متوند اور مضبوط جسم کا ایک تھا، ۳۲ء سے ۳۵ء تک پوسے آخر سال وہ فاجح جیسے نامراد مرض میں مبتلا رہا، لیکن اپنے کسی کام سے غافل نہیں ہوا، اب حالات سنئے،

۱

ابن بطان طبیب کے خط سے ابن ابی امیہ نقل کرتے ہیں کہ جاحظ اور یوحنا بن اسویہ ابن بطان کے قول کے مطابق اسمیل بن میل کے ہاں ایک دسترخوان پر بیٹھے، امیہ نزدیک محوِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ دعوت ابن ابی داؤد کے ہاں تھی نہ کہ اسمیل بن میل کے ہاں، بہر حال تاؤ دسترخوان پر چاہاں اور لذتِ لذت کھانے لائے گئے، دودھ دہی بھی آیا، لیکن مچھلی کے ساتھ یوحنا نے دونوں کے استعمال سے منع کیا اس لئے کہ نقصان کا اندیشہ تھا جاحظ نے کہا خوب یا تو مچھلی اور دودھ ملنا، ایک دوسرے کے متضاد ہیں، اگر ایسا ہے تو علاج بالصد تو خوب ہوتا ہی ہے، اور اگر مضرت نہیں ہے ایک چپ، تو گو یا ایک ہی چیز کھانی ہر گز کیا ہوا؟ یوحنا نے کہا میں بحثِ سائنس کا تو مادی نہیں ہوں، کل دیکھ لینا کیا ہوتا ہے؟ جاحظ نے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے خوب ہی خوب کھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ کدات کو فاجح کا جب حملہ ہوا تو کہنے لگا، خدا کی قسم یہ قیاسِ حال کا نتیجہ ہے، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟

۲

ابو ساد عبدان النخوی کہتے ہیں کہ ہم جاحظ کی عیادت کو گئے، وہ فاجح میں مبتلا تھا، ہم مجلس میں بیٹھے ہی تھے کہ متوکل باللہ کا ایک قاصد آیا، پھر جاحظ باری طرف متوجہ ہوا اور کہا: اس شخص کے بارے میں حکم کیا کہتے ہو، جس کے دو پہلو ہیں ایک کی یہ حالت ہے کہ اگر آردہ سے چیر ڈالا جائے تو بھی ذرا احساس نہ ہو، اور دوسرے کا یہ حال ہے کہ اگر کبھی بھی بیٹھ جاتی ہے تو دردِ دوالم

کی انتہا نہیں رہتی۔

۳

دائے نصف حصہ بدن کا یہ حال تھا کہ شدت حرارت کی وجہ سے اس پر منڈل اور
کا فور کی مالش کی جاتی تھی اور دوسرے نصف حصہ کی یہ کیفیت تھی کہ اگر قہمی سے کاٹ دیا جائے
جب بھی کچھا اثر نہ ہو۔

۴

ابو العباس مبرد کہتے ہیں کہ میں جامعہ کی عیادت کو گیا اور میرے ساتھ
دو ف سے مخلوج ہوں اگر قہمی سے تراش دو تو مجھ پر اثر نہ ہو۔
کبھی بھی اڑ کر بیٹھ جائے تو درد کرب کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔

۵

ابو طاهر کہتے ہیں میں جامعہ کے ہاں گیا میرے ساتھ فقہوں کی ایک جماعت تھی جامعہ
اپنی آخر عمر کو پہنچ چکا تھا، ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا، مگر کوئی جواب نہیں ملا، سامنے روشن دان
سے اس نے جھانکا اور کہا میں بہت زیادہ بوٹھا ہو گیا۔ نصف وقاحت کا دور دورہ ہے تم
لوگ اب مجھ سے کیا کر گے؟ میرا دوا علی اور زہی سلام قبول کرؤ، نے بھی سلام کیا، اور واپس چلے
آئے۔

۶

جامعہ کا جب انتقال ہوا اور خبر وفات قعر خلافت میں پہنچی تو خلیفہ معتز بالله نے
مدد جریج و تاسف کا اظہار کیا، اور یزید بن مہلبی سے پوچھا اے ابو یزید کیا جامعہ کی خبر وفات
آئی ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں! خدا امیر المؤمنین کو ہمیشہ سلامت رکھے، ابو شراہ القیس نے بہت
مدد ناک مرثیہ لکھا، اور اس طرح بالآخر تاریخ اسلام کا وہ زبردست رکن ختم ہو گیا۔

ہمیشہ لہے نام اللہ کا!

جاخط کے خصائص و کمیزات

ظہور جاخط سے پیشتر ہاں موم لوگوں کا فضل و کمال کسی ایک فن تک محدود رہا تھا لیکن جاخط کا رنگ سب سے الگ ہے، وہ ادیب بھی ہے شاعر بھی ہے، متکلم بھی ہے، فلسفی بھی ہے، منطقی بھی ہے۔ غرض کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں جاخط پایہ اہتمام نہ رکھا ہو، تحقیق علم و تجارب تقریبات کے لئے اس نے دور و دراز کی مسافتیں کیں، تکلیفیں اٹھائیں، اور ہر قسم کے آفات و مصائب سے دوچار ہوا، وہ پہلا شخص ہے جس نے تقلید اعلیٰ سے گلو خلاصی حاصل کی، اور رائے عامہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے معتقدات و خیالات علی الاعلان ظاہر کئے، اس کے بڑی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس کی جو کتاب بھی اٹھا کر دیکھئے ہر ہر سطر سے اس کی شخصیت اپنی غیر معمولی ملاوت اور شیریں بیانی، وقت نظر و وسعت علم کا پرتو آپ پر ڈالے گی، اسے خود بھی اپنی عظمت و جبرگی کا احساس تھا، اس لئے اس میں "انانیت" بھی کافی تھی، وہ اپنا جیسا بجا طور پر کسی کو نہیں سمجھتا تھا اور اپنا ہم پایہ اور متحق عزت و تنظیم بھی اس کی نظروں میں کوئی نہیں تھا، یہ تو اس کے خصائص و کمیزات پر ایک سرسری اظہار خیال ہے، ورنہ

سفینہ جاہئے اس بحر سبکراں کے لئے!

مکالمہ ارواح

۲

رسالہ جامعہ نمبر ۲ جلد ۱۸، ماہ فروری ۱۹۷۷ء میں مکار ارواح پر نیل زید ان صاحبہ
کا ایک مقالہ اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ جس میں وعدہ کیا تھا کہ اگر موت
ہو تو دوسری قسط بھی شائع کی جائے گی۔ چنانچہ اسلئے
دوسری قسط حسب وعدہ شائع فرمائی ہے۔ ناظرین
پیش ہے۔

فائل۔

(ترجمہ)

یہ موضوع ان لوگوں کے لئے جو مکالمہ ارواح پر یقین کرتے اور ان لوگوں کے لئے جو صحیح
ہنیں خیال کرتے برابر دلچسپ ہے اس موضوع پر جو مضامین لکھے جا رہے ہیں کم سے کم انہوں نے افکار
واذہان انسانی کے لئے غور و فکر کا ایک جدید دروازہ کھول دیا ہے اور ہر شخص کو حق ہے کہ وہ
اپنے نقطہ خیال کے ماتحت اس میں غور کرے اس کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے دلائل فراہم کر کے ایک
مفید نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس موضوع پر جو مضامین ہیں
ان سے یہ قطعی ثابت ہو گیا ہے کہ ہمارا علم روح انسانی کے متعلق ہمارے جہل کے مقابلہ میں بہت
ہی کم ہے۔

ناظرین نے سابقہ مضمون میں وہ نمونہ مکالمہ ملاحظہ کیا ہو گا جو میرے اور میرے والد
مروم کی روح کے درمیان ہوا تھا۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے والد مروم کی روح
کا لفظ استعمال کیا ہے مگر یہ کہ مروم کی روح نہیں اپنے پورے یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ

والد مرحوم کی روح تھی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ نہ تھی۔ ابھی تک یہ ساطح
یقینات کے حد میں نہیں ہے۔

وجہ یہ ہے کہ جو کچھ اب تک کے معلومات ہیں وہ قطرہ ابد دریا کی نسبت سے ہے جب
جہل کی یہ کیفیت ہو تو یقین کے ساتھ کیے کہا جاسکتا ہے تاہم یہ مزید ہے کہ علماء کے لئے غور و فکر
کے وسیع میدان اس موضوع پر پیش کر دئے گئے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس کے موافق مخالف
دلائل ظاہر کریں اور ایک نتیجہ پر پہنچیں مگر یہ کہ انسانیت کی سب سے اعلیٰ خدمت یہ ہی ہو۔

میں یہ کہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو گفتگو میرے اور میرے والد صاحب مرحوم کے درمیان
ہوئی تھی۔ اس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ سوائے میرے والد مرحوم کے اور کوئی دوسرا نہیں
کر سکتا تھا اور معنی معنی اشارات تو موصوف نے ایسے فرمائے تھے جن کو حاضرین جلسہ میں سے کوئی
نہیں جانتا تھا میں نے جب ان کی تحقیقات کی تو وہ بالکل صحیح ثابت ہوئے آج میں اس گفتگو
کا خلاصہ پیش کروں گا جو میرے اور میرے سب سے بڑے شفیق دوست جبران خلیل جبران صاحب
کی روح کے درمیان ہوئی۔ مرحوم ملک لبنان (دشام) کے بہت مشہور صاحب قلم تھے گزشتہ سال
سوم بہار میں دانع مفارقت دے گئے۔ میں نے اپنے ان عزیز دوست کی روح سے مشرف کالمہ
حاصل کیا۔ مجھے مرحوم کی دوستی پر ہمیشہ غرور رہا ہے۔ میں ان کا طرز اور طریقہ استدلال خوب سمجھتا
ہوں۔ میں نے ان کی روح سے جو گفتگو کی اس میں وہی بات میں نے محسوس کی جو خود مرحوم میں تھی

اس طریقہ کے مطابق جو ہم پہلے مضمون میں بیان کر چکے ہیں درمیانی لوگوں کے توسط سے
ہم نے ایک جلسہ میں جبران خلیل جبران صاحب کی روح کو بلا یا جب میں معلوم ہو گیا کہ مطلوبہ
روح آگئی ہے۔ تو ہمارے اور روح کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ
جبران صاحب کی روح جو جواب دیتی تھی ہم نے اس کو حرف بحرف نقل کر دیا ہے

میں۔ آپ کون صاحب ہیں؟
روح جبرائیل۔ ایک ایسی روح ہے جو اپنے ذمہ دار دوست کے ساتھ سرگوشی کر رہی ہے اس
شخص کے متعلق آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ جس کی بات آپ سنتے اور خود اس کو نہیں دیکھتے ہیں کیونکہ
آپ کی رائے پر عبور نہ کیا جاسکتا ہے۔

میں اب کچھ کچھ شک میں کمی اور ایسی نسبت سے یقین میں بیٹھی ہوتی جا رہی ہوں
وہ تم کو یقین کرنا چاہیے تمہاری آنکھیں بند ہیں تمہارا بھائی دینی خود وہ عالم بالائے
تمہے گفتگو کر رہا ہے بہت عرصہ تک میں اس عالم کا تصور کرتا رہا۔ لیکن اب اس عالم کا
نہایت آرام سے ہوں۔

میں شاید آپ کو اس عالم میں کامل سکون دے گا
وہ کامیابی۔ بھائی یہ وہ لفظ ہے جس کا مفہوم سوا

میں کیا آپ کوئی پیغام دیں گے؟
وہ میں چند پیغام بھیجوں گا۔ میں نے تمہارے ہاتھ سے ایک مضمون تو لکھا دیا ہے یہ
اشارہ اس مضمون کی طرف تھا جو سالہ کل شنی کی نمبر ۱۲۳ میں زیر عنوان صورت من
عالم الاسرار عالم ارواح سے ایک آواز شائع ہوا ہے جس میں جبرائیل کی گفتگو
درج ہے۔ چند روز ہوئے میں ایک اور پیغام بھی ارسال کیا ہے۔

دیکھ اور طلبہ میں جہاں میں موجود نہ تھا مرحوم نے یہ پیغام جس کا اشارہ ہے لکھا یا
تھا۔ اور حاضرین جلسہ میں سے ایک شخص نے حرف بہ حرف نقل کر لیا تھا۔
میں چاہتا ہوں کہ وہ پیغام آپ کے سامنے پڑھوں اور آپ چاہیں تو عبارت میں مناسب
تغیر فرمائیں۔

میں نے مندرجہ ذیل مضمون سنایا۔ جب میں نے مضمون سنایا تو مجھے محسوس ہوا کہ روح
کچھ تغیر کرنا چاہتی ہے پناغیہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ عبارت ذیل سے معلوم ہوگا یہ پیغام ایک سوال کے

جواب میں گھسایا گیا تھا جو مرحوم کے خمازہ کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا۔ وہ غلٹت بزرگی اور شہرت
تین دیوتا ہیں جو کل تک تائید کی میں اور اس پردے کے نیچے ستور تھے جو لاشی اور کل شی کے درمیان
فصل کرتا ہے جب یہ پردہ اٹھا تو یہ دیوتا عالم وجود کے سامنے ایک ایسے شخص کی یادگار قائم کرتے
ہوئے نظر آئے۔ جو کل تک تو کچھ نہ تھا اور آج موت کے بعد سب کچھ بن گیا۔

موت! آہ موت! تاریکی سے نور کی جانب صرف ایک قدم کے دروے نے ترمیم کی!
قدم میں نے میرے لئے غیر فانی زندگی ہیرا کر دی جس کا میں متظر رہتا تھا۔ مگر نہ اسے دیکھ سکتا تھا
نہ محسوس کر سکتا تھا اور نہ حقیقت میں سمجھ ہی سکتا تھا۔ اب میں نے اسے اس طرح چھوا جس طرح
کسی چیز کو ہاتھ سے چھوتے ہیں میں اس سے فائز المرام ہوا اور کامیاب و غیر فانی بن گیا۔ تم موت
سے کیوں خوف زدہ ہو اور کیوں ڈرتے ہو۔ تم مرنے والے کے وارث کس طرح بن جاتے ہو حالانکہ
وہ تو بقید حیات ہے کیا تم نے میرا وہ مرثیہ پڑھا ہے جو میں نے زندان کے لئے کہا ہے۔
روح نے کہا۔ تم کو معلوم ہے میں نے یہ سوال کیوں کیا۔

میں نہیں۔

وہ جب لوگ مجھے بڑا آدمی سمجھتے ہیں جیسا کہ وہ تھامے والد مرحوم زیدان کو سمجھتے تھے
تو ان کو چاہئے کہ وہ میرے اس قول کی پیروی کریں جو میں نے زیدان مرحوم کی نسبت کہا تھا۔
یقیناً بڑے آدمی سے فائدے حاصل کئے جاتے ہیں اسے فائدہ پہنچایا نہیں جاسکتا۔ بڑے آدمی سے
میرا مقصد وہ جو عوام سمجھتے ہیں۔

میں مجھے جناب سے جو شرف تکلم حاصل ہے اس کو میں اپنی بڑی کامیابی سمجھتا ہوں
وہ تم دین کے باشندے فطرت کامیابی کو نہیں جانتے حقیقت میں کامیابی اس عالم میں ہے
میرا نفس اس ابدی زندگی کے لئے کس قدر مشتاق تھا میں نے کتنی سوچنے تصور میں اس کی تصویر
کھینچی۔ اب میں نے اس چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جس کے لئے میرا نفس تڑپتا تھا میں اپنے
مشاہدات کی خوبی الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

- میں۔ کیا آپ کسی کے نام کوئی اور پیغام پہنچانا چاہتے ہیں؟
- وہ۔ میری بہن مرزا کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ وہ اس قدر رنج نہ کرے کیونکہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جن پر رنج کیا جائے۔
- میں۔ جناب کو میں یاد دلاتا ہوں کہ آپ نے مجھے صبر تشریف لانے کا۔ مدد فرمائی خاں آپ کے شریف نہ لانے کا کیا باعث ہو۔
- وہ۔ مجھے وقت نہیں ملا لیکن کچھ پروا نہیں اب تم جہاں۔
- میں۔ کیا آپ کی مرضی ہے کہ میں آپ کو آپ کا پیغام پہنچاؤں؟
- امتحان کی غرض سے کیا تھا کیونکہ مجھے مرحوم کے اور اس کا دل تھا۔
- وہ۔ اس سے کہ دنیا کہ جبران نے جو کچھ پیشین گوئی کی تھی وہ پوری ہو چکی اور کچھ اس نے عالم خیال میں دیکھا تھا اُسے اپنے حواس ظاہری سے محسوس کر لیا۔ تم غلو کے نغمہ گاتی۔ ہو اور میرے نتائج فکر کا مطالعہ کرتی رہو تاکہ ہماری رومی اس عالم میں بھی اسی طرح متحد رہیں جس طرح عالم مادی میں ہمارے اذکار یکساں تھے۔ (یہاں پر یہ محسوس ہوا کہ روح نے پھر عبارت میں کچھ تفسیر کیا)۔
- میں۔ کیا آپ ان لوگوں کو کچھ نصیحت فرمانا چاہتے ہیں جو اپنی زندگی میں کامیابی چاہیں۔
- وہ۔ ان کا مقصد حیات صداقت اور عزم راسخ ہونا چاہئے۔ یہ اس شخص کی رائے ہے جس نے تمہاری مادی دنیا کو خوب آزمایا ہے۔
- میں۔ آپ نے شرکاء وجود زیادہ پایا یا خیر کا۔
- وہ۔ برادر من! شرک بہت زیادہ ہے بلکہ اکثر شرک خیر کے پردہ میں چھپا ہوا ہے۔
- میں۔ شرکے وجود میں کیا ممکن ہو؟
- وہ۔ غالباً اکبر نے انسان کو عقل کامل عطا فرما کر اپنے اعمال و افعال میں باطل آزاد کر دیا ہے۔

اس کو اختیار ہے کہ برائی اور بھلائی سے جو راستہ چاہے پسند کر کے عمل پیرا ہو۔
 میں لیکن یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ اکثر لوگوں میں نیکی کرنے کا خیال ہی بہت کم ہوتا ہے۔
 وہ میں نے پہلے آپ سے کہا تھا کہ سُستکان نہیں بہت کم نیکی کی راہ پر گام زن نظر آتے ہیں
 غیر اختیاری طور پر کسی راستہ پر ڈال دئے جاتے ہیں۔ غالباً روح شریرہ (شیطان)، انہیں برائی
 کے راستہ پر ڈال دیتی ہے روح شریرہ جب تجربہ ثبات نہیں کسی برائی کی طرف دیکھتی ہے اور
 تم مدافعت نہیں کرتے جس کا تم کو کامل اختیار ہے تو گویا تم شرکار راستہ خود اختیار کر لیتے ہو۔
 میں لیکن قلم لوگ عقلمند فہم میں برابر نہیں ہوتے۔

وہ بے شک لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جرم سے بری ہو جائیں
 میں کیا جناب حیات جاوید پر کوئی مضمون ہمارے لئے تحریر فرمائیں گے۔

وہ کچھ دیر بعد حیات جاوید یہ الفاظ ایک نمائندہ سے تحریروں اور تقریروں میں مستعمل ہیں
 ہیں لیکن اس کے حقیقی راز کو بہت کم سمجھا گیا عام عقل انسانی اور افکار بشری اس کے تصور و
 تخیل سے ابھی غروم ہے۔ ان کے تصور میں اس کا مفہوم نہیں آسکتا مگر تھوڑی غور و فکر سے وہ یہ تصور
 معلوم کر سکتے ہیں کہ اس چند روزہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی جس کا نام ہم نے حیات جاوید رکھا
 ہے شروع ہونے والی ہے

(اس جگہ پسینہ گر گنگو ختم ہو گئی)

لبنان کے قیام میں میں نے والد مرحوم اور جبران خلیل، جبران کی روح سے جو گنگو کی
 وہ مفصل بیان کر دی گئی لیکن ان کے علاوہ بھی میں نے بعض ادواح کو طلب کیا مثلاً ڈاکٹر
 یعقوب حروف سابق ایڈیٹر رسالہ "التقطف" سعد زعول پاشا مشہور مصری لیڈر اور نقولا
 توامیک بیئرڈیہ صاحب میرے خسر تھے، ان کے علاوہ اور لوگ بھی تھے جن کی رگوں کو ہا کر
 میں نے گنگو کی لیکن میں ان گنگوؤں کو ناظرین کے سامنے پیش کرنا مزوری نہیں خیال کرتا کیونکہ
 اس گنگو کا زیادہ حصہ جو ہمارے اور رگوں کے درمیان میں ہوا پرائیویٹ اور ذاتی معاملات

کے متعلق خاص سے ناظرین کو کوئی دیکھی نہیں ہو سکتی یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ سب سے پہلے
پانچامرحوم نے ہدایت کی تھی کہ میں اپنے رسالہ میں اس معنوں کو ضرور جلد شائع کروں یہ گھنگو
لبان سے روانہ ہونے کے ایک روز پہلے ہوئی تھی۔ اس نے میں اس کی یادداشت جلد مرتب نہ
کر سکا۔ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ڈاکٹر یقوب حروف ڈیڑھ المقتطف اپنی زندگی میں مکالمات شائع
ذخیرہ کے امکان کے قائل نہ تھے اور المقتطف میں اس موضوع کے خلاف ان کے مضامین شائع
ہو چکے ہیں جب ان کی روح آئی تو باہمی تعارف کے بعد سب ذیل گھنگو ہوئی۔

۵۹۔ تمہارے والد مرحوم کس قدر خوش نصیب ہیں کہ انہوں نے تمہارے ذریعے سے اس موضوع
کے اکتشاف میں بڑی کامیابی حاصل کی ہم سب خوش قسمت ہیں۔
غور و فکر کر کے گہری نظر ڈالتا مگر میں ان لوگوں میں تھا جو اس خیال
ذرائع موجود نہ تھے جو آج تمہارے پاس موجود ہیں۔

میں غالباً جناب روحوں کے متعلق معلومات کی اشاعت میں آپ کی مدد فرماتا ہوں۔
۶۰ ضرور ضرور

میں کیا آپ اپنی بیٹی کے نام کو کوئی پیغام ارسال فرمائیں گے؟
۶۱ بہت بہت سلام کہہ دیجئے اور یہ پیغام پہنچا دیجئے کہ فواد کا بہت بہت خیال رکھیں استاد
فواد مصروف ایڈیٹر المقتطف سے مراد تھی (غریب انیس دانیں استاد فواد کے حقیقی بھائی تھے اور
یورپ سے ان کے انتقال کی خبر آئی)۔

میں کیا آپ کو ان کے انتقال کی اطلاع ہے۔
۶۲ ہاں مجھے معلوم ہے لیکن ابھی تک وہ نہا میں دھچکے معنوں میں والد صاحب مرحوم کی
روح جو مکالمہ درج ہے اس میں یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ روح جسم سے جدا ہو کر کچھ عرصہ تک تنہا
رہتی ہے۔

میں پھر آپ کو ان کے انتقال کا حال کیسے معلوم ہوا؟

۵۹۔ میں نے روئے سوئے لوگوں کو دیکھا
میں مجھے خباب سے توقع ہے کہ عالم ارواح طاقات لکھنے اور ان امور کی اشاعت
میں آپ میری مدد کریں گے۔

۶۰ ہم ذمّت میں سب سے پہلے تمہاری مدد کے لئے حاضر ہیں اور ہم سب تمہاری مدد کریں گے
اور تمہارے مضامین کی اشاعت کی آرزو رکھتے ہیں۔

میں کیا آپ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیں گے جسے میں وہاں استعمال کر سکوں کیونکہ میں
مصر کی دواہیاء پر بھی خباب سے طاقات و گنگو کی آرزو رکھتا ہوں۔

۶۱ یہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے۔ اگر تم کو درمیان فی لوگ اس غرض کے لئے دستیاب ہو گئے
تو ہم سب سے پہلے تمہاری طاقات کے لئے تیار ہوں گے۔

جب میں ایک مرتبہ جلد مکالمہ ارواح میں جانے لگا تو مجھے نقولاً بک مروج کی ایک صاحبزادی
نے فرمائش کی کہ میں ان کی روح کو بلاؤں اور ان سے سوال کروں کہ کیا وہ نقولاً بک اور ان کی
صاحبزادی پر جب کہ وہ موتی بہرہ سے اٹھنے کے بعد نقاہت کی حالت میں تھیں ظاہر ہوئے تھے کیونکہ
ایسے ایسا خیال ہو اگر مروج کی روح ان پر ظاہر ہوئی اور اس روح نے ان سے گنگو بس کی۔
جب میں طلب میں پہنچا تو میں نے نقولاً بک مروج کی روح کو طلب کیا اس وقت مجھے یہ خیال
نہ تھا کہ میں ان واقعات کا سوال کروں جو ان کی بیٹی نے مجھ سے کہا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ سخت
بیاری اعصاب پر اثر کرتی ہے اور انسان جلد فریب میں آکر اس دہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ کچھ
دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتا۔

جب میں اور نقولاً بک مروج کی روح گنگو کر رہے تھے تو دوران گنگو میں ہمارے
افراد خاندان کے متعلق تذکرہ آیا۔ جب ان صاحبزادی کا ذکر آیا میں نے متعلق میں پہلے اشارہ

کھڑے تھے اور ان کا نام سنہد ہے تو مرحوم نے بے ساختہ یہ الفاظ کہے کہ میں نے اس کو اول کے
بہائی کو بلایا تھا لیکن ان میں سے کوئی نہیں آیا میں نے اس سے دریافت بھی کیا تھا کہ کیا وہ
آئے گا۔ تو اس نے سننے سے بھی انکار کر دیا۔

میں آپ نے سنہد کو کیوں طلب کیا تھا۔

۵۹ میں نے اس لئے اس کو بلایا تھا کہ وہ شدید مرض میں مبتلا تھی اور میں چاہتا تھا کہ میں
اس کے مرض کے متعلق مفید مشورہ دوں۔

چین اس جلسہ کے بعد سنہد سے نقولابک کی ملاقات کا ذکر

ظاہر ہو کر اسی قسم کا اشارہ کیا تھا۔

غالباً میرے مشاہدات و مکالمات نقولابک مرحوم نے یہ بیان کیا۔
چاہیے کہ نقولابک مرحوم میرے خسر تھے ہمارے خانگی معاملات میں بہت کچھ گفتگو میرے اور نقولابک
کی روح کے درمیان ہوئی۔ ایک روز میری بیوی بھی جلسہ مکالمہ ارواح میں شامل تھی اور انہوں
نے مجھ سے چاہا کہ میں ایک ایسی بات کے متعلق سوال کروں جس کا نہ مجھ سے تذکرہ کیا گیا تھا
نہ کسی دوسرے شخص سے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن شام کے وقت جب کہ میری بیوی تنہا بیٹھی ہوئی
تھی اور اس کے سامنے والد مرحوم کی قد آدم روغنی تصویر تھی اس کو ایسا معلوم ہوا کہ تصویر زندہ ہو گئی
ہے اور دروغ و طال کے آثار اس کے چہرے سے عیاں ہیں۔ مگر میری بیوی نے اس کی دونوں
آنکھوں سے آنسو گرتے ہوئے دیکھے اس کا علم مجھے اور حاضرین جلسہ میں سے کسی کو نہ تھا نقولابک کی
روح سے جب حیا فت کیا فلاں دن کیا ہوا تھا تو روح لے لے گا کہ اس نے آنکھوں سے کیا دیکھا
تھا۔ اس سے ان آنسوؤں کی طرف اشارہ تھا جو میری بیوی نے اپنے والد کی روغنی تصویر
کی آنکھوں میں دیکھے تھے۔

اس سے بھی زائد عجیب بات یہ ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ کیا آپ کوئی پیغام اپنی بیوہ کو دینا پسند فرمائیں گے

۵۹ میلانہ دیوہ کا نام، کو میرا سلام شوق پہنچا دو اسے اکثر میری تصویر دیکھنا چاہیے وہ تصویر کو اپنے کمرہ میں کیوں نہیں رکھ لیتی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حاضرین میں سے کسی کو بھی تصویر اور اس کے جانے وقوع کا علم نہ تھا۔

میلانہ اس زمانہ میں کچھ دن ہوئے موسم گرما بسر کرنے لبنان آئی ہوئی تھی جب ہم نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سفر لبنان کے وقت تصویر لا نا اپنے ساتھ بھول گئی ہے۔

یہ واقعات جو میں نے بیان کئے ہیں بہت کافی ہیں میری غرض صرف یہ ہے کہ میں اس معاملہ میں ناظرین کے سامنے کچھ نونے جو خود میں نے دیکھے ہیں پیش کر دوں ان لوگوں کو جو اس پر یقین نہیں کرتے اور ان لوگوں کو جو یقین کرتے ہیں۔ ظاہر کر دوں یہ حالات ہیں جو خود میں نے مشاہدہ کئے اور تحقیقات سے صحیح ثابت ہوئے۔

میرے نہایت بڑے دوستوں نے جو واقعات اپنے چشم دید بیان کئے ہیں ان کے ہند نہونے پیش کر کے اپنے معنوں کو ختم کر دوں گا..... یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ میں ان طلبوں میں جن کا ذکر آگے آئے گا خود حاضر نہ ہو سکا۔ اس لئے صحت واقعات کی ذمہ داری راویوں پر ہے۔

پہلا واقعہ۔ ایک جلسہ میں ایک عورت (ج) نے درمیانوں کی معرفت ایک روح کو طلب کیا اور اس سے سوال کیا کہ (ج) کا بانی جس کا گھر اس جلسہ گاہ سے قریب تھا اس وقت کیا کر رہا ہے روح نے جواب دیا کہ اس وقت اس نے گھر میں دیکھی ہے جس میں ۷ بجکر ۲۰ منٹ گئے ہیں اور اپنے ایک دوست کے ساتھ جو فلسطین سے یہاں آیا ہے تب وہ پنی رہا ہے۔ اس کے

[illegible]

تیسرا واقعہ ایک عورت نے ایک شخص مرحوم کا تیم بنا کر
خواہش کی اور کہا کہ وہ شخص میرا قدیم جاننے والا ہے جب وہ
تم اس جلسہ میں کسی کو جانتے ہو تو روح نے جواب نفی میں دیا۔ دوبارہ پھر سوال کیا روح نے پھر
جواب نفی میں دیا۔ جس وقت یہ سوال وجواب جاری تھے گھر کی کھانا پکانے والی خادمہ پانی لیکر
جلسہ میں آئی اس کو دیکھ کر روح نے اقرار کیا کہ یہ عورت اس کی والدہ ہے۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ خادمہ
نے اپنی مالکہ سے کہا تھا کہ کسی جلسہ میں اس کے مرحوم بچے کی روح کو بلایا جائے اس نے نامعلوم کر کے
اس کو بلایا اور اتفاق سے اس کی ماں کے آنے پر روح نے اس کو شناخت کیا جلسہ میں اس کا
کوئی اور شناسا نہ تھا۔

میں نے یہ واقعات ناظرین کے لئے ہساکر دیے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ عجائبات اکثر و خیر ایسے ہیں جن کی آسانی سے تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ جب یہ واقعات میرے سامنے گذر رہے تھے تو اس وقت میں اگر تھک نہیں کر رہا تھا تو کم سے کم متبسم ضرور تھا۔

واقعہ جبکہ بھی ہو بہر حال میں نے اپنا یہ مضمون ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے جس میں میں نے اپنے ذہنی اثرات اور ذاتی مشاہدات کو بیان کر دیا ہے فی الحال میں اس کی کسی توجیہ کے درپے نہیں ہوتا نہ ابھی کسی آخری فیصلہ کے قبول کرنے کے لئے تیار ہوں مکن ہے کہ یہ گفتگو حقیقت اصلی ارواح سے ہوئی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ نفس انسانی میں کوئی طاقت پوشیدہ ہو جو اس قسم کے واقعات پیش کرتے ہیں۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ اپنی ذات و تعجب میں ناظرین کو شامل کروں میں اپنی جگہ اس کی معلومات کر رہا ہوں ناظرین جن کو اس موضوع سے دلچسپی ہو امید ہے کہ وہ بھی اس کی معلومات کر کے کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل کریں گے۔ علماء اور مفکرین کو ان روحانی مباحث کی طرف توجہ کرنا چاہئے اور نیک نیتی سے وقت نظر کے ساتھ۔ اس کی تحقیقات کرنی چاہیئے ہیں جلد بازی کر کے ابھی کوئی فیصلہ کن نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے نہ ان عقائد و آراء پر بھروسہ کرنا چاہئے جو صحیح مباحث پر مبنی نہ ہوں۔

یہاں ہم فلاسفہ ملت ہو راسیو کے قول پر اپنی مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ زمین و آسمان میں لاکھوں کرداروں ایسی چیزیں ہیں کہ ہمارا فلسفہ ابھی تک ان کا قیام ہی نہیں کر سکا ہے۔

امیل زیدان

نوٹ:- جب ہمارا پہلا مضمون اس موضوع پر شائع ہوا تو ہمارے پاس کثرت سے ایسے خطوط آئے کہ اس موضوع کے متعلق مزید روشنی ڈالی جائے اور اس کے متعلق اور امور بھی جہاں تک مطوم ہو سکیں پیش کی جاویں ہم ان خطوط کا خلاصہ بیان کرنا ضروری خیال کرتے ہیں زیادہ تر جن لوگوں نے خطوط روانہ کئے ان میں ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اس طریقہ کی زیادہ تفصیل کی جائے جس کے ذریعہ وہ خود بھی ہلکا مدد غیرے ارواح کو طلب کر سکیں اور وہ خود اس طریقہ

کا تجربہ کریں سب نے اپنے خطوط میں بیان کیا کہ طریقہ مذکورہ کے مطابق عمل کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ بلا واسطہ درمیانی لوگوں کے اس معاملہ میں کامیابی ممکن نہیں اگر خدمت نے مساعدت کی تو میں اس معاملہ میں اور تجربات کے بعد مزید روشنی ڈال سکوں گا۔ بعض لوگوں نے متحرک میز کے ذریعہ سے تجربات کا ذکر کر کے اس کے متعلق میری رائے دریافت کی ہے۔ میں اس کا یہ جواب دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اس قسم کے فیصلہ کن تجربات کا موقع نہیں ملا۔

بعض علمائے سلسلہ تنقید اس کو یقین کا درجہ عطا دینے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی رائے میں بھی یہ ممکن ہے کہ یہ یقینی واقعات ہوں لیکن ابھی تک ایک گروہ ان کے برعکس رائے ذاتی رائے میں ابھی صحیح فیصلہ کا وقت نہیں آیا۔ قطعاً

ابو حمزہ سید محمد زبیر رحمتی

(بھوپال)

نقش بدیوار

ای، وی، لوکس کے قلم سے

کل شام ڈینیے (Dabney) کے مکان پر جو واقعہ پیش آیا اس کے خیال سے اس وقت بھی بن پرسنی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اطمینان ہے تو محض اتنا کہ اس واقعہ میں اور لوگ بھی میرے شریک ہیں۔ مجھے یاد ہے ہمارے درمیان فوق العادۃ واقعات کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ عنوان اگرچہ بے حد چسپ ہے لیکن حقیقتاً بالکل بے کاغذ بہر حال ہم سب نے بعض نے ایک آدھ واقعہ بیان کیا مگر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ میرے سامنے جو اجنبی صورتیں تھیں ان میں سے ایک کو تاہ قامت شخص ہی تھا جس کا چہرہ سفید تھا اور جسے رڈسن (Redson) کے واسطے (Redson's) اپنے ساتھ کھینچ لایا تھا۔ وہ ہر شخص کی بات کو بڑے غور سے سنتا مگر خود کچھ نہ کہتا تھا۔ ڈینیے (Dabney) چاہتا تھا کہ دوران گفتگو میں اس کا تعارف ہو جائے۔ اس نے اجنبی سے پوچھا: کیا آپ کو بھی کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس میں کوئی ناقابل تفرق عنصر موجود ہو یا آپ نے کوئی ایسا قصہ ہی سنا؟ ایک لمحہ تک اجنبی سوچتا رہا "خیر" اس نے کہا میں کوئی کمائی یا ہزاری گپ تو بیان نہیں کروں گا جیسا کہ آپ میں سے بعض نے کیا میری رائے میں سچی بات ہمیشہ افسانے کی نسبت زیادہ تعجب انگیز ہی نہیں بلکہ زیادہ دلچسپ بھی ہوتی ہے" میں آپ سے ایک واقعہ بیان کر سکتا ہوں جس کا تعلق میری ذات سے ہے اور جو ایک عجیب انداز میں آج ہی سر پہر کو ختم بھی ہوا ہے۔

ہم نے بڑے اشتیاق سے اس سے اپنا واقعہ بیان کرنے کی استدعا کی۔

ایک یا دو سال ہوئے اس نے کہا میں گریت آرمڈ اسٹریٹ (Ormand Street)

میں (Molbourne) کی سمت ایک پرانے مکان میں مقیم تھا جس کو وہاں

یہ سوچا کرتا تھا اس کی دیواریں کسی گزشتہ مکاندار کے ہاتھوں بعد ہی اور رنگ آمیز ہو گئی تھیں
 ونگہ مگر مطلوب تھی اس لئے دیوار پر بڑے بڑے دھبہ نمایاں ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک جیسا
 لڑکھوٹا ہے۔ بالکل انسانی چہرہ سے مشابہ نظر آتا تھا بلکہ معمول سے زیادہ موہو اور نہایت عجیب
 صبح کے وقت بستر میں پڑے پڑے روشنی اٹھ کرتے وقت خواب سے بیدار ہوتے ہوئے ہیں
 بیشہ اسے دیکھا کرتا اور بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ
 کسی دہم یا تخیل کا نتیجہ نہیں بلکہ حقیقتاً حیران کن ہے عجیب امر یہ تھا کہ جہاں دیوار کے دوسرے
 نقش بالعموم بڑھتے اور اپنی حدود بدلتے رہے وہاں اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی بلکہ
 ہلچل جوں کا توں رہا۔

”اسی زمانہ میں میں انفلوئنزا میں گرفتار ہو گیا شدید تھک گیا۔“

مارا دن سوائے اس کے کچھ اور کام ہی نہ تھا کہ پڑے جاؤں۔

اس چہرہ نے مجھ پر اور زیادہ اثر کیا اب یہ بالکل حقیقی اور ایک عجیب تھک گیا۔

اسی کامیرے خیالات پر قبضہ تھا۔ اس کی آنک میں ایک عجیب کچی آنکھی اور ماتھے کا وصال بھی
 انوکھا ہو گیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک انسان کا چہرہ تھا ہزاروں میں سے ایک انسان کا۔

”غیر میں مرض سے سنبھل گیا۔ لیکن چہرہ کا اثر اب بھی مجھ پر غالب تھا رفتہ رفتہ میرے دل
 میں یہ احساس پیدا ہوا کہ گویا میں اس میسے کسی شخص کی تجویز ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شخص حقیقتاً
 کسی نہ کسی جگہ موجود اور میں کبھی نہ کبھی اس سے ضرور ملوں گا۔ یہ محض گمان ہی نہ تھا مجھے یقین تھا
 کہ میں اور وہ کسی نہ کسی طرح آپس میں منسلک ہو چکے ہیں میں ہر شے ان مقامات پر جہاں لوگوں کی
 بے پرواہی رہتی ہے آیا جا کر آتا تھا۔ سیاسی مجالس، فنٹ بال میچ، ریلوے اسٹیشنوں پر جہاں
 شہر کے اطراف کی گاڑیاں صبح کے وقت جوق درجوق لوگوں کو شہر میں اتارتی ہیں اور شام
 کو پھر ان کو ان کی منزل مقصود پر لے جاتی ہیں۔ لیکن بے سود۔ اس سے پہلے مجھے کبھی
 یہ خیال نہیں آیا تھا کہ انسانوں کے چہرے کتنے مختلف ہوتے ہیں مگر باوجود ان اختلافات کے

ہم ان کی متعدد قسمیں قرار دے سکتے ہیں جنکو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔

پہر حال یہ تجویز میرے لئے ایک خطا سا ہو گئی تھی، میں ہر چیز کو قبول کیا مشغلہ صرف یہ تھا کہ مزید معروف گوشوں میں کھڑے ہو کر عمیوں کو جاننا کہتا تھا یاں تک کہ لوگ مجھ کو دیوانہ خیال کرنے لگے۔ پولیس بھی مجھے پہچان گئی اور مشتبہ سمجھنے لگی سورتوں پر میں نے کبھی نظر نہیں ڈالی ہر وقت میں صرف مردوں، مردوں، مردوں کو دیکھا کرتا تھا۔

اس نے قدرے تنکان کے ساتھ اپنے ابرو پر ہاتھ پھیرا اور تب اس نے گفتگو جاری کی ہوئے کہا: "آخر کار میں نے اسے دیکھ لیا" وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھا پکیدی *piccadilly* کی طرف مشرقی سمت میں جا رہا تھا میں بھی مڑا اور اس کے ساتھ کچھ دور تک دوڑا۔ ایک غالی گاڑی میری طرف آرہی تھی "اس ٹیکسی کا تعاقب کرو" میں نے اپنے ہوئے کہا اور کوڈر گاڑی کے اندر سوار ہو گیا۔ ڈرائیور تھوڑی دیر ٹیکسی کا پیچھا کیا بالاخر وہ مجھے چیزنگ کر اس (cheering) لے گیا میں لپک کر لمیٹ فارم پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص دو خالوں اور ایک چھوٹی لڑکی کے ساتھ وہاں موجود ہے۔ دو بجکر میں منٹ والی گاڑی سے اسے فرانس مانا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ اس سے کوئی بات کروں مگر اس کا امکان نہ تھا اس نے کہ اس کے دوسرے احباب بھی آگئے تھے اور اب وہ سب ایک گروہ کی شکل میں گاڑی کی طرف حرکت کر رہے تھے۔

"میں نے جلدی سے فوک سٹون (Folkstone) کا ٹکٹ خریدا۔ اس امید پر کہ میں ان لوگوں سے جہاز پر ملوں گا قبل اس کے کہ وہ روانہ ہو۔ لیکن فوک سٹون پر بھی اس کا موقع نہ ملا میرے آنے سے پہلے ہی وہ احباب سمیت جہاز میں سوار ہو چکا تھا اور میں نے دیکھا کہ وہ ایک بڑے سیلون میں داخل ہو گئے ہیں جو شاید کئی کروڑ پر مشتمل تھا۔ اب ہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ شخص دولت مند

"میری تدبیریں ایک دفعہ باطل رہیں، لیکن میں نے بھی غم کر لیا کہ اسی جہاز پر سفر کروں گا

مجھے یقین تھا کہ بحری سفر شروع کرنے پر وہ عورتوں کو چھوڑ کر تھمہ بہار پر چل قدمی کی غرض سے ضرور آئے گا۔ میرے پاس بولون تک (Boulogne) ایک مرد بھگے لئے کافی رقم تھی۔ بہر حال کوئی شے مجھے اس ارادہ سے پیر نہیں سکتی تھی۔ سیلون کے دروازہ کے سامنے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ قریب آدھ گھنٹہ کے بعد دروازہ کھلا اور وہ شخص ہارنگٹن لیکن چھوٹی لڑکی کو ساتھ لے کر میرے دلوں کی حرکت تیز ہو گئی معلوم ہوتا تھا اس کی دھڑکن جہاز کے انجن سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اسے ہلا سکتی ہے۔ میں فی الواقعہ اپنے سامنے اس چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہی خط وہی نقشہ۔ اس نے مجھ پر نگاہ ڈالی اور بالائی تختہ پر جانے کے لئے تیار ہوئی۔

میں نے محسوس کیا کہ اگر یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا تو پھر !

”مٹاف فرمائیے گا“ میں نے ہلکا کر کہا ”ذرا آ“

متعارف ہونے کی خواہش ہے اور اس کی ایک اہم وجہ۔

وہ بے حد متحیر معلوم ہوتا تھا اور حقیقت میں اسے ہونا بھی چاہیے تھا لیکن اس نے میری درخواست کو رد نہیں کیا۔ کافی فکر اور تامل کے بعد اس نے اپنا کیس نکالا اور اپنا کارڈ مجھے دے کر تیزی کے ساتھ زینے کی طرف چلا صاف ظاہر تھا وہ مجھے پاگل جانتا ہے۔ کارڈ لے کر میں جلدی سے جہاز کے ایک گوشہ میں چلا آیا میں نے کارڈ کو دیکھا تو میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور سر جھکانے لگا اس کے الفاظ یہ تھے ”مسٹر آرمند وال“ (Mr. Ormand) اور گے (Pittsburg) ٹمبرگ یو اے۔

مجھے پھر کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ البتہ ہوش آنے پر میں نے اپنے آپ کو بولون کے شغلخانہ میں پایا وہاں چند بختے شکستہ مالی میں گزرے۔ ابھی ایک ہی مہینہ ہوا ہے کہ واپس آیا ہوں وہ خاموش ہو گیا۔

ہم اسے دیکھ رہے تھے اور انتظار میں تھے کہ وہ کیا کہتا ہے شام کی تمام صحبتیں اس کو تادم قد زرد رو آدمی کے قصہ کے مقابلہ میں بیچ تھیں۔

”میں گریٹ آرمنڈ اسٹریٹ *Great Ormeau Street* میں واپس گیا“ اس نے لمحہ دو لمحہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ”اور اس امریکن کی بابت جو کچھ بھی معلوم کر سکتا تھا کرنے لگا! میں نے ٹسبرگ *Thames Street* لکھا۔ امریکن ایڈیٹروں سے خط و کتابت کی اور جو امریکن لندن میں مقیم ہیں ان کی محبت میں اٹھنا بیٹھنا شروع کیا لیکن جو کچھ کہ میں معلوم ہوا وہ مفید یہ تھا کہ وہ ایک لکھوتی ہے جس کے والدین انگریز ہیں اور لندن ہی میں کہیں رہتے ہیں۔ یہ تپشیں چل سکا کہاں۔

اور اس طرح کل جمع تک دن پہ دن گزرتا گیا۔ میں سمول سے زیادہ تھک کر لیٹا تھا اور دیر تک پڑا سوتا رہا۔ جب جاگا تو کمرہ میں دھوپ آرہی تھی۔ جیسا کہ سمول تھا میں نے دیوار پر نظر ڈالی، چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ میں نے آنکھوں کو ملا اور خوف سے اچھل کر بیٹھ گیا چہرہ کا نقشہ مستحضر ہند لاکھوں ہو گیا تھا۔ گذشتہ رات تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس قدر نمایاں تھا کہ میں تقریباً اسے بولتے ہوئے سن سکتا تھا لیکن اس وقت اس کی کیفیت ایک سائے کی سی تھی۔

میں اسی ادھیڑن اور خوش میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور باہر چلا گیا، شام کے اخبارات کی پہلی اشاعت نکل چکی تھی فہرست مضامین پر نگاہ ڈالی تو یہ الفاظ نظر آئے ”امریکن لکھوتی کی موٹر کا حادثہ“ آپ سب لوگوں نے بھی اس خبر کو پڑھا ہوگا۔ میں نے اخبار خرید لیا اور بتیابی سے پڑھنا شروع کیا خبر کے الفاظ یہ تھے: ”مسٹر آرمنڈ وال ٹسبرگ کے لکھوتی اپنے رفقاء کے ساتھ اسپینیا *Spain* سے پیا *Spain* سفر کر رہے تھے کہ ان کی موٹر کی ایک رابہ سے ٹکر ہو گئی مسٹر وال کی حالت ”نازک ہے“

میں پھر چنڈھیا ہوا کمرہ میں داخل ہوا اور ہلنگ پر بیٹھ کر انبیا آنکھوں سے دیوار کے چہرہ کو دیکھنے لگا اور تعجب یہ ہے کہ اب میرے دیکھتے ہی چہرہ اپنی جگہ سے غائب ہو گیا تھا۔

بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر وال *Mr. Wall* زخموں کی تکلیف سے جانبر نہیں ہو سکے میرا خیال ہے کہ شاید اسی لمحہ.....

دنیا کی فتنہ

عالم اسلام
شریف دشمن اور فیاض دوست

یہ الفاظ تھے جنہیں سفیر برطانیہ نے پچھلے مہینہ معرکہ گیلی پولی کی سرکاری تاریخی صدر جمہوریہ ترکی کی خدمت میں ہر بیٹہ پیش کیا، بین الاقوامی نگاہوں میں انگریزوں کا یہ فعل دوستانہ التفات اور مروت و محبت کی ایک سرت نخبش علامت ہے اور اس سے مقصود فرمانروائے ترکی کے تعلق خاطر اور جنگی قابلیتوں کا اعتراف کرنا ہے۔ فنی اعتبار سے نفارت حربیہ کی یہ تاریخ گیلی پولی کے معرکہ ہائے جنگ کی ایک اہم دستاویز ہے اس لئے کہ اس کی ترتیب میں ترکی اور جرمن افسر ہی شامل تھے۔ مصنف کتاب یعنی بریگیڈر جنرل اسپنیاں راوگ لینڈر نے لکھا ہے..... مجھے خوش قسمتی سے کرنل دلماس سے گفتگو کرنے کا موقع ملتا رہا..... جو سلوا میں ترکی افواج کے سپہ سالار تھے اور..... کمال غایت و مہربانی کے ساتھ ۶ اور ۸ اگست ۱۹۱۵ء کے خوفناک واقعات کو بیان کرتے رہے.....

یہ گیلی پولی ہی کا خوفناک معرکہ تھا جس میں دنیا مصطفیٰ کمال پاشا کی زبردست شہنشاہت اور غیر معمولی جنگی قابلیتوں سے آشنا ہوئی غازی موصوف آج سے کئی سال پہلے جنرل راوگ لینڈر کے دل پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھا چکے تھے ان کا اندازہ ان سطور سے جو اس وقت لکھی گئی تھیں جب حکومت برطانیہ کو اس قسم کے تبدیے کا مطلق خیال تھا، سے کیا جاسکتا ہے جنرل راوگ لینڈر کی رائے ہے کہ لیمان فاں سائڈرس کو جو ابداد اس مالک تقدیر یعنی موجودہ فرمانروائے ترکی سے ملی اس کی پوری پوری تعریف کرنا ناممکن ہے مصطفیٰ کمال پاشا اس وقت ایک سپیدل دستے کی کمان کر رہے تھے اور ان کی وہ خدا داد قابلیت جو ان کو قیادت و سپہ سالاری میں

عطا ہوئی ہے وہ رہ کر عیاں ہو رہی تھی۔ یہ صرف جنرل مومفٹ ہی کی ساحل مہنی کا نتیجہ تھا جنہوں نے صورت جنگ کا نہایت صحیح اندازہ کرتے ہوئے انرک کو روک دیا تھا۔ پہلے ہی دن اپنا مقصود حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ انہیں کی زبردست مدافعت تھی جب ۹ اگست کو انہوں نے شمالی علاقے کی قیادت کرتے ہوئے جس کا انہیں صرف ایک لمحہ پہلے حکم ملا تھا کوریا کی پیش قدمی کو روک دیا۔ ٹیک چو میں گھنٹہ بعد اطلاع رسائی کی خدمت بھی خود ہی انجام دیتے ہوئے چناق باز پر اپنے جوالی ملے کی ابتدا اس کامیابی سے کی کہ تھوڑی ہی دیر میں ترکوں کا اس چاٹری پر پورا قبضہ ہو گیا۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ محض ایک دستے کے کمانڈر نے اتنے بڑے علاقے پر قابضیت ذات کا اس قدر گہرا اثر چھوڑا ہو جس سے محض اس جنگ۔

ایک پوری قوم کا مستقبل معین ہوا ہو۔

جنرل اوگ یڈرنے جو کچھ لکھا ہے اس میں ذرا

سے کہہ سکتے تھے کہ مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت کا اثر واقعات عالم پر موجود ہے اس لئے کہ اگر انگریزی عساکر گیلی پولی پر قابض ہو جاتے تو پھر ان کا راستہ قسطنطنیہ تک صاف تھا اور قسطنطنیہ کا سقوط خاتمہ جنگ کا مرادف ہوتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء کے واقعات پیش ہی نہیں آتے، بہر حال ہم گیلی پولی میں مصطفیٰ کمال پاشا کی بے تغیر جنگی قابلیتوں کے خلاف انگریزی فوج سے انتہائی کمزوری اور نالائقی کا اظہار ہوتا رہا مثلاً خلیج سلواہی پر جو معرکہ ہوئے ہیں ان کے متعلق جنرل اوگ یڈرنے لکھا ہے ”سلواہی دوسرے روز بھی کوریا سے کچھ نہ ہوا حالانکہ بائیں بالین ساحل پر موجود تھے اور مقابلہ صرف ۱۵۰۰ ترکوں سے تھا۔“ ظاہر ہے کہ ان حالات کے ہوتے ہوئے مصطفیٰ کمال ایک ایسے اولولعزم اور جہنم سپہ سالار سے لڑنا گویا تقدیر کے خلاف جنگ کرنا تھا۔

۲۔ ترکی میں مسیحی مدارس

ذیل کا اقتباس جو کسی ترکی اخبار کے حوالے سے مسلم ورلڈ میں شائع ہوا ہے۔ ان لوگوں کی غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہو گا جن کو اپنی قوم کی تعلیم و تربیت معانیروں کی مداخلت گوارا نہیں یا جن کے سینے پر ترکوں کا اتحاد اور لامذہبیت کا بوس ہوا ہے :-

”صلحنامہ لوزاں کی رو سے اس سال مسیحی مبلغین کو ترکی میں تعلیم و تدریس کا کوئی حق حاصل نہ ہو گا۔ اگر حکومت چاہے تو وہ یک ظم تمام مدارس کو بند کر سکتی ہے لیکن موجودہ صورت حالات اس کی تحمل نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ہمارے ملک میں تعلیم کے لئے کافی مدارس موجود نہیں وزارت تعلیم کی خواہش غالباً یہ ہے کہ وہ اس مقصد کی طرف رفتہ رفتہ قدم بڑھائے۔ اس کے لئے دو تدبیریں اختیار کی گئی ہیں اول یہ کہ ہم اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم کے لئے ان مدارس میں نہ بھیجیں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مسیحی مدارس کو ابتدائی تعلیم کے ذریعے بند کر دینا پڑے گا۔ تاہنا یہ کہ یونیورسٹی ان مدارس کی اسناد کو تسلیم نہ کرے لیکن اس میں دقت یہ ہے کہ جو طالب علم ان مدارس کی سند لے کر براہ راست یورپ یا امریکہ چلے جاتے ہیں وہ برابر انیس درگاہوں میں تعلیم پاتے رہیں گے۔ بہر حال ان تبلیغی مدارس سے جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ ظاہر ہے ہیں اور یہ ہے کہ حکومت جلد سے جلد کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے گی جس سے ہمارے بچے مزید نقصان سے محفوظ رہیں۔“

۳۔ دستور افغانستان

اعلیٰ حضرت شہزاد غازی اور ان کی حکومت نے گذشتہ دو برس میں اپنے وطن عزیز اور ملت کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کا تذکرہ جامد کے صفحات میں اکثر آچکا ہے لیکن کسی ملک کی ترقی کا حقیقی نصاب اس پر ہے کہ اس کی حکومت کی بنیاد میں استوار ہوں اور اس کے اور قوم کے درمیان ایک زندہ ربط قائم ہو جائے۔ مجدد اللہ کہ جلالت مآب کی حکومت اس اہم ذمہ داری سے بھی نہایت متحسن طریق پر عہد ابراہونی ہے۔ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ افغانستان

اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں کاغذ آزاد ہے حکومت کا مذہب اسلام ہے اور بادشاہ
کافر نہیں ہوگا کہ وہ دستور حکومت اور شریعت اسلامیہ کا پابند ہے سوائے شرعی معاملات یا
قوانین حکومت کے ریاست کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اہل افغانستان کی ذاتی آزادی میں مداخلت
کے غلامی اور ہنگامہ منوع قراردی گئی ہیں۔ کسی شخص کی ذاتی جائداد ضبط نہ کی جائے گی الا
یہ کہ کوئی شخص افغانستان سے فرار کر جائے۔ ابتدائی تعلیم جبری ہوگی اور اس کی نگرانی حکومت
کے گی۔ ایک دارالشوریٰ قائم کیا گیا ہے جس کے اراکین تین سال کے لئے منتخب ہوں گے۔
دارالشوریٰ کی غیر حاضری میں بادشاہ حکامی قوانین نافذ کر سکتا ہے لیکن دارالشوریٰ سے آئندہ جہاں
میں ان کا پیش کرنا ضروری ہوگا۔ نئے نئے قوانین صرف

پر مہر تصدیق ثبت کرے گا اور بادشاہ دستخط۔

دارالشوریٰ الگ ایک ایوان بالا اقامت کیا گیا

کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس ایوان کی سفارشات دارالشوریٰ کے سامنے پیش ہوں گی۔
ایسے مسائل جن میں دارالشوریٰ اور ایوان رؤسا کو اختلاف ہوگا جس میں اراکین کی ایک مجلس
میں پیش ہو کر پس گئے جن کا انتخاب دونوں جماعتوں سے عمل میں آئے گا۔ اس مجلس کی سفارشات
اول دارالشوریٰ اور اس کی منظور ہو کر بادشاہ کے سامنے پیش ہوں گی۔

مغربی اہل رائے کا خیال ہے کہ یہ نظام حکومت اعلیٰ حضرت شہر بارغازی کی غیر معمولی
قابلیت اور بصیرت کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کے صحیح
حالات اور ان کے واقعات کا اندازہ کرنے میں شاہ مغرور کی نسبت کہیں زیادہ حق بجانب
ہیں معلوم ہوتا ہے کہ امان اللہ خاں کی نگاہیں خراب کی ظاہری آب و تاب سے بہت جلد فیہ کوئیں
لیکن نادر شاہ غازی جو پانچ برس تک پیرس میں قیام کر چکے تھے مغربیت کے جذبے سے بجا طور
پر متاثر نہیں ہوئے۔

ہماری رائے میں دستور افغانستان میں صرف ایک ہی سقم ہے اور وہ یہ کہ اس میں خیریت

اور قانون حکومت کے دو لحاظ الگ الگ استعمال کئے گئے ہیں اور یہ اصولی اعتبار سے ایک شدید غلطی ہے اس لئے کہ شریعت کا تعلق محض مذہبی اعمال سے نہیں بلکہ دنیوی اعمال و افعال بھی اس میں شامل ہیں اور اسی لحاظ سے قانون حکومت شریعت ہی کا ایک جزو ہے اس کی کوئی شک نہیں کہ بفضل اس قسم کی تفریق سے ممالک اسلامی کی ترقی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا لیکن اس بات کا ہر شخص کو اقرار کرنا پڑے گا کہ حیات قومی کا انحصار مادی وسائل یا نظام سیاست سے بڑھ کر رفت تخیل پر ہے بشرطیکہ اس کی ترغیبی عمل میں ہو سکے۔ مسلمانوں کی یہ خواہش کہ قوامی وسائل کی فراہمی اور اس قدیم اور فرسودہ نظام اجتماعی کے ترک نئے صریحاً۔ تعلیمات اسلامی کے خلاف ان کے گلے منڈھ دیا گیا تھا اپنی حیات قومی میں بھگی پیدا کریں سرسرخ بجانب ہے لیکن ایسا کرنے میں انہیں غیر معمولی بصیرت اور وقت نظر کی ضرورت ہوگی ہیں غصہ قابض کے اس عبرت آمیز نکتے کو یاد رکھنا چاہیے کہ جب ایک دفعہ شجر قومی کا رشتہ اس کی اصل سے منقطع ہو جاتا ہے تو پھر ایک شاخ بیدہ کی طرح اس میں زندگی کے آثار پیدا نہیں ہو سکتے۔ یہیں امید ہے کہ انہوں کی غیور ملت اس سبق کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

۴۔ ڈاکٹر ٹیگور، بلا داسلامیہ میں

پچھلے مہینے بنگال کے نامور شاعر ڈاکٹر راجندر ناتھ ٹیگور جنہوں نے اپنی شاعری اور بین الاقوامی درگاہ کے علاوہ سیاحت و تقریر آرائی میں بھی ایک قابل رشک شہرت حاصل کر لی ہے دولت ایران کی دعوت پر اس سرزمین میں تشریف لے گئے جس کو جہاں شاعری کا فلک لاملاک تصور کیا جاتا ہے حکومت ایران نے دلی محبت اور گرم جوشی سے ان کو خوش آمدید کہی اور وہ جہاں کہیں بھی گئے ایرانیوں نے بڑے تپاک اور مسرت کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ ان کے اعزاز میں جلسے ہوئے دعوتیں دی گئیں، تقریریں ہوئیں اور یہی کیفیت اہل عراق کی تھی جہاں شاعر نے سیاحت ایران سے فارغ ہو کر شاہ فیصل کی دعوت پر قدم رکھا تھا۔ ڈاکٹر ٹیگور حال ہی میں وہاں سے لوٹے

تسے ہیں اور اس عجیب و غریب سفر کی مسرت بخش یاد ابھی تک ان کے دل میں باقی ہے بلا واسطہ
کی وسعت و رواداری اور اہم اسلامیہ کی اطلاقی اور روحانی عظمت سے وہ کہاں تک متاثر ہوئے
اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے کراچی میں ہوائی جہاز سے اترنے
پہی خدماتِ مہبئی کے سلسلہ میں دیا تھا۔ ایسے ہی بلدیہ بغداد کی ایک دعوت میں انہوں نے
عراق کی قدیم تہذیب اور اہل عراق کی زندہ دلی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ
”.... نوع انسانی میں اتحاد پیدا کرنے کی ذمہ داری اہل قلم پوچھ رہی ہے....“

میں اسی جذبے سے سرشار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں.... آئیے ہم نفع انسانی کے
شکوہ اور غیہ سازشوں کو ہنس نہں کریں.... عجب کبھی بھٹن...

ہندوستان میں مسلمانوں کی کثرت کی وجہ سے ہم ہندو

کہتے ہیں آپ پھر ایک دفعہ بحیرہ عرب کے پار ہندوستان

اور اہل ایمان کو ہمارے درمیان بھیجے۔ اپنے حق مہمانگی کو اس

رواداری کا وجود نہ رہے....“

مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر ٹیگور نے اسلام اور مسلمانوں کی روحانی عظمت سے اظہار
نہیں کیا اور وہ عرب کے اس عالمگیر اثر کا اعتراف کرتے ہیں جو ہندوستان پر بھی حاوی ہے اگرچہ یہ اس طور
میں مسلمانانِ ہندوستان کی ذمہ کا پہلو برابر موجود ہے۔ بہر حال ہم اپنی حمایت میں کچھ نہیں
کہیں گے۔ البتہ ڈاکٹر ٹیگور سے صرف اس امر کی التجا کریں گے کہ وہ ہندوستان پر عرب کے عالمگیر
اثر کا اندازہ کرنے میں اور زیادہ وسعت نظر اور رواداری سے کام لیں اور پھر نفع انسانی میں ربط و تعلق
پیدا کرنے کی جو ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے اس کے ادا کرنے میں اپنی قوم کی صحیح رہنمائی فرمائیں۔

ہندوستان

۱۔ فرینچا تریپورٹ

بالآخر فرینچا تریپورٹ کی رپورٹ جس کی صدارت لارڈ لوٹین نے فرمائی تھی شائع ہو گئی مالدیا دستور کی نظر میں یہ دولت برطانیہ کے حسن نیت اور مدبرین ہند کی آنسی جدوجہد کا پہلا ثمرہ ہے جس سے ان عزائم کی تکمیل میں جو گول میز کانفرنس نے اپنے ذمے لے تھے غیر معمولی مدد ملے گی رپورٹ کا خلاصہ ہے:-

”فرقہ دارانہ مسلح لوٹین کیپٹی کے علاقہ بمبٹ سے خالی تھا۔ اس کے علاوہ کیپٹی نے حق رائے دہندہ کے منکر پر پہلو سے غور کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ صوبائی مجالس قوانین سانکے رائے دہندگان کی موجودہ تعداد ۱۰ لاکھ آٹھ ہزار کو بڑھا کر تین کروڑ چھ لاکھ کر دینا چاہیے گویا ہر ایک کو مستثنیٰ کرتے ہوئے۔ اس طرح ہندوستان میں بہ نسبت سابق ۱۸۶۱ء فی صدی رائے دہندوں کا اضافہ ہو جائے گا اور مردوں میں ۴۶٪ م۔

لوٹین کیپٹی کی دوسری تجویز یہ ہے کہ فیڈرل اسمبلی کے لئے برطانوی ہند کے دائے دہندوں کی تعداد گیارہ لاکھ چالیس ہزار سے چوبیس لاکھ چالیس ہزار کر دی جائے گویا اگر پہلے مردوں کی ایک فی صدی آبادی کو حق رائے دہندگی حاصل تھا تو اب اس کے مقابل میں ان کی تعداد دس فی صدی ہو جائے گی۔ لوٹین کیپٹی نے عورتوں کے حق رائے دہندگی میں خاص طور پر اضافہ کرنے کی سفارش کی ہے قرار داد یہ ہے کہ ان کی تعداد تین لاکھ بارہ ہزار کی بجائے چالیس لاکھ کر دینی چاہیے علاوہ ازیں ان کے لئے ہر پلس میں ۲ سے لے کر ۵ فی صدی تک کچھ نشستیں محفوظ کر دی جائیں گی۔

اچھوت قوم کے لئے کیپٹی نے خاص طور سے سفارش کی ہے کہ ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد فرسٹ رائے دہندگان پر ترجیح کی جائے۔ مزدوروں کے حصہ نیا بت کو بڑھا دیا

گیا ہے۔ البتہ اہل تجارت (زمینداروں اور یونیورسٹیوں کی نیابت میں مطلق امتیاز نہیں ہو
 کیشی کی رائے میں حق رائے دہندگی بالائمان کا اصول موجودہ حالات میں ناقابل
 عمل ہے۔ اول تو سندھ و تان کی آبادی بہت زیادہ وسیع ہے۔ نائیا ملک میں جہالت
 کا زور ہے اور فرقہ وارانہ انجمنوں کا وجود کالعدم

صوبہ جات میں حق رائے دہندگی کے لئے کیشی نے جو معیار قائم کئے ہیں وہ یہ ہیں
 اصل ایک عام معیار یعنی جائداد جس کی مقدار کو اتنا کم کر دیا گیا ہے کہ زمینداروں کا تنگد
 اور غریبوں کی زیادہ سے تعداد کو حق رائے دہندگی حاصل ہو سکے اور تعلیم جس کا درجہ مردوں
 کے لئے زیادہ اور عورتوں کے لئے کم رکھا گیا ہے۔

عورتوں 'مزدوروں' 'اچھوت' 'جاتیوں' اہل صنعت و
 کے لئے خاص صلاحیتیں مقرر کی گئی ہیں 'تجزیہ یہ ہے کہ آئندہ:

کا چھ حصہ عورتوں پر ختم ہو۔

مزدوروں کے لئے کیشی نے ہر مجلس میں ۸ نشستوں کی سفارش کی ہے۔ اب تک صرف
 و نشین امتیاز کیشی نے اس بات کی حمایت کی ہے کہ یورپین، ہندوستانی عیسائیوں اور
 انگریزوں کے لئے خاص نیابت کا انتظام کیا جائے لیکن چونکہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہونے ل
 نہیں ہوا۔ لہذا کیشی کسی جماعت کے حصہ نیابت کو متعین نہیں کر سکی۔

اچھوت جاتیوں کا حق رائے دہندگی بڑھانے کے لئے کیشی نے چھ مختلف تجویزیں پیش کی ہیں
 مبنی۔ ۱۔ ہر دیہاتی کو حق رائے دہندگی دیا جائے ۲۔ ہر رائے دہندہ دو رائے دے
 سکے ۳۔ ہر گھر کو ایک رائے کا حق حاصل ہو ۴۔ محض تعلیم کو معیار رائے دہندگی بنا دیا جائے
 ۵۔ یا جائداد کی مقدار اس کے لئے اور بھی کم کر دی جائے ۶۔ یا یہ کہ جس اچھوت کو حق رائے دہندگی
 ملے اس کی بیوی کو بھی یہی حق حاصل ہو۔

صوبہ جاتی مجالس قانون ساز کے متعلق کیشی کی رائے یہ ہے کہ ان کے منتخب اراکین

کو بڑھا کر دو یا سہ چند کر دیا جائے۔ وفاقی مجلس کے لئے کمیٹی کی رائے میں چھ سو نشتین کافی ہوں گی اس کے لئے حق رائے دہندگی کا معیار وہی رہیگا جو اب صوبائی مجالس کے لئے ہے البتہ تعلیمی مہتمم میں کمیٹی کی رائے ہے کہ فیڈرل مجلس کے انتخابات براہ راست ہونا چاہئیں اور صوبائی مجالس کی کمیٹی کی رائے ہے کہ فیڈرل مجلس کے انتخابات کر کے بھیجے البتہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ صوبائی فیڈرل مجالس میں ان کی میعاد کمیت ایک ساتھ ختم ہو جائے۔

ایوان بالا کے اراکین کے انتخاب کے لئے کمیٹی نے اسی طریق کو پسند کیا ہے جس کی مجلس ترکیب وفاق نے حمایت کی ہے۔ لیکن کمیٹی کی رائے میں فیڈرل اسمبلی میں برطانوی ہند کا حصہ نیابت ۲۰۰ کی بجائے ۳۰۰ ہونا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ اگر لوہین کمیٹی کی سفارشات پر عمل کیا گیا اور اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایسا کیوں نہ کیا جائے، تو اس سے آئندہ مجالس قانون ساز کی ترکیب اور ملک کی مختلف جماعتوں کی نیابت پر غیر معمولی اثر پڑے گا۔ لوہین کمیٹی کی رپورٹ پر دو پہلوؤں سے غور کیا جاسکتا ہے اول ذہنی اعتبار سے یعنی یہ دیکھا جائے کہ لوہین رپورٹ اور اس کی ہم مثل چیزوں کی بنا پر آئندہ نظام سیاست قائم ہوگا اس کے نتائج اس ملک کی عام اخلاقی اور تمدنی زندگی کے لئے کیا ہوں گے۔ اس وقت ہمارا اجتماعی سوچ پر مغربی اثرات نہایت تیزی سے غالب آرہے ہیں لیکن چونکہ برہمن کو ان پر کوئی خاص اعتراض نہیں اور نیشنلزم میں بھی ان کے فہم و ادراک کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوتی لہذا ان معاشرتی تبدیلیوں کا جائزہ لینا بیکار ہوگا جو دن بدن ہمارے نظام جماعت کی تبدیلیوں سے مترتب ہوتی جا رہی ہیں لیکن صرف یہ ہے کہ علی گڑھ سے لوہین رپورٹ اس مسئلے کے حل میں کہاں تک مفید ثابت ہوتی ہے جو ہندوستان کے موجودہ افسوسناک اور یاس انگیز حالات کی سبب بڑی وجہ ہے۔

نیشنلسٹ پریس یعنی ہندی صحافت کے اس حصے سے قطع نظر کرتے ہوئے جس کو کانگریس کی آواز کا ترجمان سمجھا جاتا ہے، لوہین رپورٹ کے متعلق تقریباً ہر جگہ اطمینان و مسرت کا اظہار کیا گیا ہے

اور واقعی یہ ہے کہ لاڈ لوہتین اور ان کے رفقاء نے جس محنت اور سرگرمی کے ساتھ مسلح رائے دہندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا ہے وہ قابلِ داد ہے کانگریس نے اب تک حق رائے دہندگی بالائے کھول پر زور دیا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کو لوہتین رپورٹ مسترد کر چکی ہے قوم پرور جماعت کا دعویٰ یہ ہے کہ لوہتین کمیٹی کی تجاویز نے "غریب کسانوں کو بدستور حق رائے دہندگی سے محروم رکھا ہے۔ اس کے متعلق لاڈ لوہتین کا عذر کہ موجودہ حالت میں "غریب کسانوں" کو دفعۃً اس سطح پہلے آنا جو کانگریس کے زیرِ نظر ہے نامکن ہوگا کچھ بہت زیادہ لائقِ سماعت نہیں اس لئے کہ یہ جواز سے کادہ ثبوت ہے جو داعی کی طرف سے پیش ہوا ہے کانگریس کو اپنی جگہ پر سندھوستان کی ایک ہی نمائندہ اور غریبوں اور کاشتکاروں کی سب سے بڑی جماعت ہونے کے علاوہ اس کے اندر اسے حکومتِ ہند کا چون و چرا تمام اختیارات اس کے سپرد کرے لہذا ظاہر ہے کہ کبھی قابلِ قبول نہیں ہوں گی۔

لیکن چونکہ کانگریس کے اصرار نے نمائندگی پر اقلیتوں کو اثر

میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مزید براں اس کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ برطانوی پارلیمنٹ حکومتِ ہند کے تمام اختیارات کسی ایک سیاسی جماعت کو تفویض کر دے۔ لہذا بہتر ہوگا کہ اہلِ ہند باہم خاص مسلمان اپنی پوری کوشش کے ساتھ ان فروگزاشتوں کے خلاف آواز بلند کریں جو لوہتین رپورٹ میں جا بجا موجود ہیں اول تو ملحقہ رائے دہندگی کی توسیع سے انتخابات کا خرچ اتنا بڑھ جائے گا کہ صوبائی حکومتیں شکل سے اس کی تحمل ہو سکیں گی نیا نیا لوہتین کمیٹی کا ملحقہ انتخابات کو دفعۃً وسیع کر دینا اور وہ بھی ایک ایسے ملک میں جہاں ابھی سیاسی تعلیم و تربیت کی غیر معمولی ضرورت ہے ایک خطرناک اقدام ہے جس کے نتائج بہت ممکن ہے کچھ بہت زیادہ خوشگوار نہ ہوں۔ اکثر لبرل رہنماؤں کا خیال یہ ہے کہ اس معاملہ میں کمیٹی کو ان اراکین کی تجاویز قبول کر لینی چاہیے تھیں جن کو اس مسئلہ میں اختلاف تھا ہمارے نزدیک کمیٹی کا مزدوروں کے لئے خاص ملحقہ قائم کرنا اور عورتوں کے لئے مردوں کی نسبت جداگانہ میاں پر زور دینا ایک شدید غلطی ہے جس سے بعض جماعتوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

ان مام نقائص کلاوہ کو تین دہرے میں ایک بہت بڑا ستم یہ ہے کہ اس کی تجاویز کے ماتحت کسانوں کا سواد اعظم حق رائے دہندگی سے محروم رہ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے بعض جماعتوں کے رائے دہندگان کی تعداد کم ہو جائیگی۔ گو جدا گانہ انتخابات کی صورت میں اس سے قوموں کے حصہ نیابت پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن چونکہ فہرست رائے دہندگان پر ہمیشہ ان کی تعداد کم رہے گی اس لئے ہر قوم کو دوسری قوم کے خلاف شور و غوغا کرنے کا موقع ملتا رہے گا۔ مسلمانوں اور بالخصوص مسلمانان پنجاب کو اس مسئلہ پر خصوصیت کے ساتھ غور کرنا ہے

بہر حال یہ امر قابل اطمینان ہے کہ لو تھین کمیٹی نے حلقہ رائے دہندگی کی توسیع کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ اس وقت سندھوستان کو ایک پختہ اور وسیع تر نظام رائے دہندگی کی ضرورت ہے اور یہ یقین ہے کہ اقوام سندھ اپنی سیاسی تربیت اور جذبہ عمل کی بدولت ایک روز اس نیک مقصد میں بھی کامیاب ہو جائیں گی۔

۲۔ ایک نا واجب اعلان

چند دن ہوئے مسلم کانفرنس کے بعض اراکین کی طرف سے جریدہ "انٹرنیٹ" ایک اعلان شائع ہوا جس میں حکومت برطانیہ سے درخواست کی گئی تھی کہ فرقہ وارانہ مسئلے تھیں وہ مسلمانان سندھ کا خصوصیت سے خیال رکھے اس لئے کہ مسلمانان سندھ ہمیشہ حکومت برطانیہ کے وفادار رہے ہیں۔ ان کی طرف کسی سیاسی سازش یا قتل و دہشت انگیزی کی تحریک منسوب نہیں کی جاسکتی۔ قانون شکنی کی مہم میں انہوں نے مطلق حصہ نہیں لیا وغیرہ وغیرہ۔ ہیرائیس سر آغا خاں نے اس اعلان کے الفاظ میں جہاں ضروری سمجھا مناسب ترمیمات بھی کر دیں

اس اعلان کا شائع ہونا تھا کہ ہمارے قومی یا قوم پرور حوائج نے آسمان سر پر اٹھایا کہا گیا کہ یہ ایک نہایت ہی ذلیل اور نفرت انگیز دستاویز ہے جس کا مطلب سندھو قوم پرنا واجب انتخابات قائم کرنا ہے۔ جہاں تک اعلان کا تعلق ہے اس سے ہیں بھی اختلاف ہے اور یہ دیکھ کر

سرت جوتی ہے کہ اسلامی صحافت نے بحیثیت جمہوری اس کی خدمت کی نینا کوئی خود دار مسلمان ایک لحظے کے لئے بھی اس قسم کے کسی اعلان کی تائید نہیں کرے گا خود مسلم کانفرنس کے صدر و محدث نے اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ کانفرنس کا اس اعلان سے کوئی تعلق نہیں اگر معین ممبران کانفرنس نے اس قسم کی غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی یا کانفرنس کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھایا تو یہ ایک نہایت ہی ناواقب حرکت ہے جس کا انھیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ مگر یہاں بحث "قومی صحافت" کے انداز تنقید سے ہے۔ اگر معین مسلمانوں نے اپنے سیاسی مسلک یا عقائد کے مطابق اس قسم کا کوئی اعلان شائع کر دیا تو اس سے یہ کہاں لازم آتا تھا کہ برادران وطن ساری قوم پر مطمئن و اذ کرتے آخر مسلمانوں کے علاوہ جو قومیں ہندوستان میں سستی ہیں ان کی طرف سے بھی تو برابر اپنے سیاسی خیانات، آراء کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ کتنی وطن پرست اور قوم پرور ہستیاں ہیں جنہوں نے قانوں سے ہمیشہ بریت کا اظہار کیا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ قانون شکنی یا دہ اور کون نہیں لینا ملک کے جوہمی واقعات ہیں وہ سب کے ساتھ۔

کی سیاسی اور اخلاقی ترقی اور اس کے امن و امان میں کون سی چیز ممانعت ہے۔ اگر یہ سب ہم سب بے لاگ تنقید اور شرافت اور دیانتداری سے کام لیں تو کیا اچھا ہو۔ گزشتہ دو ڈہائی برس سے ہمارے ملک کی سیاسیات نے جو رنگ اختیار کر رکھا ہے وہ ہمارے سامنے ہے کیا ہیں اس بات سے رنج نہیں ہوتا کہ ہم نے اپنے باہمی اختلافات سے ترقی اور کامرانی کے کتنے موقعے کھو دیے ہیں کیا فسادات بھی اور اس قسم کے دوسرے افسانہ جواث کو دیکھتے ہوئے ابھی اس امر کی ضرورت ہے کہ ہندو مسلم منافقت کا سلسلہ بدستور جاری رکھا جائے یہ کہنا غلط ہو گا کہ سب کچھ انگریزی حکومت کا نتیجہ ہے۔ یا یہ کہ ہندو اور مسلمانوں کی باہمی لڑائی دراصل اقتصادی لڑائی ہے۔ دراصل ہندو اور مسلمانوں کا اختلاف ایک طرح کا تمدنی اور روحانی اختلاف ہے اور ضرورت اسی امر کی ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کے اعمال و افعال کا اندازہ کرنے میں غیر معمولی وسعت نظر اور تحمل و دروادی سے کام لیں جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ ہم اقوام ہند کی باہمی رقابتوں کو عقیدہ وطنیت کی بدولت مٹا سکتے ہیں ان کے لئے تو اور بھی ضروری

ہے کہ وہ ہر موقع پر اپنی وسعت قلب اور جماعتی تعصبات سے بالاتر ہونے کا ثبوت دیا کریں نہ تو بیت
و وطن دوستی کا وہ عقیدہ میں کا اظہار عمل کی بجائے محض صفہ قرطاس تک محدود ہو۔ فرقہ دہلی سے
بھی زیادہ مغرت کا باعث ہو گا۔

پارلیمنٹ کی بچی

انگریزوں کا خیال ہے کہ دنیا کی تمام جمہوری مجالس دراصل برطانوی پارلیمنٹ کی نقل ہیں اس
لئے کہ جمہوریت کا نثر و نمائش پہلے انگلستان میں ہوا۔ گویا انگریزی پارلیمنٹ ہر اس جمہوری ادارے
کی ماں ہے جو کتم عدم ہے و جو دیں آئے اور چونکہ صوبہ سرحد کی قانون ساز مجلس حال ہی میں قائم ہوئی ہے
اور وہ بھی انگریزوں کی کوشش سے ، وہ پارلیمنٹ کی بچی ہوئی۔ یہ امر کہ اب تک وہ لوگ جن کے
مدعیان یہ بچی پرورش پار ہی ہے اور جو سرڈنیں برے کی رائے میں تمام ہندوستانیوں کی نسبت جمہوری
ادارات کے کہیں زیادہ اہل ہیں انگریزوں کی نظر اتفاقات سے کیوں محروم رہے افسوسناک ضرور ہے
مگر اب جو بچی دنیا و فضا وجود میں آگئی ہے لیکن لوگوں کا اب تک خیال ہے کہ اس کی ولادت قبل از وقت
ہے تو حکومت نے انرا ذرا فائدہ اٹھا لیا تو جو اس کو بہتر سے بہتر سربراہوں کے سپرد کر دیا ہے تاکہ وہ اس کی تربیت
اور نگرانی کا خاص طور سے خیال رکھیں۔

صوبہ سرحد کی کونسل ہر اعتبار سے بچی ہے کیا بہ کاظ عمراد کیا بہ کاظ جسم۔ اس کے اراکین کی تعداد
صرف چالیس ہے چونکہ شمالی ہند میں ادھر گرمی کا سخت زور رہا ہے اور شپاڑ کی آب و ہوا اس زمانہ
میں کچھ بہت اچھی نہیں رہتی لہذا بہتر یہ سمجھا گیا کہ اس نوخیز کونسل کا اجلاس ایبٹ آباد کی روح
پرور اور فرحت بخش ہواؤں میں منعقد ہو۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ بچی ماشاء اللہ اپنی عمر سے
کہیں زیادہ بڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی صحت اور اس کے قومی نہایت اچھے ہیں اور چشم بد و دلوس
سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

بالفعل اس کونسل میں پانچ جماعتیں قائم ہوئی ہیں۔ اول سرکاری جماعت جس کے

نہد آرمیل مشنری۔ ایچ گڈنی اعلیٰ درجے کے مقرر اور بارسوخ ممبر ہیں۔ صاحب موصوف کے بعد صاحبزادہ سر عبد القیوم کا نمبر آتا ہے جن کو شاید اسی کونسل کی سربراہی کے عہدے میں پیر سرحد کا لقب دیا گیا ہے پھر ذاب مظفر خاں صاحب جنہوں نے کونسل کلارا تارپود تیار کیا اور جوائنٹسٹین کے نام نگار کی رائے میں گویا کونسل کے "باپ" ہیں۔

سرکاری جماعت کے علاوہ دوسری جماعت ہندوؤں کی ہے تیسری "عامیان ترقی" کی اور چوتھی لبرل پارٹی جو بڑے بڑے خوانین پر مشتمل ہے مگر افوس یہ ہے کہ وہ مقرر بہت "چھوٹے" ہیں راوی کہتا ہے کہ وہ اپنی قوم یا پبلک کی کسی خدمت کا دعویٰ نہیں کر سکتے پانچویں اور آخری جماعت انڈی پینڈٹس کی ہے یعنی:

بڑی شکایت یہ ہے کہ ان کے مالکین صدر کی بجائے زیادہ تر ان لوگوں کے کا تماشہ دیکھنے کے لئے گیلریوں میں آجے ہوئے ہیں۔ ان کے

عادت ہے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ کونسل کے پہلے ہی اجلاس میں ان سب

بہر حال یہی جماعت رائے عامہ کی ترجمان ہے اور کونسل کے اجلاس اول سی میں ان کا طرز عمل نہایت کامیاب رہا۔ انہوں نے تمام سیاسی حالات کا جائزہ لیا، نظم و نسق حکومت پر نکتہ چینی کی، صوبہ سرحد کی ضرورتوں پر زور دیا اور آبادی اور رجسٹریشن کے مطالبے کے خلاف ایک فتح بھی حاصل کی البتہ ان کا کونسل سے "اٹھ جائے" کا فعل "مئی" خود (مجلس) کچھ بہت زیادہ تسخیر نہیں تھا، لیکن ہے یہ زمانہ جہالت کی یاد کا نتیجہ ہو اس لئے کہ آزاد جماعت کے رہنما ایک زمانہ میں کانگریس کے ممبر تھے۔ اور اپنے سابق مرشد کے تتبع میں حکومت کو "شیطانی حکومت" کے نام سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ بہر کیف یہ امر موجب مسرت ہے کہ اب وہ پرانی غلط فہمیاں دور ہو چکی ہیں اور وہ جو شاعر نے کہا ہے کہ

بس اک نگاہ پٹہ رہے فیصلہ دل کا۔

آزاد جماعت کو حکومت کی نگرانیات پر جو تبدیلی قلب کی وجہ بڑی علامت

ہے اتنا ہے اب اس بات کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ وہ پرانی روش سیاست جو کبھی راعی اور رعایا دونوں کو مضطرب رکھتی تھی ختم ہوئی اور اس کی بجائے عیش و کامرانی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ خدا اس نوسولود پچی کو صحت و عافیت عطا فرمائے اور اس کے دولت و اقبال میں اضافہ کرے۔

ممالک غیر

تحقیق اسلحہ جیٹو کا نفرنس کوئی چار مہینے سے اوپر پہنچے آئے کہ تحقیق اسلحہ کا نفرنس مینیو میں جو رہی ہے لیکن ہنوز کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا پہلے ہی دن سے مختلف قوموں کے مقاصد کا اختلاف ظاہر ہونے لگا۔ لیکن ایک دوسرے کی اور ساری دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی یہ کوشش ابھی جاری ہے اور چار مہینے کی کاوشوں کے بعد ابھی یہی مسئلہ زیر بحث ہے۔ جلد عائد اسلحہ کون سے ہوتے ہیں اور یہ نفاذ کون سے یا اسلحہ جس کی کیف سے لحاظ سے ہو یا کم کے اعتبار سے ؟ اول الذکر قسم کی تحقیق کے اسلحہ کو ایک قلم ممنوع کر دیا جائے یا ان میں معتد بہ کمی کا معاہدہ ہو جا اسلحہ کی تعداد اور مقدار میں کمی کی جائے ؟ آدمیوں میں مصارف میں آمد

یہ ہے کہ ہر قوم چاہتی ہے کہ تحفہ اسلحہ کی وہ تجویز مان لی جاوے۔۔۔۔۔

قوت کو کم سے کم نقصان ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ فرانس نے ایک طرح کی تحفہ چاہتا ہے۔ نہ دوسری قسم کی۔ اسے آج بھی وہی تحفہ فرانس کی دٹ لگی ہے جو عائدہ و رسائی کے وقت سے شروع ہوئی تھی۔ فرانس یہ کہتا ہے کہ اسلحوں تحفہ بھی ہو گئی تب بھی یہ تحفہ حامل نہیں ہوتا، ہم دودھ کے بچے ہیں چاچہ کو بھی چونک چونک کر بیٹیں گے۔ اگر استحال اسلحہ یعنی فنگ کو روکنا ہے تو کسی بین الاقوامی جامعیت کو مسلح کرو جو موثر طریق پر جنگ کو روک سکے۔ فرانس کی اس سہٹ نے جنیوا کانفرنس کے کام کو روک سا رکھا تھا کہ اپریل میں امریکن نمائندے نے بہت کر کے یہ تجویز پیش ہی تو کر دی کہ ہم پینکنے والے ہوائی جہاز، ٹنک، زہریلے گیس اور متحرک بھاری توپیں بالکل ممنوع قرار دے دی جائیں فرانس، پولینڈ، اور اتلاف صغیر کی حکومتوں کے علاوہ اور سب نے اس تجویز کی تائید کی۔ روس کا نمائندہ تو اس سے بہت زیادہ آگے بڑھے کہ آمادہ تھا، مگر فرانس کے سابق وزیر اعظم مار دیونے اس کی سخت مخالفت کی اور قتلایاکہ مدافعانہ اور جارحانہ اسلحہ میں تمیز کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے اگر قوموں کے نام نہاد

جارحانہ اسلحہ میں کمی کر بھی دی گئی تو اس سے دراصل ان کی مدد آوری کی قوت میں زیادہ فرق نہ آئیگا اور وہ ممنوعہ اسلحہ کو بھی برابر چھپ چھپ کر تیار کرتی رہیں گی۔ اس لئے مجتہد اقوام کے پاس خود اتنی زبردست فوجی قوت ہونی چاہیے کہ وہ اس شکن دول کی بد وقت سرکوبی کر سکے۔ امریکن تجویز میں جنگی جہازوں کا ذکر دھونے پر فرانسیسی خاص طور پر چمکیاں کرتے رہے۔

ایک نوجوز میٹھ ہونے کے دو ہی روز بعد اٹلی کے وزیر خارجہ سینور گرانڈی نے ممنوعہ اسلحہ کی مجوزہ فہرست میں بڑے جہازوں، آبدوزوں، اور ہوائی جہازوں کو اہم ترین سرے جلنے والے جہازوں، نیز جراثیم کے ذریعہ جارحہ کی تمام تدبیروں کا بھی اضافہ کر دیا۔ اور فرانس کے ثبات کے جواب میں متلا کر کہ اگر قوموں کی بد عہدی کے اسکان کو سامنے رکھ کر ہی گفتگو کی گئی تو پھر تو تحفظ کے واسطے خیال خواب ہو کر رہ جائیں گے فرانس کے ایک اور چٹکی لی۔

اس کشاکش میں سر جان سائمن نے کوشش کی کہ کوئی ایسی بات نکالیں جس پر سب متفق ہوں اور ایک قرارداد پیش کی کہ یہ کانفرنس خاص خاص قسم کے اسلحہ کی ممانعت کے اصول کو نپند کرتی ہے یعنی اس اصول کو کہ اسلحہ کی بعض قسمیں تعین کر کے بین الاقوامی معاہدہ کے ذریعہ ان کا دکھنا یا استعمال کرنا ممنوع قرار دیدہ یا جائے بظاہر تجویز معقول تھی اور نپندہ نمائندوں میں سے ۱۳ اس سے موافق بھی تھے۔ مگر فرانس اور دو آئیائے اس تجویز کو بھی زمانا ادا ہی وقت تسلیم کیا جب اپنی سٹ پوری کر لی یعنی ممنوع قرار دینے کے ساتھ یہ لفظ بھی بڑھوا لئے کہ یا بین الاقوامی قابض دیدہ جائیں اس قرارداد سے کوئی بات ملے تو بانی نہیں ظاہر میں ایک چیز پر سب متفق ہو گئے اور اس کی منظوری کے بعد ہی سب متہذ مانیدوں نے اپنے اپنے ملک کی راہ لی۔ تشدد و گفتند و برخاستند۔

ہاں گھر جاتے جاتے یہ لوگ اہرین کے چند کمیشن مقرر کرتے گئے کہ مختلف اسلحہ کے جلد خانہ یا دفائنہ ہونے، ان میں کمی کے امکانات وغیرہ پر اپنی رپورٹیں تیار کریں یہ اہرین مہینوں سے بحث کر رہے ہیں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ جب عظیم کے بعد صلح در سائی کے وقت جرمنی کو جلد خانہ اسلحہ کھنے سے منع کرنا تھا تو ہم گھنٹہ کے اندر اہرین نے ملے فرما دیا تھا کہ کون کون سے اسلحہ اس میں

شامل ہیں اور ان کے فیصلہ پر عمل بھی ہو گیا۔ اب دو مہینے سے زائد کی جستجو میں اس کا پتہ نہیں چلا !
 البتہ تین چار ماہ کی کارروائیوں کا یہ نتیجہ ضرور ہوا ہے کہ فرانس اپنے چند چھوٹے چھوٹے یورپی
 مہینوں کے علاوہ تخفیفِ احمہ کے معاملہ میں ساری دنیا سے الگ ہو گیا ہے، امریکہ اس کے خلاف ہے،
 بھنگان اس کے خلاف ہے، اٹلی اس کے خلاف ہے، جرمنی اور بہت سی چھٹی پھوٹی ریاستیں اس
 کے خلاف اس جدائی کا اثر فرانس کے مستقبل پر کچھ بہت اچھا نہیں پڑے گا۔ دنیا کی قوموں میں گلوبل
 رہنا ذخاں خل ہے اگرچہ اس وقت فرانس نے اپنی فوجی قوتیں بعد یورپ کی نو آفریدہ ریاستوں کی مدد سے
 اپنی حیثیت ایسی کر لی ہے کہ اس اہم معاملہ میں یکسی اہم معاملہ میں اس کی رضامندی بغیر کوئی فیصلہ کرنا منہ پر
 کونا قابلِ عمل بنا دیتا ہے اور آج ضروریہ حال ہے کہ سیاستِ عالم کی تازہ کاری
 وہی پدمک جاتا ہے اس سے ابھی تو اسے کوئی نظر انداز نہ کر سکے گا کیونکہ
 ہے فرانس ہی اٹلی کے توسیعی منصوبوں میں حائل ہے اور انگریزوں کی
 میں بہت مضبوط نہیں دیکھ سکتے، فرانس ہی غار کی طرح کھٹک رہا ہے یہ سچ
 دنیا سے الگ کر کے اس کی آئندہ سرکوبی کے لئے اچھا سامان مہیا کر رہی ہیں !
تاوان اور قرضہائے جنگ۔ لوزان کانفرنس | اور جرمنیوں میں تخفیفِ احمہ کے سکرپٹ پر اب رہن مقرر ہے ہیں
 اور اور دنیا کی تمام حکومتیں مالی دشواریوں میں مبتلا ہیں۔ قریب قریب دیوالیہ ہو رہی ہیں اور قبول
 وزیرِ اعظم انگلستان معلوم ہوتا ہے سارا کارساز نظام معاشی بنیا دوں سے بٹھا جا رہا ہے، اس میں انگلستان
 فرانس، جرمنی اور امریکہ کا سوال نہیں بلکہ ساری دنیا کا حال تباہ ہے بین الاقوامی قرضوں کے اتوا سے
 سال بھر تک جو دم ملا تھا وہ مدت بھی ختم ہو رہی ہے اور جرمنی کی حالت تو آگفتہ بہ ہے، مالی تباہی
 کے ساتھ ساتھ ملک میں انتہا پسند جماعتوں کا اقتدار بڑھ رہا ہے اور اکثر قوموں کے لئے تردد کا باعث ہے
 چنانچہ تاوان جنگ اور قرضہائے جنگ کے سائل پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس ہو رہی ہے ان سطحوں کو
 لکھتے وقت اس کی کارروائیوں کا کوئی ختم نتیجہ نہیں نکلا ہے۔
 اس کانفرنس کی کارروائیاں سمجھنے والے کیسے جرمنی انگلستان، فرانس اور امریکہ کے نقطہائے نظر کو

سمجھنا ضروری ہے۔ جرمنی کا حال تو اس بیل کا سا ہے جو تھک کر کندھا ڈال لے۔ یہ اب صاف صاف کتاب ہے کہ تم لوگوں سے جو بن پٹیکروہاری مالی حالت اتنی خراب ہے کہ ہاری طرف سے تاوان کمسٹر کو منم مجبور۔ ہم اب کچھ ادا نہیں کر سکتے۔ اور نہ کریں گے، اس نے کہ اگر تاوان کا ٹنگ گراں ہاری گردن میں بند ہار ہا تو ہم کسی طرح اپنے اندرونی مالی اور معاشی معاش کا سد باب نہ کر سکیں گے۔

فرانس جس کی سرزمین کو ۵۰ سال میں دو مرتبہ جرمن افواج نے تباہ و برباد کیا کچھ ڈرا ہوا ہے۔ کچھ ڈا ہوا ہے۔ کچھ واقعی نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کی جائز خواہش رکھتا ہے کچھ اپنی مظلومیت کو سراہے بنا کر اصل نقصان سے زیادہ وصول کرنا چاہتا ہے اور سب زیادہ یہ کہ صلح نامہ و دستانی کی رو سے تاوان کی ایک ایسی توقع قائم کر چکا ہے کہ اسے چھوڑتے دل دکھتا ہے چنانچہ پچھلے انتخاب عام کے موقع پر قریب سیاسی جماعتوں کے اکابر نے یہ بات بہت صاف طور پر بتلا دی تھی کہ اگر واقعی جرمنی اس وقت کچھ ادا نہیں کر سکتا تو اس کی وجہ خود اس کی خیریت خرابی ہے، غیر مجبوری ہے اس وقت ادا نہ کرے لیکن ہمیشہ کے لئے اپنے مطالبہ کو ٹٹا نہیں دے گا۔

انگلستان جسے یورپ میں فرانس کا فوجی تفوق ایک آن نہیں جاتا چاہتا ہے کہ فرانس اور جرمنی میں کچھ جو مان ہو جائے وہ جرمنی کا دوست قبلے اور وہ کرنے کو تیار ہے جسے وہ خوب جانتا ہے کہ فرانس نہیں لڑ سکتا۔ چنانچہ اس کی تجویز ہے کہ تمام جنگی قرضوں کو جس میں جرمنی کا تاوان بھی ہے، کا ادم کر دیا جائے اور اس کی حیثیت اور اس کے قابل حل ہونے پر اسے اتنا بردہ رہے کہ کچھ عرصہ پہلے انگریز و ڈیل نے حکومت کا میزانیہ پیش کیا تو اس میں جرمن تاوان کو آمدنی میں شامل کیا نہ اس رقم کو جو انگلستان امریکہ کو ادا کرتا ہے خرچ میں دکھایا۔

امریکہ جو ان سب ساہوکار ہے خود مالی دشواریوں میں پڑ گیا ہے وہ اپنے قرضے صاف کرنے کے لئے آسانی سے آمادہ نہیں اس آمادہ ہو سکتا ہے تو اسی وقت کہ یورپ میں تخفیف اٹھو سے عام سکون اور سیاسی اتحاد سے معاشی حالات پر ایسا پڑے کہ امریکہ کا لین دین بھی بڑھ سکے اور قرضے صاف کر کے وہ جو کموٹے اسے تجارت اور مالی لین دین میں کچھ تو وصول کرے۔

چنانچہ اُدھر کانفرنس انگریزوں کی اس تجویز سے شروع ہوئی کہ سب بین الاقوامی قرضے کا اہم
 کردار بن جائیں۔ جرمنی نے ہر طرح کی ادائے گئی سے منع دہری ظاہر کی، اٹلی نے ان دونوں کا ساتھ دیا
 لیکن فرانس کے وزیر اعظم نے باوجودیکہ انگریزی وفد نے پہلے سے بہتری ہوا باجمعی تھی صاف صاف
 کہ دیا کہ ہم ہمیشہ کیلئے تاوان کے مطالبہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ظاہر معاملہ یہاں آکر رک سا گیا تھا کہ امریکہ نے
 اپنے نمائندے کی طرف سے یہ اطلاع پہنچائی کہ وہ قرضوں کی مشغولی یا ان میں تخفیف کے سوال پر سب سے
 وقت خود کر سکتا ہے کہ دول یورپ اپنے اسلحہ پر معارف میں : اس فی صدی کی کمی کر دیں جو بول، اسلحہ پر
 اس قدر فضول خرچ کر سکتے ہیں نہیں ضرور اپنے قرضے بھی ادا کر سکتا جائے ۔

اس تجویز نے قرضہائے جنگ اور تاوان کے مسئلہ کو تخفیف دے
 کانفرنس کو مضبوط کر ایک بار بیدار کر دیا مگر اس تجویز نے مسئلہ کے حل کو
 نئی پوری پوری تائید انگریزوں نے بھی نہیں کی۔ انگریز چاہتے تھے :
 قوت کے لئے بڑا خطرہ ہے یک قلم ممنوع ہو جائے امریکہ کی تجویز ان میں صرف سیب و سدر ہے
 پھر انگریزوں کے نزدیک سب قوموں کی بحری قوت میں ایک ہی انداز سے تخفیف بھی درست نہیں کہ
 کوئی قوم کسی قسم کے جہازوں کو ضروری سمجھتی ہے، کوئی دوسری قسم کو، جاپان ہی انگریزوں کا منہوا ہے اور ہر
 فرانسیسی پرانے باپ ہیں اور کہتے ہیں کہ تخفیف اسلحہ کے معاملہ کو قرضہائے جنگ سے کیا تعلق، خصوصاً جب کہ امریکہ
 بار بار یہ بتلا چکا ہے کہ قرضہ جنگ کے مسئلہ کو تاوان کے مسئلہ تک تعلق نہیں ہے ! اٹلی نے امریکہ کی تجویز کو
 جاکم و کاست اور بلا کسی شرط کے منظور کر کے فرانس کو اور بھی چھیڑ دیا ہے اس لئے کہ ان تجاویز کا اثر یہ ہے کہ
 فرانس اور اٹلی کی قوت میں باہم نسبت وہی قائم رہے جو اس وقت ہے اور اس پر راضی نہیں، اگر فرانس اس
 پر راضی ہو سکتا تو اٹلی اور فرانس اس بحری ساءہ میں کیوں شریک نہ ہو جاتے جو برطانیہ، امریکہ اور جاپان میں
 ہوا تھا اور جو اس وقت تک تخفیف اسلحہ کی ساہا سال کی گفت شنید کا منہوا ہے۔

فرانس اس نئی تجویز سے پییدگیوں کچھ کم نہیں ہوئیں بڑھ ہی گئی ہیں البتہ یہاں بھی تاوان کے
 معاملہ میں فرانس کو اکیلا کر دیا گیا ہے انگریزی سیاست تو کسی طرح یہ نہیں چاہتی کہ فرانس اور جرمنی میں کوئی

محمول محبوبہ ہو۔۔۔۔۔ اور اس وقت نگاہ رانی بھی اس خواہش میں شریک ہے، فرانس یہ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ جرمنی سے اس وقت یا عرصہ تک کچھ وصول کرنا ناممکن ہے اور اگر اس نے اپنی رائے عامہ پھیلانے کے لئے اس وقت کسی متعین یا غیر متعین مدت کے لئے تاوان کا لینا ملتوی ہی کیا اور اس قضیہ کو بالکل ختم نہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جرمنی میں فرانس کے خلاف جوش بدستور بڑھے گا، انتہائی سیاسی جامعہ کو جو فرانس کے خلاف ہیں فردغ ہو گا اور یورپ کے کاروبار میں بھی وہ اطمینان اور یقین کی صورت نہ پیدا ہو سکے گی جس کی اسے اس وقت سخت ضرورت ہے اور جس کے فقدان کے اثر سے فرانس بھی اب زیادہ دن تک بچ نہیں سکتا دوسری صورت فرانس کے لئے یہ ہے کہ جرمنی کا تاوان کو صاف کرے، لیکن جرمنی سے کوئی ایسا ساشی ساہرہ کرے جس سے یورپ کی ساشی زندگی میں ان دونوں ملکوں کا تباہی ممکن ہو جائے اور اس تقاضا کے فوائد سے تاوان کی منسوخی کی گوتالی ہو سکے۔ فرانس ان دو راہوں میں سے کوئی راہ اختیار کرتا ہے اس کا فیصلہ اگلے چند مہینوں میں ہو جائیگا۔

ڈانزنگ اور پولینڈ | ناظرین کو معلوم ہو گا کہ صلحہ درسا کی بہت سی عجیب و غریب کارروائیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ جرمنی کی سب سے بڑی ریاست پریشا کے مشرقی حصہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان دونوں کے پہنچ کا علاقہ پولینڈ کو دیدیا گیا تھا تاکہ مشرق میں پولینڈ کی قوت بڑھے اور جرمنی تقریباً بس ہو جائے اس علاقے سے متصل جرمنی کی مشہور بندرگاہ ڈانزنگ ہے یہ پولینڈ کو دیا تو نہیں گیا لیکن علیحدہ ایک آزاد شہر بنا کر حبیبہ اقوام کا ایک کھنڈر یہاں متعین کر دیا گیا اور پولینڈ کو یہ آسانی ہم پہنچانی گئی کہ وہ کچھ عرصہ تک اس بندرگاہ کو اپنے امدادی جگہ بندرگاہ کے طور پر کام میں لائے اس غرض سے جو ساہرہ شہر ڈانزنگ اور ریاست پولینڈ میں ہوا تھا اس کی مدت یکم مئی کو ختم ہو گئی۔ ڈانزنگ کی حکومت نے پولینڈ کو اطلاع دیدی کہ اب آئندہ اس شہر کو جگہ بندرگاہ کی حیثیت سے استعمال نہ کیا جاسکے گا، بعد یہ ساہرہ کی ضرورت اس لئے اور بھی نہیں کہ پولینڈ نے گڈنگن بننے و اپنا جگہ بندرگاہ نہ لیا ہے پولینڈ نے اس پر بہت کچھ احتجاج کیا لیکن ہیک کی بین الاقوامی عدالت ڈانزنگ کی موافقت میں فیصلہ دے دیا۔

لیکن بین الاقوامی معاملات میں انصاف کے ساتھ ساتھ بہت کچھ کر دفریب اور خود غرضی کو بھی

دھن تو ہے پونڈ نے دلالت کے اس فیصلے سے پہلے اور شاید اس فیصلہ پر اثر ڈالنے کے لئے یہ مشورہ کرنا شروع کیا کہ
 بلکہ کا جو ہم فوجی شکر منتر کر دیا گیا ہے اسکا نیا مرکز ڈانرگ بنا ہے اور یہاں فوج کے خلاف تمام کارروائیوں کے
 پیمانے جائیں گے اور پہلے پہل تو یہ شہر بلکہ کے ساتھیوں اور جرمنی کی مشترکہ حمایت میں ایک سخت سوکڑا جوڑ لگا دیا گیا
 اس خبر سے اکثر ممالک میں فضا ترود پیدا ہوا۔ اخباروں کے نمائندے جوق جوق آنے لگے لیکن اگر کیا کہ جرمنی سیاسی طاقتوں
 میں تو کسی قسم کے تضاد کا اندیشہ نہیں البتہ جرمن آبادی میں یہ اندیشہ ہے کہ مدت سادہ کے ختم ہوتے ہی پولینڈ کی فوج پڑے
 ہمیں تو بے ضابطہ و ضرور شہر ڈانرگ پر قبضہ کر سکی نظر ہر تو یہ اندیشہ بیدار قیاس و حد بہ ہوتا تھا لیکن سنہ ۱۹۳۹ء کے اکتوبر میں
 اسی پولینڈ کا ایک فوجی انسپکٹر جنرل زلی گوٹکی نے بے ضابطہ طور پر شہر واپس پناہ مانگی۔ اس سے متعلق
 کہ کر پولینڈ نے اس کے قتل کے تنازع سے اپنے کو بری الذمہ قرار دیا چاہا تھا
 کہ اسے سب کچھ حکومت کے ایذا، بلکہ حکم سے کیا تھا۔ چنانچہ پولینڈ کے سابق
 میں صاف صاف اقرار کیا ہے کہ وٹنا پڑھائی با ضابطہ سرکاری حکم

اس تجربہ کی وجہ سے اس اندیشہ کو اور بھی تقویت ہوئی اور مختلف ممالک کے نامہ نگاروں نے اسے خبر دی
 اس کی اطلاع بھیجی ایک حکومت نے تو اس کا اعلان ہی کر دیا کہ اسکا ایک فوجی جہاز شاید کیمپ کو ڈانرگ بھیجا جائے
 قبل از وقت افشا ہو جائے پولینڈ کے بے ضابطہ فوجی حملوں کے منصوبے سر دھڑکنے شروع ہوئے ہیں کیا بی حد کا نوچنے میں
 رادہ میں کامی ہوئی تو پولینڈ کے سائے کے سائے اخبار حمیت اقوام کے سینئر کنٹر کے پیچھے بڑھ گئے کہ اس کی نیر ماہدی نے
 بھی ان کے منصوبہ کو رو براہ ایسے بہت کچھ روکا۔ اب اس غریب پر طرح طرح کے الزامات لگائے جا رہے ہیں اور اسے نام کر نیکی تمام
 جتن کئے جا رہے ہیں۔

اسی زمانہ میں پولینڈ میں عجیب غریب مطالبہ بھی با ضابطہ پیش کیا ہے کہ ڈانرگ میں حاصل برآمد و درآمد کا اساتذہ
 اسکے سپرد کر دیا جائے یہ مطالبہ سلطانہ و سائی کی دفعات کے خلاف ہے لیکن پولینڈ کے امدادات نہایت شدید اس کی تائید
 کر رہے ہیں شہر ڈانرگ نے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے سے کھلم اٹھا کر کیل ہے اور اپنی جواب میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ نظام محکم
 پولینڈ کو دینے کے بعد ڈانرگ کا آزاد شہر فوجی سیاسی اور معاشی اعتبار سے بالکل پولینڈ کے ہاتھ میں چلا جائیگا اور کسی طرح آزاد
 شہر کہلانے جانے کا مستحق درجہ گا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ اسکے لئے تیار نہیں! دیکھئے آگے کیا ہوا!

شذرات

کارکنان اردو اکادمی چاہتے تھے کہ جامعہ ملیہ میں گرمی کی تعطیل ہونے سے پہلے اکادمی کا ایک اور جلسہ منعقد کیا جائے لیکن ایک تو جامعہ کے امتحانات شروع ہو گئے تھے دوسرے گرمی کی بڑی شدت تھی اس نے یہ خیال ترک کر دیا گیا اب امید ہے کہ ستمبر کے مہینوں کا سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا اور اپریل ۱۹۳۳ء تک ہماری رہے گا۔ اس عرصہ میں انشاء اللہ چند کچھ اور دو جامعہ منعقد ہوں گے۔

اکادمی کی طرف سے مولوی حفیظ الدین صاحب جوائنٹ منیجر جولائی کے مہینے میں مالک محروسہ حیدر آباد اور بار کا دورہ کریں گے تاکہ علم دوست حضرات کو اکادمی کا رکن نہیں ہیں امید ہے کہ جامعہ ملیہ کے سبب اردو علم ادب کے قدردان موصوف کو ہر طرح سے مدد دیں گے اور کارکنان اکادمی اور خطاب شیخ المجاہد صاحب کو زیر بار احسان فرمائیں گے حیدر آباد آج کل اردو زبان کا سب سے بڑا علمی مرکز ہے انجمن ترقی اردو کی کوشش سے اور جامعہ عثمانیہ جیسے عظیم الشان ادارے کی بدولت اردو دہلی طبقہ میں صحیح علمی مذاق پیدا ہو گیا ہے اور اس طبقہ میں بہ خلاف ہندوستان کے اور حصوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بھی داخل ہیں برآں میں اردو جاننے والوں کی آبادی بہت کم ہے لیکن جو تھوڑے سے لوگ ہیں وہ جامعہ ملیہ کی تعلیمی اور علمی خدمات کے بہت بڑے قدردان ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ مولوی حفیظ الدین صاحب کا یہ سفر کامیاب ہوگا۔

۱۸۔ جون کو عورتوں کی یونیورسٹی کا اٹھارہواں سالانہ جلسہ لمبے کے کاؤس جی جانیگر ہال میں باورام چند چٹرجی کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار نے سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی

ہیں کا خلاصہ یہ ہے کہ یونیورسٹی کے ماتحت چار کالج پڑنا۔ طبی، ڈیوڈہ، اور احمد آباد میں ہیں۔ طالبات کی مجموعی تعداد پچھلے سال ششترقی اور اب ۱۰۷ ہے یعنی کالج اسی سال قائم ہوا ہے اس کے پہلے سال میں ۱۱ اور غیرے میں چار طالبات ہیں پڑنا کالج کی پرنسپل کے عہدے سے اتھارڈ صاحب نے استعاف دیدیا ہے۔ اب ڈاکٹر مندر کلا بائی ڈیٹیا ٹڈے جی۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پرنسپل مقرر ہوئی ہیں۔ یونیورسٹی کے ماتحت متعدد اسکول بھی ہیں جس میں سے پڑنا کے اسکول نمبر ۳۳ روکیاں پڑھتی ہیں یہی میں دو اسکول ہیں جن میں سے ایک یہی بھی کنیاں لاہ میں طالبات کی تعداد ۲۴۳ ہے۔ پچھلے سال ۱۹۸ روکیاں انٹرنس کے امتحان میں شامل ہوئی تھیں۔ اس سال ان کی تعداد ۲۵۳ ہو گئی پچھلے سال ۹۱ نے کالج کے امتحانات دئے تھے اس سال ۱۲۲ نے دئے چائے اسکول کا احاطہ یونیورسٹی سے ہوا ہے جن میں سے دو صوبہ متوسط میں ہیں ایک گجرات میں اور ایک ۔

نئے بھی احاطہ کی درخواست دی ہے۔

باپورا، مندر چرمی صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں

نے تعلیم یافتہ لوگوں کا ذریعہ سہا سہو دے چند پیشوں میں محدود کر دیا ہے اور ان پیشوں سے سہو دے یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے کی شرط ہے اس لئے نئے تعلیمی اداروں کو جو مفید تجربات کرنا چاہتے ہیں ایک کی طرف سے مدد نہیں ملتی اس کی وجہ سے تعلیمی ترقی محدود ہو گئی ہے چنانچہ عورتوں کی یونیورسٹی کو تعلیم کا نایاب نام اور مفید تجربہ کر رہی ہے ابھی تک وہ مدد اور سہو دے نصیب نہیں ہوئی جس کی وہ محتاج ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ عورتوں کی تعلیم کی ضرورت عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے۔ اب سوال زیادہ تر یہ ہے کہ یہ تعلیم کن اصولوں پر مبنی ہو۔ یہ خیال تنگ نظری پر مبنی ہے کہ عورتوں کو مندری تعلیم نہ دی جائے۔ علم مشرق و مغرب کا پابند نہیں۔ یہ ہوا اور پانی کی طرح خدا کی ایک نعمت ہے جو ہر ملک کے لئے اور ہر فرد کے لئے عام ہے۔ البتہ اخلاقی تربیت ہر قوم کی اس کی مخصوص روایات کے سایہ میں ہونا چاہیے خصوصاً عورتوں کی تعلیم میں اس کا اور بھی خیال رکھنا چاہیے

ذریعہ تعلیم کے تعلق موصوف نے فرمایا کہ تعلیم انگریزی زبان میں ہونے سے پارے ملک میں پڑے

اور بن پڑھے مکتوں کے درمیان ایک فیصلج حاصل ہو گیا ہے جسے عموماً کرنا ناممکن ہے۔ شک ہے کہ عموماً
 کی تعلیم میں یہ افسوسناک طریقہ اختیار کر کے پر کوئی خیر نہیں مجبور نہیں کرتی جو رتوں کو انگریزی پڑھانے میں
 کوئی حرج نہیں لیکن اس کی تعلیم کا معیار اس سے زیادہ نہیں ہوتا چاہیے قبا انگلستان۔ فرانس وغیرہ
 میں ہوتا ہے جہاں یہ زبان ہر قدر ضرورت پڑھائی جاتی ہے۔

بالوصاحب کا یہ خطبہ ہر لحاظ سے نہایت معقول اور مدلل ہے، اس کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ
 موصوف ملک کی تعلیمی ضروریات کے پورے بغض شناس ہیں۔ ہیں امید ہے کہ سب ذی ہوش حضرات خصوصاً
 مسلمان ماہرین تعلیم اس خطبہ کا مطالعہ نظر غور سے کریں گے مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی جس قدر شدید ضرورت
 ہے اس کی طرف ہم پہلے مہینے کے شذرات میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ فی الحال اعلیٰ تعلیم کی اتنی ضرورت
 نہیں جتنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی ہے۔ لیکن یہاں بھی وہی صورت ہے جو لڑکوں کی تعلیم میں پیش آتی تھی
 کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم شروع ہونے کے لئے سب سے پہلے کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت محسوس ہوتی جو
 مسلم اور عیسائی رہنمائی کا کام کر سکیں۔ بلکہ لڑکوں کی تعلیم میں تو ابتدا میں انگریز معلموں سے کام پتار لیا کر رہا گیا
 تعلیم میں غیر ملکی مسلمات کو زیادہ دخل دینا مختلف وجوہ سے مناسب نہیں اس لئے مسلمان عورتوں کی
 ثانوی تعلیم کا مسئلہ اعلیٰ تعلیم کے مسئلے سے وابستہ ہے۔ اور اس پر بہت جلد غور کرنے کی ضرورت ہے۔

منشی جی کو انکار کرنا پڑا۔ ان کی چیب میں اس وقت ایک روپیہ تو تھا۔ مگر وہ اسے دینا نہیں چاہتے تھے۔ منشی جی نے گنا اور منشی جی بہت گھبرا گئے۔ اتفاق سے سینا ختم ہوا، اتنا شاید منشی جی کے ایک پرانے بھائی کے پاس بھی تھا۔ انھوں نے منشی جی کو اچھا دکھائے گا و عدہ کر کے موٹر پر بٹھالیا۔
 منشی جی بہت خوش ہوئے۔ منشی جی ایک اور موٹر میں سوار ہوئے۔ جیل پرانا دوست، موٹر کی سواری، گاڑی، ناچ، جنت، نگاہ، فردوس، گوش، منشی جی ایک اور موٹر میں سوار ہوئے۔ جیل کی طرف ان کا خیال بھی نہ گیا۔ جب موٹر چلنے لگی تو انھوں نے دیکھا کہ وہ وہاں اسی طرح چپ کھڑا ہے۔
 ”دلاری“ اور ”گرمیوں کی ایک رات“ اس مجموعے کے بہترین افسانے ہیں۔ جنت کی بشارت میں منشی جی بہت ہے، اور شری پارسانی کی قلعی کھولی گئی ہے ایک سن مولوی صاحب ہیں جنہوں نے عمر کا خیال کئے بغیر اور آٹھ بچوں کے باپ ہونے کے باوجود دوسری شادی کی ہے ان نئی دھڑکی وہ بے سولانا کی جان بنی ہیں۔
 مگر مولانا انھیں یقین دلایا کرتے تھے کہ ان کی داڑھی کے چنڈاں سبز کی وجہ سے سفید ہو گئے ہیں ان کے ان کی جوان بوی فوراً دوسرے ثبوت پیش کریں اور مولانا کو چپ۔

شب قدر کو مولانا مسجد میں گئے، غشا کے بعد ڈیڑھ دو بجے۔

محرگی کی حاضر لذت سے جسم نے نوا پائی، اور مولانا گھروا لبر۔

صحن کے ایک کونے میں ان کی بوی کا چنگ تھا۔ مولانا دب۔

سکا شانہ ملایا مولوی صاحب کی جوان بوی گہری نیند سو رہی تھیں۔ اور یہ رات سو رہی۔

آدھے جاگتے آدھے سوتے ہوئے دھیمی آواز سے پوچھا: ”اے کیا ہے؟“

مولانا اس نرم آواز کے سننے کے عادی نہ تھے۔ ہمت کر کے ایک لفظ بولے: ”دیا سلائی“
 مگر مولوی صاحب کی بوی کے شباب پر رات کی تاریکی، ستاروں کی جگمگاہٹ، اور ہوا کی خشکی نے اسے اطمینان کر دیا تھا۔ دیا سلائی کی درخواست کا انھوں نے جو جواب دیا اس سے مولانا کو ”جو اکی آرزو آدم کا پہلا گناہ“

زلیخا کا عشق، یوسف کی چاک دامانی، غرض عورت کے گناہوں کی تمام فہرست یاد آگئی مولانا فوراً

اپنی بوی کے ہاتھ سے نکل کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بتلی آواز سے پھر پوچھا: ”دیا سلائی کہاں ہے؟“

مولانا کو دیا سلائی مل گئی، اگرچہ نو جوان بوی کی زہر سے بھی ہوئی زبان نے ان کا دل بہت دکھایا اور وہ ایک تخت پر جا نماز بچھا کر قرآن خوانی میں مشغول ہو گئے۔ لیکن سورہ رحمن پڑھتے پڑھتے نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ وہ سو گئے۔ خواب میں وہ جنت پہنچے، وہ ایک کمرے میں تھے جس کی دیواروں پر قد آدم کھڑکیاں تھیں، ہر کھڑکی کے سامنے ایک دیرپے جس میں ایک برہنہ چور کھڑی تھی۔ مولوی صاحب پہلے تو شرانے پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتے ہوئے ایک کھڑکی کی طرف بڑھے لیکن انسان ایک بھی

ان کی وہ عزت اور قدر نہیں کرتا۔ تنقید کی آزادی۔
جو تنقید کو تو بہن اختلاف کہے۔

کاسے کٹر دشمن ہے لیکن اس پر غور کرنا زندگی کے ہر مصور کا فرض ہے کہ تنقید اور نکتہ بینی کا اس نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس کے مطلب کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔ گالی دینا بھی خیالات اور جذبات ظاہر کرنے کا ایک طریقہ ہے اور جسے خدا نے زبان دی ہے اس سے ہم گالی دینے کا حق نہیں چھین سکتے۔ مگر یہ سب جانتے ہیں کہ گالی دینے سے مطلب کہاں تک نکلتا ہے، ہنسی اڑانے کے بھی بہت سے طریقے ہیں بعض بات کو اس طرح ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ کوئی اصحاہ انداز ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، بعض آدمی کو اتنا خفا کر دیتے ہیں کہ وہ بھر اور کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتا۔ یہ ایک سوئی مسی بات ہے، مگر افسوس ہے، "انگاریے" کے معنیوں کو اس کا خیال نہیں ہوا۔ سجاد ظہیر صاحب کے افسانوں میں سے ایک "دلاری" اس زمانہ کی تعریف ہے جب وہ آرٹسٹ تھے

کسی نئے فلسفہ حیات کے مبلغ نہیں تھے کوئی نئی ذہنیت پیدا کرنے کی فکر میں نہیں پڑے تھے۔ اس افسانے کا موضوع اہل معاشرتی ہے اور اس میں ایک آبرودار خاندان کی بے حیائی، بد اخلاقی اور سنگدلی دکھائی گئی ہے۔ زبان، افعال، انداز ہر لحاظ سے یہ تصویر مکمل اور دلکش ہے اور آخری منظر کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔ گرمیوں کی ایک رات میں، مین آباد پارک کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اور ایک منشی برکت علی کی جن چیراسی سے پیچھا چھڑانے اور قرض دینے سے بچنے کی کوشش کا قصہ نہایت طرافت آمیز طریقے سے سنایا گیا ہے۔ منشی جی کو جن نے دیکھا، سلام کیا اور ان کے بچے لگ گیا۔ منشی جی سوچنے لگے کہ اس کا سبب آخر کیا ہے۔ انھوں نے منہ سے حال، حوالہ پوچھا تو اس نے اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیا۔ منشی جی اس کا مطلب مانگے، اور اس ارادے سے کہ، وہ یہ مانگنے کا موقع ہی نہ ملے وہ جن سے مذہب پر گفتگو کرنے لگے؛ اور نبی اسرائیل پر جو عیبتیں نازل ہوئیں ان کا ذکر کیا۔ جن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ "آخر یہ نبی اسرائیل بچائے کون تھے"۔ اس پر منشی جی کو بہت حیرت ہوئی۔ انھوں نے جن کو بہت لعنت و لعنت کر کے پوچھا:

"حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا نام بھی تم نے سنا ہے؟"

"جی کیا فرمایا آپ نے؟ کلیم اللہ؟"

"ارے یہی حضرت موسیٰ۔ موسیٰ..... سا؟"

"موسیٰ..... وہی تو نہیں جن پر نکلی گری تھی؟"

منشی جی ٹھٹھا مار کر بیٹھے، مگر مذہبی گفتگو کا سلسلہ کہاں تک دکھا جاسکتا تھا۔ انھوں نے دنیا کے قریب پیچھا چھڑانے کی کوشش کی مگر جن کو واقعی روپے کی ضرورت تھی، وہ کب انھیں جانے دیتا۔ آخر میں وہ مانگ ہی بیٹھا اور

اسلام۔ ایک تاریخی عقد

ہم لوگ لفظ 'اسلام' کو مختلف معنوں میں استعمال کیا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم اس سے ذہن اسلام مراد لیتے ہیں، خواہ وہ محمد کی ابتدائی تعلیمات ہوں یا تکمیل کا نظام عقاید جو بنیادی طور پر مختلف ہے، یا ایسیا اور افریقہ میں بسنے والے مسلمانوں کے موجودہ مذاہب۔ ہم ایک ہی لفظ 'اسلام' استعمال کرتے ہیں خواہ ہم ترکوں کی دینی تحریکات کا ذکر کر رہے ہوں یا جہشیوں کی، خواہ یہ خوالی سے بحث کر رہے ہوں یا سودانی مہدی سے۔

یہ عظیم الشان شرعی سلطنت کو بھی موسوم کرتے ہیں
سلطنت کے کھنڈ پر تعمیر ہوئیں اور آج کل کی مسلم

ریاستوں کے لئے ہی لفظ 'اسلام' استعمال نہیں کرتے بلکہ یہ۔

• بنیادی تعلیمات کا نتیجہ ہو یا اخروی تعلیمات کا۔ پھر آخر میں ہم اس لفظ سے وہ تمدنی شکل مراد لیتے ہیں جو دین اور ریاست دونوں پر حاوی ہے۔ ایک ایسا تمدن جو باوجود تمام مکانی اور زمانی اختلافات کے بھی بظاہر ایک واحد رنگ رکھتا ہے۔ اسلامی دین، اسلامی تمدن یا اسلامی حکومت سے وابستہ ہونے کو ہم ایک ایسا امتیازی نشان اور اتحادی عنصر سمجھتے ہیں کہ آری، سامی اور عیسیٰ مختلف نسلوں کے افراد کو ہم ایک مشترک نام 'اسلام' سے موسوم کر دیتے ہیں۔

لیکن ہم اس مسئلے پر قبضہ زیادہ غور و خوض کرتے ہیں حقیقت واضح تر ہوتی جاتی ہے کہ ہمیں امتیازات قائم کرنے کی ضرورت ہے اور اس امر پر چہاں تک زور دیا جائے کم ہے کہ خصوصاً ایسی حالت میں جب گوشش تفضیلی اقدار کے متعین کرنے کی ہو اس کی اشد ضرورت ہے کہ ہم صاف صاف بتا دیں کہ لفظ 'اسلام' سے ہماری کیا مراد ہے۔ پھر بھی باوجود ہر قسم کی اقبایط اور تحدید کے اس مشترک اور مجموعی لفظ 'اسلام' کے استعمال سے بچنا ممکن نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ

جانیے یعنی کیا تمام پہلوؤں پر یہ نفاذ اسلام جو درحقیقت ایک دین کا نام ہے حاوی ہو سکتا ہے۔
 اس نقطہ کے تجربے کے سلسلے میں ہم ان عناصر کا ذکر کر چکے جو مل کر اسلام کا مجموعی تصور پیدا کرتے ہیں یعنی ایک مشترک ایمان، ایک مشترک سیاسی سطح نظر اور ایک تمدن جو باوجود مقامی اختلافات کے کم از کم اپنے نظریے میں تو ضرور اور ایک حد تک اپنے عمل میں بھی یک رنگ اور یک آہنگ ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مختلف عناصر کو یکجا کرنے والی قوت 'دین' ہی ہے اور دین ہی پر تمدن کا سیاسی نصب العین کی بنیاد ہے۔ اس زمانے میں تو ضرور ہی دین اسلام اتحاد کا ایک ایسا رشتہ ہے جو قومیت کی رو کا مقابلہ کر کے مختلف اقوام کو ایک رشتے میں منسلک رکھنے پر ایک حد تک قادر ہے۔ اگر مشرقی افریقہ کے 'وانگنڈو' قبیلے کا کوئی رکن دین اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس کے بعد وہ اپنی قوم کا نام 'وانگنڈو' نہیں اسلام بتاتا ہے۔ عرب مسلم حبشی مسلم کا بھائی ہو جاتا ہے اور یہ مختلف لوگ ایک دینی مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں۔ سچی یورپ کے خلاف بالخصوص تمام دنیا کے مسلمان متحد نظر آتے ہیں۔ چونکہ دین کی اہمیت روزمرہ زندگی کو ہر جگہ کم و بیش ایک ہی رنگ دے دیتی ہے اس لئے ہم ایک ایسے مشترک تمدن کے وجود کو تسلیم کر سکتے ہیں جس میں دین فیصلہ کن عنصر ہو۔

نامہ موجودہ کی اس ناقابل انکار صورت حال کی بنا پر اسلام کے تاریخی ارتقا کو سمجھنا اور زیادہ دشوار ہو گیا ہے۔ چونکہ آج کل دین ہی ایسا عنصر ہے جس پر ہر چیز کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور چونکہ اسلام کا تاریخی طور ایک دین کے بانی کا زمین منت ہے اس لئے اس سے زیادہ اور کیا بات قرین قیاس ہو سکتی تھی کہ دین ہی وہ عنصر ہو گا جس نے اسلام کے مشترک تمدن کو اگر کلیتاً نہیں تو کم از کم بہت بڑی حد تک پیدا کیا۔ دوسرا سبب ہر چیز کو مولویانہ نظر سے دیکھنے کی عادت ہے جو ہم کو ازمنہ وسطیٰ سے ورثے میں ملی ہے اور اب تک اسلام سے متعلق یہی نقطہ نظر عموماً قائم ہے یہ صرف اس زمانے میں بلکہ عہد جدید کی ابتدا میں بھی اسلام کو محض اس نظر سے دیکھا جاتا تھا کہ وہ ایک مخالف دین ہے جس نے مسیحیت کی اشاعت کو روکا اور اس کے ماسن اور لمبا تک کو خطرے میں ڈال دیا۔ اسلام کے تاریخی ارتقا کا جو تصور قائم کیا گیا وہ یہ تھا کہ نئے دین نے عربوں میں جوش

پیدا کیا۔ تبلیغ دین کے جذبے نے انہیں اپنے گھروں سے باہر نکالا۔ تلوار کے ذریعے انہوں نے اپنا
 دین پھیلایا۔ محمد ایک ہی قالب میں نبی اور سیاسی دونوں تھے اور اسی وجہ سے ایک عالمی سلطنت کا
 تخیل پیدا ہوا۔ اس نئی سلطنت میں قدیم عربی تہذیب اور جدید اسلامی دین نے مل کر عربی اسلامی
 تمدن کی تعمیر کی اور اگرچہ ظہور اسلام سے پہلے کے بہت سے تصورات اور ادارے قائم رہے لیکن
 دین نہ صرف تمدن کی پیدائش کا سبب اول تھا بلکہ اسی نے اس کی تعمیر اور تنظیم بھی کی۔ اسی وجہ
 سے فطری طور پر دین نے پورے تمدن کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا۔ یہ تھا 'رنگ اسلامی
 تمدن' کا تصور۔

اگر کوئی اس تصور کو لے کر جو سمیت کی ارتقا کی غذا
 مطالعہ کرے تو اس کے تصور کی تصدیق فوراً ہو جائے گی۔
 موجود ہے۔ وہاں بھی یہی خیال موجود ہے کہ اسلام کی

راشدین کے عہد زندگی کا ریاست اور معاشرت علوم اور معانی
 ہیں۔ اگر نظریے کے اس مرتبہ باغ میں کبھی کوئی خشکی پودا لگ آتا ہے تو وہ بدست لگ کر کھڑکھڑایا
 جاتا ہے۔ کم از کم فطری طور پر تو ضروری اسلامی دنیا پر۔ ماضی اور حال دونوں میں۔ دین ہی
 کی حکومت ہے۔

ابھی بہت دن نہیں گزرے ہیں۔ اور آئندہ زمانہ کریم کی قابل قدر تاریخ تمدن کے شائع
 ہونے کے کچھ دنوں بعد کی یہ بات ہے۔ کہ جدید اصول تنقید نے اس میدان میں قدم رکھا ہے۔
 تحقیق نے آہستہ آہستہ اسلامی روایات کی پابندی سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا اور ہم نے سیاست اور
 قانون، مذہب اور زندگی، نظریہ اور عمل میں امتیاز کرنا سیکھا۔ ہم نے تکالیف شرعی اور قومی عادات کی
 جنگ میں بیشتر مؤثر الذکر کو فتح پاتے دیکھا اور یہ بھی محسوس کیا کہ تصورات کی کشمکش میں بے شمار مواقع
 پر دینی رنگ اسلوب بیان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ہم نے معلوم کیا کہ فقہ کی بنیاد عمل پر نہیں رکھی
 گئی بلکہ عمل سے الگ ہو کر اور بیشتر اس کے خلاف۔ اور آخر کار ہمیں یہ بھی یقین آ ہی گیا کہ عربی سلطنت

کے بانیوں نے اپنے دین کی تبلیغ نہیں کی بلکہ صرف عربوں کی دنیاوی طاقت کو پھیلایا کیا یہ انصاف ہمارے لئے ہمارا مان نکر نہیں فراہم کرتے اور کیا ان کی موجودگی میں ہیں اپنے اس روایتی تصور کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہے جو اسلامی تمدن پر دین کے اثر کا ہم نے قائم کر لیا ہے۔

یہ عقیدہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جیسا کہ پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے۔ اس سے تو کوئی بھی انکار نہیں کرے گا کہ اسلام کی ابتدا ایک مذہبی وجدان سے ہوئی ہے لیکن محمد کی اس ذہنی کیفیت کے جو بنیادی طور پر مذہبی تھی، اور بعد ماضی کی اسلامی اتحاد کی تحریکوں کے بیچ میں ایک بہت بڑا اضافہ ہے جسے ایک ناواقف بلا کسی خیال کے بہت جلد طے کر جاتا ہے۔ بانی اسلام کے مذہبی تخیل نے تمام موانع کو کس طرح رفع کیا یا ایک فرد کے مذہبی خیالات نے کس طرح ارتقائی منازل طے کر کے ایسے عالمی اور یک رنگ تمدن کی شکل اختیار کر لی جس میں دین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے؟ اگر ہم اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے اپنے ذہن کو روایات سے آزاد کر لیں تو دین کی عظمت اور اہمیت تو ہمیں ضرور تسلیم کرنی پڑے گی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کے دوش بدوش سیاسی طاقت کا جذبہ بے پایاں اور معاشی ارتقاء کے نتائج بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ تو گویا ہمارے عقیدے کا حل اس سوال میں مضمر ہے کہ 'اسلام کا ایک رنگ تمدن کس طرح وجود میں آیا اور اس ارتقاء میں مذہبی جذبے کو کتنا دخل رہا ہے؟'

ہم دین اسلام کی اشاعت کے مطالعے سے ابتدا کرتے ہیں۔ یہ فرض کرنا بعید از قیاس نہ ہو گا کہ کم از کم یہ کلیتہاً مذہبی تو بڑی حد تک ضروری دینی جوش اور جذبہ تبلیغ کا نتیجہ ہو گی۔ کئی عہد میں بے شک ایسا ہی تھا۔ میں اس مورخ کی رائے کو تسلیم نہیں کر سکتا جو محمد کو ایک ایسا سیاسی سمجھتا ہے جو شروع ہی سے سمیت اور بت پرستی کے درمیان محض داؤ گھات کی تلاش میں ادھر سے ادھر پھیرا ہوا ہو۔

Hugo Winckler, Arabisch - Semitisch - Orientalisch,

1901, pp. 52 et seq.

وستان کھدوہوں نے مشرق قریب میں اپنا دین بزدل شہر پھیلایا، مسیحی مسکین کے لئے کتنی ہی کارآمد کیوں نہ ہوں لیکن اس موقع پر اس کی تفصیلی تردید کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہر جگہ مفتوحہ اقوام کو اپنے دینی لوکان کے ادا کرنے کی پوری پوری آزادی تھی بہ شریکہ سیاسی حیثیت سے وہ عربی اسلامی ریاست کے فرماں بردار رہے۔ اس صورت حال سے یقینی طور پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلام اب محمدؐ کی کامض تبلیغی دین نہیں رہا تھا۔ ممکن ہے کہ سیاسی امکانات کا اثر اس پر پڑا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس عہد میں عربی قومی عنصر عالمی دینی عنصر پر غالب آگیا تھا۔ بعض متشکیک افراد سے قطع نظر عام طور پر عربوں نے مفتوحہ اقوام کو تبلیغ دین کی ہی نہیں۔ دور حاضر کے مستعمرین کی طرح وہ بھی خراج ادا کرنے والے ذمیوں کے اور ایک اعلیٰ طبقے کی حیثیت رکھتے تھے۔ 'شہری' صرف عرب ہو سکتا تھا جو علقہ اسلام میں کم و بیش اسی طرح داخل ہوتا تھا جس طرح آج کل قومیت حاصل کی جاتی ہے۔ اس طرح مشرق قریب پر عربی حکومت کا قیام کیفیت اور زمانے دونوں کے لحاظ سے دین اسلام کی اشاعت کے تمیز اور مختلف ہے۔ ان دونوں میں کہیں ایک اور کہیں دو یا تین صدیوں کا فرق ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم ان دونوں عناصر کے تاریخی ارتقا کا۔ جنہوں نے مل کر اسلام کے یک رنگ تمدن کو ترکیب دیا ہے۔ الگ الگ مطالعہ کریں۔

وجہ مذکورہ بالا سے یہ تو کہا ہی نہیں جاسکتا کہ ریاست اسلامی کی توسیع محض جذبہ دینی کی رہیں منت ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں مشرق میں جو واقعات رونما ہوئے ان کو سمجھنے میں جو تصور ہمیں سب سے زیادہ مدد دیتا ہے وہ 'ہجرت اقوام' کا تصور ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پہلے بھی عربوں کے فاتحانہ اقدام کو ایک مذہب قومی ہجرت سمجھا گیا ہے اور اس کی توجیہ میں مسیحی اسباب بھی پیش کئے گئے ہیں لیکن تھوڑے دنوں پہلے تک دین ہی کو عام طور پر سبب اصلی قرار دیا جاتا تھا۔ یہ سہ ہو گا جو منکر کی قابلیت تھی کہ اس نے سب سے پہلے عربی قومی ہجرت کی تاریخی حیثیت کو نمایاں کیا۔ اس کے اشارات سے فائدہ اٹھا کر بعد میں لیونے کائناتی نے اپنا مشہور لیکن مختلف خفیہ نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے کی رو سے عربی ہجرت وہ آخری بڑی سامی ہجرت ہے جو جزیرہ نمائے عرب

یعنی سامیوں کے مرکز سے تمدن دنیا کی طرف ہوئی۔ اس نظریے میں نئی بات یہ ہے کہ اس کی رو سے یہ تہام ہجرتیں۔ جیسا کہ عام قاعدہ ہے۔ ہزاروں سال کی تدریجی موسمی تبدیلی یعنی ملک کی تدریجی خشکی کا قیومہ تھیں۔ وہ جذبہ دینی نہیں تھا بلکہ ہجوک کی شدت تھی جس نے عربوں کو اپنے وطن کے حدود سے باہر نکالنا بالکل اسی طرح جیسے ہزاروں سال قبل سامی قبائل نے ہجرت کی تھی۔

میں اس نظریے سے بالکل متفق ہوں اس لئے کہ اس کا ثبوت تاریخی واقعات سے ہوتا ہے۔ محدثے صدیوں پہلے سے عرب میں ایک ہیسانی کیفیت رونما تھی۔ جنوبی قبائل شمال میں آکر آباد ہو رہے تھے۔ سرحدی قبائل تمدن ممالک پر چھوٹے چھوٹے حملے کرتے رہتے تھے اور غالباً یہ صحیح ہے کہ عرب میں اس وقت سے کبھی امن ہو ہی نہیں جب کہ پہلی جماعت۔ نہ اس ملک سے ہجرت کی۔ یہیں اس ملک کے تدریجی معاشی تنزل کی تاریخی شہادت کم ہونے کا خاص طور پر ذکر ہے اور جیسا کہ قدیم مصنفین اور قدامت سے ہو رہا تھا۔ یہ تو فرض نہیں کیا جاسکتا کہ پانی کی کمی اور ہوائی۔

کو پہنچ گئی اس لئے کہ یہ صورت حال تو ہزاروں سال میں پیدا ہوتی ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض موسمی تبدیلیاں بہت تیزی سے ہوئی ہوں جن کا سبب جنگوں کا کم ہو جانا یا سمندر کے دھاروں کی تبدیلی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اقوام میں ان تبدیلیوں کا رد عمل بھی جلد نہیں ہو کرتا۔ غالباً عرب اپنے ملک سے باہر نہ جاتے اگر ان کی پشت پناہی کے لئے اسلامی فوجی طاقت نہ ہوتی اور ٹھیک اسی زمانے میں ایران اور بازنطین کی حالت دعوت فتح نہ دیتی ہوتی۔

اس نظریے کی صحت کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ اس عظیم الشان قومی ہجرت کا اور کوئی سبب ہجر معاشی سبب کے باقی ہی نہیں رہتا اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ دینی سبب بہت جزوی

حیثیت رکھتا تھا۔ اگر عربوں کی معاشی حالت اچھی ہوتی تو وہ غنیمت کی امید میں اپنے وطن سے باہر ہرگز نہ جاتے۔ ہاں جذبہ دینی کی ایک لہران کو اپنے گھروں سے نکال سکتی تھی لیکن اس حالت میں جدید اسلامی ریاست کا وہ یہ ملک عرب سے باہر ایسا نہ ہوتا جیسا فی الواقعہ تھا۔

اسلامی حکومت کی توسیع کے محرک معاشی اسباب تھے لیکن یہ ایک سلطنت قائم کرنے کے لئے کافی نہ تھے۔ عربی قبائل پر حرکت پیم طاری تھی لیکن اگر وہ الگ الگ باہر نکلتے تو زبردست فوجی طاقت کے مقابلے میں کیا کر سکتے تھے خصوصاً ایسی حالت میں کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن تھا اور کسی قوم کا اتحاد عمل ممکن نہ تھا۔ اس کمی کو اسلام نے پورا کر دیا۔ اس سے یہ نہ بچھ لینا چاہئے کہ اسلام نے قبائلی منافرت کو کمیر مٹا دیا کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ شمالی اور جنوبی عربوں کی منافرت عہد اسلامی میں ہی پایہ کمال کو پہنچی تھی۔ محمدؐ نے جب دور کے قبیلوں کو اپنے علم کے نیچے جمع کیا تو اس وقت سیاسی طاقت حاصل کرنے کی خواہش دینی جذبے پر غالب آچکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ دین ہی کی وجہ سے ابتدائے میں سیاسی نظم ممکن ہوا اور دینی جمعیت پر ہی ریاست کی بنیاد رکھی گئی لیکن اس کے بعد جمعیت نے نہیں بلکہ ریاست نے اپنے سیاسی اغراض کے لئے عربی قومی ہجرت سے، جو اس کے قیام سے پہلے شروع ہو چکی تھی، فائدہ اٹھایا۔ ان لوگوں کی سیرت کا مطالعہ کیجئے جنہوں نے عربی سلطنت کی بنیاد رکھی خالد بن الولیدؓ اور عمر بن العاصؓ نظر ثنائی اور حکمران تھے۔ دین کا اثر ان پر بہت کم ہوا تھا اور دین سے ان کو سروکار تھا تو اتنا کہ اپنے اغراض کے لئے اس کو استعمال کرنا جانتے تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ یا ان کی مہمی طبیعت رکھنے والے اور دینی مسائل میں غور و فکر کرنے والے افراد نے اس توسیع سلطنت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ مدینے کی حکومت اور اس کے سپہ سالاروں نے اس تحریک کو اٹھایا لیکن بہت جلد یہ خیران کے بس سے باہر ہو گئی۔ یکملی ہوئی بات ہے کہ شروع میں مرکزی حکومت اپنی کامیابی سے خود ہی پریشان ہو گئی تھی لیکن پھر عربی ناقابل انکار سیاسی دور بینی اور استقامتی قابلیت سے کام لے کر اس نے قبائل کی حرم غنیمت پر حدود و عاید کئے اور آہستہ آہستہ منقطعہ علاقے کے نظم و نسق کی ایک طرح ڈالی۔

کلہ اتحاد و طور اسلام تھا لیکن اس کے معنی تھے عربوں کا قبضہ تمام دنیا پر۔ اس قومی شعار میں
جلاشہ دینی عنصر موجود تھا جیسا کہ مشرقی اقوام کی ہر بڑی تحریک میں ہوتا ہے لیکن باریک بینی نظر سے قومی
اور دینی عناصر میں بہت آسانی سے امتیاز کر سکتی ہیں خصوصاً تبلیغ دین کے معاملے میں یہ بات بالکل
صاف ہو جاتی ہے۔ غیر عرب کے لئے حلقہ اسلام میں داخل ہونا اسی وقت ممکن تھا جب وہ کسی عربی
قبیلے سے منسلک ہو جائے۔ قومی عنصر غالب تھا۔ نہ تبلیغ دین کے جذب نے اور نہ رسولؐ کے پر جوش
الفاظ نے عربوں کو اپنے وطن سے نکالا تھا اور نہ ان کی غرض یہ تھی کہ لوہار اور زبان کی قوت سے
تمام دنیا کو حلقہ اسلام میں داخل کر لیں بلکہ خروج کی وجہ تو معاشی تکلیف اور تباہی کی بے چینی تھی۔
اس میرے بقول کامیابی کا راز یہ ہے کہ ان کی خوش قسمتی سے ان کے لئے ایک
جدید ریاست کا جذبہ جہاں گیری تھی اور ان کی باگ با عظمت
اس طرح اسلامی سلطنت قائم ہوئی۔ لیکن سوال یہ

کے دین اسلام مفتوحہ اقوام میں کس طرح پھیلا۔ جب اشاعت دین یہ
وجہ ہی ہو سکتی ہے کہ تبلیغ دین میں بہت جدوجہد کی گئی ہو۔ یہی رائے سرتاسر آرنلڈ کی ہے جن
کی اچھی اور مکمل تصنیف سے لوگ کما حقہ واقف نہیں ہیں۔ لیکن آرنلڈ کو بابہ بابہ دشواری محسوس
ہوتی ہے کہ اس تبلیغی جدوجہد کی شہادت بہت کم ملتی ہے۔ شہادت کی کمی بالکل تعجب انگیز بات
نہیں ہے اس لئے کہ تبلیغ دین اسلام مقصود بالذات نہیں تھی بلکہ وہ تو ایک معنسی نتیجہ تھی اہل اسلام
کے امصار و یار میں پھیلے مکا۔ دین اسلام کی ابتدائی تبلیغ غالباً آج کل کی تبلیغ سے کچھ بہت زیادہ
مختلف نہیں تھی بلکہ اُس زمانے میں دشواریاں زیادہ تھیں۔

دین اسلام کی اشاعت مراد وہ تھی مگر اہل طبقے میں اضافے کی جس کا لازمی نتیجہ تھا خراج

اداکارنے مالی رعایا میں کمی۔ یہ نہ تو حکومت کے لئے مفید تھا اور نہ عرب حکمران طبقے کے لئے اس میں شک نہیں تھا۔ ابتدا ہی سے ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کو اشاعت دین کے مقابلے میں خراج کی کمی کی پروا نہیں تھی لیکن ظاہر ہے کہ ان افراد کا کیا اثر ہو سکتا تھا جب ریاست کی بنیاد مسلمان اور غیر مسلم کے فرق پر تھی۔ یہ بات کہ عربوں کو اشاعت دین کی بہت کم توقع تھی اور انہوں نے اس کے لئے بہت کم کوشش کی اسی سے ظاہر ہے کہ جب کثرت سے لوگ ملتہ اسلام میں داخل ہونے لگے تو ان کو اپنا سارا نظام مالیات و معاشیات بدل دینا پڑا۔ یہ واقعہ ہے کہ عربی ریاست کی خسرابی کی صورت خود اس کی تعمیر میں مضمر تھی۔ وہ اس طور پر کہ اس نے شروع سے ہی ملتہ اسلام میں غیر عرب کا داخلہ ممنوع نہیں قرار دے دیا۔ یہ ظاہر ہے کہ جب رعایا کو راعی بننے کے لئے بس اسی کی ضرورت ہو نہ کسی دین کو خارجی طور پر اختیار کر لے تو امتیاز طبقات کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن غیر عرب کا اسلام لانا ممنوع نہیں قرار دیا جاسکتا تھا اس لئے کہ یہ اسلام کے دینی رجحان کے خلاف ہوتا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ دین محمدی کا دروازہ کسی کے لئے بند کر دیا جاتا۔ یہاں پہنچ کر عالمی دین کے تصور نے قومی ریاست کے اصول کو توڑ دیا حالانکہ ابتدا میں یہ دونوں عناصر ایک دوسرے میں ضم تھے۔ ریاست کی طاقت اور دینی تبلیغ کی کمی کی یہی دلیل ہے کہ یہ تیسرے قرن اول ہی میں نہیں ظاہر ہوا۔ اہل ریاست کو تبلیغ دین کے اس تجربے میں عضو کا اس وقت احساس ہوا جب وقت گزر چکا تھا۔

چند ہزار افراد تھے تو غالباً فتح کے بعد فوراً ہی دین اسلام قبول کر لیا۔ شہری آبادی نے ضرور یہ کوشش کی ہوگی کہ جلد سے جلد حکم ران طبقے میں شامل ہو جائے۔ جب تک ملک کے لاکھوں افراد نے دین تبدیل نہ کیا تھا بعض افراد کی تبدیلی عربوں کے لئے نہ صرف فوجی بلکہ معاشی حیثیت سے بھی بہت زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ خصوصاً اعلیٰ طبقے کے چند ہزار افراد نے تو مصلحت اسی میں دیکھی کہ عربوں سے گہرا تعلق پیدا کیا جائے۔ اسی حلقے میں مسلم اور سنی علما کے درمیان مناظرے بھی ہوا کرتے تھے۔ ہمارے ذہن میں ان مناظروں کی ایک دھندلی ہی تصویر یو خادشی کی تصانیف سے قائم ہو سکتی ہے۔ مگر ان مناظروں سے دین اسلام کی اشاعت میں غالباً بہت کم بددلی۔ زیادہ اثر تبلیغی کوشش کا

ہوا لیکن اس وقت جب یہ کام عربوں کے ہاتھ سے۔ جن میں دینی جذبہ بہت زیادہ نہ تھا۔ مکمل کر آرمیوں کے ہاتھ میں۔ جن کی دینی تعلیم و تربیت عرصے سے ہوئی تھی۔ پہنچا۔ ہم اس پہلو پر بعد میں نظر ڈالیں گے۔

ان مبلغین کی تبلیغ و ارشاد سے زیادہ محرک وہ معاشی فوائد تھے جو کسی نو مسلم کو عرب کا مولیٰ بن جانے سے حاصل ہوتے تھے۔ مولیٰ کو ابتدا میں گراں بار خراج سے معافی مل جاتی تھی اس معصوم پر یہاں تفصیلی بحث ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شہری زندگی کے بہت سے منافع بھی حاصل ہوتے تھے اور عربی معاشرت میں داخل ہونے کا شرف بھی ملتا تھا۔ نئے نئے ملک کا تہہ اچ کرنا کچھ آسانا زادہ شہر بھی نہیں تھا اس لئے کہ اس زمانے میں جب عقاید کی ترتیب میں کچھ بہت زیادہ فرق نمایاں نہیں تھا۔ یہ بظاہر ایک نیا مذہب اور سامی ذہن اس زمانے کی مسیحیت کے مقابلے میں

تھی اسلام میں ایک روحانی مناسبت پاتا تھا۔ پھر اسلام حکمراں جماعت کا دین تھا۔ وہ یہودی بنی غیر تائید ایزدی کیسے حاصل ہو سکتی تھی۔ ان وجوہ سے اسلام کی ذہنی مخالفت اتنی قوی نہیں تھی کہ وہی فوائد کی موجودگی میں لوگوں کو اپنا دین بدلنے سے روکتی۔ معاشی منافع کو اپنا خوشگوار اثر آزادی سے پھیلانے کا موقع ملا۔ پھر بھی قدیم ادیان کی مضبوط گرفت کی وجہ سے یا ممکن ہے ذرائع آمد و رفت کی کمی کی بنا پر فتح کے تقریباً نصف صدی بعد لوگوں نے حلقہ اسلام میں اتنی تعداد میں داخل ہونا شروع کیا جس سے ریاست کے نظام مالیات میں اتنی بڑی واقع ہوئی۔ مدبر اعظم حجاج کے زمانے میں ہی ایسے ذرائع کی تلاش شروع ہو گئی تھی جو دین اسلام کی اشاعت کے ملک اثرات کو روک سکیں۔ بعد اموی کا آخری زمانہ تمام تر اسی کوشش میں صرف ہوا کہ عربی ریاست کے اصول اور دین اسلام کی کثیر اشاعت میں مبالغہ پید کی جائے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ قوانین مالی میں بہت سی بنیادی تبدیلیاں ہوئیں۔ ابھی تک ہم لوگ ان تبدیلیوں سے برائے نام واقف ہو سکے ہیں۔ اس کے بعد قبول اسلام

کاتبہ خراج ہے آراوی نہیں ہوتا تھا اگرچہ کچھ معاشرتی منافع اور حکمران طبقے کی یک گونہ مساوات ضرور حاصل ہوتی تھی۔

دین اسلام کی اشاعت بڑے پیمانے پر دراصل اس وقت شروع ہوئی جب عربی قومی ریاست کی دیواریں منہدم ہو گئیں اور نظام معاشرت کی بنیاد قومیت پر باقی نہ رہی۔ یہ عظیم الشان تبدیلی بنی عباس کے ابتدائی عہد میں واقع ہوئی۔ اس کے متعدد اسباب تھے سب سے زیادہ اہم سبب یہ تھا کہ آہستہ آہستہ مفتوحہ اقوام کی ذہنی اور مادی تمدنی فوقیت نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ جب تک عرب اپنے محکمہ میں متبع رہے، مفتوحہ اقوام سے الگ تھلگ رہے، اور فوجی سرداروں کی حیثیت نہیں بدلی۔ اس وقت تک ان کی فوقیت بھی قائم رہی لیکن جب یہ لوگ کثیر تعداد میں اپنا مرکز چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں آباد ہونے لگے اور امن قائم ہو گیا، جب عربوں کو حکومت سے طغیہ مٹا بند ہو گیا اور انھیں خود کسب معاش کرنا پڑا، جب موالی کی کثرت سے عرب عجم کا امتیاز مٹ گیا تو پھر ان کے پاس کوئی چیز ایسی نہیں رہ گئی جو مفتوحہ اقوام کی عظیم الشان فوقیت کے اظہار کو روک سکتی۔ یہ شہر میں بھی ہوا اور دیہات میں بھی۔ جب عرب کی حیثیت زمیندار کا شکار یا ادنیٰ تاجر کی ہو گئی جس میں یا تو وہ نو مسلم کارگیروں کا دست نگر ہوتا تھا یا زیادہ سے زیادہ ان کا ہم چشم تو پھر اسے اپنی شان امتیاز قائم رکھنے میں بڑی دشواری پیش آنے لگی۔

جو حالت معاشی زندگی کی ہوئی بجنسہ وہی ذہنی زندگی کی بھی ہوئی۔ آرامی یونانی اور ایرانی تہذیب اور روایات کے لحاظ سے عربوں پر اس درجہ فوقیت رکھتے تھے کہ عرب بے چارہ ناشائستہ دیہاتی شمار کیا جانے لگا اور اسے مشرقِ قریب کے تمدنی عادات اختیار کرنے میں

(2) Becker, Beiträge zur Geschichte Aegyptens (بقیہ نوٹ صفحہ ۴۲)

II p. 81 et seq.

(3) Becker, Papyri Schott Reinhardt 39 et seq.

بڑی دقت ہوئی۔ اب اس رد عمل کے مقابلے میں عرب کے پاس نہ تو معیشتی طاقت تھی اور نہ کوئی تمدنی عنصر۔ دے دے کر ایک دین رہ گیا تھا جو بلاشبہ عربی تھا۔ ان حالات میں دین کی اہمیت و بوج آشکارا ہوئی اور وہ لوگ بھی جو پہلے بے پروا تھے دین کی قدر کرنے لگے۔ دین کی رونق ہی ایک چیز تھی جس کو عربوں سے کوئی نہیں جھین سکتا تھا۔

عربوں کی فوقیت اتنی جلد معرض زوال میں نہ آتی اگر حکومت نے، اب ریاست کے سیادت کی اصول کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہوتی لیکن حکومت بھی مجبور تھی کہ رعایا کی اکثریت کے سیاسی خیالات کی رعایت کرے اور یہ خیالات ایک فرد غالب کے لئے منبہ تھے بھی۔ عہد اموی میں ہی اب اس ہو چکی تھی لیکن عہد عباسی میں تو پوری طرح قدیم مشرقی مطلق العنان

حاکم کی خداوندی، آداب و مراسم شاہی کی حفاظتی دیواریں، نما

اور غلاموں اور دربانوں کے فوجی دستے شامل ہیں، جلوہ آراہ۔

شان خود حاکم اعلیٰ کو ناگوار ہونے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم مشرقی ریاست

اور اب بجائے حاکم اور محکوم اقوام کے صرف ایک فرد حاکم رہ گیا اور باقی سب اس کے محکوم خواہ وہ عرب ہوں یا عجم۔ یوں فرق مراتب بالکل اٹھ گیا اور رعایا نے حاکم کے دین کو قبول کرنے میں سبقت کی۔ اس کے علاوہ جب حاکم اور محکوم طبقوں میں میل جول بڑھا تو عربی زبان بھی رائج ہوئی اور عربی دین بھی۔

اب اشاعت دین بہت تیزی سے ہونے لگی۔ عربوں نے مفتوحہ اقوام کو حلقہ اسلام میں

داخل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب تبلیغی کام ان کے ہاتھ میں نہیں رہا بلکہ نو مسلم اور ان کی اولاد نے یہ کام شروع کیا۔ ان لوگوں کی روایات بالکل مختلف تھیں۔ یہ پہلے عیسائی رہ چکے

تھے کہ کلیسائی حکام رکھتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آرمیوں کو دینی مسائل سے بے حد مناسبت تھی۔ ایرانی نسل کے افراد بھی ریاستی کلیسیا کا تجربہ رکھتے تھے اور دین کو زندگی کے ہر شعبے میں دخل دیتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ جب کسریٰ کی مطلق العنان حکومت کا اچھا ہوا تو اس کے ساتھ درباری علماء بھی پیدا ہوئے مالاںکہ باوجود اپنی دینی فوقیت کے دعوے کے یہ عنصر عربی طبعیت کے بالکل مخالف تھے۔ غیر مسلموں کا طبقہ اسلام میں داخل ہونا اب حکومت وقت کے لئے اتنا ہی مفید تھا جتنا بنی امیہ کی عربی ریاست کے لئے مضر ثابت ہوا تھا۔ حکام کو ایک نئے طبقے کی مدد حاصل ہوئی جو پہلے نہیں حاصل تھی یہی تسکین اور تقابلاً بالفاظ دیگر علماء کا طبقہ۔ جب یک گونہ معاشرتی مساوات پیدا ہو گئی تو ان لوگوں کو 'جو دینی جذبے سے متاثر تھے طبعاً غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ ایسی کامیابی جو عرب فاتحین کو اس لئے نہیں حاصل ہو سکی تھی کہ وہ غیر عرب اقوام کو اپنے حلقے میں داخل کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ عہد بنی عباس میں ایک عالم دین کی عظمت کا انداز اس پر تھا کہ ہزاروں افراد نے اس کی تبلیغ و ارشاد سے دین اسلام قبول کیا۔ ان حالات کی بنا پر کچھ میں آتا ہے کہ اس زمانے میں دین اسلام تیزی سے پھیلا ہو گا اور غالباً چوتھی صدی ہجری کے آخر تک دین اسلام کی مشرق میں تقریباً اتنی ہی اشاعت ہو گئی تھی جتنی آج کل ہے۔ گویا اس زمانے میں پھر اشاعت اسلام کا محرک جذبہ دین ہو گیا جیسا کہ عہد کے کئی عہد میں تھا لیکن درمیانی زمانے میں معاشی اور سیاسی عناصر اگر خالصتاً نہیں تو بڑی حد تک ضرور کار فرما تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام کی ایک رنگ دینی تہذیب کے وجود کا واحد سبب یہی ہے کہ مشرق میں دین اسلام پھیل گیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اگر ایسا خیال کیا جائے تو اس کے

cf Goldziher, *Islamisme et Parsisme* (Revue de l'histoire des religions, 43, 1901.)

cf Arnold, *The Preaching of Islam*, p. 65.

یعنی ہمیں کہہ سب کو متفقہ قرار دیا جا رہا ہے۔ دین محمدی نے یک رنگ اسلامی تہذیب نہیں پیدا کی بلکہ عباسی سلطنت کی یک رنگ تہذیب نے جو بالکل دوسرے اسباب کا نتیجہ تھی ایسی حالت پیدا کی جس میں دین اسلام کی اشاعت ممکن ہوئی۔ واقعات کی رفتار پر عربی تہذیب کی عظمت کے افسانے کی وجہ سے پردہ بڑ گیا ہے۔ کما جاتا ہے کہ عہد خلافت کی تہذیب عربوں نے پیدا کی اور بعض لوگ تو ملوکی عمارات اور الحمر اکو بھی عربوں سے ہی منسوب کر دیتے ہیں۔ یہ صریح غلط فہمی ہے۔ یہ تاریخ کا سائنسی نظریہ ہے اور اتنا ہی غلط ہے جتنا دینی نظریہ جس کی تردید کی جا چکی ہے۔ محض اس وجہ سے کہ خلفاء کے عہد سے مشرق قریب میں عربی زبان رائج ہو گئی ہے اور ابتدائی زمانے میں ادبی زبان بھی عربی ہی تھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تہذیب بھی عربی ہی ہے۔ جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے اندازہ ہوا ہو گا کہ ایسا ہونا طبعاً ناممکن تھا و اعتقاداً یہ کہاں تک صحیح ہے؟

خلفاء کے تمدن میں کون سے خصوصی عربی عناصر پائے؟

میں پائے جاتے ہیں؛ ابتدائی عہد میں ایسا ضرور تھا لیکن ابھی ریاست کو ہونے تک نہیں قائم رکھ سکے۔ کیا یہ عناصر سلطنت کے نظم و نسق پر شخص جس نے قدیم نوشتوں کا مطالعہ کیا ہے اور عدم تعصبی سے عربی اور یونانی مآخذ کا مقابلہ کیا ہے یہ کہہ دے گا کہ ”عربی نظام حکومت خلفاء کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ بازنطینی اور ایرانی دقت پرست کا۔ وہ بہت انتہا پرستی کی ہے۔ یہی کیفیت تہذیب و تمدن کے ہر شعبے کی ہے حتیٰ کہ دین عربی کے نظام اعتقادات میں بھی سچی کلیسا کے اعتقادی مباحث اور فسطاطی اور ہندی روحانیت کے اثرات نمایاں ہیں۔ علوم طبیعی اور فلسفہ یونان سے آیا فن تعمیر ایران اور بازنطین سے اور علم تاریخ ایران سے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلامی سلطنت کے تمدن میں بعض عربی اثرات بہت نمایاں ہیں مثلاً شاعری میں یا فقہ کے بعض اجزاء مثلاً قانون وراثت اور قانون ازدواج وغیرہ میں لیکن یہاں بھی بس یہی ہوا کہ حکمران قوم کے قدیم رسوم اور قرآن کی تعلیمات کو جگہ دے دی گئی۔ رہے فقہی اجتہادات تو ان پر بالکل دوسرے اثرات نظر آتے ہیں۔ یہ حقیقت قابل لحاظ ہے کہ اصول فقہ کے مآخذ تو عربی ہیں لیکن اصول

کا رنگ چڑھنے لگا اور آخر میں بازنطینی سلطنت نے ساسانی اثر قبول کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت سے مشرق کا وہ رد عمل شروع ہوا جس کا اثر یونان اور روم پر بھی پڑا۔

مشرق اور مغرب کی حد فاصل آہستہ آہستہ کمزور ہوتی گئی اور بالآخر سیاسی تغلق بھی ایران اور بازنطین کی آئے دن کی کشمکش کی وجہ سے قائم نہ رہی۔ خسرو ثانی اور ہرقل کی لڑائیوں کا بھی چھوٹے پیمانے پر وہی اثر ہوا جو سکندر اعظم کی فتوحات کا ہوا تھا یعنی یہ کہ ایک مغلوط لیکن یک رنگ تمدن کی بنیاد پڑ گئی۔ مشرق ادنیٰ میں تمدنوں کے اس عجیب و غریب نسلط مغلوط کا کل اظہار آرامی مسیحیت میں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ آرامی زبان بھی نہ صرف الفاظ میں بلکہ طرز ادب میں بھی یونانی اور ایرانی عناصر کا عجیب و غریب مرکب ہے۔ اس کے علاوہ آرامی کلیسا ایک ایسا ادارہ تھا۔

سیاسی سرحدوں کو پار کر کے دوسرے ملک میں برابر پہنچتے رہتے۔
حقیقت ہے کہ باوجودیکہ آرامی عیسائیوں کی نسل بھی مغلوط تھی۔
رہتے تھے ان میں ایک قسم کا نوعی اتحاد پایا جاتا تھا جو اسی خصلت۔

کہ عربی فاتحین کو مشکلات کا سامنا صرف وہیں ہوا جہاں قومی عناصر کا مقابلہ تھا یعنی ایران اور شمالی افریقہ میں۔ اس حقیقت کو میں اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ اس علاقے کی تمدنی کیسائیت ظاہر ہو جائے جس میں آرامی زبان بولی جاتی تھی۔ قریباً مکمل اور نوٹ لکھنے کی تصانیف سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ عرب زمانہ قبل اسلام میں بھی آرامی تمدن سے بے حد متاثر تھے۔ یہ کیفیت اس وقت بھی قائم رہی جب انھوں نے مغربی ایشیا کو فتح کیا۔ انھوں نے آرامی تمدن کو بہ تمام و کمال اختیار کر لیا اور اس میں اسی طرح زندگی بسر کرنے لگے جیسے اسلام سے پہلے کیا کرتے تھے۔

۱۔ ملاحظہ ہو میری کتاب 'Christentum und Islam' ص ۱۸۔ یہی کیفیت قطعی اور شمالی افریقہ کی مسیحیت کی بھی تھی لیکن آرامی اثر غالب تھا۔

۲. Fraenkel, Die Aramaischen Fremdwörter im Arabischen.

خاص عربی عناصر کا ذکر تو پہلے آ ہی چکا ہے۔

بائیں ہمہ اگر ہم یہ سمجھیں کہ اسلامی تمدن عبارت ہے محض آرامی تمدن اور چند عربی عناصر سے تو یہ خیال بالکل غلط ہو گا اور ہمارے ذہن میں اسلامی تمدن کی بالکل صحیح شدہ صورت قائم ہوگی۔ یہ کیفیت ابتدائی زمانے میں ضرور تھی اور یہی واقعہ ہے کہ اسلامی تمدن کی بنیاد آرامی تمدن پر ہے لیکن بنیاد سے زیادہ ہمیں اسلامی تمدن آرامی تمدن کی بہت زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے لیکن اس کی ارتقا کا رجحان وہی رہا جو آرامی تمدن کا ساتویں صدی عیسوی تک تھا۔ یہ تو پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ محمد سے قبل چند صدیوں سے مشرق ادنیٰ کا رجحان آہستہ آہستہ ایشیا کی طرف ہوتا جا رہا تھا رائج اوقات تمدن کا مرکز شہل اور اس کے آخذ آہستہ آہستہ بحیرہ روم سے ہٹ کر اندرون ایشیا کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔ یہ رفتار مسلسل اسلامی عہد میں قائم رہی۔ اس کا سبب معلوم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ یہ سبب دین اسلام میں نہیں ملے گا بلکہ مغربی ایشیا کے سیاسی اتحاد میں یا بہ الفاظ دیگر تاریخ عالم کی اس حقیقت میں کہ مغربی ایشیا میں یک رنگ و یک آہنگ سلطنت قائم ہو گئی۔ اس سے پہلے بھی باوجودیکہ مشرق ادنیٰ دو سیاسی حصوں میں تقسیم تھا اور سیاسی رجحان زیادہ تر مغرب کی طرف تھا ایک اتحاد قائم ہو چکا تھا لیکن اب تو یک بیک یہ تمام علاقہ اور سلطنت ایران ایک واحد ریاست کے رشتے میں ساتھ ساتھ منسلک ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کی قدیم تہذیب سے تعلق قطع ہو گیا اور ایشیائی اثرات کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں وہ سب کی سب ہٹ گئیں۔ تاریخی واقعات کے اس رجحان کا صحیح انداز اس زمانے میں نہ تو عربوں کو ہوا اور نہ آرامیوں کو اور نہ ہی امیہ کے عہد میں دار السلطنت سرحد کے قریب ہی رہا۔ دمشق کی فوقیت کچھ تو اتفاقی تھی اور کچھ عربی عنصر کے غلبے کی وجہ سے لیکن اس زمانے میں بھی عراق کی معاشی اور تمدنی اہمیت دن پر دن واضح ہوتی جاتی تھی۔ دار السلطنت کا بعد ازاں کو منتقل ہو جانا اس بات کا مین ثبوت ہے کہ ارتقا کا جو خاکہ کھینچا گیا ہے وہ لازمی تھا۔ اس زمانے سے خلافت سلطنت کسریٰ کے سلسلے کی ایک کڑی ہو گئی جس کا سیاسی مطلقہ وسیع تر تھا۔ چنانچہ طبعاً اس سلطنت کے تمدن میں ایرانی اثر زیادہ نمایاں ہوا اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا وسط ایشیا، ترکستان اور چین کا اثر بھی اس پر

پڑا۔ یہ تمدن نہ عربی تھا نہ خالص ایرانی اور نہ خالص آرا می بلکہ ایک ایسا مخلوط ایک رنگ تمدن تھا جس کی بنیاد ایک متحدہ ریاست پر تھی۔ چونکہ یہ ریاست اسلامی تھی اس لئے اس تمدن کو بھی اسلامی کہنا صحیح ہے۔

ابھی ضرورت ہے کہ سلطنت کے اتحاد کا جو اثر تہذیب و تمدن پر پڑا اس کو اور واضح کیا جائے۔ اس سے قبل میں نے اکثر لکھا ہے کہ عربوں کی حالت بہت کم بدلتی ہے لیکن اس موقع پر اتنے ہی زور کے ساتھ یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ باوجودیکہ مقامی آزادی حاصل تھی محض اتحاد حکومت کی وجہ سے مختلف عناصر میں بہت تیزی سے خلط ملط واقع ہوتا رہا۔ سب سے پہلے کیفیت معاشی زندگی میں نمایاں ہوئی۔ اگرچہ محاصل درآمد و برآمد کی سرحدیں قائم رہیں لیکن تجارت کو جو زندگی کے پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ بہت وسیع علاقے جو تجارت کی آخری حد سمجھے جاتے تھے اب مال کو آگے روانہ کرنا پڑا وہی اس وقت جب ایک طرح کا سرمایہ داری نظام بن رہا تھا۔

بڑے سرمایہ دار سٹیلین یا لینن کی صورت میں کرتے تھے۔ یہ اثرات علامت سے بہت دور ہیں۔ سلطنت کے ہر گوشے تک پہنچے۔ پھر سب سے بڑھ کر خود حکومت نے جب مقامی عہدہ داروں کے نظام کو وسیع کر کے تمام سلطنت میں پھیلا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک حصہ سلطنت کے تمدنی اثرات دوسرے حصے پر جلد از جلد اور زیادہ زیادہ پڑنے لگے اور اس سے جو کیفیت پیدا ہوئی اس کا تصور بھی سلطنت عباسیہ کے قیام سے پہلے نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا قصہ تھا کہ اس ارتقا کو ذرا تفصیل سے بیان کرتا لیکن اسٹیلین ہر سفیلڈ کے مضمون کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اس مضمون کے نتائج سے بہ تمام و کمال متفق ہوں۔ ہر سفیلڈ نے اسلامی نمونہ لطیفہ کی مثال لے کر یہ بہت خوبی سے دکھایا ہے کہ یک رنگ اسلامی تہذیب کی تعمیر میں معاشی اسباب کا کتنا بڑا حصہ ہے۔

بہل ہی کیفیت ذہنی زندگی کی بھی تھی لیکن یہاں مبادلہ خیالات اس وقت شروع ہوا جب عباسی
 اور عباسی عناصر اپنا کام کر چکے تھے۔ اس وقت ایک ایسا ایک رنگ دین پیدا ہوا جو سلطنت کی آبادی
 کے مختلف اور آزاد عناصر میں ایک مضبوط رشتہ اتحاد ثابت ہوا۔ پرانی مذہبی دیواریں بھی اسی طرح
 مسمار ہو گئیں جس طرح سیاسی دیواریں۔ اب کہ دین اسلام میں مذکورہ بالا طریقے پر زور پیدا ہو گیا تھا اور
 اس نے قدیم ادیان کے ذہنی تر کے پر قبضہ کر لیا تھا طلب حدیث شروع ہوئی اور اس نے ایسا
 ذہنی اتحاد پیدا کیا جس پر اسلامی رنگ غالب تھا۔ اب بحر محیط سے لے کر چین تک ایک ہی قسم
 کے علوم دین کی اشاعت شروع ہوئی اور ارسطو کی تصنیفات اور دوسری علمی فتوحات کو علما اسلام
 نے اپنا جامہ پنا کر سلطنت کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا بلکہ سلطنت کے حدود سے باہر لاپ نار
 (Lap Nor) اور فلج شاد (Lake Chad) تک یہ علوم پہنچ کر رہے۔

ایک سلطنت کے قیام کا بہت ہی اہم نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممالک بھی جن تک آرامی تہذیب و
 تمدن نہیں پہنچا تھا مثلاً ایران، مصر اور افریقیہ اس جدید اتحاد میں شریک ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ ممالک
 مرکزی سلطنت سے بہت جلد الگ ہو گئے لیکن اتحاد کا مطمح نظر قائم رہا اور ان حصوں میں بھی باہمی
 رشتہ قائم رہا جو ایک بین قومی خصوصیت کے مالک تھے مثلاً اندلس اور ایران۔ اس طرح آرامی تمدن
 کی چوٹی سی جہیل میں ہر طرف سے معاون دریاؤں کے آکر گرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تمدن کا
 بحر زخار موجیں مارنے لگا۔ اب دین کا غلبہ شروع ہوا اور وہ ارتقائی منازل طے کر کے اس جدید
 شکل کا غالب عنصر بن گیا۔ یہاں اس بیان کے اعادے کی ضرورت ہے جو اشاعت دین اسلام
 سے متعلق پہلے دیا جا چکا ہے۔ مولویانہ رجحان کے پیدا ہونے کا واحد سبب محمد کی تعلیم نہیں ہے بلکہ
 وہ قدیم رجحانات کا نتیجہ ہے جس میں سیمی کلیسائیت اور ایرانی ریاستی کلیسا کو خاص طور پر دخل ہے۔
 عباسی 'خلافت' کی فتح اموی 'ملک' پر صرف یہی معنی نہیں رکھتی کہ محمد کی دینی تعلیمات کو شرفارکہ
 کے دنیاوی رجحانات پر فتح حاصل ہوئی بلکہ وہ بڑی حد تک ایرانی اور سیمی ریاستی کلیسا اور مشرق
 قدیم کے شدید دینی نقطہ نظر کی فتح ہے خالص دنیاوی عربی قومی ریاست پر اسلام کا نام تو قائم

راہنیں اس کی کیفیت اصل بدل گئی۔

اب جا کر کہیں اسلام ایک دین، ایک سیاسی سطح نظر اور ایک تمدن کا مجموعہ بنا اور عالمی تبلیغ کی صلاحیت اس میں پیدا ہوئی اگرچہ بعد کو بعض مقامی اثرات سے مختلف فرقے پیدا ہو گئے مثلاً ایران میں فرقہ شیعہ، اگرچہ خوارج بھی موجود تھے اور صوفیوں کے سلسلے بھی، اگرچہ چین کے دور افتادہ علاقے میں اسلام قومی تمدن پر غالب نہ آ سکا مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک عظیم الشان اسلامی وحدت قائم رہی۔ یہ وحدت یورپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے مقابلے میں بہت زیادہ نمایاں طور پر ظاہر ہوئی اس کا اظہار لفظ شریعت سے ہوتا ہے جسے زندگی کے ہر شعبے میں دخل ہے۔

یہ حقیقت بہت زیادہ قابل لحاظ ہے کہ دین جس کی راہ

نے مدد کی اس وقت بھی قائم رہا بلکہ بڑھتا ہی رہا جب خود

کی جگہ ایک ریاست کے سطح نظر نے لے لی۔ عام طور پر یہ خیال

کے عہد زریں کی صورت حال پر مبنی ہے لیکن میری رائے میں یہ صحیح نہیں اس کا عالمہ امور اور عباسی عروج کے زمانے سے لے کر خلفاء راشدین کے عہد کی طرف غسوب کر دیا گیا ہے۔ اس قسم کے بیشتر نظریے بنی امیہ کی مخالفت میں پیدا ہوئے اور بنی عباس کے عہد میں جو خود کو خلفاء راشدین کا جانشین کہتے تھے ان نظریوں نے اعتقادات کی صورت اختیار کر لی۔ واحد ریاست کے تخیل نے اس زمانے میں بھی جب خلافت برائے نام رہ گئی تھی سلاطین کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ بے بس خلیفہ سے پروانہ حکومت حاصل کریں۔ ابتدائی زمانے میں دین ریاست کا خادم تھا۔ عہد عباسی میں سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے ریاست کو دینی حیثیت دے دی گئی اور بعد کے سلاطین کو یہ حیثیت تسلیم کرنی پڑی۔ اس خیال کی اہمیت آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے لیکن اب بھی مسلم ممالک خلیفہ بننے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

سیاسی سطح نظر سے زیادہ اہم زندگی اور تہذیب کا وہ نصب العین ہے جو شریعت اسلامی نے

پیش کیا ہے یہ دین سے سراسر وابستہ ہے۔ اس میں مدعو و ج کے عمل کو نظری نظام کی شکل دے دی گئی ہے۔ یہ عمل اس زمانے کے معاشرتی ماحول کے لئے نہایت درجہ موزوں اور مناسب تھا لیکن جب آخری زمانے میں اسلام بغیر سیاسی طاقت کے محض دین اور تمدن کی شکل میں مدعو و خلافت سے باہر نکلا اور زیادہ تر تاجروں کے ذریعہ دوسرے ممالک میں پہنچا تو ان ممالک کے عمل اور شریعت اسلامی میں کم و بیش وہی نسبت باقی رہی جو اس عہد کی قابل افسوس سیاسی حالت اور سیاسی سطح نظر میں تھی اس طرح 'شریعت' اور 'عادت' کا وہ اختلاف نمایاں ہوا جو ان ممالک میں نظر آتا ہے۔ اس مہزین میں بھی جہاں 'شریعت' نے نشو و نما پائی اس کی حیثیت عمل سے زیادہ سطح نظر کی ہی تھی اور دوسرے ممالک میں تو یہ سراسر سطح نظر ہی رہی شریعت کے خالص دینی ارکان پر تو ضرور عمل ہوا اور یہی وجہ ہے کہ آج کل اسلام کا دینی پہلو ہی اہم اور موثر پہلو ہے اور قہقہے ممالک کے مسلمانوں میں جو رشتہ قائم ہے وہ محض اعتقادات اور واحد نصب العین کا رشتہ ہے۔ پس ماندہ ممالک میں آج کل بھی اسلام کی اشاعت تیزی سے ہو رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام بیک وقت ایک دین اور ایک تمدن پیش کرتا ہے اور ریاست کے قیام کی صلاحیت بھی پیدا کرتا ہے۔ رشتہ اتحاد دین ہے جس پر ابھی تھوڑے عرصے سے قومیت اور نئی روشنی کا اثر پڑنا شروع ہوا ہے۔

اسلام کے ارتقا کو سمجھنا اس قدر آسان نہیں ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ جو لوگ اسلام کو 'عربی تہذیب' کے تصور کی مدد سے سمجھنا چاہتے ہیں وہ ابھی اس عقدے کے صمیم حل سے بہت دور ہیں۔ وہ لوگ جو قرآن اور سیرت محمدی کو موجودہ اسلام کے سمجھنے کے لئے کافی سمجھتے ہیں تو ان کا تب خدا ہی حافظ ہے۔ چونکہ اس قسم کے خیالات آج کل بھی عام طور پر پھیلے ہوئے ہیں اس لئے غالباً میری یہ کوشش بے سود نہ سمجھی جائے گی جو میں نے ارتقا اسلام کا ایک ابتدائی خاکہ سمجھنے میں صرف کی ہے۔ لیکن ہے اس میں بہت سے نتائج محل بحث ہوں اور بعض چیزیں محض موضوعی

ہوں لیکن اہم حصوں کی بنیاد تفصیلی مطالعے اور غور و فکر پر ہے۔ امید ہے کہ میرے بعد آنے والے محقق اس خاکے کے نقائص کو دور کریں گے اور اگر یہ صحیح ثابت ہوا تو اس میں تفصیلات کا اضافہ کریں گے۔

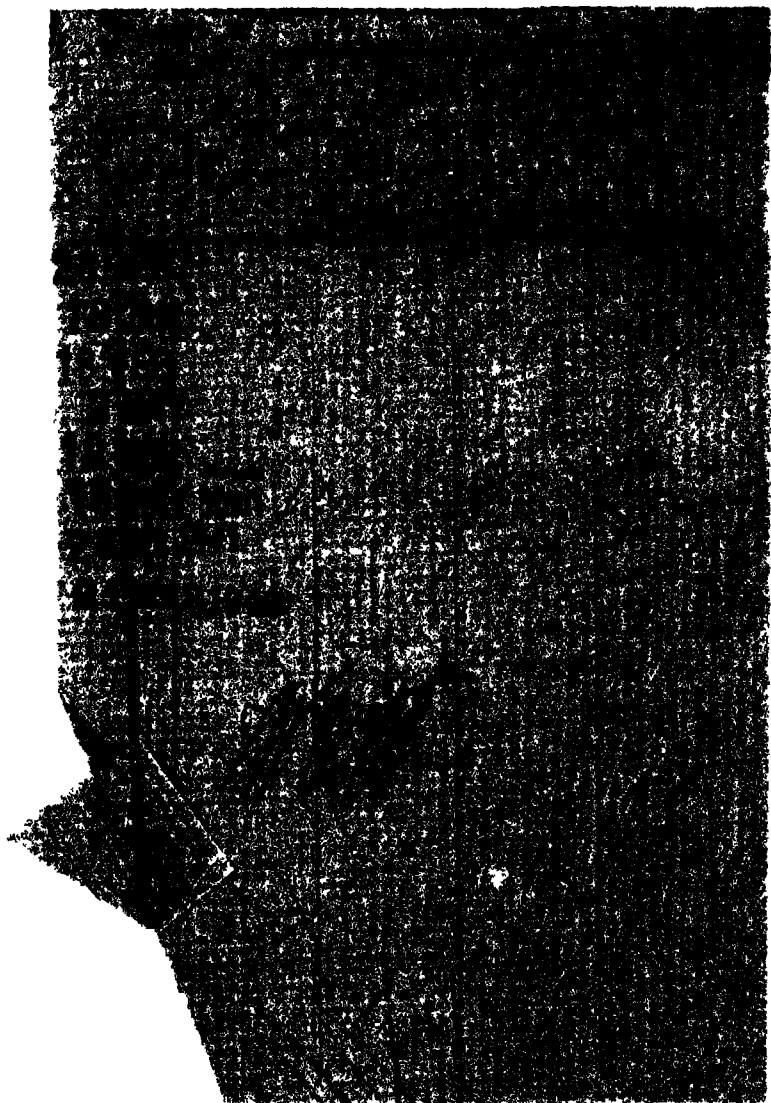
(پروفیسر بکیرم جوہن کا انتقال گذشتہ سال ہوا اس زمانے کے مستشرقین میں بہت نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ تاریخ اسلام میں ان کو بہت زیادہ شغف تھا اس کے مسائل کو حل کرنے اور مشکلات کو رفع کرنے میں ہی انہوں نے اپنی تمام عمر صرف کی۔ جنگ عظیم کے بعد سبب جرمی کی تشکیل ہوئی تو وہ اس ملک کے سب سے بڑے صوبے پریشیا کے وزیر امور بن گئے۔ انہوں نے تقریباً دس سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۷۹ء میں تو جامعہ برلن میں تاریخ اسلام کے استاد کی حیثیت سے درجہ شرف حاصل کرنے والے انہوں نے وفات کی اور تقریباً ۵۵ سال کے سن میں انتقال کیا۔)

مضامین کا ایک مجموعہ *Islam-studien* کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں بیشتر مضامین اسلام کی تمدنی اور دینی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اس پر جو مقدمہ انہوں نے لکھا تھا وہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مضمون اسی مقدمے کے ایک حصے کا ترجمہ ہے۔ باقی تین حصوں کے ترجمے کا بھی ارادہ ہے جو آئندہ پرچوں میں شائع ہوں گے۔ *Islam-studien* کی دوسری جلد بھی شائع ہو گئی ہے۔ دوسری جلد کے شائع ہونے کے بعد ہی مصنف کا انتقال ہو گیا اور اس کی مقبولیت کو وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔

اس مضمون میں تمدن اسلام کی ارتقا کا جو خاکہ انہوں نے کھینچا ہے اس میں انہوں نے ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ مجھ کو ان سے ذاتی طور پر نیاز حاصل تھا اور مجھے یقین ہے کہ تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ وہ بے تعصبی اور ایمان داری سے اسلام اور تمدن اسلام کا مطالعہ کرتے تھے اور بہت غور و فکر کے بعد کچھ لکھتے تھے۔ اس مضمون کے ترجمے کا مقصد یہ ہے کہ بہت دستان

کے مسلم مفکرین کو ایک متاثرہ مشرق کے خیالات سے آگاہی ہو۔ بااوقات اپنی چیز کو دوسروں
 کی نگاہوں سے دیکھنا بہت مفید ہوتا ہے۔ [ع . ع]





اردو کی سب کتابیں
آپ مکتبہ جامعہ سے طلب فرمائیں

چند سالانہ پانچ روپہ
قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ



پرنٹر، پبلشر: محمد مجیب بی، اے (آکسن)

نے

جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا ا

